بیادِ ابنِ انشاء

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) .... 700 روپے

ایشیا، افریقہ، یورپ .... 5000 روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا .... 6000 روپے

مستقل سلسلے

خط و کتابت کا پتہ

کرن

37- اردو بازار کراچی

جنوری 2015

جلد 37 شمارہ 10

قیمت 60 روپے
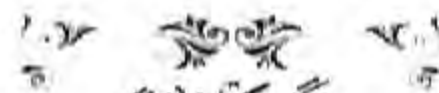
پبلشر آزر ریاض نے ابنِ حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: kiran@khawateendigest.com Website: www.khawateendigest.com

جنوری 2015ء کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

نئے سال کا سورج اپنی تمام تر توانائیوں کے ساتھ روشن ہے اور ہمارے لیے بہت سی امیدیں اور آرزوؤں کا پیغام لے کر آیا ہے۔

سال گزشتہ کا سورج جہاں بہت ساری خوشیاں دے کر گیا ہے وہیں بہت سارے سانحے بھی رقم کر گیا۔ سانحہ پشاور نے پوری قوم کو جھنجوڑ کر رکھ دیا ہے۔ ایک اور 16 دسمبر کو پاکستان پھر سانحہ پشاور کی صورت لہولہان کر دیا گیا۔ پاکستان گزشتہ کئی سالوں سے دہشت گردی کی لپیٹ میں ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم ایک قوم بن کر متحد ہو جائیں اور تفریقات کو مٹا کر ایک ہو جائیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ نیا سال ہم سب کے لیے ڈھیروں خوشیاں لے کر آئے۔ سال گزشتہ جن کٹھن لمحات کا سامنا کرنا پڑا اس سال ان سے محفوظ رہیں۔ (آمین)

قارئین کو نیا سال مبارک۔

ابن انشا کی برسی،

ابن انشا دنیائے ادب کے شناور تھے۔ کالم نگاری ہو یا سفرنامے، ان کا ایک منفرد انداز ہے۔ شاعری میں دیکھیں تو ایک طرف میر کا رنگ نظر آتا ہے، دوسری طرف جب وہ بچوں کے لیے لکھتے ہیں تو ایک علیحدہ ہی انشا جی نظر آتے ہیں۔ چاند نگر سے لے کر جوگ کا بستر تک انشا جی کی شاعری دل موہ لینے والی ہے۔

11 جنوری کو ان کی برسی کے موقع پر قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

اس شمارے میں،

- بیادِ ابن انشا،
- سال نو کے موقع پر مختلف شخصیات سے دلچسپ سروے،
- اداکارہ "سیرا حسن" سے شاہین رشید کی ملاقات،
- اداکار سمیع خان کہتے ہیں "میری بھی سنیے"،
- اس ماہ "پارس شاہ" کے "مقابل ہے آئینہ"،
- "اک ساگر ہے زندگی"، نفیسہ سعید کا سلسلے وار ناول،
- "ردائے وفا"، فرحین اظفر کا نیا سلسلے وار ناول،
- "دریچۂ محبت"، شفق افتخار کا مکمل ناول،
- "فصیلِ دل"، مصباح علی کا مکمل ناول،
- "محبت تیرے کتنے رنگ"، سلمیٰ فقیر حسین کا ناولٹ،
- "ایسا بھی ہوتا ہے"، راشدہ رفعت کا ناولٹ،
- "خالہ، سالا اور راہ پر والا"، فاخرہ گل کی دلچسپ مزاحیہ تحریر،
- ندا حسنین، نورعین، نزہت جبیں ضیاء اور فرح نعیم کے افسانے،
- اور مستقل سلسلے،

مفت،

ربیع الاول کے مہینے کی مناسبت سے کرن کتاب "رحمت اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم" کرن کے ہر شمارے کے ساتھ علیحدہ سے مفت پیش خدمت ہے۔

مجھے تجھ سے محبت ہے، مرے اللہ
یہی میری عبادت ہے، مرے اللہ

مجھے بھی تو وہی خوبی عطا کر
جو خوبی تیری فطرت ہے، مرے اللہ

خود اپنے رنگ میں تو رنگ لے مجھ کو
یہی اس دل کی حسرت ہے، مرے اللہ

میں تیرے کام کا بندہ نہیں تو کیا
کہ تو میری ضرورت ہے، مرے اللہ

مجھے اس راہ پر ہی گامزن رکھنا
کہ جو راہِ ہدایت ہے، مرے اللہ

ہے جو بھی کچھ مرے دامانِ قسمت میں
وہ سب تیری عنایت ہے، مرے اللہ

پرویز ساحر

پاؤ گے قرآن کی ایک ایک آیت کا شعور
دل سے گر حاصل کرو آقا کی سیرت کا شعور

وہ سراجِ ضوفشاں ہیں یعنی مصباحِ منیر
کاش دنیا کو ہو اس نورِ نبوت کا شعور

مل نہیں سکتی مواخاتِ مدینہ کی مثال
آپ نے انساں کو بخشا ہے اخوت کا شعور

آپ عبدِ بے مثال اور آپ سردارِ انام
آپ نے ہم کو دیا رب کی عبادت کا شعور

آپ کی تعلیم ہے، اللہ سے ڈرتے رہو
دل میں رکھنا سختیٔ روزِ قیامت کا شعور

پیٹ پر باندھے ہیں پتھر اور خندق کھودی
آپ کی سیرت سے ملتا ہے مشقت کا شعور

بے گماں رب کی اطاعت ہے اطاعت آپ کی
مقبول! رکھنا چاہیے ہر پل اطاعت کا شعور

تنویر مقبول

رسالہ در معرفت ابن انشا

مشفق خواجہ

تمہید دنیائے ادب بھی عجیب جائے عبرت ہے کہ جہاں شہرت اور گم نامی دونوں کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ کل جو شہرت عام اور بقائے دوام کے دربار میں صف اول میں تشریف فرما تھے' آج ان کا نام و نشان صف نعال میں بھی نہیں ملتا۔ ادبی تاریخوں کے متن تو کیا حواشی بھی ان کے تذکرے سے خالی ہیں۔ بشرطیکہ یہ ادبی تاریخیں انہوں نے خود نہ لکھی ہوں۔ کل استاد ذوق کے سامنے غالب کی کوئی اہمیت نہ تھی اور آج استاد ذوق کی اتنی بھی اہمیت نہیں ہے کہ جتنی استاد اختر انصاری اکبر آبادی کی ہے۔ اس صورت حال سے ادب کو جو نقصان پہنچتا ہے وہ تو ظاہر ہے لیکن محققوں کو جو ناقابل تلافی زحمت اٹھانی پڑتی ہے' اس کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔ ان بے چاروں کو پھٹے پرانے کرم خوردہ' آب رسیدہ اور سرد و گرم زمانہ چشیدہ مخطوطوں اور کتابوں کے حوالے سے گم نام ''مشاہیر ادب'' کا سراغ لگانا پڑتا ہے اور مبہم' بے کار اور بے مصرف اشاروں کی مدد سے ان رفتگان ادب کی شخصیت اور کارناموں کو عظیم ثابت کرنا پڑتا ہے اور جب زندگی بھر کی محنت کے بعد کسی شاعر یا ادیب کے حالات پردہ اخفا سے نکال منظر عام پر لائے جاتے ہیں تو بے چارے محقق کو کوہ کندن اور کاہ بر آوردن کا طعنہ سننا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل تحقیق نے مرزا مینڈھو سر سبز' مرحمت خان مرمت' میر بھیشا عشق اور میر کلو حجام کے بارے میں جو تحقیق کی ہے' بعض عاقبت نا اندیش اس کا مذاق اڑاتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ اگر مینڈھو سر سبز جیسے شعرا کے سال ہائے

پیدائش و وفات معلوم نہ ہوتے تو اس سے ادب کا کیا نقصان ہوتا۔ افسوس کہ یہ عاقبت نا اندیش یہ نہیں سوچتے کہ اگر اس قسم کے کام نہ ہوتے تو محقق حضرات اپنا خالی وقت کس طرح گزارتے۔ وہ اپنی صلاحیتوں کا یا ان کے ضائع ہونے کا مظاہرہ کس طرح کرتے۔ آج جو لوگ محققوں پر اعتراض کرتے ہیں' انہیں اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ کل ان کی ذات گرامی بھی کسی نہ کسی محقق ہی کی وجہ سے حیات ثانی حاصل کرے گی۔ لہٰذا محققوں پر اعتراض کرنا خود اپنی ادبی حیات بعد الموت کو خطرے میں ڈالنے کے مترادف ہے۔

سبب تالیف اس تمہید کے بعد ہم اصل مقصد کی طرف آتے ہیں اور ایک ایسے ادیب سے آپ کو متعارف کراتے ہیں جس کا نام گزشتہ صدی کی پانچویں دہائی تک سکہ رائج الوقت کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس طرح دار ادیب نے دنیائے ادب میں بڑے بڑے معرکے سر کیے' متعدد [illegible] لکھیں' ہر چھوٹے بڑے سے خراج تحسین وصول کیا اور ان کے وصول کرنے میں کسی سے نرمی برتی نہ [illegible]۔ اخباروں میں اس ادیب کے مضامین [illegible] کثرت سے اور نمایاں طور پر شائع ہوتے [illegible] افسوس کہ آج یعنی اکیسویں صدی کے ربع آخر میں بیشتر لوگ اس عظیم صاحب قلم کے کارناموں سے تو کیا نام سے بھی واقف نہیں۔ نئی نسل تو خیر اردو زبان ہی سے نابلد ہے' وہ بھلا اس ادیب کو کیا جانتی ہوگی۔ ہاں کچھ پرانے زمانے کے بزرگ ایسے موجود ہیں جنہوں نے اپنے بچپن میں اس ادیب کو دیکھا یا پڑھا تھا' سو ان کے تعاون سے اور بعض دستیاب شدہ نادر تذکروں اور کتابوں کی مدد سے ہم یہ رسالہ لکھ رہے ہیں جس کا نام ''رسالہ در معرفت ابن انشا'' رکھا ہے کہ شاید اس سے تاریخ تصنیف نکلتی ہو۔ امید ہے علمی حلقوں میں ہماری اس کوشش رائیگاں کو پسند کیا جائے گا۔

نام اس گمنام ادیب کا نام ابن انشا تھا۔ ہم نے جہاں تک اس نام کی ساخت پر غور کیا ہے' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اصلی نام نہیں ہے۔ ابن انشا کا مطلب ہے انشا کا بیٹا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انشا کون تھا' اور یہ اس کا کون سا بیٹا تھا۔ کیونکہ گزشتہ صدی میں کسی بھی شخص کے صرف ایک ہی بیٹا نہیں ہوتا تھا ہم اس سوال کا جواب دینے سے قاصر ہیں کیونکہ ہم ابن انشا کے حسب و نسب اور خاندانی حالات و مناقشات و تنازعات سے ناواقف ہیں۔ نام کے سلسلے میں خود ابن انشا کا ایک بیان ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ انہوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ہمارے اصلی نام میں ایک چوپائے کا نام آتا ہے' اس لیے ہم نے اصلی نام ترک کر کے ''ابن انشا'' اختیار کیا۔ یہ جاننے کے لیے کہ کس چوپائے کا نام... ابن انشا کے اصلی نام میں شامل تھا[1]' ہم نے حیوانیات کے متعدد ماہرین سے رجوع کیا اور حیوانیات کی خاص خاص کتب حوالہ دیکھیں' لیکن افسوس کہ ہمیں کسی چوپائے کا ایسا نام نظر نہیں آیا' جو ابن انشا سے مطابقت رکھتا ہو۔ یہ مسئلہ مزید تحقیق کا محتاج ہے اور چونکہ ہم حیوانیات کے ماہر نہیں' اس لیے اس مسئلے کو یہیں چھوڑتے ہیں تاکہ کوئی دوسرا محقق اس کو اٹھالے' اور پھر جھاڑ پونچھ کر اس پر مزید تحقیق یا طبع آزمائی کرے۔

البتہ اس امر کی تردید کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ جو لوگ ابن انشا کو مشہور شاعر انشاء اللہ خاں انشا سے منسوب کرتے ہیں' وہ سخت غلطی پر ہیں۔ انشاء اللہ خاں ابن انشا سے کم از کم ڈیڑھ سو برس پہلے کے شاعر ہیں۔ ظاہر ہے کہ باپ بیٹے کے درمیان کئی نسلوں کا واسطہ نہیں ہو سکتا اور کوئی بیٹا باپ کے مرنے کے اتنے عرصے بعد پیدا نہیں ہو سکتا۔

وطن ابن انشا کے وطن کا مسئلہ بھی متنازع فیہ ہے چونکہ ان کی ساری زندگی سیر و سفر میں گزری اور انہیں کسی

[1] ابن انشا کا اصل نام شیر محمد قیصر تھا۔

ایک جگہ جم کر بیٹھنے کا موقع نہیں ملا اس لیے ان کا کوئی وطن متعین نہ ہو سکا۔ جن لوگوں نے ابن انشا کے کلام (نثر و نظم دونوں کا) مطالعہ کیا ہے ان کی رائے ہے کہ وہ دہلی یا لکھنؤ کے رہنے والے تھے کیونکہ ان کے ہاں بے شمار ایسے محاورے ملتے ہیں جنہیں دہلی اور لکھنؤ والے استعمال کرتے ہوئے جھجکتے بلکہ ڈرتے ہیں۔ لیکن بعض ایسے بزرگ جنہوں نے ابن انشا کا آخری زمانہ دیکھا یا جھیلا ہے' یہ کہتے ہوئے کہ موصوف پنجابی تھے۔ ہم نے تمام ماخذوں کی چھان بین کرنے کے بعد... اور ابن انشا کے بعض جاننے والوں سے ملاقات کرکے یہ نتیجہ نکالا ہے

ابن انشا بنیادی طور پر رہنے والے تو پنجاب کے تھے لیکن لکھنے والے پنجاب سے باہر کے تھے۔ یعنی یہی بات اگر یوں کہی جائے تو زیادہ مناسب ہوگی کہ موصوف جب بولتے تھے تو پنجابی معلوم ہوتے تھے لیکن جب لکھتے تھے تو لکھنؤ اور دہلی والوں کے بھی کان کاٹتے تھے۔ گو وہ ان دونوں مقامات میں سے کسی کے روڑے نہیں تھے لیکن محاورے کے ہاتھ پاؤں توڑنے میں وہ اہل زبان کو بھی پیچھے چھوڑ جاتے تھے۔ ہمارے لیے یہ نہایت حیرت کا مقام ہے کہ ایک ایسا شخص جس نے کبھی زبان کے ان مراکز کی سیر نہ کی ہو' وہ کس طرح ایسی زبان لکھ لیتا جو ان مراکز والوں کے لیے بھی باعث حیرت یا موجب عبرت تھی۔ اردو ادب کی تاریخ میں استاد امام بخش ناسخ لاہوری کے بعد ابن انشا دوسرے پنجابی اہل قلم ہیں جنہوں نے لسانی اکھاڑے میں اہل زبان پر فوقیت حاصل کی ہے اور خود ابن انشا کو ناسخ پر یہ فوقیت حاصل ہے کہ وہ زبان سیکھنے کے لیے ناسخ کی طرح کبھی لکھنؤ نہیں گئے بلکہ لکھنؤ والوں کو یہیں بلا کر پہلے ان سے زبان سیکھی اور پھر ان کی زبان درست کی گو اس عمل میں خود ابن انشا کے حواس درست ہوتے ہوتے رہ گئے۔

تعلیم و تربیت ابن انشا کی تعلیم و تربیت اور ابتدائی زندگی کے حالات کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوتا' لیکن ان کی جو تصانیف دستبرد زمانہ سے محفوظ رہ گئی ہیں' ان کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اچھے خاصے تعلیم الرحمن یعنی پڑھے لکھے آدمی تھے۔ علوم رسمیہ و غیر رسمیہ میں انہیں دست گاہ کامل تھی۔ البتہ یہ روایت بھی سننے میں آئی ہے کہ موصوف اپنے مضمون اور کالم دوسروں کو املا کراتے تھے اور پھر انہیں سے پڑھوا کر سن بھی لیتے تھے تاکہ اندازہ کر سکیں کہ کاتب کی اصلاحوں کا معیار کیا ہے۔ اصلاح اگر موقع و محل کی مناسبت سے ہوتی تو قبول کر لیتے ورنہ کاتب سے کہتے کہ مزید غور و فکر کرو اور طبیعت پر زور دے کر اصلاح دو۔ کبھی کبھی کاتب مضمون کے بجائے کاغذ پر زور دے دیتا تو ابن انشا کو سارا مضمون دوبارہ املا کرانا پڑتا۔

ابھی تک ابن انشا کے ہاتھ کا لکھا ہوا کوئی مسودہ دستیاب نہیں ہوا ورنہ ہم ان کے خط پر بحث کرکے یہ معلوم کرتے کہ وہ خط غبار میں لکھتے تھے یا خط بہار میں۔ موصوف چونکہ شاعر کی حیثیت سے خاصے شکستہ دل تھے اس لیے گمان غالب ہے کہ خط شکستہ ہی میں لکھتے ہوں گے۔ بہرحال اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ عموماً "قلم کان پر ہی رکھتے تھے' ہاتھ میں کم لیتے تھے ہاں کبھی کبھار رقم وغیرہ وصول کرنے کے بعد رسیدوں پر دستخط بہ نفس نفیس کر دیا کرتے تھے۔ انگوٹھا اس لیے نہیں لگاتے تھے کہ بے انتہا صفائی پسند تھے۔ لیکن صفائی کا خیال صرف انگوٹھے تک محدود نہیں تھا بلکہ پورے ہاتھ کی صفائی کا خیال رکھتے تھے۔ مختصر یہ کہ نہایت قابل اور ذہین انسان تھے۔ یہ قابلیت ان میں زیادہ تر اپنی تحریروں کے مطالعے سے پیدا ہوئی تھی۔ تعلیم و تربیت کے سلسلے میں ابن انشا کی کفایت شعاری کا ذکر بھی کیا جا سکتا ہے' لیکن ان کی یہ خصوصیت اکتسابی نہیں وہبی تھی۔ اس لیے اس کا ذکر ہم کسی دوسرے باب میں کریں گے۔

تصانیف جس طرح بعض منصوبے کثیر المقاصد ہوتے ہیں' اسی طرح ابن انشا بھی کثیر التصانیف مصنف تھے۔ لیکن ان کی یہ تصانیف کسی منصوبہ بندی کا نتیجہ نہیں تھیں۔ وہ اخبارات میں کالم لکھا کرتے تھے۔ کچھ عرصے بعد یہ کالم کتاب کی صورت اختیار کر لیتے تھے۔ کتاب سازی کا یہ طریقہ خاص ان کی ایجاد تھا۔ اس طریقے پر عمل کرنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ کالم نگاری جو ابن انشا کے بعض ہم عصروں کو لے ڈوبی' ابن انشا کے لیے سودمند ثابت ہوئی اور کالم نگار کے ساتھ ساتھ انہیں ادیب کی حیثیت سے بھی تسلیم کیا جاتا رہا۔ حالانکہ ان دونوں میں بعد مشرقین ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ادیب انہیں کالم نگار کہہ کر اپنا دل خوش کرتے تھے اور کالم نگار انہیں ادیب کہہ کر دل کی بھڑاس نکالتے تھے۔

ابن انشا کی کالم نگاری کا سب سے بڑا فائدہ یا نقصان یہ ہوا کہ لوگوں نے انہیں شاعر کی حیثیت سے بالکل فراموش کر دیا۔ حالانکہ ابن انشا کو اپنی اردو شاعری پر اتنا ہی فخر تھا جتنا غالب کو اپنی فارسی شاعری پر۔ اس صورت حال کا ابن انشا کو خود بھی پوری طرح احساس تھا اور انہوں نے اپنی تحریروں میں جا بجا اس بات پر افسوس کا اظہار کیا ہے کہ شاعر انہیں شاعر نہیں مانتے اور نثر نگار شاعروں میں شمار کرتے ہیں۔ ابن انشا کے اس اظہار افسوس میں ہم برابر کے شریک ہیں۔ گو ہمارے نزدیک ان دونوں طبقوں میں ابن انشا کی شمولیت یا عدم شمولیت سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ جو شخص ابن انشا بن جائے وہ شاعروں یا نثر نگاروں میں شمار ہوئے بغیر بھی اپنا کام چلا سکتا ہے اور یہ تاریخی حقیقت ہے کہ موصوف اپنا کام نہایت خوش اسلوبی سے چلاتے رہے۔

ابن انشا کی سب سے بڑی خصوصیت ان کی بسیار نویسی تھی۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق موصوف نے تقریباً" دس ہزار صفحات سیاہ کیے۔ ممکن ہے بعض لوگ یہ سوچیں کہ ایک بسیار نویس سے کسی اعلیٰ ادبی معیار کی توقع نہیں رکھنی چاہیے' لیکن یہ خیال غلط ہے۔ ابن انشا کا کمال ہی یہی ہے کہ وہ بسیار نویس ہونے کے باوجود خوش نویس' یعنی عمدہ نویس تھے ان کی ایسی کوئی تحریر ابھی تک دستیاب نہیں ہوئی جس کے بارے میں یہ کہا جا سکے کہ یہ محض لکھنے کے لیے یا قارئین کے خلاف انتقامی کارروائی کے طور پر لکھی گئی ہے۔

یہاں یہ امر ملحوظ خاطر رہنا چاہیے کہ ابن انشا اپنے ایک بزرگ ہم عصر نقاش نظرت' حضرت ایم' اسلم کی طرح بسیار نویس نہیں تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ابن انشا صرف فرصت کے اوقات میں لکھتے ہیں اور ایم' اسلم صاحب کو لکھنے سے فرصت ہی نہیں ملتی تھی۔ بسیار نویسی کے باوجود ابن انشا کی تحریروں میں وہ عیوب پیدا نہیں ہوئے جن سے بعض کم لکھنے والوں کی تحریریں بھی عام طور پر خالی نہیں ہوتیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ابن انشا اپنی تحریروں میں اپنے ذاتی عیوب اس قدر فراخ دلی سے بیان کر دیتے تھے کہ مزید کسی قسم کے عیوب کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی تھی۔ اپنے عیوب بیان کرنے والی بات ذرا وضاحت طلب ہے۔ قصہ یہ ہے کہ ابن انشا جب کسی دوسرے کا مذاق اڑانا چاہتے تھے تو پہلے اپنے گریبان پر ہاتھ ڈالتے تھے۔ اپنے بارے میں وہ ایسی باتیں بھی لکھ جاتے تھے کہ اگر کوئی دوسرا لکھ دیتا تو وہ اس پر ازالہ حیثیت عرفی کا دعویٰ کرکے اچھی خاصی رقم حاصل کر سکتے تھے مثلاً "اگر آپ کسی شخص کے بارے میں یہ کہیں کہ وہ بلا کا کنجوس ہے۔ خالی پیٹ بھی ہاضمے کی دوا کھاتا ہے تاکہ اپنے آپ کو اپنی نظر میں پیٹ بھرا ثابت کر سکے تو وہ شخص یقیناً" آپ سے لڑنے مرنے پر آمادہ ہو جائے گا۔ لیکن ابن انشا نے یہی بات اپنے بارے میں لکھ کر حق گوئی و بے باکی کا عالمی ریکارڈ قائم کیا تھا۔

ویسے ابن انشا دوسروں کے وار بھی ہنس کر سہہ جاتے تھے' بعض اوقات اس پر فخر بھی کیا کرتے تھے۔ مثلاً" مشرقی پاکستان والے پرنسپل ابراہیم خان نے ایک بار انہیں اردو کا ملا دو پیازہ کہا تھا۔ یہ بات ابن انشا کو اس قدر پسند آئی کہ انہوں نے اسے بطور سند اپنی ایک کتاب کے دیباچے میں درج کیا تھا۔ معلوم نہیں ابراہیم خان صاحب نے ابن انشا سے مذاق کیا تھا یا ملا صاحب مرحوم و مغفور سے' کیونکہ ہمیں تو ان دونوں بزرگوں میں کسی قسم کی مماثلت نظر نہیں آتی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ملا صاحب کے بارے میں لطیفے دوسروں نے گھڑے تھے اور ابن انشا اپنی رسوائی کا سبب خود آپ تھے۔

سننے میں آیا ہے کہ ابن انشا کے زمانے میں مشہور خونخوار قوم پری چہرگاں نے فتنہ فساد برپا کر رکھا تھا ابن انشا بھی اس قوم کی فتنہ سامانیوں سے نہ بچ سکے۔ آئے دن موصوف کے دل پر چرکے لگائے جاتے تھے جس کی وجہ سے انہیں مجبوراً" ہر وقت آہ بلب رہنا پڑتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس زمانے کا شریف آدمی اس سے زیادہ جوابی کارروائی نہیں کر سکتا تھا۔ اس آہ کی لے جب بڑھی تو وہ شاعری کا روپ اختیار کر گئی۔ گویا شعر کہنے کا مقصد واردات دلی اور کیفیات بے دلی کو رقم کرنا تھا جب یہ مسائل تصوف شاعری سے حل نہ ہوئے تو ابن انشا نے اپنے غم زدہ چہرے کے آگے ہنسی کا پردہ لٹکا لیا یعنی طنز و مزاح سے دل بہلانا شروع کر دیا۔ ان کی شاعری تو صرف دل زدگاں اور از خود رفتگاں میں مقبول تھی' لیکن طنزیہ و مزاحیہ مضامین ہر عمر اور ہر طبقے کے لوگوں میں پسند کیے گئے۔ اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ ان کے قلم سے نکلی ہوئی ہر تحریر کو طنز و مزاح کا

شاہکار سمجھا جانے لگا' خواہ وہ تحریر تعزیتی شذرہ ہی کیوں نہ ہو۔ معاملہ یہیں ختم نہیں ہوا' ان کی دل دوز اور دل سوز نظموں' غزلوں کو بھی طنزو مزاح کے کھاتے میں ڈال دیا گیا۔ لوگ ان کا کلام سن کر سر دھننے کے بجائے دوسروں کا سر دھنتے اور فلک شگاف قہقہے لگاتے۔ شروع شروع میں یہ صورت حال ابن انشا کے لیے خاصی تکلیف دہ تھی' لیکن آخر آخر میں وہ خود بھی اپنا کلام پڑھ کر زیر لب مسکرا دیتے تھے۔

ابن انشا کی شاعری کے بارے میں کوئی رائے دینا ہمارے لیے ممکن نہیں ہے کیونکہ ان کا مجموعہ کلام دست برد زمانہ کی نذر ہو چکا ہے۔ البتہ یہ سننے میں آیا ہے کہ ان کا کلام بعض گانے والوں اور گانے والیوں کی وجہ سے خاصا مقبول تھا' لہٰذا ابن انشا کی شاعری کا ذکر تفصیل کے ساتھ ہم اس وقت کریں گے جب ان گانے والوں اور گانے والیوں کے بارے میں کوئی رسالہ لکھیں گے' فی الحال ہم اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ابن انشا اپنے عہد کے اچھے شاعر تھے' گو ان کا عہد اچھی شاعری کا عہد نہیں تھا' یہ دوسری بات ہے کہ اس عہد کی تشکیل میں ابن انشا کی مخلصانہ کوششوں کو بھی پورا پورا دخل تھا۔ بعد میں صرف دخل ہی رہ گیا تھا' کوششیں انہوں نے ترک کردی تھیں۔

ابن انشا بنیادی طور پر سیاح تھے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ ہمیشہ عالم سفر ہی میں رہتے تھے۔ وہ سال چھ مہینوں میں چند دنوں کے لیے وطن بھی آتے تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ انہیں اپنے وطن سے بے حد محبت تھی' لیکن حیرت ہے کہ انہوں نے کبھی وطنی اور قومی نظمیں نہیں لکھیں' حالانکہ ان کے بعض ہم عصر اور دوست شعرا نے وطنی اور قومی نظمیں لکھ لکھ کر وطن و قوم کے ساتھ ساتھ شاعری کو بھی امتحان میں ڈالا تھا۔ ہاں تو بات سفر کی ہو رہی تھی۔ ابن انشا کے لیے سفر وسیلہ ظفر نہیں تھا بلکہ وہ ہمیشہ بقول خود تزکیہ نفس کے لیے سفر کیا کرتے تھے۔ اپنے گھر میں انہیں ہر طرح کا آرام میسر تھا۔ لیکن ان کا خیال تھا کہ آرام انسان سے جدوجہد کرنے کا جوہر چھین لیتا ہے' لہٰذا ابن انشا اپنے آپ کو تکالیف اور نت نئے امتحان میں ڈالنے کے لیے سفر کیا کرتے تھے۔ ابن انشا کی تکالیف کا ریکارڈ ان کی تصانیف کی صورت میں دستیاب ہو سکتا ہے لیکن ان لوگوں کی تکالیف کا کوئی ریکارڈ ہمارے سامنے نہیں ہے۔ جن کے ملکوں میں جا کر ابن انشا اپنے آپ کو امتحان میں ڈالتے تھے۔ گو ابن انشا کا یہ دعوا ہے کہ انہوں نے اپنے سفر ناموں میں دوسروں کی تکالیف بھی بیان کی ہیں' لیکن ہمیں اس کا کوئی ثبوت نہیں ملا۔

ابن انشا جب کسی غیر ملک میں جاتے تو وہاں وہ ہمیشہ ایسے ہوٹل کا انتخاب کرتے جس کا کرایہ کم ہو' بلکہ ان کی خواہش یہ ہوتی تھی کہ کوئی بغیر کرائے کا ہوٹل مل جائے تو وہیں قیام کریں۔ جب وہ کسی نئے شہر میں پہنچتے تو پہلا کام یہ کرتے کہ تمام ہوٹلوں' سراؤں' بھٹیار خانوں وغیرہ کا جائزہ لیتے۔ پورا ایک دن اسی کام کی نذر ہوتا۔ اس طرح وہ ایک دن کے قیام کا کرایہ بچا لیتے۔ پھر کسی ایسے ہوٹل کا انتخاب کرتے جہاں برسوں سے کوئی مسافر نہ آیا ہوتا۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا کہ ہوٹل والے ابن انشا کو خود انہیں کی شرائط پر اپنے ہاں ٹھہرا لیتے۔ ایسے کئی ہوٹلوں کا ذکر ابن انشا نے اپنے سفر ناموں میں کیا ہے۔ ان ہوٹلوں کے کمروں کے دروازے ادوائن کی رسی سے بند کیے جاتے تھے اور یہ رسی اتنی لمبی ہوتی تھی کہ اس کا کچھ حصہ ابن انشا بطور ازار بند بھی استعمال کر لیتے تھے۔ موصوف جب سفر سے واپس آتے تھے ان کے سامان میں سب سے زیادہ تعداد انہیں ازار بند کی رسیوں کی ہوتی تھی جنہیں وہ اپنے احباب میں غیر ملکی سوغات کے طور پر تقسیم کر دیتے تھے۔

دوران سیاحت موصوف غیر ممالک کے نظاروں سے زیادہ ان کی کرنسی پر نظر رکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کسی غیر ملک میں ضرورت سے زیادہ تو کیا ضرورت کے مطابق خرچ کرنے سے بھی اس ملک میں افراط زر کا مسئلہ پیدا ہو سکتا ہے۔ ابن انشا کا یہ کارنامہ ہے کہ انہوں نے کسی غیر ملک میں افراط زر کا مسئلہ پیدا نہیں ہونے دیا۔ یہ کارنامہ اردو ادب کی تاریخ میں آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے' لیکن شرط یہ ہے کہ یہ آب ابن انشا کے جمع کردہ زر کا نہ ہو۔ یہ بتا دینا بے موقع نہ ہو گا کہ ابن انشا روپے پیسے کے معاملات میں بے حد بے نیاز تھے۔ ان کے بینک میں ڈھیروں روپیہ جمع ہوتا رہتا تھا لیکن وہ کبھی بھول کر بھی اس کی طرف نہیں دیکھتے تھے اور نہ کسی اور کو دیکھنے کا موقع دیتے تھے۔ روپے کو انہوں نے ہمیشہ ہاتھ کا میل سمجھا بشرطیکہ روپیہ دوسروں کا ہو اور ہاتھ ان کا اپنا۔

ابن انشا نے بے شمار ممالک کا سفر کیا تھا اور اپنے سفر ناموں میں انہوں نے تفصیل سے یہ بتایا ہے کہ ان سفروں کے دوران ان پر کیا گزری۔ وہ جب بھی کسی سفر سے لوٹتے تھے تو ان کا وزن کچھ پونڈ کم ہو جاتا تھا اور آخر آخر میں تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ لوگ رئیس امروہوی کو ابن انشا سمجھ کر یہ مشورہ دیتے تھے کہ "حضرت اب سیاحت کا شوق ختم کر دیجیے کیونکہ آپ کے جسم مبارک میں مزید کمی کی گنجائش نہیں رہی۔" رئیس امروہوی یہ بات سن کر شیروانی کے بٹن بند کر لیا کرتے تھے اور ابن انشا اپنے ہوئے ادوائن کے تختے کو کس لیتے تھے۔

ہمیں بعض لوگوں کے اس خیال سے اتفاق نہیں ہے کہ ابن انشا محض سفر نامے لکھنے کے لیے سفر کرتے تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو ان جیسے ذہین آدمی کو سفر کرنے کی کیا ضرورت تھی' وہ گھر ہی میں بیٹھ کر بستر سے بہتر سفر نامے لکھ سکتے تھے' جس طرح ان کے بعض ہم عصروں نے لکھے ہیں۔ یہ ابن انشا کی دیانت داری کا بین ثبوت ہے کہ انہوں نے صرف سفر نامے ہی نہیں لکھے سفر بھی کیے تھے۔ انہیں سفر نامہ لکھنے کے لیے کوئی خاص اہتمام نہیں کرنا پڑتا تھا' وہ اتنے مستعد اور فرض شناس تھے کہ سفر کے دوران ہی سفر نامہ لکھنا شروع کر دیتے تھے۔ ذہین اور دور اندیش اتنے تھے کہ بیشتر اوقات اگلی منزل پر پیش آنے والے واقعات پیشگی لکھ لیتے تھے جو اس منزل پر پہنچ کر حرف بہ حرف درست ثابت ہوتے تھے اگر کوئی واقعہ تحریر شدہ صورت سے مختلف ہوتا تو واقعے میں تحریف گوارا کر لیتے لیکن اپنی تحریر میں تحریف پسند نہ کرتے۔ اگر اتفاقاً" اگلی منزل بدل جاتی تو وہ اپنے پیشگی لکھے ہوئے سفر نامے میں صرف مقام کا نام بدل دیتے اور اپنے لکھے ہوئے واقعات کے مطابق ہی سفر کو انجام تک پہنچاتے۔

سفر کے دوران ابن انشا کو سارقوں اور رہزنوں سے بھی واسطہ پڑتا تھا۔ یوں تو ان کے سامان سفر میں کوئی چیز ایسی نہیں ہوتی تھی جیسے کوئی چوری کر کے اپنی دنیا یا عاقبت خراب کرتا' لیکن ابن انشا خود سارقوں کی اور رہزنوں کی حوصلہ افزائی کرتے کہ اور کچھ نہیں تو ان کا دل ہی چرالیں۔ دل وحدت میں کثرت کے وہ تماشے دکھاتا کہ قدم قدم پر چوری ہو جاتا۔ ان چوریوں کے واقعات دلچسپ بھی ہیں اور معنی خیز بھی۔ لیکن افسوس کہ یہ واقعات ابن انشا کے سفر ناموں میں اشاروں کنایوں میں بیان کیے گئے ہیں۔ تفصیل کہیں نہیں ملتی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ جس زمانے میں ابن انشا کے سفر نامے شائع ہوئے۔ اس زمانے میں ان کے ملک میں پریس آرڈی نینس نافذ تھا جس کے تحت کوئی مخرب اخلاق چیز شائع نہیں ہو سکتی تھی۔ ابن انشا کا ارادہ تھا کہ جب پریس آرڈی نینس کے ذریعے اخلاق کو نافذ کرنے کا سلسلہ ختم ہو گا تو وہ اپنے سفر نامے دوبارہ لکھیں گے۔ افسوس کہ ابن انشا کے جیتے جی اخلاق تو نافذ نہ ہو سکا۔ البتہ پریس آرڈی نینس ضرور نافذ رہا۔ اس لیے موصوف کو اپنے سفر نامے دوبارہ لکھنے کا موقع نہ مل سکا۔

ابن انشا نے ایک مترجم کی حیثیت سے بھی نام پیدا کیا۔ ان کے عہد میں لوگ تراجم کو طبع زاد تصانیف کی حیثیت سے پیش کرتے تھے۔ لیکن ابن انشا نے انتہائی فراخ دلی سے کام لیتے ہوئے اپنی بعض طبع زاد تصانیف کو تراجم کی حیثیت سے پیش کیا۔ خصوصاً" چینی نظموں کے بارے میں عام طور پر یہ رائے تھی کہ یہ ابن انشا کی وہ نظمیں ہیں جنہیں بوجوہ اپنے نام سے وہ پیش نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ایک جگہ یہ روایت بھی پڑھنے میں آئی ہے کہ ابن انشا کی چینی نظموں کا ترجمہ چینی زبان میں ہوا تو اہل چین نے اسے بہت پسند کیا۔ چینی نقادوں کی رائے تھی کہ ایسی عمدہ چینی نظمیں تو خود چینی شاعروں کو بھی لکھنی نصیب نہیں ہوئیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

ابن انشا کی تمام تصانیف تو دستیاب نہیں ہو سکیں۔ البتہ ان کی آخری کتاب خوش قسمتی سے ہمیں مل گئی ہے اس کا نام ہے "اردو کی آخری کتاب" نام سے یہ اندازہ ہوتا ہے جیسے اس کتاب کے بعد اردو میں کوئی کتاب نہیں لکھی گئی ہو گی لیکن یہ خیال غلط ہے۔ ہماری تحقیق کے مطابق اس کتاب کے بعد اردو زبان میں کم از کم دو اور کتابوں کے لکھے جانے کا سراغ ملتا ہے۔ ایک تو مرزا ظفر الحسن کا مجموعہ کلام "ذکر یار چلے" ہے اور دوسری کتاب سید محمد تقی کی "داس کیپیٹال" جو انہوں نے مارکس نامی ایک مصنف کے اشتراک سے لکھی تھی۔ اس میں خیالات سید صاحب کے تھے۔ اور اسلوب بیان مارکس کا تھا۔ ممکن ہے معاملہ اس کے برعکس ہو لیکن نتیجہ یکساں تھا۔ (جملہ معترضہ : ۔ یہاں مرزا ظفر الحسن کے بارے میں یہ بتا دینا نامناسب نہ ہو گا کہ آپ ابن انشا کے ہم عصر تھے۔ خدا نے زبان اور قلم دونوں پر زبردست قدرت دی تھی لیکن زبان کے سامنے قلم مرفوع القلم تھا۔ موصوف مجمع لگانے کے شوقین تھے۔ "ذکر یار

بقیہ صفحہ 260 پر

سمیرا حسن سے ملاقات

شاہین رشید

سمیرا حسن اگرچہ مختصر رول میں آتی ہیں مگر مختصر رول میں بھی ناظرین کی توجہ حاصل کر لیتی ہیں۔ سمیرا حسن ہرفن مولا فنکارہ ہیں ہر کردار میں اپنے آپ کو ڈھال کر حقیقت کا رنگ دے دیتی ہیں۔ آج کل آپ انہیں "ٹوٹے تارے" میں پٹھانی کے رول میں دیکھ رہے ہیں جبکہ "دل نہیں مانتا" میں ڈاکٹر کے رول میں "دراڑ" میں بھی ان کا اچھا رول ہے۔

★ "ہیلو سمیرا... کیا حال ہے؟"

✳ "جی اللہ کا شکر ہے۔"

★ "کیا مصروفیات ہیں آج کل؟"

✳ "مصروفیات تو شوبز کی ہی ہیں... جو آن ایئر ہیں وہ تو آپ کو پتا ہی ہے۔ اے آر وائی سے "دراڑ" اور "دل نہیں مانتا" "ٹوٹے تارے" چل رہا ہے جبکہ ٹی وی ون سے "نیویارک سے نیو کراچی تک" سے آن ایئر ہے۔ پی ٹی وی سے "وفانہ آشنا" آن ایئر ہے... اور اب جیو کے لیے سوپ "شہر دل" کی شوٹ چل رہی ہے۔"

★ "بہت اچھی پرفارمر ہیں آپ... پھر کیا بات ہے کہ کبھی لیڈنگ رول نہیں ملا؟"

✳ "جی ایسا بہت کم ہوا ہے کہ مجھے مسلسل کوئی رول ملا ہو اور اس کی ایک وجہ ہے کہ یہاں اکثریت ایسے فنکاروں کی ہے جن کی فیملی میں سے کوئی نہ کوئی پہلے

سے ہی کام کر رہا ہوتا ہے اور جس کا بڑا نام ہوتا ہے۔ اور میرے ساتھ ایک بڑا بیڈ لک یہ ہے میرا کوئی بھی شوبز میں نہیں ہے۔ بلکہ میں کہوں کہ سات پشتوں میں کوئی اس فیلڈ میں نہیں ہے تو غلط نہ ہوگا۔ میں تو بس اپنے شوق شوق میں آ گئی ورنہ مجھے کسی کی سپورٹ حاصل نہیں تھی۔ میں نے دیکھا ہے کہ اس فیلڈ میں کوئی نہ کوئی سپورٹر ضرور ہوتا ہے اور اگر کوئی کہے کہ میں صرف اپنی ہی محنت سے اس فیلڈ میں آیا ہوں یا آئی ہوں تو وہ بکواس کرتا ہے۔"

★ "تو پھر آپ بغیر سپورٹ کے کیسے آ گئیں؟"

✳ "جو اپنی محنت سے آتے ہیں پھر وہ بہت آہستہ آہستہ اپنی جگہ بنا پاتے ہیں۔ چاہے آپ کی شکل کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو، چاہے آپ میں کتنا ہی ٹیلنٹ کیوں نہ ہو۔ تو میری بھی یہی مثال ہے میں خالصتاً اپنے ٹیلنٹ سے اس فیلڈ میں آئی ہوں۔ ورنہ تو جناب اس فیلڈ میں بہت زیادہ سفارش چلتی ہے۔ شکر ہے کہ اب لوگ مجھے جاننے اور پہچاننے لگے ہیں اور پہلے تو میں کام کم لیتی تھی مگر اب تو میں کام بھی زیادہ لینے لگی ہوں کہ میں نے سوچا کہ جب اس فیلڈ میں آ ہی گئی ہوں تو کیوں نہ بھرپور طریقے سے کام کروں۔"

★ "اکثر فنکار کہتے ہیں کہ بس جی ایک سیریل کیا اور پھر کام کی لائن لگ گئی... ایسا ہے؟"

✳ "نہیں نہیں ایسا بالکل نہیں ہے۔ بلکہ میں تو کہوں گی کہ شوبز میں بڑی برائی یہ ہے کہ روز کنواں کھودو اور روز پانی پیو۔ ایسا نہیں ہے کہ آپ نے بہت اچھا سیریل کر لیا تو لوگ آپ پر جھپٹ پڑیں گے اور آپ کو ایک کے بعد ایک آفرز آتی چلی جا رہی ہیں ایسا نہیں ہے اور سچ بتاؤں کہ اگر جاوید شیخ صاحب اور ندیم صاحب بھی گھر بیٹھ جائیں گے تو انہیں بھی کوئی نہیں پوچھے گا۔ انہوں نے بھی باقاعدہ اپنے منیجر وغیرہ رکھے ہوئے ہیں جو ان کے لیے لوگوں سے بات کرتے ہیں۔ گھر بیٹھ جائیں تو بڑے سے بڑا اسٹار بھی کھو جاتا ہے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ کچھ عرصے تک ایتا بھ بچن بھی

اسکرین سے غائب رہے تھے... یہ شوبز کی دنیا بہت بے وفا دنیا ہے... انڈیا کی کتنی فنکارائیں جوانی میں ہی مارکیٹ سے آؤٹ ہو جاتی ہیں۔ مارکیٹ میں "اِن" رہنے کے لیے تعلقات رکھنے پڑتے ہیں۔ میل ملاپ رکھنا پڑتا ہے۔"

★ "کچھ اپنے بارے میں بتائیں؟"

✳ "جی میرا پورا نام سمیرا حسن ہے پیار سے سمی بلاتے ہیں اور یکم ستمبر میری تاریخ پیدائش ہے اور مجھے فخر ہے اپنی تاریخ پیدائش پہ کہ میں پہلی تاریخ کو پیدا ہوئی، حالانکہ اس میں میرا کوئی اختیار نہیں ہے۔ اسلام آباد میرا جنم شہر ہے اور قد میرا ماشاءاللہ سے 5 فٹ 8 انچ ہے۔"

★ "ماشاءاللہ سے مردوں والا قد پایا ہے آپ نے؟"

✳ قہقہہ... "جی نہیں مردوں کا قد تو چھ فٹ ایک انچ ہوتا ہے اور 5 فٹ 8 انچ پوری دنیا میں جو خوب صورتی کے مقابلے ہوتے ہیں ان میں 5.8 ہی مانگی جاتی ہے... اور میں تو اکثر اوقات مردوں کے سامنے بھی لمبی لگتی ہوں، اگر ہیل نہ پہنوں تو ٹھیک لگتی ہوں۔"

★ "بات درمیان میں رہ گئی آپ کے بہن بھائی،

تعلیم اور فیملی بیک گراؤنڈ وغیرہ؟"

✲ "میرے والدین اردو اسپیکنگ ہیں اور ددھیال دہلی سے اور ننھیال لکھنؤ سے تعلق رکھتے تھے۔ ہم چار بہن بھائی ہیں۔ سب سے بڑے بھائی ہیں جو اسکواڈرن لیڈر ہیں اور میرے ابو فارن آفیرز میں رہے اور ان کی زیادہ تر پوسٹنگ ملک سے باہر ہوتی رہتی تھی۔ اور ہم لوگ کافی چھوٹے تھے جب ہمارے والد کا انتقال ہو گیا۔ امی ہماری ایجوکیشن سے وابستہ رہیں اور امی نے ہمارے لیے بہت محنت کی۔ باپ کی کمی کو پورا کرنے میں امی کا ہاتھ ہے انہوں نے نہ صرف ہماری بہترین تربیت کی بلکہ تعلیم کے زیور سے بھی آراستہ کیا۔

میں نے اسلامک اسٹڈیز میں ایم اے کیا ہے بے شک ننھیال والوں نے بہت سپورٹ دینے کی کوشش کی مگر امی نے کسی کی سپورٹ نہیں لی۔ بھائی کے علاوہ تین بہنیں ہیں جن کی شادیاں چھوٹی عمروں میں ہی ہو گئیں اور میری بھی چھوٹی عمر میں ہی شادی ہو گئی تھی اور میں نے اپنی تعلیم شادی کے بعد مکمل کی اور ماشاء اللہ میرے دو بچے ہیں۔۔۔ اور اسلامک اسٹڈیز میں ماسٹرز کر کے مجھے دین کی کافی نالج ہے۔ ہمارے مذہب نے بہت آزادیاں دی ہوئی ہیں مگر ہمارے علماء اسے غلط طریقے سے بیان کرتے ہیں۔"

★ "شوبز میں کیسے آئیں؟"

✲ "اسکول و کالج کے زمانے سے ہی مجھے اس فیلڈ میں آنے کا شوق تھا۔ میں پی ٹی وی گئی' وہاں آڈیشن دیا۔ بہت کوششیں کی' تب ایک ڈرامے میں کام مل ہی گیا پھر بھی کوششیں جاری رکھیں۔ این ٹی ایم میں بھی تھوڑا کام مل گیا۔ چونکہ شادی جلدی ہو گئی تو بھی کام کر لیتی تھی کبھی نہیں کرتی تھی اور اکثر بہت بد دل ہو جاتی تھی کہ دیکھو کتنی محنت کرتی ہوں پھر بھی کام ٹھیک طرح سے نہیں ملتا۔ بس شوق پورا کرتی رہتی تھی۔"

★ "پہلا ڈرامہ کونسا تھا اور گھر والوں کا کیا ردعمل تھا؟"

✲ "بھائی کو تھوڑا اعتراض ہوا۔ جبکہ شوہر نے کہا کہ اگر تمہیں شوق ہے تو کرتی رہو' مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔۔۔ بھائی کو بھی امی نے سمجھایا کہ جب اس کے شوہر کو اعتراض نہیں ہے تو تمہیں بھی اعتراض نہیں کرنا چاہیے۔ شادی کے بعد میں نے شیئر مارکیٹ میں بھی کام کیا کیونکہ میں نے اکنامکس پڑھی تھی پراپرٹی کا کام بھی کیا۔ مردوں کی طرح بزنس کیا اور مجھے بہت اچھا لگتا تھا یہ سب کام کر کے اور میرا پہلا ڈرامہ "نور جام تماچی" تھا اور ڈرامہ سیریل "مہندی" بہت ہٹ گیا تھا چار بہنوں میں بڑی بہن کا رول تھا اور ڈرامہ مجھ پر ہی Base کرتا تھا اور یہی وجہ شہرت بنا۔"

★ "آپ بتا رہی ہیں کہ والدہ تو تدریس سے وابستہ رہی ہیں تو آپ پڑھائی میں کیسی تھیں؟"

✲ "میں پڑھائی میں بہت اچھی تھی اور نرسری سے لے کر میٹرک تک ہمیشہ مانیٹر رہی ہوں اور میرا نہیں بھی موڈ ہوتا تھا تو میری ٹیچرز مجھے ہی مانیٹر بناتی تھیں اور میں نے تو اسکالرشپ بھی لی ہے۔"

★ "کم عمری میں والد کا ساتھ چھوٹ گیا۔ مشکلات کا سامنا تو کرنا پڑا ہو گا؟"

✲ "بالکل کرنا پڑا' بہت مشکلات دیکھیں' لیکن امی کا حوصلہ اور ان کی تربیت نے بہت کچھ فیس کرنا سکھا دیا۔ اسی لیے مشکلات سے نہیں گھبراتی اور نہ صرف اپنے بچوں سے بلکہ لوگوں سے بھی یہی کہتی ہوں کہ زندگی میں مشکلات آتی ہیں مگر ان کو فیس کرنا سیکھیں کیونکہ مشکلیں ہمیشہ ساتھ نہیں رہتیں۔"

★ "کوئی سین ڈرامہ کا جو ابھی یاد ہو؟"

✲ "ہاں جی یاد ہے۔۔۔ میں نے ایک ڈرامے میں "مرنے" کا سین کیا اور مجھے بہت اچھا لگا اور اس سین کے بعد ایک خاتون ملیں اور کہنے لگیں کہ تمہارے مرنے کا سین دیکھ کر تو میں سچ سچ رونے لگی تھی اور ایک بار میری ممانے دیکھا تو وہ بھی بہت روئیں اور کہا کہ ایسے رول مت کیا کرو۔۔۔ مگر مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ اداکاری تو اداکاری ہی ہوتی ہے۔"

★ "کردار کس قسم کے پسند ہیں۔ کسی کردار کو کر کے کوئی پچھتاوا ہوا؟"

✲ "کردار تو میں نے کافی کیے ہیں۔ کسی خاص کردار کی خواہش تو نہیں ہے' بس اب یہ خواہش ہے کہ جو بھی کردار ہو اس میں ویری ایشن زیادہ ہو اور کسی کردار کو کر کے پچھتائی نہیں کیونکہ ہمیشہ کردار دیکھ کر لیتی ہوں۔ ہاں جب میں نے "مہندی" "آسمانوں پہ لکھا" اور "ٹوٹے تارے" کیا تو مجھے ملک سے باہر رہنے والوں نے بھی بہت اچھا رسپانس دیا۔"

★ "اس فیلڈ میں وقت کی پابندی نہیں ہوتی۔ آپ لوگوں کے رنگ میں رنگی یا دوسروں کو اپنے رنگ میں ڈھالا؟"

✲ "نہیں' رنگی تو نہیں نہ ہی رنگ میں ڈھال سکی۔ مگر میں وقت کی بے حد پابند ہوں۔۔۔ اگر کسی نے دس بجے بلایا تو دس بجے ہی پہنچ جاتی ہوں۔ ایک آدھ بار تو ایسا ہوا کہ میں پہنچ گئی اور میک اپ آرٹسٹ نہیں آیا۔ کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ آرٹسٹ وقت پر نہیں آتے تب مجھے بہت غصہ آتا ہے۔ تو میں یہی کہتی ہوں کہ مجھے آپ وہ ٹائم دیا کریں جب آپ کے آرٹسٹ آجائیں۔"

★ "ڈراموں کے کردار ہمارے معاشرے میں نظر آتے ہیں؟"

✲ "میرے خیال میں تو 90 فیصد کردار ایسے ہوتے ہیں جو ہمارے معاشرے میں ہوتے ہیں ہاں 10 فیصد ایسے ہوتے ہیں جو مبالغہ پر مبنی ہوتے ہیں اور وہ کردار پھر عجیب سے لگتے ہیں' مثلاً" کسی کو منحوس کہا ہے تو حد سے زیادہ۔۔۔ کسی کو مظلوم دکھایا ہے تو حد سے زیادہ"

★ "آپ خود بھی تو شاید پروڈکشن میں ہیں نا۔۔۔ اور کیا فیوچر پلاننگ ہیں آپ کی؟"

✲ "فیوچر پلاننگ تو یہی ہے کہ مجھے اس فیلڈ میں بہت آگے تک جانا ہے میں نے سارے کام چھوڑ کر مستقل طور پر شوبز کو اپنا لیا ہے اور جہاں تک پروڈکشن کی بات ہے تو میں نے تو اپنی دو تین ٹیلی فلمز بھی بنائی ہیں ایک کا نام "جنتم جنتم کا ساون" دوسری کا نام "ہمت" تھا تو بس اس میں اب مزید آگے جانا ہے۔۔۔

اور میں نے شوبز میں رہ کر سب فیلڈ میں زور آزمائی کی ہے۔ مثلاً" میں نے کوکنگ چینل میں بھی کام کیا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ آٹھ نو سال پہلے اے آر وائی کے ٹی چینل میں میں نے دو پروگرام کیے تھے کوکنگ کے' ایک پروگرام کا نام تھا "آج کیا پک رہا ہے" اور دوسرے کا نام تھا "ذائقہ"۔ تو "آج کیا پک رہا ہے" کی میں ہوسٹ تھی اور ہم لوگوں کے گھروں میں جا کر کوکنگ کرواتے تھے۔ اور "ذائقہ" میں لوگوں کو اپنے پروگرام میں بلوا کر کوکنگ کرواتے تھے اور یہ عام خواتین ہوتی تھیں اور اس پروگرام کو بہت زیادہ پسند کیا گیا اور یہ پروگرام جب ختم ہوا تب بھی لوگوں کی ڈیمانڈ تھی کہ اسے جاری رہنا چاہیے۔ یہ دونوں پروگرام اس لحاظ سے منفرد تھے کہ اس میں بالکل نیچرل کھانا پک کر سامنے آتا تھا۔۔۔ آج کل کے جو کوکنگ چینل ہیں ان میں ساری ترکیبیں انگریزی میں ہوتی ہیں تو گھریلو خواتین کے تو سر سے گزر جاتی ہیں یہ۔ ہلدی اور کالی مرچ کو بھی انگریزی میں بولو گے تو کہاں سمجھ میں آئے گی۔ یہ پروگرام ڈیفنس اور کلفٹن والی خواتین نہیں دیکھتیں بلکہ عام گھریلو خواتین دیکھتی ہیں۔"

★ "آپ خود کیا اچھا پکا لیتی ہیں؟"

✲ "میں سب ہی کچھ اچھا پکا لیتی ہوں لیکن میرے گھر والوں اور رشتے داروں کو میرے ہاتھ کے بنے ہوئے شامی کباب بہت پسند ہیں جبکہ مجھے خود اپنی امی

کے ہاتھ کے پکے ہوئے کھانے بہت پسند ہیں۔"
★ "لوگ آپ کو پہچان کر کیا فرمائش کرتے ہیں؟"
※ "ایک زمانہ تھا جب لوگ ملتے تھے تو آٹو گراف مانگتے تھے اب ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ پلیز ہمارے ساتھ ایک تصویر بنوالیں تو اگر فیملی ہو تو پھر میں تصویر بنوالیتی ہوں۔ اس طرح ایک خاتون ملیں کہ میں کینیڈا میں رہتی ہوں اور وہاں آپ کو ڈراموں میں دیکھا۔ اور اب یہاں آپ کو اپنے سامنے دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے اور اپنا فون نمبر دیا کہ جب آپ کینیڈا آئیں میرے پاس ضرور آیئے گا۔"
★ "گڈ... آج کل آپ مارننگ شو میں بہت نظر آتی ہیں۔ مزا آتا ہے کیا... اور صبح صبح اٹھنا مشکل تو نہیں لگتا؟"
※ "صبح صبح اٹھنا بالکل بھی برا نہیں لگتا کیونکہ مجھے صبح اٹھنے کی عادت ہے... اور مارننگ شو میں اس لیے نظر آتی ہوں کہ سب بہت پیار سے محبت سے بلاتے ہیں تو انکار نہیں کرتی... اچھا لگتا ہے مجھے مارننگ شو میں جانا۔"
★ "کس قسم کے مارننگ شو اچھے لگتے ہیں؟"
※ "جن میں میں خود شریک ہوتی ہوں لیکن "جنوں بھوتوں" والے پروگراموں میں نہ شرکت کرتی ہوں اور نہ ہی پسند کرتی ہوں۔ ایک تو ہماری عوام پہلے ہی بہت توہم پرست ہے اوپر سے آپ ان کو ایسے پروگرام دکھا کر اور بھی زیادہ وہم میں مبتلا کر دیتے ہیں تو ایسے پروگراموں کی تو میں سو فیصد مخالفت کرتی ہوں۔"
★ "پیسہ تو اس فیلڈ میں ہو گا ہی پھر بھی اگر بہت سارا پیسہ ہاتھ آجائے تو کیا کریں گی؟"
※ "اللہ کا شکر ہے اللہ نے پیسہ اور عزت دی ہوئی ہے۔ بس پھر اچھی سی گاڑی لوں گی۔"
★ "اپنی شخصیت کو مکمل سمجھتی ہیں یا کچھ تبدیلی کی خواہش ہے؟"
※ "مکمل تو خیر کوئی انسان نہیں ہوتا۔ اس لیے مکمل تو میں بھی نہیں ہوں اور ہاں کچھ عرصہ قبل مجھے لگا کہ میں موٹی ہو گئی ہوں تو پھر اپنے آپ کو میں نے کافی حد تک کم کیا... اور ہاں ایک تبدیلی چاہتی ہوں کہ میں بہت نرم دل اور نرم زبان ہوں اور میری اس نرمی کا لوگ ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔"
★ "فلمیں گھر میں دیکھتی ہیں یا سینما ہاؤس میں؟"
※ "بچپن سے شوق ہے فلمیں دیکھنے کا اور بچپن سے ہی سینما ہاؤس میں فلمیں دیکھنا اچھا لگتا تھا اور آج تک لگتا ہے۔"
★ "ارد گرد منڈلاتے فقیر کو کتنا دیتی ہیں؟"
※ "ارد گرد منڈلاتے فقیر تو بہت ہی برے لگتے ہیں اور ان کو تو دینے کو دل ہی نہیں چاہتا... اور میں دیتی بھی نہیں کیونکہ میں نے تو ایسے لوگوں کا مہینہ باندھا ہوا ہے جو واقعی ہماری امداد کے مستحق ہیں اور مجھے یاد آ رہا ہے ایک واقعہ کہ کسی نے بھیک مانگتے ہوئے فقیر سے کہا کہ آؤ تم میرے ساتھ تم کو کام والا دوں اور 300 روپے روزانہ ملیں گے تمہیں... تو وہ کہنے لگا 300 روپے؟... میں رات کو جب گھر جاتا ہوں تو ہزار روپے لے کر جاتا ہوں اور اس واقعے کو سننے کے بعد تو چلتے پھرتے فقیروں کو دینے کا سوچا ہی نہیں جاتا۔"
★ "کچھ اندازہ ہے کہ لوگ اپنا زیادہ وقت کن باتوں میں گزارتے ہیں؟"
※ "جب سے انٹرنیٹ اور فیس بک کی سہولت آئی ہے لوگ اپنا وقت اسی پہ گزارتے ہیں۔ اب ادھر ادھر کی گپ شپ کے لیے ٹائم ہی نہیں ملتا۔"
★ "زیادہ تر شاپنگ کہاں کرتی ہیں؟"
※ "یہاں ہمارے کراچی میں تو بہت اچھی اچھی جگہیں ہیں جہاں سے شاپنگ کرنا اچھا لگتا ہے۔ ویسے مجھے ذاتی طور پر تو طارق روڈ سے شاپنگ کرنے میں مزا آتا ہے۔ ویسے کلفٹن بھی اچھا ہے۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے سمیرا حسن سے اجازت چاہی۔ اس شکریے کے ساتھ کہ انہوں نے ہمیں ٹائم دیا۔

☆ ☆

سال نو مبارک

وقت کا پنچھی وقت کو اپنی چونچ میں دبائے اڑے جا رہا ہے کہاں ٹھہرنا ہے کہاں رکنا ہے اسے اس سے کوئی مطلب نہیں اس کا سفر صدیوں سے جاری ہے اور صدیوں تک تا قیامت تک جاری رہے گا اور جو لوگ وقت کی دوڑ کو سمجھتے ہوئے اس کے ساتھ ساتھ دوڑتے ہیں پھر وہ دنیا کی دوڑ میں بھی کامیاب رہتے ہیں۔ کامیابیاں اور ناکامیاں مقدر میں لکھے سے ملتی ہیں لیکن چونکہ انسان لاعلم ہے اس لیے کامیابیوں کو حاصل کرنے کے لیے تگ و دو میں لگا رہتا ہے۔

2015ء کا آغاز ہو چکا ہے۔ خدا کرے کہ یہ نیا سال سب کے لیے خوشیاں لائے آمین۔ ہماری نامور شخصیات کا 2014ء کیسا گزرا۔ اس کے لیے ایک سروے حاضر ہے۔

سوالات

1 آپ کا 2014ء کیسا گزرا؟ کامیابیاں اور ناکامیاں جو بھی آپ کے حصے میں آئیں بتائیے۔

2 2015ء میں اپنا اور اپنے ملک کا فیوچر کیسا دیکھتے ہیں؟

3 نئے سال کی آمد پر ایکسائیٹڈ ہوتے ہیں یا نارمل لیتے ہیں؟

سالِ نو مبارک

شاہین رشید

کیف غزنوی ۔ (آرٹسٹ)

1 2014ء ہم دونوں میاں بیوی کے لیے بہت اچھا ثابت ہوا ہے۔ کچھ کام جو ہم نے نئے سال کے آغاز پر شروع کیے تھے۔ وہ اب تقریباً "فائنل" ہو گئے ہیں تو اس لحاظ سے تو ماشاء اللہ یہ سال ہمارے لیے بہت ہی اچھا رہا ہے اور جہاں تک ناکامی کی بات ہے تو ہم نے کبھی ناکامی کو ناکامی سمجھا نہیں ہے۔ ہم نے ناکامی کو اس طرح لیا کہ جیسے ہم نے کوئی امتحان دیا اور اس میں ہمارے مارکس اچھے نہیں آئے ہیں۔ مجھے اور میرے میاں ذیشان کو کبھی بھی ایسا نہیں لگا کہ ہم امتحان میں فیل ہو گئے ہیں یا مرحلہ ہم نے پار نہیں کیا اچھے طریقے سے کیا یا برے طریقے سے کیا مگر پار ضرور کیا اور بہت اہم بات میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں کہ ہم نے یعنی میں نے اور ذیشان نے زندگی میں یہ سوچ کر کبھی کوئی کام نہیں کیا کہ "ہائے لوگ کیا کہیں گے" ہماری ہمیشہ یہ سوچ رہی ہے کہ ہمیں کھانے کو کون دے رہا ہے؟ ہم خود دے رہے ہیں۔ اگر ہم پریشانی میں مبتلا ہوں گے تو ہمارے پڑوسی ہماری مدد نہیں کریں گے ہمیں خود ہی اپنی پریشانی سے نکلنا ہے۔ تو پھر ہم اپنے کام سے صرف اس لیے کیوں رکیں کہ لوگ کیا کہیں گے۔ ہم نے اپنی زندگی اپنے طریقے سے گزارنی ہے اور کسی کو نقصان نہیں پہنچانا۔

2 اپنا فیوچر تو میں ماشاء اللہ اچھا ہی دیکھتی ہوں۔ کیونکہ میں تو اندھیرے میں بھی اپنے لیے کوئی نہ کوئی امید کی کرن نکال ہی لیتی ہوں۔ لیکن ملک کے لیے کبھی کبھی ناامیدی اس لیے ہو جاتی ہے کہ بہت سی چیزوں پر ہمارے لوگ اپنی عقل کا استعمال نہیں کرتے اور یہاں میں اپنے پڑھے لکھے طبقے کو بھی انوالو کروں گی جو سوچتے ہیں یا سمجھتے ہیں کہ ہمارے پڑھے لکھے [illegible] نے کہا تبدیلی آرہی ہے تو تبدیلی آجائے گی لیکن ایسا نہیں ہے۔ تبدیلی اس لیے نہیں آئے گی کہ آپ تو تبدیل نہیں کر رہے اور آپ اس لیے سسٹم کو تبدیل نہیں کر رہے کہ آپ خود سسٹم ہو۔

جب آپ خود change نہیں ہوں گے تو تبدیلی کیسے آئے گی۔ لگتا ہے کہ ابھی تو ملک کے حالات اور بھی برے ہوں گے۔ ابھی تبدیلی آنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

3 نئے سال کے لیے بہت ایکسائیٹڈ ہوتی ہوں کیونکہ ہمارا نیا سال عموماً "کام کرتے ہوئے ہی گزرتا ہے۔ اور جب ہم دوسرے سال میں داخل ہو رہے ہوتے ہیں تو وہ گھنٹہ یا منٹ ایسا ہوتا ہے۔ جس میں ہم کوئی نیا کام شروع کر رہے ہوتے ہیں۔ تو ہم دونوں اس لیے بہت ایکسائیٹڈ ہو رہے ہوتے ہیں کہ ایک نئی چیز کی شروعات ہو رہی ہوتی ہے۔ اور نئی چیز ہمیشہ ایکسائٹمنٹ لے کر آتی ہے۔

شکیل الدین ۔ (FM-93 کمپیئر' پروڈیوسر' رپورٹر)

1 2014ء اچھا رہا' اللہ تعالیٰ نے جڑواں بچے دیے اور میں صاحب اولاد ہوا۔ زندگی کی سب سے بڑی خواہش پوری ہوئی اور زندگی حسین ہو گئی۔ اور اللہ کا شکر ہے کہ 2014ء میں کسی ناکامی سے دوچار نہیں ہوا سب ٹھیک رہا۔ بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ 2014ء میرے لیے بہترین سال رہا تو غلط نہ ہو گا۔ اب دعا ہے کہ 2015ء بھی کامیابیوں اور کامرانیوں کا سال ہو۔

2 اپنا مستقبل تو ملک کے حالات کے اوپر ہے۔ اگر مہنگائی کم ہو جائے تو میرا کیا سب کا مستقبل اچھا ہو جائے۔ اور رہی ملک کی بات تو بس ملک کا تو اللہ ہی حافظ ہے و نگہبان ہے اور وہ ہی پاکستان کا مستقبل بہتر کر سکتا ہے۔

3 نیو ایئر کی تو اسکول اور کالج کے زمانے میں ہی ایکسائٹمنٹ ہوتی تھی اور نئے سال پہ گلاب کا ایک ایک پھول یا کوئی گفٹ دوستوں کو اور ٹیچرز کو دینا اچھا لگتا تھا۔ اب تو زندگی کے جھمیلوں میں اتنے مصروف

ہوگئے ہیں کہ پرانے سال کے جانے پر اور نئے سال کے آنے پر کوئی خاص ایکسائٹمنٹ نہیں ہوتی۔

احمد کامران : ۔ (ڈائریکٹر ڈائجسٹ رائٹر + دیگر)

1 الحمدوللہ 2014ء میرے لیے بہت اچھا رہا۔ "شب زندگی" سیریل کا بہت اچھا رسپانس ملا اور اب "دو ڈائجسٹ رائٹر" بہت زیادہ پسند کیا جارہا ہے۔ ڈرامہ سیریل "ارینج میرج" اور "کوئی دیپک" کا رسپانس ملا جلا رہا۔ مجموعی طور پر میرے لیے یہ کامیابیوں کا سال رہا۔

2 2015ء کے لیے کچھ اچھے پروجیکٹس پلان کر رہا ہوں۔ جن سے بہت اچھی امیدیں ہیں۔ جہاں تک ملک کی بات ہے تو یقیناً "2015ء پاکستان کے لیے اچھا رہے گا اور ہم نئے پاکستان کی شروعات ہوتے ہوئے دیکھیں گے۔ ان شاء اللہ۔

3 نئے سال کے آغاز پہ تو کوئی ایکسائٹمنٹ نہیں ہوتی، مطلب کوئی خاص ایکسائٹمنٹ نہیں ہوتی، بس اللہ سے دعا ہوتی ہے کہ وہ مجھ سے اچھا کام کروائے اور اچھے عمل انجام دینے کی توفیق عطا فرمائے۔

مریم انصاری : ۔ (آرٹسٹ)

1 2014ء الحمدوللہ بہت اچھا گزرا، بہت لکی رہا ۔۔۔ میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی کہ نیا سال میرے لیے لکی ثابت ہو میرا نصیب اچھا ہو اور ایسا ہی ہوا۔ میرے جتنے بھی سیریلز آن ایر ہوئے سب کامیاب ہوئے۔ آج کل آپ "میرا سسرال" اور "اگر اجازت ہو" دیکھ رہے ہیں۔ جو کہ بہت کامیاب جا رہے ہیں۔ تو میں جانے والے سال سے بہت خوش ہوں۔

2 اپنے فیوچر کے لیے تو بہت پر امید ہوں۔ ان شاء اللہ بہت اچھا ہوگا۔ کچھ نئے سیریل سائن کیے ہیں۔ سب میں میرے رولز بہت اچھے ہیں۔ تو ان شاء اللہ 2015ء میرے لیے بہت اچھا ثابت ہوگا اور ملک کے فیوچر کے بارے میں یہی سوچتی ہوں کہ ملک ترقی کرے گا اور تبدیلی آجائے۔

3 ہاں ۔۔۔ یہ ضرور سوچتی ہوں کہ ارے اتنی جلدی سال گزر گیا اور نئے سال کے لیے بہت ایکسائیٹڈ ہوتی ہوں اور نئے سال کو ویلکم کرکے سوتی ہوں۔

اقبال بانو : ۔ (ناول نگار + افسانہ نگار + ڈرامہ رائٹر)

1 میں اپنے اللہ کی بے حد شکر گزار ہوں کہ میرا 2014ء بہت اچھا گزرا۔ میری برسوں پرانی ایک خواہش پوری ہوئی میں اکثر سوچا کرتی تھی کہ کیا کبھی پی ٹی وی سے میرا لکھا ہوا ڈرامہ بھی "آن ایر" آئے گا اور میرے رب کا بڑا احسان ہے کہ 2 دسمبر 2014ء کو میرا لکھا ہوا ڈرامہ "جینا دشوار سہی" آن ایر ہوا۔ یہ سیریل ہے اور میرے ناول "دروازہ کھلا رکھنا" پہ بنایا گیا ہے اور میں آپ کو بتاؤں کہ یہ ناول کرن ڈائجسٹ میں پورے 20 ماہ تک شائع ہوا۔ آج کل ایک سوپ "اے اینڈ بی" پروڈکشن کے لیے لکھ رہی ہوں۔ "شہر دل" کے نام سے اور مزید تین ڈراموں کے لیے میری کہانیاں "اپروف" ہو چکی ہیں سوپ لکھنے کے بعد ان پر کام شروع کروں گی۔ تو رب العزت کا احسان ہے کہ 2014ء میں مجھے کامیابیاں ملی ہیں اور یہ سال میرے لیے لکی ثابت ہوا ہے ۔۔۔ اور کسی ناکامی سے دوچار نہیں ہوئی۔ اللہ ناکامیوں سے محفوظ رکھے۔ (آمین)

2 آپ نے دکھتی رگ پہ ہاتھ رکھا ہے۔ ملک کے فیوچر سے ہی تو ہمارا فیوچر وابستہ ہے۔ میرے پیارے پاکستان کا فیوچر برائٹ ہو سکتا ہے بشرطیکہ ہمارے حکمران ہمارے ساتھ مخلص ہو جائیں۔ مگر افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ ہمارے حکمران عوام سے مخلص نہیں ہیں۔ ہمارے فیوچر کی سیکورٹی کے لیے صرف ایک ڈیم بنا دیا جائے تو اس سے ہمارے ملک کے 50 فیصد مسائل حل ہو جائیں گے۔ اس ڈیم کی وجہ سے اندھیروں سے نجات ملے گی، بنجر زمینیں کار آمد ہو جائیں گی 4 کروڑ کیوسک پانی جو سمندر میں گرتا ہے وہ محفوظ ہو جائے گا، اگر ایسا نہ کیا گیا تو 2025ء تک ہمارے پاس پانی نہ ہونے کے برابر رہ جائے گا اور لوگ بھوکے پیاسے مریں گے۔ ہمارے حکمرانوں کی توجہ میٹرو بس، [illegible] ٹرین اور موٹر ویز کی طرف ہیں بے شک یہ بھی [illegible] ضروری ہیں لیکن پہلے پانی کو محفوظ کرنے کا بندوبست [illegible] کریں۔ پتا نہیں حکمران ڈیم کی اہمیت کو کیوں نہیں سمجھتے [illegible] گزارش ہے کہ عوام کو مت ماریں۔ عوام [illegible] نہیں ہوں گے تو یہ موٹر ویز، یہ میٹرو بس اور ٹرین کس کام کی۔ آپ کے توسط سے میرا یہ پیغام ضرور شائع کریں۔ شاید حکمرانوں کو عقل آجائے۔ صدر جنرل ایوب خان نے جو ڈیم "منگلا اور تربیلا" بنا دیئے سو بنا دیے اس کے بعد کسی نے اس جانب توجہ ہی نہیں دی۔

3 نئے سال کی آمد پر میں نارمل ہی رہتی ہوں۔ لیکن ہر سال کی شروعات میں یہ ضرور سوچتی ہوں کہ اس سال روٹین سے زیادہ لکھوں گی، لیکن کچھ مصروفیات ایسی ہو جاتی ہیں کہ لکھ ہی نہیں پاتی اور ملک کا فیوچر؟ اللہ ہی حافظ ہے۔ نیا سال آئے گا اور ساتھ ہی مہنگائی کا ایک نیا طوفان بھی ساتھ لائے گا اور بجٹ الٹ پلٹ ہو جائے گا۔ اف اللہ میرے ملک کو شاد و آباد رکھے (آمین) اور ہمیں خوشیاں بانٹنے کی توفیق دے۔ آمین

مناعباس : ۔ (ریڈیو پریزنٹر سرگودھا + ہوسٹ + ورک ایڈ ڈان نیوز)

1 2014ء کے لیے یہ کہنا مناسب ہوگا کہ اچھا گزر گیا۔ کچھ بہت اچھے دوست زندگی کے اس سفر میں بچھڑ گئے کہ ان کی یادیں ہمیشہ تازہ رہیں گی اور کچھ اچھے دوست ملے بھی کہ جن کے ہونے سے زندگی میں رنگ ہیں۔ چونکہ میں یونیورسٹی کی طالبہ ہوں تو دوست ملتے بھی رہتے ہیں اور بچھڑتے بھی رہتے ہیں۔ اور ایک طالبہ ہونے کی حیثیت سے پڑھائی کی ٹینشن اور امتحان کا بخار تو چڑھتا اترتا ہی رہتا ہے۔ تو یہ بھی زندگی کا ایک حصہ ہے اور جہاں تک کامیابیوں اور ناکامیوں کا تعلق ہے تو 2014ء میں اللہ تعالیٰ نے مجھے کامیابیوں سے ہی نوازا ہے مثلاً "2014ء میں پی ٹی وی کے عید شو میں اور دیگر شوز میں ہوسٹنگ کا موقعہ ملا تو بہت مزا آیا۔ اندازہ ہوا کہ ٹی وی کی تو دنیا ہی الگ ہے۔ اور ریڈیو کی الگ ۔۔۔ تو ٹی وی میں کام کرکے سیکھنے کو بہت کچھ ملا اور جن لوگوں کو میں اسکرین پہ دیکھا کرتی تھی ان کے ساتھ کام کرنے کا جو خواب میں دیکھا کرتی تھی وہ خواب 2014ء نے پورا کر دیا اور اللہ کا شکر ہے کہ ناکامی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

2 آپ کے اس سوال پر بہت سے جوابات زبان پہ مچل گئے کہ ایسا ہو جائے۔ ویسا ہو جائے۔ مگر میں

خوابوں کی دنیا میں رہنے والی لڑکی ہرگز نہیں ہوں جو حقیقت ہے وہ آپ کے سامنے اور میں حقیقت پسند ہونے کے ساتھ ساتھ پر امید بھی ہوں کہ اللہ جو کچھ کرے گا ہمارے لیے بہتر ہی کرے گا اور پاکستان کے فیوچر کے لیے دعا گو ہوں کہ اسے اپنے نیک و ایماندار حکمران عطا فرما جو زبانی کلامی دعوے نہ کریں بلکہ عملی طور پہ بھی کام کریں اور ہماری نوجوان نسل میں جو شعور اجاگر ہو چکا ہے اسے زنگ نہ لگے۔ ہمیں ایک بہتر قیادت کی ضرورت ہے۔ کیونکہ بقول شاعر کہ "ذرا نم ہو یہ مٹی تو بڑی زرخیز ہے ساقی۔"

فیروز خان :۔ (آرٹسٹ "چپ رہو" فیم)

1 2014ء میں ہی میں نے شوبز انڈسٹری کو جوائن کیا اور چھ ماہ ہوئے ہیں مجھے اداکاری کرتے ہوئے اور 2014ء میں میں نے بہت محبت، بہت پیار اور بہت کامیابی پائی اور جو لوگ اپنے کام سے لوگوں کے دلوں میں جگہ بنا لیتے ہیں ان کے لیے یہ بہت بڑی کامیابی ہوتی ہے۔ یاسر نواز کی پروڈکشن میں میرا سیریل "چپ رہو" ہٹ گیا اور لوگوں نے میرے کام کو بے حد پسند کیا اور مجھے پہچان ملی ... اور اللہ کا شکر ہے ناکامی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

2 سچ بات بتاؤں، میں نے ابھی کل کے بارے میں سوچا تک نہیں اور نہ ہی میں سوچنا چاہتا ہوں۔ میں صرف اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ جو میرے حق میں بہتر کرتا اور میرا رب جو مجھے دیتا ہے۔ اس کو سوچ سمجھ کر اور اچھے دماغ سے فیصلہ کرتا ہوں کہ اب مجھے کیا کرنا ہے اور یقین کریں کہ میں بہت مطمئن زندگی گزار رہا ہوں۔ ہاں اگر سوچتا ہوں تو اپنے ماں باپ کے لیے سوچتا ہوں اپنے بہن بھائی کے لیے سوچتا ہوں اور اپنے کام سے بہت مخلص ہوں۔ بہت محنت کے ساتھ کرتا ہوں۔ اور ملک کا فیوچر بھی بہت اچھا دیکھ رہا ہوں۔ کیونکہ بہتری آرہی ہے ان شاء اللہ جب مخلص حکمران برسراقتدار آئیں گے تو آپ کو بہت فرق نظر آئے گا۔

3 بہت ایکسائٹمنٹ ہوتی ہے ... اور اپنے لیے سوچتا ہوں کہ آنے والے سال کے لیے مجھے کیا کیا کرنا ہے اور ان شاء اللہ 2015ء میں مجھے فلم کرنی ہے۔

ناہید سبطین :۔ (رنگ ریز)

1 2014ء بہت اچھا نہیں گزرا ... بڑے صدمے سے دوچار ہوئی جب ہر دل عزیز بھائی نے دنیا کو الوداع کہا۔ باقی پھر رہ ہی کیا جاتا ہے۔ بس ملا جلا ہی گزرا۔

2 مجھے اپنا فیوچر تو بہت برائٹ لگ رہا ہے۔ ان شاء اللہ اس سال کچھ اچھا ہی ہوگا میرے ساتھ اور ملک کے لیے تو دعا ہی کر سکتی ہوں کیونکہ یہ ہمارے سیاست دان ملک کے لیے مخلص نہیں ہیں اور آپ اس بات کو بہتر سمجھتی ہیں۔

3 40s میں تو ساری ایکسائٹمنٹ ختم ہو جاتی ہے۔ اس لیے میں تو نارمل ہی رہتی ہوں۔

زرنش خان ... Zarnish

1 2014ء بہت اچھا گزرا۔ ماشاء اللہ سے بہت کامیابیاں ملی۔ بہت پسند کیے گئے میرے سیریلز۔ گھر میں بھی ہر طرح سکون رہا۔ ماشاء اللہ سب کچھ بہت اچھا رہا۔ ناکامی کوئی نہیں آئی۔

2 2015ء میں تو اپنا فیوچر یہ ہے کہ میری ماشاء اللہ ... رخصتی ہے۔ نکاح کو تین سال ہو گئے ہیں، اب ان شاء اللہ رخصت ہو کر دبئی چلی جاؤں گی اور بہت برائٹ دیکھ رہی ہوں اپنے فیوچر کو کیونکہ سب کچھ نیا نیا ہوگا ... اور ملک کے فیوچر کے لیے تو یہی کہوں گی کہ بس جی اللہ ہی خیر کرے۔

3 اور نئے سال کو نارمل نہیں لیتی بلکہ بہت ایکسائیٹڈ ہوتی ہوں۔ بہت انتظار کرتی ہوں اور اچھی طرح سے سیلیبریٹ کرتی ہوں۔

شعیب احمد :۔ (ریڈیو براڈکاسٹر 105-FM+ پروڈیوسر)

1 2014ء بھرپور سفر میں گزرا۔ یہ میری زندگی کا بہت اہم سال تھا اور کہوں گا کہ یہ میری زندگی کا بہترین سال تھا تو غلط نہ ہوگا۔

2 اپنا فیوچر تو اچھا دیکھتا ہوں اور اپنے فیوچر کے لیے ماں کے الفاظ دہراتا ہوں کہ "اب اس کے پیروں میں بیڑیاں ڈال دیں" تو دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ اور ملک کے لیے بھی یہی کہوں گا مادر پدر آزادی جس طرح حکمرانوں سے لے کر میڈیا تک ہے تو 2015ء میں ان کے پیروں میں بھی تھوڑی سی بیڑیاں ڈال دی جائیں، تاکہ یہ اپنے ملک کے مفاد کے لیے کچھ سوچیں۔

3 نئے سال کے لیے ایکسائٹمنٹ ہوتی ہے کیونکہ ہماری زندگی چل ہی جنوری سے دسمبر تک کے لیے ہے۔ ورنہ نیا سال تو کہنے کو شروع ہو گیا ہے سعودی عرب میں ساری چھٹیاں عید کی، حج کی محرم کی اسلامی کیلنڈر سے ہوتی ہیں اور تنخواہیں بھی اسی طرح ملتی تھیں۔ عربی کیلنڈر سے سب کچھ ہوتا تھا سعودی عرب میں اور اب بھی ہوتا ہے۔ مگر یہاں پاکستان میں تو آپ کو پتا ہی ہے۔

سیدہ غزالہ (ایس ایچ او)

1 2014ء بہت اچھا گزرا ... ایک بڑے عہدے پہ فائز ہوئی۔ بہت سے ٹارگٹ Achieve کیے بہت عزت پائی۔

2 اپنا اور اپنے ملک دونوں کا فیوچر برائیٹ دیکھ رہی ہوں۔ ان شاء اللہ 2015ء ملک کے لیے بہترین سال ثابت ہوگا۔

3 جی کیوں نہیں' نئے سال کے آنے کی سب کو خوشی ہوتی ہے اور مجھے بھی ہے اور ہمیشہ ہوتی ہے۔ اور نئے سال کے موقع پر ڈیوٹی بھی سخت ہوتی ہے۔"

عمران اسلم (آرٹسٹ)

1 جی الحمد وللہ 2014ء بہت اچھا گزرا' بہت کامیابیاں ملیں۔ بہت کام کیا۔ جو کرنا چاہتا تھا وہ کیا پر ابھی بھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔

2 ملک کا فیوچر ان شاء اللہ گزرے وقت سے زیادہ اچھا ہو گا۔ میں اپنے ملک کے فیوچر سے بہت پر امید ہوں اور اپنا فیوچر بھی بہت اچھا ہو گا۔

3 بہت ایکسائیٹڈ ہوتا ہوں۔ کیونکہ نیا سال' نئے Goals نئی امیدیں' نئی راہیں۔ ان کی سوچ ایکسائیٹڈ کر دیتی ہیں۔ تو نئے سال کو نارمل نہیں لیتا۔

ہمانواب :۔ (آرٹسٹ)

1 2014ء بہت اچھا گزرا۔ ہر دن کامیابیاں ملیں' پاکستان آئی سب نے ویلکم کیا۔ ڈھیروں کام ملا محبت کے ساتھ گزرا۔۔۔ سانس لیتے ہوئے گزرا' صبح اٹھو اور سانس آ رہی ہو تو شکر ادا کرتی ہوں رب کا کہ ایک دن اور زندگی کا عطا کر دیا۔

2 کچھ نہیں کہہ سکتی' ملک سے باہر پندرہ سال رہی یہاں سے گئی تو نواز شریف تھا پھر مشرف آ گیا۔ واپس آئی تو پھر نواز شریف ہے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ مجھے پاکستانی سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ جب پیدا ہوئی تو مارشل لا دیکھا اب پھر لوگ مارشل لاء کی باتیں کر رہے ہیں حالانکہ مارشل لا کسی بھی ملک کے لیے اچھا نہیں ہوتا' مگر ہمارے ملک کے لیے یہ بیک بون بن چکا ہے عمران خان کو بھی کافی لوگ پسند کر رہے ہیں ۔۔۔ دیکھیں کہ کیا ہوتا ہے۔ بس مستقبل اچھا ہونا چاہیے۔

3 ایکسائیٹڈ کیا ہونا۔ بس اچھی طرح ویلکم کروں گی۔

☆ ☆

ایک اندوہناک سانحہ'

ماہنامہ کرن کے دیرینہ اور مخلص کارکن شعبہ اشتہارات کے منیجر رضا امام کے جواں سال صاحب زادے عدنان رضا کراچی میں ہونے والی ٹارگٹ کلنگ کا شکار ہو گئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

رضا امام صاحب کے لیے جوان بیٹے کی اچانک وفات انتہائی اندوہناک صدمہ ہے۔ دکھ کی اس کیفیت کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

رضا امام صاحب کی ماہنامہ کرن سے دیرینہ رفاقت کی بنا پر ادارے کے تمام لوگ ان سے دلی وابستگی رکھتے ہیں۔ اس صدمے پر ہمارا پورا ادارہ سوگوار ہے۔ ہم سب اس شدید دکھ کو دل سے محسوس کرتے ہیں اور دکھ کی اس کٹھن گھڑی میں ان کے ساتھ ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کو اپنی جوار رحمت میں جگہ دے اور رضا امام اور ان کے اہل خانہ کو صبر جمیل سے نوازے۔ آمین۔

قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

نفیسہ سعید

ملک صاحب اپنے گھر والوں کو بے خبر رکھ کر اپنے کم سن بیٹے ایشال کا نکاح کر دیتے ہیں جبکہ ایشال کی دلچسپی اپنی کزن عریشہ میں ہے۔

حبیبہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے حیدر آباد سے کراچی آئی ہے۔ شاہ زین کے والد نے اسے اپنے آفس میں اپائنٹ کر لیا شاہ زین حبیبہ میں دلچسپی لینے لگا۔

فرہاد تین بھائی ہیں۔ فرہاد کے دونوں بھائی معاشی طور پر مستحکم ہیں اور دونوں اپنی بیوی بچوں کی ضروریات کو دل کھول کر پورا کرتے ہیں جبکہ فرہاد اپنی بیوی زینب اور بچیوں کی ضروریات پوری کرنے میں بے حد کنجوسی سے کام لیتا ہے جو زینب کو بالکل پسند نہیں۔

فرہاد کے بڑے بھائی کی بیوی فضہ زینب کی خوب صورتی سے حسد کرتی ہیں اور آئے دن اس حسد کا اظہار کرتی رہتی ہیں۔

(اب آگے پڑھیے)

ساتویں قسط

"ایک بات تو بتاؤ فضل دین۔" سکینہ پر سوچ نگاہوں سے اسے تکتے ہوئے بولی۔

ہاں بولو۔ کھانا کھاتے فضل دین نے ہاتھ روک دیا۔

"ایک بے اختیار انسان' کسی دوسرے انسان کی زندگی کا فیصلہ کرنے سے پہلے سوچتا کیوں نہیں۔ فضل دین جب ہم اس قابل ہی نہیں ہوتے کہ اپنے کیے گئے فیصلے دوسروں سے منوا سکیں' تو پھر ایسے فیصلے ہی کیوں کرتے ہیں جو ہماری وجہ سے اپنے لوگوں کی زندگی خراب کردیں جن کا خدا کے بعد اس دنیا میں سوائے ہمارے کوئی دوسرا سہارا بھی نہ ہو۔"

بات ختم کرتے ہوئے سکینہ کی آواز بھیگ سی گئی۔ وہ کیا کہنا چاہتی تھی بنا کسی وضاحت کے فضل دین جان چکا تھا۔

"بھلی مانس شاید تو بھول گئی انسان کبھی بھی بااختیار نہیں ہوتا' وہ تو ہمیشہ سے ہی بے اختیار ہے' بااختیار تو صرف سوہنے رب کی ذات ہے۔ ہم تو صرف کٹھ پتلیاں ہیں جو اوپر والے کے اشاروں پر چلتی ہیں اور شاید ایسے میں ہم جو بھی فیصلہ کرتے ہیں وہ ہمارے نصیب میں لکھ دیا جاتا ہے اور نصیب کے آگے تو ہم سب ہی بے بس ہیں اور یہ بات تو۔ تو بھی اچھی طرح جانتی ہے۔"

"تو کیا اس سوہنے رب نے ہماری بی بی کے نصیب میں ہمیشہ کے لیے تنہائی ہی لکھ دی ہے تو کیا اس کا مقدر یہ ہی ہے کہ وہ اپنی ساری جوانی ہم جیسے کمی کمین لوگوں کے ساتھ ہی گزار دے' اس غریب کے نصیب میں اپنوں کا پیار' اپنوں کا ساتھ کچھ نہیں ہے۔"

وہ سوالیہ انداز میں اسے تکتے ہوئے دکھی لہجہ میں بولی۔

"اللہ نہ کرے سکینہ کیوں اپنے بد فال منہ سے نکالتی ہے۔ خدا سے ڈر جانے اسے تیری کون سی بات کب بری لگ جائے توبہ کر بھلی مانس توبہ......"

فضل دین نے قدرے برا مناتے ہوئے اسے گھرکا۔

"یہ بد فال نہیں ہے' فضل دین سچائی ہے' ایک تلخ سچائی جو مجھے صاف دکھائی دے رہی ہے اور یہ بات تو تم بھی بہت اچھی طرح جانتے ہو کہ ملک صاحب اپنی بیگم اور بیٹے دونوں کے سامنے بالکل بے بس ہیں' اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ معصوم بچی اتنے سالوں سے یوں تن تنہا ہمارے سہارے نہ پڑی ہوتی' بلکہ کب کے ملک صاحب اسے اپنے ساتھ لے گئے ہوتے۔ اپنی سوہنا کر اب بھلا اتنے سالوں میں جو بات وہ آج تک نہ منوا سکے تو خود سوچو کس طرح وہ اس معصوم کو اس کا حق دلوا سکیں گے۔ مجھے تو اپنی زندگی میں یہ سب ہوتا نظر نہیں آتا۔"

آج سکینہ کے دل میں جو کچھ تھا وہ کہہ دینا چاہتی تھی۔ پھر جانے یہ موقع دوبارہ کبھی ملے یا نہ ملے' کیونکہ فضل دین اس موضوع پر ہمیشہ بات کرنے سے کتراتا تھا۔

"اللہ سے اچھے کی امید رکھو' وہ جو کرے گا ان شاء اللہ بہتر ہی ہو گا۔"

فضل دین نے مختصراً جواب دے کر بات ختم کرنا چاہی۔

"میری تو ہمیشہ سے یہ ہی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس معصوم بچی کا نصیب جلد ہی اچھا کرے۔ وہ بے چاری تو پہلے ہی بہت پریشان اور دکھی ہے اور سچ مانو تو جب جب میں اسے دیکھتی ہوں اس کی تنہائی کے تصور سے ہی میرا دل ہول اٹھتا ہے۔"

اسے مسلسل بولتا دیکھ کر فضل دین بنا کوئی جواب دیے اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں بی بی کو لینے کالج جا رہا ہوں' تم مزید باتیں بنانا چھوڑو اور اٹھ کر جلدی سے کھانا تیار کرو۔"

سکینہ کو ہدایت دیتا وہ قریبی ٹیبل سے گاڑی کی چابی اٹھاتا ہوا لکڑی کا دروازہ دھکیل کر باہر نکل گیا۔

☆ ☆ ☆

"میں نے تمہیں منع بھی کیا تھا ابھی اماں جی کو لینے مت آنا' میں کچھ دن انہیں اپنے ساتھ رکھوں گی' مگر تم پر تو شاید کسی بات کا اثر ہی نہیں ہوتا' میرے روکنے کے باوجود لینے آگئے ہو۔"

احسان کو دیکھتے ہی زینب نے برا سا منہ بنایا۔

"ارے آپا آپ یہ بات اچھی طرح جانتی ہیں' مجھے اماں کے بغیر نیند نہیں آتی۔"

بہن کی بات کا برا منائے بغیر اس نے ماں سے لاڈ کرتے ہوئے جواب دیا اور اماں بی کا تو مانو سیروں خون ہی بڑھ گیا۔

اب جب گھر آئی نا تو تمہاری بیوی کو بتاؤں گی یہ بات پھر اسے بھگتنا۔" زینب ہنستے ہوئے بولی۔

"ہاں۔ ہاں۔ ضرور بتایئے گا' میں تو خود چاہتا ہوں وہ ناراض ہو کر میکے جائے اور مجھے دوسری شادی کرنے کا موقع ملے۔" وہ شرارتاً ہنسا۔

"اللہ نہ کرے بیٹا کیسی باتیں کرتے ہو۔" اماں بی ہول ہی آگئیں۔

"مذاق کر رہا ہوں اماں۔" ماں کو سنجیدہ دیکھ کر احسان بھی سنجیدہ ہو گیا۔

"چلیں اب اٹھ جائیں' گھر پہنچتے پہنچتے گھنٹہ سے بھی اوپر ہو جاتا ہے۔"

"بیٹھو میں کھانا لا رہی ہوں' کھا کر جانا۔"

"ارے نہیں کھانا' ہم گھر جا کر کھائیں گے' پھر کہیں فرہاد بھائی یہ نہ کہہ دیں کہ مہینے بھر کا راشن زینب کے میکے والے ایک ہی دن میں ہڑپ کر جاتے ہیں۔"

بظاہر مذاق میں کہا گیا احسان کا یہ جملہ زینب کے دل میں ترازو ہو گیا' بہت سال قبل مذاق ہی مذاق میں کہا گیا یاسمین آپا کا یہ جملہ وہ آج تک نہیں بھولا تھا' جبکہ اس وقت محض وہ اسکول کا طالب علم تھا اور آج پریکٹیکل لائف میں قدم رکھ چکا تھا' مگر پھر بھی اتنی پرانی بات آج تک دل میں سنبھالے بیٹھا تھا۔ شاید کچھ باتیں دلوں میں اسی طرح نقش ہو جایا کرتی ہیں۔ بہرحال جو بھی تھا زینب کو احسان کی بات پسند نہ آئی۔

"بری بات ہے احسان بنا جانے کسی کے بارے میں ایسے خیالات کا اظہار نہیں کرتے اور فرہاد تو پھر تمہارا بہنوئی ہے۔"

زینب کے ماتھے پر پڑی تیوریاں اماں بی کو صاف دکھائی دے رہی تھیں۔

"مذاق کر رہا ہوں اماں' آپ تو پھر سے سنجیدہ ہو گئیں۔"

اپنی کہی گئی بات کی سنگینی دور کرنے کے لیے ہمیشہ اسے مذاق کا رنگ دینا اس کی پرانی عادتوں میں سے ایک تھی۔

اماں جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ مریم نے تیزی سے آگے بڑھ کر تخت کے نیچے سے ان کی چپل نکالی اور پاؤں کے بالکل قریب رکھ دیں' اس کی اس بے اختیار حرکت نے سب کو ہی مسکرانے پر مجبور کر دیا۔ ماحول میں پھیلی ہوئی کچھ دیر قبل والی تلخی یک دم ہی دور ہو گئی۔

"جیتی رہو بچہ۔ اللہ تعالیٰ نصیب اچھا کرے' سوہنا رب زندگی میں ہر خواہش پوری کرے' وہ سب کچھ عطا کرے جو تم چاہتی ہو' سدا خوش رہو۔"

انہوں نے مریم کو خود سے لگا کر ڈھیروں ڈھیر دعائیں دے ڈالیں۔

"لگتا ہے اماں آپ نے کبھی مجھے اتنے دل سے دعا نہیں دی تھی۔"

نہ چاہتے ہوئے بھی اک شکوہ زینب کے لبوں پر آگیا۔

"ماں کی دی جانے والی ہر دعا دل سے ہی نکلتی ہے زینب اور پھر بتاؤ بھلا تمہیں زندگی میں کیا کمی ہے۔ اچھا گھر بچے اور محبت کرنے والا شوہر اس سے بڑھ کر کسی عورت کی خواہش اور کیا ہو سکتی ہے؟" اماں قدرے برا مناتے ہوئے بولیں۔

"دکھ تو یہ ہی اماں کہ شوہر محبت کرنے والا نہیں ہے۔ محبت تو ایک طرف وہ تو میری کسی ضرورت کو بھی سمجھنے کے قابل نہیں ہے۔" وہ ہی پرانا شکوہ اور شکایت۔

"بیٹا تم جاؤ گاڑی اسٹارٹ کرو میں آرہی ہوں۔" انہوں نے احسان کو فوراً باہر بھیجا۔

"دیکھو بیٹا ہر شخص کے محبت کرنے کا انداز دوسرے سے جدا ہوتا ہے اور کچھ لوگ تو محبت کا اظہار کرنا بھی نہیں جانتے۔ ان کے نزدیک محبت اظہار کی محتاج نہیں ہوتی اور یقین مانو فرہاد کا تعلق بھی ایسے ہی لوگوں سے ہے۔ ورنہ وہ تم سے اور اپنی بچیوں سے بہت محبت کرتا ہے۔ بس صرف اظہار کرنا نہیں جانتا۔"

بیٹی کے دل میں آیا بال دور کرنا ان کی ذمہ داری تھی اور اپنی ہر ذمہ داری نبھانا وہ بخوبی جانتی تھیں۔

"محبت الفاظ کی محتاج نہیں ہوتی اماں اور یہ بات میں بھی جانتی ہوں۔" زینب نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"یہ تو وہ جذبہ ہے جو بنا کہے بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ کیا جائے اور یقین جانیں دکھ کی بات صرف یہ ہے کہ فرہاد کا دل میری محبت سے یکسر خالی ہے۔ یہاں تک کہ بیوی ہونے کے ناطے میرا کوئی احساس کوئی ذمہ داری بھی اس کے نزدیک قطعی غیر اہم ہے کیونکہ میں ہی اس کے نزدیک اہم نہیں ہوں۔"

"غلط فہمی مت پالو بیٹا' یہ غلط فہمیاں رشتوں کو ختم کر دیتی ہیں۔ ان سے بچو' یہ شیطانی طور طریقے ہیں اپنے دل میں ہمیشہ اچھی باتیں اور اچھے خیالات کو جگہ دو' خوش رہو گی' ورنہ یہ وسوسے تمہیں کمزور کر دیں گے۔"

اماں تھیں زینب کے اندر کا دکھ جانتی تھیں۔ وہ شروع سے ہی لوگوں کی نظروں میں رہنے کی عادی تھی' کسی کا نظر انداز کیا جانا اسے کبھی نہ بھاتا تھا' اپنی تعریف وصول کرنا وہ اپنا حق سمجھتی تھی' بننے سنورنے کی شوقین تھی۔ انہوں نے اپنے حالات کے مد نظر کبھی فالتو پیسہ اولاد پر خرچ نہ کیا۔ بیٹیوں کو تو ہمیشہ یہ ہی کہا کہ جو کرنا ہے اپنے گھر جا کر کرنا' ہر خواہش پوری کرنا میری اوقات نہیں اور زینب خواہشات کا ایک محل اپنے ساتھ لے کر فرہاد کے گھر آئی تھی جو سال آتے ہی چکنا چور ہو گیا۔

روپے پیسے کے حساب کتاب سے زیادہ خود کو نظر انداز کرنا اسے اندر تک مار گیا' اپنے ہاتھوں کھلا پیسہ خرچ کرنے کی دلی خواہش سسک سسک کر دم توڑ گئی اور سب کچھ عین اس کی خواہش کے مطابق پورا کرنا اماں جی کے اختیار میں نہ تھا۔ ماسوائے اس کے کہ وہ زینب کو سمجھا بجھا کر ہر ادھوری رہ جانے والی خواہش کو غیر ضروری قرار دے دیں اور وہ ہمیشہ ایسی ہی کوشش کیا کرتیں ابھی بھی زینب کے پاس رک کر اسے سمجھانے کا ان کا یہ ہی مقصد تھا۔

"اچھا بیٹا' اب میں چلوں اور ہاں تم یہ کچھ پیسے رکھ لو' جلدی میں آئی تھی' کچھ لا نہ سکی' اب جو تمہارا دل چاہے اپنی خواہش کے حساب سے خرید لینا۔" انہوں نے زینب کی مٹھی میں کچھ روپے دبائے۔

"اور ہاں فرہاد کے لیے اپنے دل میں اچھے خیالات رکھو' کچھ لوگ اظہار میں کنجوس ہوتے ہیں' مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ محبت نہیں کرتے۔" اماں نے اسے پھر سے تسلی دینا چاہی' وہ مسکرا دی۔

"کاش صرف جذبات کے اظہار میں کنجوس ہوتا تو شاید اتنی مشکل نہ ہوتی' مگر وہ تو ہر معاملے میں ہی کنجوس ہے۔"

دل میں آئی یہ بات وہ کہہ نہ سکی' کیونکہ اب وہ مزید بحث کے موڈ میں نہ تھی۔ جانتی تھی اس کے جواب دیتے ہی اماں بی نے پھر سے اخلاقیات کی پٹاری کھول کر اس میں سے کچھ نہ کچھ نکال لینا تھا۔

"اچھا بیٹا اللہ حافظ۔"

اسے خاموش دیکھ کر اماں بی نے سر پر ہاتھ رکھ کر خود سے قریب کیا۔ "بچوں کی چھٹی والے دن تم بھی وقت نکال کر آ جانا واپس احسان چھوڑ دے گا۔"

"جی اچھا۔"

وہ گھر کی دہلیز پر کھڑی اپنی ماں کو اس وقت تک دیکھتی رہی جب تک احسان کی چھوٹی سی گاڑی گلی کے موڑ سے گھوم کر نظروں سے اوجھل نہ ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

برستی بارش کی آواز نے اس کی سوئی ہوئی سماعتوں کو بحال کر دیا۔ وہ یک دم اٹھ بیٹھی۔

"یا ہر بارش ہو رہی ہے۔"

وہ بھاگ کر کھڑکی کے قریب آئی' جلدی سے پردہ ہٹا کر باہر جھانکا۔ نیچے اپارٹمنٹ کے لان میں برستی بارش کی بوندیں ایک عجیب سی بہار کا منظر پیش کر رہی تھیں۔ حد نظر تک پھیلی ہوئی ہریالی ماحول کو مزید خوب صورت اور دلکش بنا رہی تھی۔ وہ مبہوت سی ہو کر کھڑکی کے قریب جم سی گئی' بارش ہمیشہ سے ہی اس کی کمزوری رہی تھی مگر بارش میں اتنا خوب صورت منظر شاید آج وہ پہلی بار دیکھ رہی تھی۔

"اسے نیچے لان میں جانا چاہیے۔"

آس پاس کے اپارٹمنٹس کی کچھ خواتین بھی نیچے لان میں آ گئی تھیں۔ وہ پاؤں میں چپل پہن کر تیزی سے باہر کی جانب لپکی۔

"ارے بیٹا' کہاں جا رہی ہو۔۔۔ سنو تو سہی۔"

اسے بھاگتا دیکھ کر سکینہ نے فوراً' سے پیشتر ہی داخلی دروازے کے قریب ہی جا دھرا۔

"سردیوں کی بارش ہے' مت جاؤ بیمار پڑ جاؤ گی۔"

سکینہ کے لہجہ میں جھانکتی فکر اور تشویش نے اس کے قدم سست کر دیے۔ وہ وہیں تھم گئی اسے محسوس ہوا جیسے یہ آواز اور الفاظ اس کی ماں کے ہوں۔ اس احساس کے دل میں آتے ہی اس کی آنکھیں پانی سے بھر گئیں۔

وہ واپس پلٹ آئی' سارا گھر پکوڑوں کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ مگر اب اسے کسی چیز سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ بارش اور بارش کے پکوان وہ سب کچھ یکسر بھلا چکی تھی۔ اسے اگر کچھ یاد تھا تو صرف اپنا گھر اور اس کے کچے آنگن کو گیلا کرتی بارش۔

"اماں بارش ہو رہی ہے' میں سامنے ارم کے گھر جا رہی ہوں' اس نے پینگ (جھولا) ڈالی ہے اور سب دوستیں اسی کے گھر جمع ہیں۔"

وہ بھاگتی ہوئی کچن میں آئی' جہاں ماں سلور کا کٹورا ہاتھ میں لیے کچھ گھولنے میں بری طرح مصروف تھیں۔

"چلی جاؤ' مگر جلدی آ جانا' میں تمہارے لیے گلگلے بنانے لگی ہوں اور ویسے بھی شام ڈھلنے والی ہے اور بارش کا موسم تو ڈھلتی شام کو بھی رات میں بدل دیتا ہے۔ ہر طرف جلد ہی اندھیرا چھا جاتا ہے اور ایسے عالم میں بچیوں کا گلی محلے میں پھرنا اچھا نہیں لگتا۔"

ماں نے اجازت دینے کے ساتھ ہر بات تفصیل سے سمجھا دی۔

"بس ابھی تھوڑی دیر میں ہی واپس آ رہی ہوں۔"

بھاگ کر تار پر لٹکا دوپٹا اٹھا کر خود کو ڈھکتے ہوئے وہ باہر کی سمت لپکی۔ تیزی سے دروازہ کھولا۔ اس سے قبل کے

قدم باہر رکھتی سامنے نظر آنے والے منظر نے اس کا سارا جوش و خروش سرے سے ہی ختم کر دیا۔ وہ الٹے پاؤں واپس پلٹ آئی۔ ارم کے گھر کے باہر بنے چبوترے پر شوکا دو تین لڑکوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اس کے دوست بھی اسی کے جیسے اوباش تھے۔ جن کے پاس سے اس برستی بارش میں گزرنے کا تصور بھی اس کے لیے محال تھا۔ خاموشی سے واپس پلٹ کر اپنا دوپٹا اچھی طرح جھاڑ کر تار پر پھیلایا اور کچن کی جانب آگئی۔

"کیا ہوا آگئیں نہیں۔" چولہا جلاتی اماں نے پلٹ کر استفسار کیا۔

"نہیں باہر خاصا اندھیرا ہو چکا ہے۔ آپ گلگلے بناؤ' مجھے بہت بھوک لگی ہے۔"

گھی میں آٹا ڈالتے ہی گلگلوں کی خوشبو سے صحن مہک اٹھا۔ وہ مردے قدموں سے چلتی کچن سے واپس نکل آئی اور صحن میں رکھی لکڑی کی کرسی پر جا بیٹھی۔ اسے سمجھ نہ آیا یہ منحوس شوکا آخر اس کے پیچھے ہی کیوں ہاتھ دھو کر پڑ گیا تھا۔ جبکہ وہ تو شروع دن سے ہی چپ چاپ سیدھے رستے اسکول جانے اور آنے کی عادی تھی۔ وہ تو راستے میں دوسری لڑکیوں کی طرح ہنسی' ٹھٹھول بھی نہیں کرتی۔ پھر یہ مصیبت اسی کے گلے کیسے پڑ گئی۔ دل چاہا ماں کو سب کچھ بتا دے۔ مگر کیا فائدہ یہ ہی سوچ کر خاموش ہو گئی۔

"یہ لو۔" اماں نے پلیٹ اس کی جانب بڑھائی۔

"لے کر اندر چلی جاؤ' باہر سب کچھ گیلا ہو جائے گا۔"

کچھ دیر قبل والی ہلکی بوندا باندی اب تیز بارش میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی۔ وہ جیسے ہی اندر جانے کے لیے کھڑی ہوئی۔ یک دم ہی لائٹ چلی گئی اور ہر طرف گھپ اندھیرا چھا گیا۔ اتنے اندھیرے میں ہونے والی ایسی تیز بارش اسے سخت ناپسند تھی۔

"اچھا ہوا جو تم نہیں گئیں' ورنہ اب اتنے اندھیرے میں تمہیں لینے کے لیے مجھے ارم کے گھر جانا پڑتا۔"

اماں نے لالٹین کا شیشہ ہٹاتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔ وہ بنا کوئی جواب دیے پلیٹ تھامے اندر کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

☼ ☼ ☼

ملک صاحب کی اچانک' اس وقت آمد شاید ان دونوں کے لیے ہی قدرے غیر متوقع تھی۔ ایشال نے پلٹ کر مما پر ایک نظر ڈالی۔ جو تذبذب کے عالم میں کھڑی تھیں۔ وہ ڈر رہی تھیں کہ کہیں ملک صاحب نے کچھ سن تو نہیں لیا۔ لاکھ وہ ایشال کو ہر وقت اس رشتہ کے خلاف بھڑکاتیں' مگر پھر بھی وہ کئی سال قبل ملک صاحب کی طرف سے طلاق کی دی جانے والی دھمکی نہ بھولی تھیں۔ انہیں خدشہ لاحق ہوا' کہیں ایشال کوئی غلط بات نہ کر دے۔

"کیا ہوا بھئی' یہ تم دونوں ماں' بیٹا یک دم اتنے خاموش کیوں ہو گئے ہو۔"

اپنی بات کا کوئی جواب نہ پا کر ملک صاحب نے مسکراتے ہوئے دونوں پر ایک نظر ڈالی۔ "سب ٹھیک تو ہے نا۔"

"جی پاپا۔ دراصل میں اریشہ کی ضد کی بات کر رہا تھا۔"

ایشال کو لگا آج اسے قدرت نے ایک بہترین موقع فراہم کیا ہے جو اگر ہاتھ سے نکل گیا تو شاید دوبارہ نہ ملے گا۔

"ہاں۔ میں نے بھی یہ بات کئی بار نوٹ کی ہے۔ وہ خاصی ضدی اور خود سر لڑکی ہے۔"

ایشال کے ساتھ اریشہ کی دوستی پاپا کو کبھی بھی پسند نہ آئی تھی اور یہ بات وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ مگر اس وقت اس کا مقصد پاپا کی اریشہ سے متعلق رائے تبدیل کرنا نہیں تھا۔ اس وقت تو وہ اپنے اور اریشہ کے سلسلے میں فائنل بات کرنے کا ارادہ باندھ چکا تھا۔ جس کا اندازہ اس کے چہرے کو دیکھ کر بخوبی لگایا جا سکتا تھا۔

"نہیں پاپا۔ آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ اس وقت وہ جو ضد کر رہی ہے وہ غلط نہیں ہے۔"

"کیا مطلب۔"

ملک صاحب نے ایک طائرانہ نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی۔

"کوئی مطلب نہیں' بس ایسے ہی بول رہا ہے۔ آپ آ کر تیار ہو جائیں' آپ کی فلائٹ کا ٹائم ہونے والا ہے۔"

مما اپنی ساڑھی کا پلو سنبھالتی ہوئی فوراً آگے بڑھیں۔

"پلیز مما۔ مجھے پاپا سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔ آپ ہمیں کچھ دیر کے لیے اکیلا چھوڑ دیں۔" وہ ہمت باندھ چکا تھا۔

"کون سی ضروری بات۔"

ایسا لگا جیسے پاپا کچھ سمجھ چکے ہیں۔ انہوں نے لب بھینچتے ہوئے ایشال کی جانب دیکھا۔ ان کے چہرے پر یک دم کرختگی سی چھا گئی تھی۔

"پاپا مجھے شادی کرنی ہے۔" وہ بنا سوچے سمجھے تیزی سے بولا۔

"اوہ۔ میں ڈر گیا' جانے کیا کہنا چاہتے ہو۔"

پاپا نے کئی دیر سے رکی ہوئی سانس باہر خارج کی اور ہنس دیے۔

"دراصل پاپا مجھے اریشہ سے شادی کرنی ہے۔"

وہ آج ہر بات کہہ دینا چاہتا تھا۔ پاپا کے چہرے سے ہنسی غائب ہو گئی۔ اور چہرے کی رنگت ہلکی سی سرخ ہو گئی' جو شاید ان کے شدید غصہ کو ضبط کرنے کی علامت تھی۔ انہوں نے اپنی ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کی۔

"آپ اندر آ کر تیار ہو جائیں' اس موضوع پر ہم بعد میں بات کریں گے۔"

مما ایک بار پھر دونوں کے درمیان آ گئیں' ایشال کو جو کہنا تھا وہ کہہ چکا تھا۔ اب اسے پاپا کے رد عمل کا انتظار تھا۔

"تم جانتے ہو تم مجھ سے کیا بات کر رہے ہو؟" مما کو پیچھے ہٹاتے ہوئے پاپا عین اس کے سامنے آ گئے۔

"پلیز پاپا۔ میں جو کہہ رہا ہوں وہ بالکل سوچ سمجھ کر کہہ رہا ہوں اور یہ میرا اپنا ذاتی فیصلہ ہے۔ جس میں مما کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ میری آپ سے گزارش ہے میرے کسی بھی فیصلہ کی غلطی کی سزا صرف اور صرف مجھے دیں۔ اس کے نتیجہ میں اپنی زندگی برباد مت کیجیے گا' کیونکہ بالغ ہونے کے ناطے مجھے اپنی زندگی کے ہر فیصلہ کا حق حاصل ہے۔"

"یہ جانتے ہوئے بھی کہ تم آل ریڈی ایک شادی شدہ مرد ہو' جس کی منکوحہ اس انتظار میں بیٹھی ہے کہ کب تمہاری تعلیم مکمل ہو اور تم اسے پورے استحقاق کے ساتھ رخصت کروا کر اس گھر میں لا سکو۔ ایشال تم تو کئی سال قبل ہی کسی کی امانت بن چکے تھے اور یہ بات تم اچھی طرح جانتے بھی تھے۔ پھر تم نے یہ سب کیوں کہا مجھ سے' یہ سب کچھ کہنے سے پہلے کیوں نہ سوچا۔" ان کا اشارہ ایشال کی کچھ دیر قبل کہی ہوئی بات کی جانب تھا۔

"میں مجبور ہوں پاپا۔ میں اریشہ کو نہیں چھوڑوں گا۔ اگر آپ کو میرے فیصلے سے اختلاف ہے تو میں واپس لندن چلا جاتا ہوں۔ وہاں مجھے جاب مل گئی ہے۔ اریشہ بھی کچھ عرصہ میں وہیں آ جائے گی۔ پھر ہم دونوں کسی اسلامک سینٹر میں جا کر نکاح کر لیں گے۔ ویسے بھی معاف کیجیے گا پاپا میرا پہلا نکاح' میری مرضی کے بغیر ہوا تھا۔ میں نے تو آج تک اس لڑکی کو دیکھا تک نہیں' میں اس کا نام نہیں جانتا' پھر بھلا ہو جس میں اسے کیسے بیاہ کر اس گھر میں لا سکتا ہوں۔ سوری پاپا۔ آپ جب کہیں گے میں طلاق نامہ پر سائن کرنے کے لیے تیار ہوں۔ مگر رخصتی نہیں کرواؤں گا۔"

ایشال کے الفاظ ملک صاحب کی توقع کے بالکل خلاف تھے۔ وہ اپنے نکاح سے ناخوش تھا۔ یہ تو وہ جانتے تھے۔ وہ اریشہ کو پسند کرتا تھا۔ انہیں یہ بھی علم تھا، مگر شاید وہ اس سے اتنے صاف انکار کی امید نہ رکھتے تھے۔ وہ ساکت کھڑے یک ٹک ایشال کو گھور رہے تھے۔ چہرے پر چھائی کرختگی سنجیدگی اور پھر پریشانی میں تبدیل ہو گئی۔

"پلیز پاپا... میری بات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ میرا ارادہ آپ کو دکھ یا تکلیف دینے کا بالکل نہیں ہے، مگر میں خود بھی مجبور ہوں۔ میں اریشہ سے بے حد محبت کرتا ہوں۔ پاپا اور یہ بات شاید آپ بھی جانتے ہیں۔" وہ روہانسا ہو گیا۔

"اوکے۔" ملک صاحب نے ایک گہری سانس لی۔

"ابھی تو مجھے جانا ہے۔" انہوں نے سامنے لگی دیوار گیر گھڑی پر ایک نظر ڈالی۔

"واپس آکر اس موضوع پر تم سے بات ہو گی۔"

ان کا ردعمل ایشال اور مما کی توقع کے بالکل برخلاف تھا۔ دونوں نے بیک وقت ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔

"میرا بیگ پیک کر دیا ہے۔" پاپا نے پلٹ کر مما کی جانب دیکھا۔

"ہاں جی کر دیا ہے، آپ چل کر تیار ہو جائیں۔" مما آگے کی جانب چل دیں۔

"میری تم سے صرف ایک درخواست ہے بیٹا، باپ ہونے کے ناطے اگر تم اسے مانو تو..." مما کے باہر نکلتے ہی وہ ایشال کے قریب آ گئے۔

"جی پاپا... بولیں۔"

دل ہی دل میں خوف زدہ ہوتے ایشال نے آہستہ سے جواب دیا۔

"مجھے تمہاری اریشہ سے شادی پر کوئی اعتراض نہیں ہے، مگر اس کے لیے میری ایک شرط ہے۔"

ایشال کے کندھے پر ہاتھ کا دباؤ بڑھاتے ہوئے وہ آہستہ سے بولے۔

"میں اگر تمہاری ماں کی بھتیجی کو تمہارے لیے قبول کرنے پر تیار ہوں تو تم بھی میری بھتیجی کو طلاق نہیں دو گے۔ اس وقت تک جب تک تم اس سے ایک ملاقات نہ کر لو۔"

پاپا کی عجیب و غریب شرط اس کی سمجھ میں نہ آئی۔

"ٹھیک ہے پاپا، مجھے منظور ہے۔"

بظاہر اس شرط میں کوئی قباحت نہ تھی۔

"مگر میں اپنی شادی سے قبل اس سے ملنا نہیں چاہوں گا۔" ملک صاحب کا آخری ترپ کا پتا بھی ناکام ہو گیا۔

"تم جب دل چاہے اس سے ملو، مگر طلاق اسے ملنے کے بعد ہی دو گے۔"

اپنی بات ایک بار پھر سے دہراتے ہوئے وہ لاؤنج سے باہر نکل گئے۔ ایشال کے لیے ان کی رضامندی بھی کافی تھی۔ اس نے پاپا کے باہر نکلتے ہی جیب سے موبائل نکالا، تاکہ اریشہ کو فون کر کے اپنی کامیابی کی خبر سنائے۔ فی الحال اس کا ارادہ پاپا کی شرط سے متعلق اسے کچھ بھی بتانے کا نہ تھا۔

☼ ☼ ☼

"مجھ سے مل سکتی ہو۔"

فون کے دوسری جانب یقیناً "سالار" تھا۔ جس کی آواز وہ لاکھوں کے مجمع میں بھی پہچان سکتی تھی۔

"کب..."

اتنے دنوں بعد سالار کی آواز سن کر اس پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی۔ اسے شاید اپنی آواز رندھی ہوئی

بھی محسوس ہوئی۔

"جب تمہیں آسان لگے، مگر جلد ہی..."

"گھر آ جاؤں؟"

"نہیں میں تم سے کہیں باہر ملنا چاہتا ہوں۔" جواب زینب کی توقع کے عین مطابق تھا۔

"کل صبح میں آ جاؤں؟"

مریم کو اسکول چھوڑنے کے بعد کم از کم دو گھنٹے وہ سالار کے ساتھ گزار سکتی تھی۔ جس کا علم فرہاد کو نہیں ہو سکتا تھا۔

"نہیں کل صبح تو شاید ہم اسلام آباد جا رہے ہیں، وہاں مجھے ویزے کے لیے اپلائی کرنا ہے، ایک، دو دن لگ جائیں گے۔" ہم سے مراد یقیناً "سالار اور نازیہ دونوں تھے۔

"خیریت... کہاں جا رہے ہیں آپ لوگ؟ اور ہاں نازیہ کی طبیعت اب کیسی ہے؟"

"نازیہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں اسے باہر علاج کے لیے لے کر جانا چاہتا ہوں۔ اس سلسلے میں اس کا بڑا بھائی میری پوری مدد کر رہا ہے۔ بہرحال وہ تو جب تم مجھ سے ملو گی ہر تفصیل بتا دوں گا۔ فی الحال مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے اور میں چاہتا ہوں لندن جانے سے قبل تم سے لازمی ملاقات کر لوں۔"

"ٹھیک ہے اسلام آباد سے واپس آکر مجھے اطلاع کر دینا میں آ جاؤں گی۔"

سالار کیا بات کرنا چاہتا تھا۔ اسے ایک فیصد بھی اندازہ نہیں تھا۔ مگر اس کے لہجہ میں کچھ ایسا ضرور تھا جس نے زینب کو بے چین سا کر دیا۔

"شکریہ زینب، تم نے میری بات کا مان رکھ لیا۔ ورنہ میں تو سمجھ رہا تھا کہ انکار کر دو گی۔"

"میں نے آپ کی کسی بھی بات کو ماننے سے کبھی انکار نہیں کیا۔" وہ جتلاتے ہوئے بولی۔

"مجھے علم ہے، بہرحال اپنا خیال رکھنا، واپس آنے کے بعد ان شاء اللہ تم سے ملاقات ہو گی اور پھر تم گھر کا ایک چکر بھی ضرور لگانا۔ نازیہ بہت یاد کر رہی ہے۔"

"ہاں ان شاء اللہ ضرور آؤں گی۔"

"اچھا خدا حافظ۔"

سالار کچھ جلدی میں تھا۔ اس نے فون بند کر دیا۔ وہ اس سے کیوں ملنا چاہتا تھا؟ اس سلسلے میں زینب نے اپنے دماغ پر زیادہ زور نہیں دیا۔

☼ ☼ ☼

"بی بی جی آپ سے کوئی ملنے آیا ہے؟"

"مجھ سے ملنے؟" حبیبہ نے حیرت سے استفسار کیا۔

"کون کرن ہے؟" خود ہی سوال کر کے جواب بھی دے دیا۔

"نہیں جی، کوئی صاحب ہیں۔"

اتنی صبح صبح اس سے یہاں اس اجنبی شہر میں کون ملنے آ گیا۔

"بی بی جی میں نے تو انہیں خود آج پہلی بار دیکھا ہے۔ ورنہ آپ سے ملنے یا تو کرن بی بی آتی ہیں یا آپ کے چاچا جی، اتنا اسمارٹ بندہ تو کبھی آپ سے ملنے نہیں آیا۔" اسے خاموش دیکھ کر جمیلہ پھر سے شروع ہو گئی۔

"اچھا تم جاؤ، میں آ رہی ہوں۔" وہ کسلمندی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"آپ پہلے فریش ہولیں' پھر اچھا سا تیار ہو کر آیئے گا۔"
اسے ہدایت دیتے ہی جمیلہ غڑاپ کرکے دروازے کے باہر غائب ہوگئی۔ وہ جانتی تھی کہ آنے والا ضرور وزیٹنگ روم میں ہوگا اور یقیناً" جمیلہ کو میڈم نعیمہ نے ہی بھیجا ہوگا۔ کیونکہ وہ خاصی بااصول خاتون تھیں اور اس طرح ہر ایرا غیرا اس وومین ہوسٹل میں آکر کسی لڑکی سے نہیں مل سکتا تھا۔
حبیبہ نے کھڑے ہو کر دیوار گیر آئینہ میں اپنا مکمل جائزہ لیا۔ بال اچھی طرح کنگھی کیے اور قریب ہی رکھا دوپٹا اٹھا کر کندھے پر ڈال لیا۔ پاؤں میں سلیپر پھنسائے وہ وزیٹنگ روم کی جانب آگئی۔ اندر داخل ہوتے ہی سامنے نظر آنے والی شخصیت پر نگاہ پڑتے ہی وہ اپنی جگہ ٹھٹک کر رک گئی۔ کچھ بھی سہی اسے کبھی بھی اس ہوسٹل میں اس طرح شاہ زین کی آمد متوقع نہ تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وزیٹنگ روم میں اس کا منتظر شخص شاہ زین ہوگا۔
"سر آپ۔۔۔"
مارے حیرت کے اس کے منہ سے صرف اتنا ہی نکلا' شاہ زین اسے دیکھتے ہی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔
"جی میں۔۔۔" وہ ہنس دیا۔
"آپ کو کس نے بتایا' میں یہاں رہتی ہوں۔"
اسے سمجھ میں نہ آیا کہ اپنی حیرت کا اظہار کس طرح کرے۔
"جو دل میں رہتے ہوں ان کا ٹھکانہ معلوم کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔"
دل میں آیا اپنا یہ جملہ وہ لبوں تک نہ لا سکا۔
"پلیز سر آپ بیٹھیں۔" اسے خاموش کھڑا دیکھ کر حبیبہ فورا" آگے بڑھی۔
"ہیپی برتھ ڈے حبیبہ' مینی مینی ہیپی ریٹرنز آف دا ڈے' ہمیشہ خوش رہو۔" وہ جیسے ہی اس کے قریب پہنچی' شاہ زین نے اپنی کمر کی طرف کیا ہوا سیدھا ہاتھ یک دم اس کے سامنے کر دیا۔ جس میں تازہ گلابوں کا خوب صورت بکے تھما ہوا تھا۔ جنہیں دیکھتے ہی وہ کھل اٹھی۔ سرخ گلاب ہمیشہ سے اس کی کمزوری رہا تھا۔
"تھینک یو سر' تھینک یو سو مچ' آپ کو کیسے پتا چلا آج میری برتھ ڈے ہے۔"
سب کچھ اتنا اچانک اور غیر متوقع تھا کہ مارے خوشی اس کی آنکھیں پانی سے بھر گئیں' جنہیں اس نے اپنے ہاتھ کی ہتھیلی سے فورا" ہی صاف کر لیا۔
"پہلے تو تم مجھے یہ سر۔۔۔ سر کہنا بند کرو' کیونکہ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے میں کوئی ساٹھ سالہ بزرگ شخص ہوں۔ جس کی عزت افزائی تمہارے جیسی خوب صورت لڑکی مسلسل سر' سر کی گردان سے کر رہی ہے۔"
اپنی مسکراہٹ ہونٹوں کے کنارے دبا تا وہ شرارت سے مسکرایا۔
"اوکے سر۔۔۔ سوری شاہ زین۔"
اپنی غلطی فورا" ہی محسوس کرتے وہ یک دم کھلکھلا کر ہنس دی' مدھر گھنٹیوں کی آواز شاہ زین کے چاروں اور پھیل گئی۔
"میں نے تمہاری وارڈرن سے بات کر لی ہے۔ تم پندرہ منٹ میں تیار ہو کر نیچے پارکنگ میں آجاؤ۔ ہم برنچ کے لیے جا رہے ہیں۔"
قریبی ٹیبل پر رکھی گاڑی کی چابی اور موبائل اٹھاتے ہوئے اس نے حبیبہ کو ہدایت دی۔
"اکیلے۔۔۔"
وہ شاید تھوڑا سا نروس ہوگئی تھی یا شاہ زین کو ایسا محسوس ہوا۔ "آپ کہیں تو پورے آفس کو ساتھ لے لیتے ہیں۔"

"نہیں سر۔ مطلب شاہ زین۔" وہ پھر سے بوکھلا گئی۔
"ڈرو مت حبیبہ' میں تمہیں کھا نہیں جاؤں گا۔"
شاید شاہ زین کو اس کا اس طرح رد عمل کچھ ناگوار لگا۔
"آپ اچھی طرح جانتے ہیں' میں کسی سے نہیں ڈرتی اور مجھے اپنی اس خوبی پر فخر ہے۔ اس کے علاوہ آپ شاید بھول گئے ہیں۔ آپ کے ساتھ دو' تین' بار پہلے بھی اکیلے سفر کر چکی ہوں' بنا کسی ڈر و خوف کے ویسے ایک بات بتائیں آپ کو کیسے پتا چلا آج میری برتھ ڈے ہے۔"
اسے اپنا سوال ایک بار پھر سے یاد آگیا۔
"کرن نے بتایا تھا' ورنہ میں کوئی نجومی نہیں ہوں' اب تم ذرا جلدی سے تیار ہو کر نیچے آجاؤ' میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔"
شاید آج پہلی بار حبیبہ کو شاہ زین کا خود کو اتنی اہمیت دینا بہت اچھا لگا' وہ تو ان سب باتوں کی بالکل عادی بھی نہیں تھی۔ بہن بھائی اس کا کوئی تھا نہیں اور زیادہ دوست بنانے کی وہ بالکل قائل نہ تھی اور یہ سالگرہ وغیرہ منانا بھی اس کے نزدیک انتہائی کوئی فضول سے تہوار تھے۔ جن کی اہمیت کا اندازہ آج اسے پہلی بار ہوا اور اس کا کریڈٹ یقیناً شاہ زین کو ہی جاتا تھا۔ یہ ہی وجہ تھی کہ آج وہ شاہ زین سے کوئی ایسی بات نہیں کرنا چاہتی تھی جو اسے بری لگے۔ پندرہ منٹ میں ہی اچھا سا تیار ہو کر نیچے آگئی' جہاں گاڑی سے ٹیک لگائے شاہ زین اس کا منتظر کھڑا تھا۔ ایک نظر حبیبہ کا بغور جائزہ لیتے اس نے فرنٹ ڈور کھول دیا۔ اس کے اندر بیٹھتے ہی گاڑی سبک خرامی سے چلتی مین روڈ پر آگئی۔
"پہلے تو میرا ارادہ آج تمہیں اپنے گھر لے کر جانے کا تھا' تاکہ مما تم سے اچھی طرح مل لیں' کیونکہ وہ اکثر ہی تمہارا پوچھتی رہتی ہیں۔"
گاڑی کے اندر پھیلی گمبھیر خاموشی کو شاہ زین نے اپنی گفتگو کے آغاز سے توڑنے کی کوشش کی۔
"اچھا... مگر وہ مجھے کیسے جانتی ہیں؟" شاہ زین کی بات نے حبیبہ کو خاصا حیران کر دیا۔
"جب وہ آفس آتی ہیں ہمیشہ تو تمہیں دیکھتی ہیں۔" شاہ زین نے پلٹ کر اسے دیکھا۔
"اچھا... لیکن وہاں تو اور بھی بہت سارے ورکرز ہوتے ہیں' پھر خاص میرا ہی کیوں پوچھتی ہیں۔" اس کی حیرت اپنی جگہ برقرار تھی۔
"اس لیے کہ ان تمام ورکرز میں تم سب سے زیادہ خوب صورت ہو اور میری ماں کو ہمیشہ خوب صورت لوگ اٹریکٹ کرتے ہیں۔"
اپنی مما کی مسلسل تفتیشی عمل سے شاید اس نے یہ ہی نتیجہ اخذ کیا تھا۔
"اچھا..."
وہ آہستہ سے کہہ کر خاموش ہو گئی۔
"مگر پھر اچانک مما کو کسی ضروری کام سے کہیں جانا پڑ گیا تو سوچا کیوں نہ تمہیں باہر لے جا کر ایک اچھا سا ناشتا لنچ کرواؤں' ویسے تم چائنیز تو کھاتی ہو نا۔"
اس نے گاڑی سی ویو جانے والی روڈ پر ڈال دی۔
"ہاں بہت شوق سے۔" حبیبہ کا جواب ابھی بھی مختصر سا ہی تھا۔
"اگر تم بور ہو رہی ہو تو ہم کرن کو بھی ساتھ لے لیتے ہیں ایک سے دو بھلے۔" اس کی خاموشی سے شاہ زین نے یہ ہی نتیجہ نکالا۔

"نہیں میں بور نہیں ہو رہی اور ہم پہلے بھی دو ہی ہیں۔"
حبیبہ کا سادگی سے کہا گیا جملہ پل بھر میں ہی شاہ زین کو خوش کر گیا۔
"چلو شکر ہے' ورنہ میں تو ڈر رہا تھا کہ شاید آج کے بعد تم کبھی بھی میرے ساتھ کہیں نہیں جاؤ گی۔"
حبیبہ اس کی بات سن کر ہلکا سا مسکرا دی۔
"ویسے کیا آپ کی مما کو علم ہے کہ آج آپ مجھے میری برتھ ڈے کی خوشی میں ٹریٹ دینے کسی ریسٹورنٹ میں لے جا رہے ہیں۔"
اپنے سیل فون میں مصروف حبیبہ کو شاید اچانک ہی یہ خیال آگیا۔
"نہیں اور ویسے بھی اب ہر کام اپنی ماں کو بتا کر کرنے والی عمر گزر گئی ہے۔ اب میں جو کچھ کرتا ہوں پوری خود مختاری سے کرتا ہوں۔"
"اوہ..."
حبیبہ نے صرف اتنا ہی کہا اور پھر سارے راستے ان دونوں کے درمیان کوئی بات نہ ہوئی۔ شاہ زین خاموشی سے ڈرائیو کرتا رہا' جبکہ حبیبہ جانے فون پر کس سے مصروف تھی کہ گاڑی رکنے تک اس نے سر اٹھا کر بھی شاہ زین کی جانب نہیں دیکھا اور پھر گاڑی پارک کرتے ہی وہ شاہ زین کی سنگت میں دو دریا کے ایک خوب صورت ریسٹورنٹ میں داخل ہو گئی۔

☼ ☼ ☼
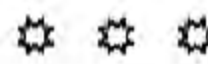
"جلدی کرو' اگر ناشتا تیار ہے تو دے دو' ورنہ میں جاؤں' مجھے دیر ہو رہی ہے۔" فرہاد نے کچن کے دروازے کے قریب کھڑے ہو کر آواز لگائی۔
"میں لا رہی ہوں۔" زینب نے جلدی جلدی پراٹھے پر گھی لگایا اور قریب ہی رکھے انڈے میں باریک باریک پیاز کترنے لگی۔
"تم کیا رات برتن دھو کر نہیں سوتیں' کس قدر ڈھیر لگا ہوا ہے۔"
کچن میں رکھا برتنوں کا ڈھیر فوراً ہی اس کی تنقید کا نشانہ بن گیا اور وہ ناگواری سے ناک سکوڑتے ہوئے بولا۔
"آج رات میں جلدی سو گئی تھی۔" زینب نے وضاحت کرتے ہوئے پراٹھا توے سے اتارا۔
"تمہیں یاد ہے' ہماری ماں ہمیشہ کچن صاف کر کے سوتی تھیں۔ وہ کہا کرتی تھیں کچن میں رات بھر پڑے برتن بے برکتی کا سبب بن جاتے ہیں۔ اب ہماری بہن کو ہی دیکھ لو' کبھی تمہیں اس کے کچن میں اس طرح برتن پڑے دکھائی نہ دیں گے۔"
"ان کے گھر مدد کے لیے کام والیاں موجود ہیں۔ وہ خود تو شاید کبھی گھر کا کوئی کام کرتی بھی نہیں ہوں گی اور یہاں ہر کام خود کرنا پڑتا ہے۔" نہ چاہتے ہوئے بھی زینب کا لہجہ تیز ہو گیا۔
"تو یہ کون سی انوکھی بات ہے' تمہاری ماں' بہن' بھابھی سب ہی اپنے گھر کے کام خود کرتی ہیں۔ ان کے ہاں کون سی ملازمائیں ہیں۔" فرہاد نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔
"میں نے دیکھا ہے تمہارے ہاں زیادہ صفائی کا رواج نہیں ہے۔ سب ایسے ہی گندے ہیں۔" ابھی وہ مزید زہر افشانی کرتا کہ اچانک ہی اندر لاؤنج میں رکھا فون بج اٹھا۔
"یہ صبح صبح کس کا فون آگیا۔"
زیر لب بڑبڑاتا وہ لاؤنج کی جانب بڑھ گیا۔ زینب نے شکر ادا کیا' ورنہ ابھی تھوڑی دیر بعد یہ گھر جنگ کا منظر پیش

کرنے جارہا تھا۔ پراٹھا اتار کر ہاٹ پاٹ میں ڈالا۔ جلدی جلدی آملیٹ بنایا۔ رات کا سالن گرم کر کے وہ لاؤنج میں ہی آگئی جہاں فرہاد کرسی پر بیٹھا بڑے مطمئن اور سرشار انداز میں کسی سے گفتگو فرما رہا تھا۔ یقیناً" فون کے دوسری جانب اس کی بہن تھی 'جس کا بخوبی اندازہ فرہاد کے چہرے پر پھیلی خوشی کی کیفیت کو دیکھ کر لگایا جاسکتا تھا۔

زینب نے ناشتا لکڑی کی ٹیبل پر رکھا اور خود کچن میں واپس آگئی۔ چائے کا پانی چولہے پر رکھ کر برتن دھوئے اور پھر کچن صاف کیا۔ جالی سے باہر جھانکا فرہاد ابھی بھی فون پر ہی مصروف تھا۔ اس نے دو کپ چائے تیار کر کے ٹرے میں رکھی اور ایک بار پھر سے لاؤنج میں آگئی۔ فرہاد شاید بھول گیا تھا کہ اسے کسی کام سے جانا تھا اور کچھ دیر قبل وہ خاصی جلدی میں تھا۔

زینب بیانو کے خود ناشتا کرنے میں مصروف ہوگئی۔ پراٹھا ختم کر کے اس نے چائے پی اور پھر اپنے برتن اٹھا کر کچن میں آگئی۔ فرہاد کی چائے واپس کیتلی میں انڈیل دی۔ اسے فرہاد اور یاسمین آپا کی گفتگو سننے میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ کچن بند کر کے وہ باہر آئی تو فرہاد فون رکھ چکا تھا۔

"تم نے مجھے بتایا ہی نہیں کہ فضا بھابھی بھی واپس آگئی ہیں۔"

فون بند کرتے ہی اس کی توپوں کا رخ زینب کی جانب مڑ گیا۔

"مجھے ان کی واپسی کا علم ہوتا تو یقیناً" آپ کو بھی ضرور بتاتی اور ویسے بھی مجھے آپ کی بھابھی کے شیڈول سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔" زینب کے منہ کے بگڑے زاویہ نے فرہاد کو تپا دیا۔

"ظاہر ہے تمہاری دلچسپی صرف اپنے لوگوں تک ہی محدود ہے۔"

فرہاد کسی بھی طور مقابلے میں پیچھے رہنا نہ جانتا تھا۔

"میں نجومی نہیں ہوں فرہاد اور مجھے کسی بھی آمدورفت کا علم اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ بتایا نہ جائے اور اطلاعاً" عرض ہے مجھے فضا بھابھی نے اپنی واپسی کی کوئی خبر نہیں دی۔" جواب دیتے ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بہرحال آپا نے کہا ہے کہ ہمیں ان سے ملنے جانا چاہیے تو ایسا کرو تم شام میں تیار رہو جانا ہم جا کر مل آئیں گے۔"

"معذرت کے ساتھ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ آپ خود جا کر ہو آئیں۔" فرہاد کی باتوں نے زینب کے اچھے بھلے موڈ کو خاصا خراب کر دیا تھا۔

"جیسی تمہاری مرضی۔"

چائے کا آخری گھونٹ بھر کر اس نے کپ واپس ٹرے میں رکھ دیا۔ زینب اندر کمرے میں آگئی۔ اسے محسوس ہوا وہ اگر مزید وہاں رہی تو ضرور فرہاد سے الجھ جائے گی۔

"بہرحال اب اگر فرہاد نے مجھ سے فضا بھابھی کے گھر جانے کے لیے کہا تو صاف انکار کر دوں گی۔"

اسے سخت غصہ آیا۔ اتنی دور بیٹھی یاسمین آپا کو ان کی واپسی کا علم ہو گیا اور یہاں فضا بھابھی نے بتانے کی زحمت نہ کی 'میں تو فرہاد کو صاف منع کر دوں گی کہ جب انہوں نے ہمیں خود اپنے آنے کی اطلاع نہیں دی تو ہمارے ملنے جانے کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ وہ رات تک یہ ہی ارادہ باندھتی رہی 'مگر فرہاد کے گھر آتے ہی اس کے تمام ارادے چکنا چور ہوگئے۔

"یہ کچھ سامان ہے جو تمہارے لیے صباحت بھابھی نے بھیجا ہے۔ فضا بھابھی بھی تمہارے اور بچوں کے تحائف دے رہی تھیں 'لیکن پھر بولیں میں خود جب ملنے آؤں گی تو لیتی آؤں گی۔"

اندر داخل ہوتے ہی فرہاد نے ایک شاپر اس کی جانب بڑھایا۔ جسے خاموشی سے تھام کر زینب نے بنا دیکھے ہی

قریب موجود چھوٹی سی لکڑی کی ٹیبل پر رکھ دیا۔

"کھانا گرم کر دوں؟" حلق میں آئے آنسو بمشکل نگلتے ہوئے وہ آہستہ سے بولی۔

"نہیں میں کھا کر آیا ہوں اور یہ کھول کر دیکھ تو لو بھابھی نے کیا بھیجا ہے۔" اس کا اشارہ یقیناً" ٹیبل پر رکھے شاپر کی جانب تھا۔

"ابھی فارغ ہو کر دیکھوں گی۔" وہ لڑنے کے موڈ میں بالکل نہ تھی۔

"ناشکری عورت۔۔۔"

کمرے کی جانب بڑھتے ہوئے فرہاد طنزاً" بڑبڑایا 'زینب نے بالکل اگنور کر دیا۔ فرہاد کا موڈ جانے کیوں آج صبح سے ہی خراب تھا اور جب کبھی ایسا ہوتا وہ بہانے بہانے سے لڑنے کی کوشش کرتا جسے آج صبح سے ہی کئی بار کر چکا تھا۔ اس وقت زینب کا کمرے میں جانا بھی جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ وہ وہیں لاؤنج میں موجود ٹی وی کے سامنے بیٹھ گئی 'جہاں کوئی پاکستانی فلم آرہی تھی۔ فلم ختم ہوتے ہوتے رات کے تین بج گئے۔ زینب نے ٹی وی بند کر کے ایک نظر کمرے کے بند دروازے پر ڈالی۔ فرہاد یقیناً" سو چکا تھا۔ وہ آہستہ آواز میں دروازہ کھول کر کمرے میں آئی اور خاموشی سے بیڈ کے کنارے ٹک کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔

☼ ☼ ☼

اسکول سے باہر نکلتے ہی اس کی نگاہ روڈ کے دوسری جانب پڑی جہاں فٹ پاتھ پر دو عجیب لوفر سے نوجوان کھڑے تھے۔ جن میں سے ایک یقیناً" شوکا تھا۔ "یہ یہاں کیا کر رہا ہے۔"

شوکے پر نظر پڑتے وہ زیر لب بڑبڑائی 'ساتھ ہی مارے خوف کے اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے قدموں سے جان ہی نکل گئی ہو آج ارم بھی اسکول نہیں آئی تھی اور اب گھر واپسی کا تقریباً" پندرہ منٹ کا سفر اسے اکیلے ہی طے کرنا تھا۔ اس نے اپنے گرد اچھی طرح دوپٹا لپیٹا اور ہمت باندھتی ہوئی روڈ کراس کی 'شوکے' کے قریب سے گزرتی ہوئی وہ مین روڈ پر آگئی۔ اس سے آگے پیچھے اسکول کی کچھ اور لڑکیاں بھی اپنے گھروں کو رواں دواں تھیں۔ ویسے بھی یہ روڈ خاصی بارونق ہوا کرتی تھی۔ اصل مسئلہ تو اپنی گلی کا تھا 'جو ہر ٹائم ہی مکمل طور پر سنسان ہوتی۔ تیز تیز چلتے اسے سانس چڑھ گیا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جسے شوکا بھی اس کے پیچھے ہی آرہا ہو۔ تقریباً" دس منٹ بعد وہ اپنے گھر جانے والی پتلی سی گلی کی جانب مڑ گئی۔ جب اچانک تیز تیز چلتا شوکا اس کے بالکل سامنے آگیا۔

"سوہنیو تسی میرے سے اتنا ڈرتے کیوں ہو۔"

اپنے گندے پیلے دانتوں کی نمائش کرتا ہوا وہ اک ادا سے بولا۔

"تمہیں ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے 'ورنہ مجھے کیا ضرورت پڑی ہے جو تم سے ڈروں۔"

اپنے کپکپاتے لہجہ پر قابو پاتے ہوئے وہ ذرا زور سے بولی۔

"ہاہاہا۔۔۔ اچھا۔"

ایسے جیسے شوکے نے اس کے جواب کو خوب انجوائے کیا۔

"پھر اتنا بھاگ بھاگ کر گھر کیوں جا رہی ہو 'میں تمہیں کھا تھوڑی جاؤں گا۔" وہ اس کے مزید قریب ہوا۔

"میرے آگے سے ہٹو۔۔۔"

وہ چلائی اور تیز تیز چلتی آگے بڑھ گئی۔ تین گھر چھوڑ کر چوتھا اس کا تھا۔ بھاگتی ہوئی گھر کی دہلیز عبور کرتی۔ جیسے ہی وہ اندر داخل ہوئی سامنے ہی صحن میں اماں کھڑی تھیں۔ اس کی سانس ابھی تک بحال نہ ہوئی تھی۔

"کیا ہوا تمہیں 'کیوں اتنا گھبرائی ہوئی ہو۔"

اس کے چہرے پر اڑتی ہوائیاں انہیں دور سے ہی دکھائی دے گئیں۔

"کچھ نہیں گرمی لگ رہی ہے۔"

منہ پر آیا پسینہ دوپٹے سے پونچھتی وہ اندر چل دی۔ اماں نے بالٹی میں رکھا آخری کپڑا تار پر ڈالا اور اس کے پیچھے پیچھے کمرے میں آگئیں۔

"تم نے کھانا نہیں کھانا۔" وہ ہمیشہ گھر آکر کھانے کا شور مچایا کرتی تھی۔

"بھوک نہیں ہے۔"

شوکے کی آج والی حرکت نے اس کی بھوک پیاس سب ختم کردی تھی۔ مارے خوف کے ابھی تک اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔

"تمہیں شوکے نے کچھ کہا ہے؟"

اماں یک دم اس کے سامنے آن کھڑی ہوئیں۔ ان کی آنکھوں میں لرزتی خوف کی پرچھائیاں اسے صاف محسوس ہو رہی تھیں۔

"آپ کو کیسے پتا چلا؟"

اپنی ماں کے اس قدر درست اندازے نے اسے حیران کردیا۔ اسے سوچنے پر بھی یاد نہ آیا کہ اس نے اماں سے کبھی شوکے کا کوئی ذکر کیا ہو۔ پھر اماں نے اس سے ایسا سوال کیوں کیا۔ وہ حیرت زدہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوگئی۔ "اماں آپ کو شوکے کا کس نے بتایا۔"

"میں ماں ہوں تمہاری' مجھے تمہارے ہر عمل پر نظر رکھنا پڑتی ہے اور یہ میری ذمہ داری ہے بارش والے دن تمہارا خوف کے مارے دروازے سے واپس پلٹ آنا میں ابھی تمہیں بھولی' پھر ایک' دو دفعہ تم سے سرزد ہونے والی حرکات نے مجھ پر واضح کیا کہ تم شوکے سے خوف زدہ ہو گیا میں غلط کہہ رہی ہوں۔"

انہوں نے مسلسل اسے گھورتے ہوئے دریافت کیا۔ ان کی آواز بھی شاید ہلکی سا کپکپا رہی تھی۔

"وہ بہت بدتمیز لڑکا ہے' بنا کسی رسپانس کے جانے کیوں مجھے تنگ کررہا ہے۔"

"میں اس کے گھر جاکر اس کی ماں سے بات کروں گی' آخر یہ پورا محلہ بچپن سے مجھے جانتا ہے۔ ایک عزت ہے میری اس محلے میں پھر کس طرح محلہ کا کوئی اوباش نوجوان میری بچی کو اس طرح تنگ کرسکتا ہے۔"

چھوڑ دیں اماں' آپ کسی سے کوئی بات نہیں کریں گی' ایسا نہ ہو آپ کے منہ سے نکلنے والی کوئی بات بلا سبب مجھے اس محلے میں بدنام کرنے کا باعث بن جائے اور ویسے بھی جو اولاد اپنے ماں' باپ سے ڈرتی ہو یا ان کا عزت و احترام کرتی ہو وہ شوکے جیسی نہیں ہوتی۔"

وہ درست کہہ رہی تھی اماں کی سمجھ میں اس کی بات آگئی۔

"پھر بتاؤ بھلا اس مسئلہ کو کیسے حل کروں' ہماری خاموشی تو اس بدمعاش کو مزید شہ دے گی وہ ہمیں مجبور اور بے بس سمجھ کر مزید شیر ہوگا۔" بے بسی اماں کے لہجہ میں در آئی۔

"کچھ نہیں ہوتا اماں اللہ پر بھروسا رکھیں۔" وہ ماں کو مزید خوف زدہ نہ کرنا چاہتی تھی۔

"کھانا گرم کریں' میں یونیفارم تبدیل کرکے آرہی ہوں۔" ماں کا دھیان شوکے سے ہٹانا اس وقت اشد ضروری تھا۔

"اچھا۔"

اماں نے اس پر ایک گہری نظر ڈالی اور کچن کی جانب چل دیں۔

☆ ☆ ☆

"بس بھائی صاحب آپ خود ہمارے گھر آگئے۔ ہمارے لیے اتنا ہی کافی ہے۔"

ماموں نے ہاتھ اٹھا کر ممانی کو مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔ ایشال نے اپنی کتنی دیر سے روکی ہوئی سانس بحال کی۔ اسے خدشہ تھا کہیں ممانی اس موقع پر اس کے سابقہ نکاح کا حوالہ دے کر کوئی بات خراب نہ کردیں' مگر ماموں جان کی بروقت مداخلت نے اس کا یہ خدشہ فوراً" دور کردیا۔ ایشال کے ساتھ ساتھ مما کے چہرے پر بھی اطمینان سا پھیل گیا۔

"پھر میں آپ کی طرف سے ہاں سمجھوں؟"

پاپا کی طویل خاموشی کو محسوس کرتے ہی مما فوراً" اپنے مطلب کی بات پر آتے ہوئے بولیں۔ ایشال نے بغور پاپا کی جانب تکا' ان کے چہرے پر پھیلی الجھن وہ واضح طور پر محسوس کرسکتا تھا۔

"میں تو پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ بھائی صاحب کی آمد کے بعد اب مزید کسی شک و شبہ یا انکار کی گنجائش باقی نہیں رہی' پھر بھی میں اپنی تسلی کے لیے چاہوں گا کہ۔۔۔"

ماموں جان کی بات درمیان میں ہی رہ گئی۔ پاپا کے سیل کی مخصوص آواز نے کمرے میں ایک ارتعاش سا پیدا کردیا۔

"ایکسکیوزمی۔۔۔"

پاپا نے فون کی اسکرین پر ایک نظر ڈالی اور اسے ہاتھ میں لیتے ہوئے فوراً" اٹھ کھڑے ہوئے۔

"میرا ضروری فون ہے۔"

یس کا بٹن دبا کر فون کان سے لگاتے انہوں نے وضاحت کی اور پھر اسی طرح ٹیرس میں نکلنے والے دروازے سے باہر نکل گئے۔ مما نے جیسے شکر کا سانس لیا۔ انہیں خدشہ تھا کہیں پاپا اپنی اس شرط کا ذکر نہ کردیں جو انہوں نے ایشال کے سامنے اس کے نکاح کے حوالے سے رکھی تھی۔

"اریشہ بیٹا صفیہ کے ساتھ مل کر کھانا لگاؤ۔" ممانی نے آواز لگائی۔

"نہیں بھابھی اب ہم چلیں گے۔ ملک صاحب کو کہیں ضروری کام سے جانا ہے۔"

پاپا نے یہاں آنے سے قبل ہی وضاحت کردی تھی کہ انہیں جلد واپس گھر آنا ہے' کیونکہ آج شاید ان کی کوئی ضروری میٹنگ تھی۔ مما کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ وہ ان کے ساتھ اریشہ کا رشتہ مانگنے' ان کے بھائی کے گھر آگئے۔ حقیقت میں یہ وہ عمل تھا جس کی انہیں ملک صاحب سے اپنی زندگی میں کم از کم ایک فیصد بھی امید نہ تھی۔ مگر شاید اللہ تعالیٰ جو کچھ نصیب میں لکھ دیتا ہے وہ اسی طرح پورا ہوا کرتا ہے۔

"اپنے پاپا کو بلاؤ' گھر چلیں دیر ہو رہی ہے۔"

مما نے ہاتھ میں پکڑا خالی گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے ایشال کو اشارہ کیا۔ ایشال فوراً" سے بیشتر اٹھ کھڑا ہوا۔ لاؤنج کا دروازہ کھول کر اس نے ٹیرس میں جھانکا۔ پاپا ریلنگ سے ٹیک لگائے کھڑے تھے۔ فون جانے کب کا بند ہوچکا تھا۔ اب وہ اپنی ہی کسی سوچ میں گم تھے۔ جب انہیں ایشال نے پکارا۔

"پاپا۔۔۔"

وہ یک دم چونکے۔

"آجائیں مما بلا رہی ہیں' گھر جانا ہے۔"

"اچھا۔۔۔" اثبات میں گردن ہلاتے وہ ایشال کے پیچھے ہی واپس آگئے وہ بے حد پریشان تھے۔ جس کا اندازہ ان کے چہرے کو دیکھ کر بخوبی لگایا جاسکتا تھا۔ مگر اپنی خواہش کے حصول میں مگن ہر شخص انہیں جان بوجھ کر نظر انداز کیے جارہا تھا۔ شاید اپنی کامیابی اور خوشی کے لیے دوسروں کا حق چھیننا ہی زندگی ہے' ملک صاحب نے تو اس تمام

اس کے چہرے پر اڑتی ہوائیاں انھیں دور سے ہی دکھائی دے گئیں۔
"کچھ نہیں گرمی لگ رہی ہے۔"
منہ پر آیا پسینہ دوپٹے سے پونچھتی وہ اندر چل دی۔ اماں نے بالٹی میں رکھا آخری کپڑا تار پر ڈالا اور اس کے پیچھے پیچھے کمرے میں آگئیں۔
"تم نے کھانا نہیں کھانا۔" وہ ہمیشہ گھر آکر کھانے کا شور مچایا کرتی تھی۔
"بھوک نہیں ہے۔"
شوکے کی آج والی حرکت نے اس کی بھوک پیاس سب ختم کردی تھی۔ مارے خوف کے ابھی تک اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔
"تمہیں شوکے نے کچھ کہا ہے؟"
اماں یک دم اس کے سامنے آن کھڑی ہوئیں۔ ان کی آنکھوں میں لرزتی خوف کی پرچھائیاں اسے صاف محسوس ہو رہی تھیں۔
"آپ کو کیسے پتا چلا؟"
اپنی ماں کے اس قدر درست اندازنے اسے حیران کردیا۔ اسے سوچنے پر بھی یاد نہ آیا کہ اس نے اماں سے کبھی شوکے کا کوئی ذکر کیا ہو۔ پھر اماں نے اس سے ایسا سوال کیوں کیا۔ وہ حیرت زدہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوگئی۔ "اماں آپ کو شوکے کا کس نے بتایا۔"
"میں ماں ہوں تمہاری' مجھے تمہارے ہر عمل پر نظر رکھنا پڑتی ہے اور یہ میری ذمہ داری ہے بارش والے دن تمہارا خوف کے مارے دروازے سے واپس پلٹ آنا میں ابھی نہیں بھولی' پھر ایک' دو دفعہ تم سے سرزد ہونے والی حرکات نے مجھ پر واضح کیا کہ تم شوکے سے خوف زدہ ہو' کیا میں غلط کہہ رہی ہوں۔"
انہوں نے تسلسل اسے گھورتے ہوئے دریافت کیا۔ ان کی آواز بھی شاید ہلکی سا کپکپا رہی تھی۔
"وہ بہت بدتمیز لڑکا ہے' بنا کسی رسپانس کے جانے کیوں مجھے تنگ کر رہا ہے۔"
"میں اس کے گھر جاکر اس کی ماں سے بات کروں گی' آخر یہ پورا محلہ بچپن سے مجھے جانتا ہے۔ ایک عزت ہے میری اس محلے میں پھر کس طرح محلہ کا کوئی اوباش نوجوان میری بچی کو اس طرح تنگ کر سکتا ہے۔"
چھوڑ دیں اماں' آپ کسی سے کوئی بات نہیں کریں گی' ایسا نہ ہو آپ کے منہ سے نکلنے والی کوئی بات بلاسبب مجھے اس محلے میں بدنام کرنے کا باعث بن جائے اور ویسے بھی جو اولاد اپنے ماں' باپ سے ڈرتی ہو یا ان کا عزت و احترام کرتی ہو وہ شوکے جیسی نہیں ہوتی۔"
وہ درست کہہ رہی تھی اماں کی سمجھ میں اس کی بات آگئی۔
"پھر بتاؤ بھلا اس مسئلہ کو کیسے حل کروں' ہماری خاموشی تو اس بدمعاش کو مزید شہ دے گی وہ ہمیں مجبور اور بے بس سمجھ کر مزید شیر ہوگا۔" بے بسی اماں کے لہجہ میں در آئی۔
"کچھ نہیں ہوتا اماں اللہ پر بھروسا رکھیں۔" وہ ماں کو مزید خوف زدہ نہ کرنا چاہتی تھی۔
"کھانا گرم کریں' میں یونیفارم تبدیل کرکے آرہی ہوں۔" ماں کا دھیان شوکے سے ہٹانا اس وقت اشد ضروری تھا۔
"اچھا۔"
اماں نے اس پر ایک گہری نظر ڈالی اور کچن کی جانب چل دیں۔

☆ ☆ ☆

"بس بھائی صاحب آپ خود ہمارے گھر آگئے۔ ہمارے لیے اتنا ہی کافی ہے۔"
ماموں نے ہاتھ اٹھا کر ممانی کو مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔ ایشال نے اپنی کئی دیر سے رکی ہوئی سانس بحال کی۔ اسے خدشہ تھا کہیں ممانی اس موقع پر اس کے سابقہ نکاح کا حوالہ دے کر کوئی بات خراب نہ کردیں' مگر ماموں جان کی بروقت مداخلت نے اس کا یہ خدشہ فوراً" دور کردیا۔ ایشال کے ساتھ ساتھ مما کے چہرے پر بھی اطمینان سا پھیل گیا۔
"پھر میں آپ کی طرف سے ہاں سمجھوں؟"
پاپا کی طویل خاموشی کو محسوس کرتے ہی مما فوراً" اپنے مطلب کی بات پر آتے ہوئے بولیں۔ ایشال نے بغور پاپا کی جانب تکا' ان کے چہرے پر پھیلی الجھن وہ واضح طور پر محسوس کر سکتا تھا۔
"میں تو پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ بھائی صاحب کی آمد کے بعد اب مزید کسی شک و شبہ یا انکار کی گنجائش باقی نہیں رہی' پھر بھی میں اپنی تسلی کے لیے چاہوں گا کہ۔۔۔"
ماموں جان کی بات درمیان میں ہی رہ گئی۔ پاپا کے سیل کی مخصوص آواز نے کمرے میں ایک ارتعاش سا پیدا کردیا۔
"ایکسکیوزمی۔۔۔"
پاپا نے فون کی اسکرین پر ایک نظر ڈالی اور اسے ہاتھ میں لیتے ہوئے فوراً" اٹھ کھڑے ہوئے۔
"میرا ضروری فون ہے۔"
یس کا بٹن دبا کر فون کان سے لگاتے انہوں نے وضاحت کی اور پھر اسی طرح ٹیرس میں نکلنے والے دروازے سے باہر نکل گئے۔ مما نے جیسے شکر کا سانس لیا۔ انہیں خدشہ تھا کہیں پاپا اپنی اس شرط کا ذکر نہ کردیں جو انہوں نے ایشال کے سامنے اس کے نکاح کے حوالے سے رکھی تھی۔
"اریشہ بیٹا صفیہ کے ساتھ مل کر کھانا لگاؤ۔" ممانی نے آواز لگائی۔
"نہیں بھابھی اب ہم چلیں گے۔ ملک صاحب کو کہیں ضروری کام سے جانا ہے۔"
پاپا نے یہاں آنے سے قبل ہی وضاحت کردی تھی کہ انہیں جلد واپس گھر آنا ہے' کیونکہ آج شاید ان کی کوئی ضروری میٹنگ تھی۔ مما کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ وہ ان کے ساتھ اریشہ کا رشتہ مانگنے' ان کے بھائی کے گھر آگئے۔ حقیقت میں یہ وہ عمل تھا جس کی انہیں ملک صاحب سے اپنی زندگی میں کم از کم ایک فیصد بھی امید نہ تھی۔ مگر شاید اللہ تعالیٰ جو کچھ نصیب میں لکھ دیتا ہے وہ اسی طرح پورا ہوا کرتا ہے۔
"اپنے پاپا کو بلاؤ' گھر چلیں دیر ہو رہی ہے۔"
مما نے ہاتھ میں پکڑا خالی گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے ایشال کو اشارہ کیا۔ ایشال فوراً" سے بیشتر اٹھ کھڑا ہوا۔ لاؤنج کا دروازہ کھول کر اس نے ٹیرس میں جھانکا۔ پاپا ریلنگ سے ٹیک لگائے کھڑے تھے۔ فون جانے کب کا بند ہوچکا تھا۔ اب وہ اپنی ہی کسی سوچ میں گم تھے۔ جب انھیں ایشال نے پکارا۔
"پاپا۔۔۔"
وہ یک دم چونکے۔
"آجائیں مما بلا رہی ہیں' گھر جانا ہے۔"
"اچھا۔۔۔" اثبات میں گردن ہلاتے وہ ایشال کے پیچھے ہی واپس آگئے وہ بے حد پریشان تھے۔ جس کا اندازہ ان کے چہرے کو دیکھ کر بخوبی لگایا جاسکتا تھا۔ مگر اپنی خواہش کے حصول میں مگن ہر شخص انہیں جان بوجھ کر نظرانداز کیے جارہا تھا۔ شاید اپنی کامیابی اور خوشی کے لیے دوسروں کا حق چھیننا ہی زندگی ہے' ملک صاحب نے تو اس تمام

عمل سے یہ ہی نتیجہ اخذ کیا۔ جس سے وہ خاصے مایوس بھی ہوئے۔

"ہم چاہتے ہیں' آپ کوئی قریبی تاریخ دیکھ کر نکاح کی تقریب رکھ لیں' کیونکہ ایشال نے لندن واپس جانا ہے اور میں چاہتا ہوں اریشہ بھی اس کے ساتھ ہی چلی جائے۔"

اپنے لہجہ کو حتی الامکان نرم بناتے ہوئے پاپا نے ایشال پر ایک نظر ڈالی۔ پاپا کے اس فیصلے کا علم بھی انہیں یہاں آکر ہی ہوا۔ ورنہ وہ تو سمجھا تھا کہ اس کے لندن شفٹ ہوجانے والی دھمکی نے پاپا کو اس رشتہ پر رام کیا ہے۔ اس کا یہ خیال بھی دوسرے تمام خیالوں کی طرح غلط ثابت ہوا۔ اسے اندازہ ہوا اس کی سوچ ہمیشہ ہی غلط رہی ہے۔

"اچھا ہم تو سمجھے اب وہ آپ کے ساتھ کاروبار سنبھالے گا۔ ہمیں تو نہیں پتا کہ وہ لندن واپس جائے گا۔" ممانی نے حیرت کے عالم میں مما پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"ممانی یہ فیصلہ میرا ہے۔ مجھے لندن جاکر اپنا فیشن ڈیزائننگ کا ڈپلومہ مکمل کرنا ہے اور ایشال نے میرے کہنے پر وہاں اپلائی کیا تھا۔ اسے اچھی جاب مل گئی ہے۔"

ایشال کی مدد کے لیے فوراً" اریشہ اس کے ساتھ آن کھڑی ہوئی اور اس میں کوئی مبالغہ آمیزی بھی نہیں تھی۔

"جیسے بچوں کا دل چاہے یہ زندگی گزاریں' ہم اور آپ کون ہوتے ہی اعتراض کرنے والے۔" ماموں کے ان الفاظ نے ایشال کو خاصا حوصلہ دیا۔ "آپ یہ مٹھائی رشتہ داروں میں بانٹ دیجیے گا' تاکہ سب کو علم ہوجائے کہ ہم نے ایشال اور اریشہ کا رشتہ پکا کردیا ہے۔"

مما نے اریشہ کو خود سے لگا کر پیار کرتے ہوئے ممانی کو ہدایت دی۔ اس ہدایت کا کیا مقصد تھا۔ شاید پاپا سمجھ چکے تھے اسی لیے وہ اپنی پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالے خاموشی سے آگے بڑھ گئے۔ اپنی خوشیوں میں مگن کسی بھی فرد نے ان کی خاموشی کو محسوس ہی نہیں کیا۔

☼ ☼ ☼
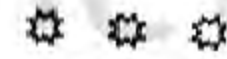
وہ جیسے ہی اندر داخل ہوئیں سامنے نظر آنے والے منظر نے انہیں اپنی جگہ بالکل ساکت کردیا۔ حبیبہ' شاہ زین کے انتہائی قریب کھڑی دور سے ہی خاصی شاداں و فرحاں دکھائی دے رہی تھی۔ شاہ زین جانے اسے ایسا کیا سنا رہا تھا کہ ہنسی اس کے لبوں سے پھوٹی پڑ رہی تھی اور ایسے میں وہ پہلے سے بھی کہیں زیادہ حسین دکھائی دے رہی تھی۔ جانے کیوں انہیں یہ منظر خاصا ناگوار لگا۔ انہوں نے آفس کے ہال پر چاروں طرف ایک طائرانہ نگاہ دوڑائی' دونوں کمپیوٹر آپریٹر اپنے اپنے کمپیوٹرز پر بری طرح بزی تھے۔ عمر صاحب کی ٹیبل خالی تھی۔ وہ تیزی سے آگے بڑھی ہی تھیں کہ اچانک ہی کرن جانے کس سمت سے نکل کر ان کے سامنے آگئی۔ وہ ٹھٹک کر اپنی جگہ رک گئیں۔

"السلام علیکم میم! کیسی ہیں آپ۔" کرن ان سے خاصی بے تکلف تھی۔

"وعلیکم السلام۔"

ابھی بھی وہ دونوں ان کی نگاہوں کی زد میں تھے جب اچانک حبیبہ کی نگاہ ان پر پڑ گئی۔ اس کے مسکراتے لب یک دم بھینچ گئے۔ اس کے خاموش ہوتے ہی شاہ زین نے پلٹ کر دیکھا اور مما کو کرن سے بات کرتا دیکھ کر مسکراتا ہوا ان کے قریب آگیا۔

"ارے پاپا تو ابھی کسی کام سے باہر گئے ہیں۔ آپ کی ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔" وہ سمجھا شاید مما' پاپا کے پاس آئی ہیں۔

"اچھا۔ میں نے کہا تو تھا میرا ویٹ کریں' مگر شاید مجھے راستہ میں ٹریفک کے باعث کچھ زیادہ ہی دیر ہوگئی' خیر کوئی بات نہیں' مجھے علم ہے وہ کہاں گئے ہیں۔"

"السلام علیکم۔" جانے کب حبیبہ' شاہ زین کے بالکل قریب آکھڑی ہوئی' انہیں پتا ہی نہ چلا۔

"وعلیکم السلام۔" جواب کے ساتھ ہی انہوں نے ایک گہری نگاہ اس پر ڈالی۔

"مما یہ حبیبہ ہے۔ آپ جانتی ہیں نا اور حبیبہ یہ میری مما۔"

اس موقع پر شاہ زین نے انہیں متعارف کروانا ضروری سمجھا۔

"میں جانتی ہوں' تم سے کئی بار ذکر سن چکی ہوں۔"

شاید وہ کچھ دیر قبل والی ناگوار کیفیت سے باہر نکل آئی تھیں۔

"تم آؤ کسی دن کرن کے ساتھ ہمارے گھر' یہ تو اکثر آجاتی ہے۔" ان کی خود پر پڑنے والی گہری نظروں نے حبیبہ کو کچھ کنفیوز سا کردیا۔

"جی ضرور۔"

حبیبہ کو شاید ان کے اس طرح بات کرنے کی امید نہ تھی ویسے بھی وہ کرن سے ان کے پر غرور رویہ کے بارے میں خاصا کچھ سن چکی تھی۔ جبکہ اس وقت وہ ایسی بالکل دکھائی نہ دے رہی تھیں۔

"چلو میں چلتی ہو تمہاری آپا کے لیے کچھ سامان بھیجنا ہے۔ ان کی ایک دوست آئی ہوئی ہے اور آج شام کی فلائٹ سے اس کی واپسی بھی ہے اور آج ہی میرا اسے ہر حال میں سامان پہنچانا اشد ضروری ہے۔" وہ وہیں سے واپس مڑ گئیں۔

"شاید دو ماہ تک آپا بھی کراچی آئیں تو میں تمہیں ان سے ضرور ملواؤں گا۔ مجھے امید ہے ان سے مل کر تمہیں بہت اچھے لگے گا' کیونکہ وہ بہت ہی اچھی ہیں' نہایت لیونگ اور دوسروں کا خیال رکھنے والی۔"

"اچھا۔"

مختصر سا جواب دے کر حبیبہ کرن کی جانب بڑھ گئی' جبکہ شاہ زین اسے وہیں کھڑا دیکھتا رہا۔

☼ ☼ ☼

"ایک بات پوچھوں بیٹا۔" مٹر چھیلتے چھیلتے سکینہ کو جانے کیا یاد آگیا۔

"جی آنٹی ضرور پوچھیں' ویسے بھی مجھ سے کچھ پوچھنے کے لیے آپ کو اس طرح اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے۔"

تیزی سے کاغذ پر قلم چلاتے ہوئے اس کا ہاتھ یک دم رک گیا۔

"تمہارے پاس ایشال صاحب کا نمبر نہیں ہے؟"

سکینہ کا سوال خاصا غیر متوقع تھا۔ وہ حیران سی رہ گئی۔

"مطلب۔"

وہ ناسمجھی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

"مطلب ان کا فون نمبر وغیرہ۔"

"آپ اچھی طرح جانتی ہیں۔ آنٹی میں نے اس سے کبھی رابطہ نہیں کیا تو پھر فون نمبر ہونے کا کیا جواز بنتا ہے۔"

"پھر بھی نمبر ہونا تو چاہیے۔ آخر اتنا حق تو تمہارا بنتا ہے۔"

"مجھے اس قسم کے حق جتانے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ویسے بھی اگر اسے میری کبھی کوئی ضرورت ہوتی تو

اتنے سالوں میں کم از کم ایک آدھ بار مجھ سے رابطہ ضرور کرتا اور یہ سب اس کے لیے اتنا مشکل نہ تھا۔"
مطلب وہ سب کچھ جانتی تھی' سکینہ چور سی بن گئی۔

"ویسے آپ کو آج یہ خیال آیا کیسے؟" سکینہ کو خاموش دیکھ کر اس نے ایک بار پھر بات شروع کی۔

"دراصل بیٹا میرا دل چاہتا ہے کہ اتنے سالوں قبل شروع ہونے والا یہ آنکھ مچولی کا کھیل اب ختم ہو جانا چاہیے۔" ان کا اشارہ یقیناً" اس کے نکاح کی جانب تھا۔

"تمہیں کوئی ایک فیصلہ کر لینا چاہیے۔ کتنے سالوں سے تم ایشال کے نام پر بیٹھی ہو اور جانے کب تک یوں ہی بیٹھی رہو گی۔" سکینہ نے اپنی آواز کو مزید آہستہ کیا۔

"تمہیں اپنی زندگی کے بارے میں خود فیصلہ کرنا ہوگا۔ آر یا پار۔۔۔ ورنہ اس طرح تمہاری ساری زندگی یوں ہی گزر جائے گی اور جانتی ہو لڑکیوں کی ایک عمر ہوتی ہے جب انہیں اپنے گھر بار کا ہو جانا چاہیے اور اگر آج تمہاری عمر نکل گئی تو ہمیشہ یوں ہی تنہا زندگی گزر جائے گی اور کسی عورت کے لیے تنہا زندگی سے بڑھ کر کوئی دوسرا عذاب نہیں ہوتا۔"

سکینہ آج اسے ہر بات سمجھا دینا چاہتی تھی۔

"پھر آپ کے خیال میں مجھے کیا کرنا چاہیے۔" اس نے ہاتھ میں پکڑے قلم پر کیپ لگا کر ایک سائیڈ پر رکھ دیا۔ اب وہ مکمل طور پر سکینہ کی طرف متوجہ ہو چکی تھی۔

"ایشال سے بات کرو' اگر وہ رخصتی پر آمادہ ہے تو ٹھیک۔۔۔ ورنہ کوئی اور اچھا لڑکا دیکھ کر شادی کرو اور اپنا گھر بساؤ۔"

سکینہ نے جان بوجھ کر طلاق کا لفظ استعمال نہ کیا۔

"میں ایسا نہیں کر سکتی۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"جانتی ہیں میری ماں کے ایک غلط فیصلے نے انہیں ساری زندگی تپتے ریگستان میں برہنہ پاؤں گزار کر تھا۔ جس نے ان کے پاؤں آبلہ پا کر دیے۔۔۔ مگر اس طرح کہ وہ اپنا دکھ اور تکلیف کسی سے کہنے کے قابل بھی نہ رہیں۔ کیونکہ انہوں نے خود اپنے تمام رشتوں کو کھو دیا تھا' مگر میں ایسا نہیں کروں گی۔ مجھے اپنی ماں کے دامن پر لگا داغ دھونا ہے۔ وہ لوگ جو مجھے میری ماں کے حوالے سے شاید ایک بد کردار لڑکی سمجھتے ہیں' انہیں بتانا ہے کہ میری طرح میری ماں بھی ایک معصوم عورت تھی۔ جس کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ حالات کی سنگینی نہ برداشت کر سکی اور مردوں کے اس معاشرے میں ایک مرد سے بھی لینے والے انتقام نے اس کو انجانے میں تباہ کر دیا۔" اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

"تو پھر تم کیا ساری زندگی اسی طرح گزار دو گی۔"

"جو بھی ہے آنٹی میں ایشال سے کبھی اور کسی بھی صورت۔۔۔ طلاق نہیں۔۔ لے سکتی۔ چاہے اسی طرح اپنی عمر کی تمام بہاریں دیکھ کر میں خزاں رسیدہ ہو جاؤں۔ مگر میں کسی اور سے شادی کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔" اس کا لہجہ حتمی تھا۔

"یہ پھر تمہاری خود اپنے ساتھ زیادتی ہو گی۔"

"آپ بس میرے لیے دعا کیا کریں۔"

وہ دوبارہ سے ہاتھ میں قلم تھام کر اپنے کام میں دوبارہ مصروف ہو گئی۔ اس پل سکینہ کو اس چھوٹی سی معصوم لڑکی پر اس قدر ترس آیا کہ اگر جو اس کے بس میں ہوتا وہ دنیا بھر کی خوشیاں اس کے قدموں میں ڈھیر کر دیتی۔ مگر یہ سب کچھ اس کے اختیار میں نہ تھا۔

☼ ☼ ☼

"تم نے وجاہت کا رشتہ کہیں طے کیا۔ مطلب اس کی شادی کی یا ابھی بھی کنوارا ہی ہے۔"

آج کئی ماہ بعد خالدہ خالہ کو جانے کیوں وجاہت کا خیال ایک دم پھر سے آگیا۔ رابعہ بھی سن کر حیران ضرور ہوئی۔ مگر بولی کچھ نہیں۔ "وہ تو پچھلے چار ماہ سے دبئی میں ہیں کسی بڑی کنسٹرکشن کمپنی میں انہیں کام مل گیا تھا جو ابھی تک مکمل نہیں ہوا۔"

رابعہ نے خالہ کے بیٹھنے کے لیے کرسی باہر برآمدے میں رکھتے ہوئے انہیں مکمل تفصیل سے آگاہ کیا۔

"چلو اچھا ہوا۔۔۔ وہاں تو سنا ہے پیسہ بھی بہت ہے۔" خالہ نے برقعہ اتار کر کرسی کی پشت پر ڈال دیا۔

"میں کھانا کھاؤں گی۔"

رابعہ کو کچن کی جانب بڑھتا دیکھ کر انہوں نے پیچھے سے آواز لگائی مبادا کہیں وہ چائے نہ بنا لائے۔ کچھ دیر بعد ہی رابعہ نے کھانے کی ٹرے ان کے قریب لا کر رکھ دی۔

"ارے کریلے گوشت تو مجھے ہمیشہ سے بہت پسند رہے ہیں۔"

سالن پر نگاہ ڈالتے ہی وہ خوشی سے کھل گئیں۔ رابعہ نے خاموشی سے پانی کی بوتل ان کے قریب لا رکھی۔

"اچھا۔۔۔ یہ بتاؤ اب تمہیں وجاہت میاں کی شادی کرنی ہے یا نہیں۔"

"ظاہر ہے خالہ کرنی ہی ہے، مگر شرط یہ ہے کہ کوئی اچھی لڑکی مل جائے۔"

"لڑکی تو خیر بہت اچھی ہے۔ بسم اللہ۔۔۔" خالہ نے لقمہ توڑ کر منہ میں رکھا۔ "خوب صورت تو ایسی ہاتھ لگائے میلی ہو اور عمر بھی کوئی زیادہ نہیں، یہ ہی کوئی مشکل سے بائیس، تیئس سال۔"

"حد ہے خالہ اتنی چھوٹی اور خوب صورت لڑکی کو ایسی کیا مشکل پیش آگئی۔ جو آپ اس کا رشتہ وجاہت بھائی کے لیے لے آئیں۔" خالہ کی تفصیل نے رابعہ کو خاصا حیران کر دیا۔

"مجبوری ہے بیٹا۔ بچی اس دنیا میں بالکل تن تنہا ہے۔ ایک ماں تھی، وہ بھی فوت ہو گئی۔ اب رشتہ داروں کے در پر پڑی ہے۔ تایا کے بیٹے سے شادی ہوئی تھی۔ وہ بھی چھوڑ چھاڑ کر بھاگ گیا۔"

"وہ کیوں بھاگ گیا۔ اتنی خوب صورت بیوی چھوڑ کر۔۔۔"

"زیادہ تفصیل تو مجھے نہیں معلوم۔۔۔ اتنا ضرور علم ہے وہ کسی دوسری لڑکی سے محبت کرتا تھا۔ بس اس کی خاطر اس معصوم کو طلاق دے دی۔ وہ تو کسی بھی ایسے شخص سے شادی پر راضی ہے، جو صرف اسے ایک گھر اور اس کی چھت فراہم کر دے۔ اس بچی کی تو کوئی اور شرط بھی نہیں۔"

"اللہ معاف کرے۔۔۔ خالہ کس قدر بے حس لوگ ہوتے ہیں۔" رابعہ کا حساس دل دکھ گیا۔ "مجھے امید تو نہیں ہے کہ بھائی اتنی چھوٹی لڑکی سے شادی کرنے پر آمادہ ہوں۔ اب وہ جب واپس آئے تو میں ان سے پوچھوں گی ضرور۔"

"چلو اگر وہ مان جائے تو بتانا۔ ورنہ میں کوئی اور رشتہ ڈھونڈوں۔"

"جی ضرور۔"

رابعہ ان کے خالی برتن اٹھا کر کچن کی جانب بڑھ گئی۔ "اچھا اب چائے مت بنانا، مجھے پہلے ہی خاصی دیر ہو گئی۔ آج ایک لڑکی دکھانے جانا ہے۔ دعا کرو کہ کام بن جائے۔"

"ان شاء اللہ خالہ اگر بہتری ہوئی تو ضرور بنے گا۔ آپ بیٹھ جائیں، میں چائے بنا کر لا رہی ہوں۔"

حسب توقع خالہ فوراً" واپس بیٹھ گئیں۔

☼ ☼ ☼

"مجھ سے شادی کرو گی؟" سالار کا سوال اتنا غیر متوقع تھا کہ زینب ہکا بکا رہ گئی۔

"آپ سے شادی۔۔۔" پہلے تو اسے سمجھ ہی نہ آیا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔

"ظاہر ہے میں کوئی فارسی تو نہیں بول رہا ہوں۔"

"میرا خیال ہے آپ مذاق کر رہے ہیں۔"

اس نے ہنستے ہوئے قریبی رکھے جگ سے گلاس میں پانی انڈیلا۔ اس کا حلق شدید ترین خشک ہو چکا تھا۔

"میں اس قسم کے مذاق نہیں کرتا اور نہ ہی میری عمر مذاق کی ہے۔" اس نے برا سا منہ بنایا۔

"میرا خیال ہے نازیہ کی طبیعت کی خرابی نے آپ کے دماغ پر بھی اثر ڈالا ہے۔" زینب ابھی بھی غیر سنجیدہ تھی۔

"میں نے جو پوچھا ہے زینب، مجھے اس بات کا جواب دو 'ہاں یا نا'۔۔۔"

وہ ٹیبل پر دونوں کہنیاں ٹکا کر اس کی طرف جھکا زینب کو اس کی نگاہوں میں اپنی بات کی مضبوطی جھلکتی دکھائی دی۔ اسے سمجھ ہی نہ آیا وہ کیا جواب دے۔

"آپ شاید بھول گئے ہیں۔ میں نہ صرف ایک شادی شدہ عورت، بلکہ دو بچیوں کی ماں بھی ہوں۔"

"تو کیا ان تمام مجبوریوں نے تم سے تمہارا دل چھین لیا ہے۔ تمہارے جذبات اور احساسات کو ختم کر دیا ہے۔ کیا شادی شدہ عورت مر جاتی ہے۔ اس کی اپنی کوئی خواہشات نہیں ہوتیں۔" زینب ایک دم خاموش ہو گئی۔

"بولو زینب، جواب دو۔"

اب زینب کی سمجھ میں ہی نہ آیا، وہ کیا جواب دے۔ سالار نے اسے ایک عجیب و غریب دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا، جس کے ایک طرف اس کا شوہر اور دو بچیاں تھیں۔ دوسری طرف سالار کی محبت اپنی تمام تر رعنائیوں سمیت کھڑی تھی۔ اس کے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا۔ وہ ایک عجیب طرح کے کشمکش و پیچ میں گھر چکی تھی۔ اسے محسوس ہوا جیسے آج کا دن روز قیامت سے بھی زیادہ مشکل ہو گیا ہو۔ وہ اپنی جگہ پر ساکت بیٹھی رہ گئی۔ جو کچھ سالار نے کہا ویسا اس سے کبھی نہ ہو جائے۔

☼ ☼

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

نزہت جبین ضیاء

31 دسمبر کی رات تھی۔۔۔ وہ بھی تو اکتیس دسمبر کی رات تھی جب اسے بازل سے منسوب کیا گیا تھا۔۔۔ کتنی حسین اور دلکش رات تھی جب اس کا اور بازل کا رشتہ طے ہوا تھا، نئے سال کی آمد کے ساتھ ہی اس کی زندگی میں جیسے خوشیاں بھی آگئی تھیں کتنے حسین تھے وہ لمحات، جب اس نے اور بازل نے مل کر بہت سارے دیئے روشن کیے تھے اور آج۔۔۔ آج۔۔۔ بھی تو 31 دسمبر تھی کل کا دن نئے سال کے سورج کے ساتھ طلوع ہونے والا تھا۔۔۔ اور اس کی زندگی کی بھی نئی شروعات ہونے جارہی تھی۔۔۔ آج اس کے ہاتھوں پہ عباس کے نام کی مہندی لگائی گئی تھی اور وہ۔۔۔ عباس کے ساتھ رخصت ہو کر اس کے فلیٹ میں آئی تھی۔

عباس کون تھا۔۔۔؟ کیسا تھا۔۔۔؟ اور کیا کرتا تھا۔۔۔؟ اسے اس بات سے کوئی غرض نہ تھی وہ تو ایک روبوٹ کی طرح الوینہ اور سفیان کے اشاروں پہ چل رہی تھی۔ ورنہ آج بھی اس کے روم روم میں بازل کی اجارہ داری تھی اس کی رگ رگ میں بازل کا پیار بسا ہوا تھا۔۔۔ اس کی سماعتوں میں بازل کی آوازیں گونج رہی تھیں بصارتوں میں بازل کا خوب صورت اور دلکش سراپا سمایا ہوا تھا اس کا ہنسنا، بولنا، سرگوشیاں، سب کچھ اس کے لیے ایسا تھا کہ جیسے ابھی ابھی وہ اور بازل بچھڑے ہوں۔ چھ سال کے عرصے بعد بھی ہر نقش، ہر بات سب کچھ ذہن کے پردے پہ تازہ تھا۔ وہ بھول بھی تو نہ پائی تھی کچھ بھی۔۔۔

"یا الٰہی! مجھے ہمت اور حوصلہ عطا کرنا کہ میں عباس کے ساتھ نیک نیتی کے ساتھ زندگی کی ابتدا کر سکوں۔ خود سے سوال کرتی کیا میں عباس کے ساتھ انصاف کر پاؤں گی۔۔۔؟ کیا اس کی محبتوں کا بھرپور جواب دے پاؤں گی۔۔۔؟ کیا میں دل کی تمام تر سچائیوں کے ساتھ عباس کے حقوق ادا کرپاؤں گی۔۔۔؟ یا اللہ میں کیا کروں۔۔۔؟" اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا دیوار پر بنے قد آدم آئینے میں اپنا سراپا دیکھا میرون اور گولڈن کلر کے بھاری شرارے میں ماہر بیوٹیشن کے ہاتھوں سے تیار ہو کر وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔ "کاش بازل۔۔۔ یہ روپ تمہارے لیے سجایا ہوتا۔۔۔ میرے ہاتھوں میں تمہارے نام کی مہندی لگتی۔۔۔ میں تمہاری سیج سجاتی۔۔۔ تمہاری منتظر ہوتی کاش۔۔۔" اس کے لبوں سے دبی سسکاری ابھری۔

وہ کون سا اس شادی پر راضی تھی سب ایک مجبوری تھی اور اب اس کی ضرورت بھی کیونکہ گزشتہ سال اماں کا انتقال ہو چکا تھا اور اماں کی یہی خواہش تھی کہ جنت اپنے گھر کی ہو جائے۔۔۔ سفیان اور الوینہ اپنے تینوں بچوں کے ساتھ امریکہ شفٹ ہونے والے تھے الوینہ کے والدین وہیں تھے اب انہوں نے بیٹی داماد کے لیے بھی وہیں بندوبست کرلیا تھا۔۔۔ سفیان کے جانے کے بعد وہ اتنے بڑے گھر میں کس طرح رہتی تب نہ چاہتے ہوئے بھی اسے عباس کے لیے ہامی بھرنی پڑی عباس کو اس نے دیکھا بھی نہیں تھا وہ سفیان کا دوست تھا آج سفیان اور الوینہ کی امریکہ کے لیے فلائیٹ تھی عصر کے بعد اس کا نکاح عباس سے کردیا گیا تھا اور عباس اسے اپنے فلیٹ لے آیا تھا۔

نکاح اور رخصتی کی رسومات ادا ہو گئیں لیکن اس نے نگاہ اٹھا کر عباس کو دیکھا بھی نہیں اسے سب کچھ اچھا بھی نہیں لگ رہا تھا۔ عباس کے دوستوں کی بیویاں ساتھ تھیں جنہوں نے اسے کمرے میں بٹھا دیا تھا اور پھر دعائیں دے کر اپنے گھر کو لوٹ گئی تھیں۔ عباس ابھی آیا نہیں تھا۔ پتا نہیں عباس تم کیسے ہو۔۔۔؟ تمہاری نیچر کیسی ہے۔۔۔ وہ عباس کے بارے میں سوچنے لگی۔ ساتھ ساتھ ماضی کے دریچے وا ہوتے چلے گئے۔

اس نے جیسے ہی گھر میں قدم رکھا رنگ برنگی جھنڈیوں میں لگے دھاگے میں پیر بری طرح الجھ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھل پاتا اس کے سر پہ بلب آگرا جسے اس نے کمال ہوشیاری سے زمین پہ گرنے سے بچالیا۔ یا وحشت! نگاہ اٹھا کر اوپر دیکھا تو پیڑ کی ٹہنی سے جنت کو لٹکا ہوا دیکھا جو درخت میں رنگ برنگے بلب لگا رہی تھی اور اس کے ساتھ محلے کے دو چار بچے بھی تھے۔

"افوہ! یہ کیا حرکت ہے جنت۔۔۔؟" بادل نے غصے سے پوچھا۔
"سوری۔۔۔؟ مجھے پتا نہیں تھا کہ تم اچانک سے آجاؤ گے۔۔۔" وہ مطمئن انداز میں بولی۔
"نظر نہیں آرہا کہ تیاریاں ہو رہی ہیں نیو ایئر کی۔۔۔؟"
جنت! اس بار وہ مزید جھنجلا کر چیخا۔۔۔ جنت نے اسے غور سے دیکھا تو تیور کچھ اچھے نہیں تھے۔۔۔ "دہشت تیری کی۔۔۔ صاحب جی سچ مچ غصے میں ہیں۔" جنت نے سر ہلایا اور دھم سے نیچے کودی۔
"افوہ! بادل نے سر پکڑ لیا "یہ کیا حرکتیں ہیں تمہاری۔۔۔؟ تم بچی ہو کیا۔۔۔ یہ کیا ہنگامہ مچایا ہوا ہے گھر میں۔۔۔؟" وہ بدستور جھنجلایا ہوا تھا۔ "اگر بلب مجھے لگ جاتا تو۔۔۔؟"
"ارے۔۔۔ سوری بولا تو ہے اب اور کیا کروں۔۔۔؟ اور تمہیں پتا نہیں ہے کہ آج کیا ڈیٹ ہے۔۔۔ یہ سب نئے سال کی تیاریاں ہیں نا اور میں ہمیشہ نیو ایئر دھوم دھام سے مناتی ہوں۔" وہ سر پر رکھی اونی ٹوپی کو ہاتھ سے درست کرتے ہوئے بولی۔
افوہ جنت! تم کب بڑی ہو گی۔۔۔ "اس کی بچکانہ حرکت پر بادل نے اپنے سر پر ہاتھ مار کر کہا۔
"ارے کیا بڑی نہیں ہوں میں۔۔۔؟ دیکھو تو پورے 5 فٹ اور 6 انچ کی ہوں تم سے تھوڑی سی چھوٹی۔" جنت اس کے برابر آکر کھڑی ہو گئی۔۔۔ اس کی بے ساختگی پر بادل کو ہنسی آگئی۔
"اب تم آگئے ہو تو تھوڑی سی ہیلپ کروو نا۔" بادل کو ہنستا دیکھ کر وہ چہک گئی بادل نے ایک گہری نظر اس پر ڈالی بلیک جینز پر چھوٹی سی کرتے شرٹ کے اوپر جیکٹ پہنے سر پہ اونی ٹوپی تھی جس کے نیچے سے جھانکتے براؤن ریشمی بال اس کے کاندھوں پر بکھرے سرخ و سفید رنگت وہ اتنی معصوم اور پیاری تھی کہ بادل اس کی کوئی بات رد نہ کرتا تھا وہ اسے بہت پیاری لگتی۔
"ارے ہیلو! کہاں کھو گئے۔۔۔" جنت کی آواز پر وہ چونکا چیونگم کا بڑا سا ببل بناتی ہوئی وہ آنکھوں سے سوال کر رہی تھی۔۔۔ "ہیلپ کروو نا۔" دوبارہ کہا۔
"اوکے! میں چچی جان کو سلام کر کے آتا ہوں۔۔۔" وہ انکار کیسے کر سکتا تھا۔
"اوہ تھینکس ڈیئر!" وہ مسکرائی اور بادل اندر کی طرف چلا گیا۔
تھوڑی ہی دیر بعد ان کا بڑا سا صحن رنگ برنگی جھنڈیوں اور برقی قمقموں سے سج گیا تھا اس نے مٹی کے دیے بھی منگوائے تھے اور ڈھیر سارے دیے جلا کر صحن کو روشن کر کے بچوں کی طرح خوش ہو رہی تھی نئے سال کی ابتدا اس نے اپنی فیملی اور بادل کے ساتھ کی تھی اسے یہ سب کچھ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ ویسے بھی بادل کا ساتھ اسے اچھا لگتا تھا۔
"کتنا اچھا لگ رہا ہے نا بادل۔۔۔! تم ہر سال میرے ساتھ نیو ایئر مناؤ گے نا۔۔۔؟" بچوں کی طرح معصومیت سے سوال کیا۔ بادل نے اس کی معصوم صورت کو نظر بھر کے دیکھا۔
"ہاں! ان شاء اللہ۔" بادل کے لہجے میں سچائی تھی جنت مسکرانے لگی۔
سرور صاحب اور انور صاحب دو بھائی تھے سرور احمد بڑے اور انور احمد چھوٹے بھائی تھے سرور احمد کی دو بیٹیاں رفیعہ اور رومیلہ تھیں اور ایک بیٹا بادل جب کہ انور احمد کے دو بچے تھے سفیان اور جنت۔ سرور احمد کی بیوی رئیسہ پھوہڑ بد مزاج اور تیز و طرار عورت تھیں جب کہ انوار احمد کی بیوی سمیرا سلیقہ مند ملنسار اور نرم مزاج خاتون تھیں۔ دونوں بھائی سرکاری ملازم تھے رئیسہ تو جو آتا سب کچھ اڑا دیتیں مگر سمیرا بڑی سلیقہ مندی اور کفایت شعاری سے گھر کا نظام چلاتیں اس وجہ سے ان کے پاس کچھ بچت بھی ہو جاتی جس کا وہ جائز استعمال کر لیتیں دونوں بھائی ایک ہی علاقے میں مگر کچھ فاصلے پر رہائش پذیر تھے۔
بادل اور جنت بچپن سے ہی ایک دوسرے کے قریب تھے۔ ساتھ ساتھ کھیلتے' پڑھتے' لڑائیاں ہوتیں مگر ایک دوسرے کے بغیر گزارا بھی نہیں ہوتا بچپن سے ہی لڑتے لڑتے وہ بڑے ہو گئے اور انہیں اس بات

کا احساس بھی نہیں ہوا کہ کس طرح وہ غیر محسوس طریقے سے ایک دوسرے کے قریب آگئے ہیں اور شاید محبت بھی کر بیٹھے تھے اور اس بات کا احساس اس وقت ہوا جب کہ شادی کی کسی تقریب میں جنت کو عباس کے گھر والوں نے دیکھا تو عباس کے لیے پسند کر لیا اور چند روز بعد ہی ان لوگوں نے معلومات کروائی اور عباس کا رشتہ لے کر گھر آگئے۔
اس روز دوپہر کو جنت کالج سے لوٹی تو ڈرائنگ روم سے کچھ نامانوس سی آوازیں آرہی تھیں اس نے سوچا کہ اماں کے کوئی جاننے والے ہوں گے وہ سیدھی اپنے کمرے میں آگئی۔ تھوڑی دیر بعد علوینہ آگئی۔
"جلدی جلدی فریش ہو کر ڈرائنگ روم میں جاؤ۔۔۔" اس نے آتے ہی کہا۔
"کیوں بھابھی۔۔۔؟ جوتے کے لیس کھولتی ہوئی اس نے نگاہ اٹھا کر سوال کیا۔
"ہاں خیریت ہے اماں کہہ رہی ہیں کچھ لوگ آئے ہیں۔" علوینہ نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔
"اوکے آتی ہوں۔۔۔" کہتی ہوئی وہ واش روم کی طرف چل دی۔ منہ ہاتھ دھو کر وہ بنا چینج کیے ایسے ہی چلی آئی۔
"السلام علیکم!" عادتاً گرمجوشی سے سلام کیا۔
"وعلیکم السلام!" سب نے جواب دیا۔ سامنے صوفے پر دو خواتین جن میں ایک درمیانی عمر کی اور ایک لڑکی سی تھی اور سائڈ پر ایک پختہ عمر کی خاتون بیٹھی تھیں۔
"ماشاء اللہ واقعی بہت پیاری بچی ہے" پختہ عمر کی خاتون نے کہا اور اشارے سے اپنے برابر بیٹھنے کے لیے کہا جنت نے آنکھوں کے اشارے سے علوینہ سے پوچھا یہ کون ہیں۔۔۔؟ علوینہ کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔
"بیٹی پڑھائی کے علاوہ کیا کرتی ہو۔۔۔؟" خاتون نے پوچھا۔
"شرارتیں اور بھابھی سے فرمائشیں پوری کرواتی ہوں۔۔۔" لاابالی انداز میں جواب دیا۔۔۔ دونوں لڑکیوں نے بھی دو تین باتیں کیں۔۔۔ تھوڑی دیر بعد طریبہ کی رونے کی آواز آئی "بھابھی طریبہ اٹھ گئیں۔۔۔ ایکسکیوزمی!" کہتی ہوئی وہ اٹھ گئی۔
"تھوڑا سا بچپنا ہے اس میں" اماں نے جلدی سے کہا۔
"کوئی بات نہیں آنٹی میں بھی ایسی ہی ہوں خوب گزرے گی ہماری۔۔۔" نوجوان لڑکی نے مسکرا کر اماں کی بات کاٹی۔

☼ ☼ ☼

جنت طریبہ کے کپڑے چینج کروا رہی تھی کہ علوینہ آگئی۔۔۔
"آہم۔۔۔ آہم۔۔۔" کمرے میں آکر شرارت سے کھنکھارا۔۔۔ جنت کچھ کچھ سمجھ چکی تھی۔
"بھابھی یہ سب کیا ہے۔۔۔؟" لہجہ قدرے برہم تھا۔
"ارے بھئی ہم لوگ پچھلے دنوں سفیان کے دوست کی شادی میں گئے تھے نا تو اُس نے تمہیں وہاں اپنے بھائی کے لیے پسند کر لیا تھا اور اب اپنی والدہ اور بڑی بہن کو لے کر آئی تھیں باقاعدہ تمہارا پرپوزل لے کر۔۔۔"
"کیا مطلب۔۔۔؟ میری شادی کر دیں گے آپ لوگ۔۔۔؟ نہیں بھابھی بالکل نہیں۔۔۔ پتا ہے آپ لوگوں کو میں پڑھ رہی ہوں ابھی۔۔۔" لہجہ مزید برہم ہو گیا تھا۔
"ارے بھئی تمہیں پڑھائی سے کون روک رہا ہے اور کون سا تمہاری شادی ابھی کر رہے ہیں ہم ارے بھئی ابھی تو ان لوگوں نے تمہیں پسند کیا ہے۔۔۔ ہم لوگ بھی لڑکے کو دیکھیں گے اطمینان ہو گا تب جا کر پرپوزل قبول کریں گے اور شادی تمہاری ایجوکیشن کمپلیٹ ہونے کے بعد کریں گے تم فکر کیوں کرتی ہو۔" علوینہ نے اطمینان سے اسے سمجھایا۔
نہیں بھابھی۔۔۔! بے ساختہ اس کے لبوں سے نکلا۔

"نہیں کیا۔۔۔؟ کیا تمہیں شادی نہیں کرنی۔۔۔؟" علوینہ نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔ شادی۔۔۔ جنت کے دماغ میں چھم سے بادل آگیا۔ اسے لگا جیسے بادل کے علاوہ اپنی زندگی میں کسی اور کو شامل نہیں کر سکتی۔۔۔۔ دفعتاً" اس کی نگاہوں میں تائی اماں کا تیز طرار اور شاکی سراپا آگیا۔

تائی اماں کو ازل سے ہی اماں سے خدا واسطے کا بیر تھا اور یہ کینہ اور جلن اس وقت حد سے تجاوز کر گئی جب تائی اماں کے ہزار ہا چاہتے ہوئے بھی سفیان کی شادی رفیعہ سے نہ ہو سکی۔ تائی اماں شروع سے ہی چاہتی تھیں کہ رفیعہ کی شادی سفیان سے ہو جائے مگر سفیان کو تو شروع سے علوینہ پسند تھی اور پھر رفیعہ تھی بھی ایک نمبر کی پھوہڑ، بد مزاج اور اپنی ماں کی طرح بد سلیقہ اور زبان دراز ذرا سا بھی طریقہ اور سلیقہ نہ تھا بس فیشن اور نت نئے ڈرامے دیکھنا، فلمیں اور مووئیز دیکھنا یہ دونوں بہنوں کا وطیرہ تھا کام سے گرہستی سے ذرا برابر بھی دلچسپی نہ تھی۔ اب بھلا یہ کیسے ممکن ہوتا کہ تائی اماں اسے بادل کی دلہن بناتیں۔۔۔

"ارے تمہیں کیا ہوا۔۔۔؟" علوینہ نے غور سے اسے دیکھا۔۔۔ شاید اچانک سے آنے والے پرپوزل نے اسے شاکڈ کر دیا ہے۔۔۔ باہر سے سفیان کی آواز آئی تو علوینہ باہر کی طرف چل دی۔

بادل دو تین دن سے آیا نہیں تھا۔ ایک تو پرپوزل کی ٹینشن اور اوپر سے بادل کی غیر حاضری وہ عجیب سے بوریت کا شکار تھی۔ بادل سے میسج پر بات ہوئی تو اس نے بتایا تھا کہ آج کل رفیعہ کے لیے پرپوزل آیا ہوا ہے تو میں تھوڑا سا مصروف ہوں دعا کرو کہ بہتری ہو

دو دن تک گھر میں مذاکرات ہوئے پھر سفیان، اماں اور علوینہ عباس کے گھر گئے تاکہ گھر اور عباس کو دیکھ آئیں۔ انہیں یہ رشتہ ہر لحاظ سے مناسب لگا۔ عباس کا اپنا چھوٹا سا کاروبار تھا والد بھی ساتھ تھے۔ ایک بہن شادی شدہ اور ایک غیر شادی شدہ تھی۔ والدہ بھی سلجھی ہوئی خاتون تھیں سب کا مشترکہ فیصلہ عباس کے حق میں تھا کہ ضروری فارملٹیز کے بعد ہاں کر دی جائے۔

ایسے مواقعوں پر لڑکیاں خوش ہوتی ہیں، انجانا سا خوشگوار احساس جنم لینے لگتا ہے، کسی کا ہو جانے کا خمار چھانے لگتا ہے، نئے نئے جذبے انگڑائیاں لینے لگتے ہیں۔۔۔ لیکن۔۔۔ جنت کی تو عجیب ہی کیفیت تھی نہ کوئی احساس، نہ کوئی جذبہ اور نہ کوئی اچھوتا اور دل آویز خمار۔۔۔ کچھ بھی تو نہیں تھا بلکہ ایک انجانا سا احساس محرومی، بے چینی، بے قراری اور اداس سی کیفیت کا شکار تھی وہ۔۔۔ دل بہت اداس ہو رہا تھا بہت بوریت محسوس ہو رہی تھی۔ بادل بھی نہیں آیا تھا کہ اس سے کچھ شیئر کرتی۔

سفیان آفس سے لوٹا نہیں تھا۔ اماں اور علوینہ مارکیٹ گئے ہوئے تھے وہ گھر میں اکیلی تھی اور سخت ترین بوریت کا شکار بھی تھی۔ وہ صحن میں چلی آئی اور وہاں کرسی پر بیٹھ گئی تب ہی کال بیل بجی اور بادل آگیا۔۔۔ بادل کو دیکھ کر وہ کھل اٹھی۔۔۔ "شکر اللہ تمہاری شکل نظر آئی کب سے میسج کر رہی ہوں جواب کیوں نہیں دے رہے تھے؟" وہ اس پر برس پڑی۔۔۔

"ارے بھئی! بائیک چلا رہا تھا تو کیسے ریپلائی کرتا۔۔۔ اور وہ تمہاری لاڈلی بھاوج کہاں ہیں نظر نہیں آرہیں تمہارے آس پاس۔۔۔؟" بادل نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے شرارت سے پوچھا۔

"مارکیٹ گئی ہیں اماں کے ساتھ۔۔۔" اس نے جواب دیا۔ لہجہ غیر معمولی طور پر اداس تھا۔

"کیا ہوا خیریت تو ہے نا۔۔۔؟" بادل نے غور سے اس کے پژمردہ چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں بس۔۔۔" سر جھکا کر دھیمے سے کہا۔

"کیا ہو گیا۔۔۔؟ خیریت تو ہے نا اداس لگ رہی ہو۔۔۔ طبیعت تو ٹھیک ہے ناں تمہاری۔۔۔؟" بادل نے غور سے اسے دیکھتے ہوئے سوالات کر ڈالے۔

"ہاں! اصل میں میرے لیے پرپوزل آیا ہوا ہے۔۔۔ اور سب کو وہ مناسب بھی لگ رہا ہے۔۔۔"

"ہائیں!" بادل کرسی سے اچھل گیا۔۔۔ "مطلب

تمہاری شادی کے لیے لڑکا پسند کیا جا رہا ہے۔۔۔؟" بادل کا لہجہ یکدم بدل گیا تھا۔۔۔ "اور تم۔۔۔ تم بھی۔۔۔" بادل نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے سوال بھی کیا اور جملہ پورا ادا بھی نہ کر سکا۔۔۔

"میں۔۔۔ میں۔۔۔ میں نے نہیں دیکھا اسے۔۔۔" وہ بے زاری اور قدرے اداسی سے بولی۔

"یعنی اتنا سب کچھ ہو گیا ان تین چار دنوں میں اور۔۔۔ اور تم نے مجھے بتانے کی زحمت بھی نہ کی۔۔۔" بادل نے سخت لہجے میں کہا۔

"دیکھو ذرا اپنا سیل تم۔۔۔ کتنے میسجز کیے تم کو میں نے کہ کہاں ہو۔۔۔؟ گھر آؤ۔۔۔ مگر تم تو رفیعہ آپا کے رشتے کے چکر میں بزی تھے۔" جنت نے تیکھے پن سے جواب دیا۔

"ہاں!" بادل شرمندگی سے بولا۔۔۔ "ایک بات بتاؤ۔۔۔ ! جنت کیا تم۔۔۔ کیا تم ہاں کر دو گی۔۔۔؟" بادل نے قدرے جھک کر جنت کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پر امید لہجے میں سوال کیا۔۔۔ اسے جنت کے چہرے کی اداسی کسی حد تک مطمئن کر تو رہی تھی مگر۔۔۔ اس نے مزید اطمینان حاصل کرنے کے لیے سوال کیا۔

"بادل۔۔۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا کیا کروں۔۔۔؟" جنت کی بڑی بڑی آنکھیں جھلملانے لگیں۔

"خبردار اگر اس پرپوزل کے لیے ہاں کی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔۔۔" بادل نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

"کیا۔۔۔؟" جنت نے الجھی نظریں اس کی جانب اٹھائیں۔۔۔

"ہاں پاگل لڑکی! اس لیے کہ تو صرف اور صرف بادل کے لیے بنی ہے اور۔۔۔ اور کوئی بھی تجھے مجھ سے چھین کر نہیں لے جا سکتا۔۔۔" خوب صورت اور برجستہ اظہار پر جنت نے آنکھیں پھاڑ کر معصومیت سے اسے دیکھا جنت کے چہرے پر قوس و قزح کے رنگ اتر آئے تھے۔۔۔ مگر۔۔۔ دوسرے لمحے ہی وہ سنجیدہ ہو گئی آنکھوں میں خوشی کی جگہ نا امیدی نے لے لی۔۔۔

"مگر بادل۔۔۔ کیا تائی اماں ایسا ہونے دیں گی۔۔۔؟" سوال واقعی غور طلب اور فکر انگیز تھا۔۔۔

"ہاں جنت ایسا مشکل ضرور ہے مگر۔۔۔ مگر ناممکن نہیں ہے۔۔۔ کیونکہ میں۔۔۔ میں تمہارے علاوہ کسی اور کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔۔۔ اور تم؟" سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"میں۔۔۔ میں بھی نہیں رہ سکوں گی! تب ہی تو عجیب سی کیفیت کا شکار تھی میں۔۔۔" خوب صورت اور برجستہ اقرار پر بادل نے محبت پاش نگاہوں سے اسے دیکھا۔۔۔

"میں ہر حال میں تمہیں اپناؤں گا اور اماں کو راضی کر لوں گا بس تم۔۔۔ فی الحال اس پرپوزل کو منع کرو اور ذرا رفیعہ آپا کا رشتہ فائنل ہو جائے تو اماں سے آسانی سے بات ہو سکے گی۔۔۔ مشکل ہے مگر۔۔۔ تھوڑا سا صبر کر لو تم۔۔۔ اور اس موقع پر تمہاری چہیتی بھاوج کام آئیں گی نا! انہیں اعتماد میں لے کر کہو کہ کسی طرح اس پرپوزل کو منع کر دیں۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے!" وہ مطمئن ہو گئی۔۔۔ دل تھوڑا سا مطمئن ہوا، بے چینی اور بے قراری میں جیسے کمی آگئی تھی۔

"اب جلدی سے کافی بنا کر لاؤ۔" بادل کی آواز پر وہ چونکی اور مسکراتی ہوئی اٹھ گئی۔ تب ہی اماں اور علوینہ آگئے۔ مغرب کی اذان ہوئی تو اماں نماز پڑھنے چلی گئیں علوینہ بھی اپنے کمرے میں چلی آئی، بادل بھی کافی پی کر اپنے گھر چلا گیا تھا۔ جنت نماز پڑھ کر علوینہ کے کمرے میں آگئی۔

☼ ☼ ☼

"آجاؤ جنت ذرا طوبیہ کو پکڑو میں اس کا فیڈر بنا دوں۔" علوینہ نے طوبیہ کو جنت کی گود میں دیتے ہوئے کہا اور تھرماس سے گرم پانی بوتل میں ڈالنے لگی۔

"بھابی! مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔۔۔" اس نے طوبیہ کو پیار کرتے ہوئے کہا۔۔۔

"ہاں بولو۔۔۔!" فیڈر میں ملک پاؤڈر ڈالتے ہوئے

علوینہ پلٹی۔
"وہ۔۔۔ بھابھی۔" جنت ہچکچا رہی تھی۔
"کیا ہوا جنت؟ خیریت تو ہے نا۔۔۔؟ تمہیں مجھ سے بات کرتے ہوئے ایسی جھجک کیوں محسوس ہو رہی ہے؟" بوتل ہلاتے ہوئے علوینہ نے غور سے جنت کے چہرے کی طرف دیکھا۔۔۔ جنت کچھ تذبذب کا شکار لگ رہی تھی۔۔۔
"اگر تم چاہتی ہو تو ہم تمہاری اور عباس کی ملاقات کروا دیتے ہیں اور ہاں! جب تک تم مطمئن نہ ہو گی ہم ہامی نہیں بھریں گے۔" علوینہ نے اپنے طور پر اس کی بات کا غلط مطلب نکالا۔۔۔
"نہیں۔۔۔ نہیں بھابھی۔۔۔ ایسا کچھ نہیں ہے اور نہ ہی اس کی ضرورت ہے۔"
"پھر۔۔۔؟" علوینہ نے اس کو غور سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔۔۔ "بھابھی۔۔۔! آپ اس پرپوزل کے لیے منع کر دیں کوئی بہانہ بنا دیں۔۔۔" وہ آہستگی سے بولی۔
"ارے! پاگل ہوئی ہو کیا۔۔۔؟ اچھا بھلا رشتہ ہے۔۔۔ اچھے لوگ' اچھا لڑکا' پرکشش شخصیت اور اچھی فیملی کوئی نیگیٹیو پوائنٹ نظر نہیں آتا۔۔۔!" علوینہ نے اس کی بات رد کرتے ہوئے کہا۔
"بھابھی۔۔۔ سب کچھ ٹھیک ہے مگر۔۔۔ مگر بات دراصل یہ ہے کہ باذل تائی اماں کو بھیجنا چاہتے ہیں پرپوزل دے کر۔۔۔"
"ہائیں!" علوینہ نے طربیہ کو لٹاتے لٹاتے چونک کر اسے اس طرح دیکھا جیسے کہ علوینہ کو اس کی دماغی حالت پر کچھ شبہ ہو۔ "یہ کیا کہہ رہی ہو تم۔۔۔؟ یہ کیسے ممکن ہے۔۔۔؟ تم جانتی نہیں ہو کیا ان کو۔۔۔؟ ان کی نیچر کو۔۔۔ اور وہ ایسا کریں گی کیا۔۔۔؟ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ تمہیں اپنی بہو بنائیں۔" علوینہ نے دوٹوک لہجے میں کہا۔
"نہیں بھابھی! رفیعہ آپا کا رشتہ بھی تقریباً" طے ہو چکا ہے اور باذل نے یقین دلایا ہے کہ وہ انہیں منا لے گا۔" جنت نے اسے قائل کرنا چاہا۔
"دیکھو جنت! اگر خدانخواستہ وہاں بھی نہ ہو اور میں یہاں بھی منع کروا دوں۔۔۔؟" علوینہ بدستور شاکی تھی۔
"اگر ایسا ہوا تو۔۔۔ تو۔۔۔ میں شادی نہیں کروں گی۔" جنت کا لہجہ حتمی تھا۔
"تو بات یہاں تک آ گئی اور مجھے کانوں کان خبر تک نہیں ہونے دی تم نے۔۔۔ کب سے ہے یہ سب۔۔۔" علوینہ نے شرارت سے اس کا سر پکڑ کر ہلاتے ہوئے کہا۔ "گھنی مجھے بتایا بھی نہیں۔۔۔"
"بھابھی۔۔۔! پتا ہی نہیں چلا کچھ۔۔۔ اچانک جب عباس کے گھر والے آئے تب ہمیں احساس ہوا کہ ہم شاید ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے۔۔۔ بچپن سے آج تک ہم نے ہر بات ایک دوسرے سے شیئر کی ہے' لگتا ہے ہم ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔۔۔ اور جب باذل نے سنا تو وہ بھی پریشان ہو گیا اس نے کہا کہ تم رشتے سے انکار کر دو میں اماں کو کسی نہ کسی طرح راضی کر لوں گا۔۔۔ بھابھی پلیز! آپ کچھ بھی کریں عباس کو منع کروا دیں۔۔۔ کریں گی نا ہماری ہیلپ۔۔۔؟" وہ معصومانہ لہجے میں سوال کر رہی تھی۔ علوینہ کو بے ساختہ اس کی معصومیت پر پیار آ گیا۔۔۔ اس نے آگے بڑھ کر جنت کو سینے سے لگا لیا۔ "خدا تعالیٰ تمہیں بہت ساری خوشیاں دے۔۔۔ میں ہوں نا! فکر مت کر میری جان۔۔۔" اور جنت کی آنکھیں علوینہ کی محبت پر پرنم ہو گئیں۔
علوینہ نے پتا نہیں کیا کہا اور عباس کے گھر والوں کو معذرت کر لی گئی۔ باذل اور جنت نے سکھ کا سانس لیا۔ جانے کیسی محبت تھی دونوں کی' نہ کوئی وعدے' نہ قسمیں' نہ ساری ساری رات کال پر باتیں نہ ہی گھومنا پھرنا' کچھ بھی نہیں مگر اس کے باوجود بھی غیر محسوس طریقے سے دونوں ایک دوسرے کے اس قدر قریب آ گئے تھے کہ اب دوری برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ یہ کیسا پیار تھا' کیسا بندھن اور رشتہ تھا۔۔۔ دونوں ہی سمجھ نہ پائے تھے۔

☼ ☼ ☼

رفیعہ کی شادی طے ہو چکی تھی۔ تائی اماں بے حد

خوش تھیں۔ خوشی خوشی مٹھائی لے کر آئی تھیں اماں نے بہت آؤ بھگت کی اور رفیعہ کے لیے ڈھیر ساری دعائیں بھی کیں۔ گلے لگا کر تائی اماں کو مبارکباد بھی دی۔
"ہاں بھئی میرا ہونے والا داماد گارمنٹ کا بزنس کرتا ہے' بہت پیسہ ہے میری رفیعہ راج کرے گی بہت ارمانوں اور چاہت سے بیاہ کر لے جا رہے ہیں رفیعہ کے سسرال والے اسے۔۔۔ سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ الحمدللہ میری بچی کے نصیب سے بہت اچھا بر مل رہا ہے اس کو۔۔۔" تائی اماں کے لہجے میں تفاخر تھا۔
"شکر ہے اللہ تعالیٰ آگے بھی اس کے نصیب اچھے کرے۔" اماں نے دل سے دعا دی۔
"ضرور۔۔۔ ضرور ایسا ہی ہو گا۔۔۔ اللہ سب سے بڑا ہے وہ مدد کرنے والا ہے' ہماری نیت صاف ہے تب ہی تو اللہ بہتر کر رہا ہے ورنہ سچ پوچھو تو یہاں پر اپنے ہی اپنے کو کاٹتے ہیں۔۔۔ خیال نہیں کرتے۔۔۔ محبتیں ناپید ہو گئی ہیں رشتہ داریاں نبھانا نہیں جانتے لوگ۔۔۔ اپنے کام نہیں آتے آج کل تو بڑا برا زمانہ ہے' الٰہی توبہ توبہ!" طنز کے تیر چلاتے ہوئے تائی اماں نے علوینہ کی طرف دیکھا۔
"تائی اماں! کھانا کھا کر جائیے گا میں بریانی بنا رہی ہوں۔" ان کے طنز کو قطعی نظر انداز کرتی ہوئی علوینہ نے خوش دلی سے انہیں مخاطب کیا۔
"چلو ضد کرتی ہو تو رک جاتی ہوں ورنہ تو سو کام ہیں ابھی کرنے کے۔۔۔" انہوں نے ناگواری سے علوینہ پر گویا احسان کیا۔
"تائی اماں! کوئی کام ہو تو بتایئے گا۔۔۔؟" جنت نے فراخدلی کا ثبوت دیا۔
"نہ بھئی ہم کیوں بتائیں۔۔۔؟" جھٹ انکار کر دیا۔۔۔ "جس کے دل میں کرنا ہو کام وہ خود آ کر پوچھتا ہے یوں چکر لگاتا ہے یوں لٹھ نہیں مار کر بیٹھے۔" بدستور سخت اور کھردرے لہجے سے جنت کو بھی لتاڑ دیا۔۔۔ جنت اور علوینہ کو ہنسی آ گئی دونوں کچن کی طرف بھاگیں۔
"اف اللہ! ان خاتون کی بہو بننے کا ارمان تمہارے اندر مچل رہا ہے۔۔۔؟" علوینہ نے کانوں پر ہاتھ لگا کر جنت سے پوچھا۔۔۔ جنت کی ہنسی چھوٹ گئی۔۔۔
"بھابھی' تائی اماں مزاجاً" تیز ہیں دل کی بری نہیں اور۔۔۔ پھر آپ نے ان کی بیٹی کے حق پر ڈاکہ ڈالا ہے وہ کچھ نہ کچھ ردعمل تو کریں گی نا۔۔۔!" جنت نے بھی شرارت سے کہا تو دونوں زور سے ہنسنے لگیں۔
رفیعہ کی شادی ہو گئی اور وہ اپنے سسرال چلی گئی۔ ساری جمع پونجی اور تایا مرحوم کو ملنے والی رقم ناجائز اخراجات پر ختم ہو گئی۔ باذل کو اچھی جاب مل گئی تھی۔ باذل اب کم آتا تھا کیونکہ وہ دل لگا کر کام کر رہا تھا تاکہ اپنے رشتے کی بات کر سکے۔۔۔ اور پھر رومیلہ کی شادی کے لیے بھی کچھ نہ کچھ جمع کرتا تھا اور یہ بات جنت اچھی طرح جانتی تھی۔
جنت کو بچپن سے ہی نئے سال کی آمد کا اہتمام کرنا اچھا لگتا تھا۔ نیا سال شروع ہونے والا تھا اور اس نے باذل کو کہہ دیا تھا کہ وہ تمام مصروفیات ترک کر کے نئے سال کی ابتدا ساتھ کرنا ہے اور باذل نے بھی ہامی بھر لی تھی۔ اسے باذل کے ساتھ مل کر سجاوٹ کرنا اور دیئے روشن کرنا بہت اچھا لگتا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس کے اندازے کے عین مطابق اس کی اماں بری طرح پھٹ پڑی تھیں۔ "ارے ہے لڑکے! باؤلا ہو گیا ہے کیا۔۔۔؟ دماغ خراب ہو گیا ہے تیرا۔۔۔؟ تو اس گھر کی لڑکی کو میری بہو بنانا چاہتا ہے جہاں تیری بہن کے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے۔۔۔ تیری اماں کی ناقدری کی گئی ہو۔۔۔؟ جہاں یتیم بچی کا خیال نہ کیا گیا ہو۔۔۔؟ دودھ میں گری مکھی کی طرح ہمیں نکال کر پھینک دیا گیا ہو۔۔۔ تجھے اس دو بالشت کی لڑکی نے قابو کر لیا ہے کہ تجھے اپنی ماں اور بہنوں کی عزت کا پاس بھی نہیں رہا۔۔۔ ایسا جادو کر دیا ہے اس حرافہ نے۔۔۔"
"اماں! کیا فضول باتیں کر رہی ہیں آپ۔۔۔!" باذل کو اماں کی بات بہت بری لگی تھی۔ "خوامخواہ ایک بے کار

سی بات کو ایشو بنا رہی ہیں آپ... کون سا چچا جان یا چچی جان نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ رفیعہ آپا کو سفیان بھائی کی دلہن بنائیں گے... کبھی کسی بات سے ایسا ظاہر بھی نہیں ہوا... کون سا ان لوگوں نے آپ کو دھوکا دیا ہے... اور پھر جو بے کار سی بات کو لے کر آپ آج تک ان سب سے نالاں ہیں اب تو اس بات کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی... کیوں کہ رفیعہ آپا ماشاء اللہ سے اپنے گھر میں خوش و خرم ہیں اور ان کو کوئی دکھ' کوئی پچھتاوا نہیں ہے پھر... پھر... آپ خوامخواہ اس بات کو لے کر کیوں دل میں بغض لیے بیٹھی ہیں... ختم کریں اس بات کو اب... جو بھی ہوا اچھا ہوا۔

شجاع بھائی کے سامنے سفیان بھائی کی آمدنی کتنی کم ہے۔" یہ بات سن کر اماں کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ احساس تفاخر ابھر آیا... باذل نے بغور اماں کے چہرے کا جائزہ لیا اس کی بات کا صحیح رد عمل ہوا تھا۔

"سب بھول جائیں ماں اور جنت کے لیے راضی ہو جائیں..." وہ اماں کا موڈ دیکھ کر دوبارہ مطلب کی بات پر آ گیا۔

"نہ بھئی نا... ! یہ تو تو بھول جا ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا میری ایک ہی بہو آئے اور وہ بھی ایسی چلتر باز' اچھلتی کودتی' ناچتی پھرتی ہے وہ سارے گھر میں... بچی بنا کر رکھا ہوا ہے گھر والوں نے اسے' مجھے تو ہر فن مولا بہو چاہیے..." اماں نے کلے پیٹتے ہوئے توبہ توبہ کی...

"اماں اس کے امتحانات ختم ہو گئے ہیں اب وہ کھانا پکانا اور سلائی سیکھ رہی ہے اور دوسری بات یہ کہ اگر اس کا ذہن بچکانہ ہے یا وہ بچی بنی رہتی ہے تو یہ تو اچھی بات ہے نا وہ آج کل کی لڑکیوں کی طرح تیز و طرار نہیں ہے... آپ جیسا کہیں گی وہ مان لے گی... آپ اپنی طرح سے اس کو چلانا... آپ جو کہیں گی' جیسا کہیں گی وہ مان لے گی..." باذل نے اماں کی دکھتی رگ پہ ہاتھ رکھ دیا

"چلو! سوچوں گی۔" اماں فوراً" ٹھنڈی پڑ گئیں کیونکہ ان کا شاطر ذہن اس وقت بہت دور تک چلا گیا تھا کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے دوسری صورت میں وہ جنت کو بہو بنا کر اس سے سارے بدلے لے سکتی تھیں... ایک لمحے میں ہی ان کا ذہن بہت آگے تک جا کر واپس آیا تھا اور جب انہوں نے مثبت جواب دیا تو باذل تو خوشی سے ناچنے لگا اسے قطعی امید نہ تھی کہ اماں اتنی جلدی مان جائیں گی" ارے واہ اماں!" وہ خوشی سے اماں سے لپٹ گیا۔

جب جنت کے گھر باقاعدہ باذل کا رشتہ گیا تو وہ سب بھی حیران رہ گئے کیوں کہ کسی کو امید نہ تھی کہ ایسا ہو سکتا ہے۔

"سو بسم اللہ بھابھی! آپ آئیں اور ہم انکار کریں ایسا نہیں ہو سکتا۔" جنت کی والدہ سمیرا بیگم نے خوشی خوشی کہا کیونکہ باذل سب کو پسند تھا۔

"ہاں بھئی! رشتے اگر آپس میں طے ہو جائیں تو یہ اچھی بات ہے اب ہر کوئی ایسا نہیں سوچتا مگر میں نے یہی سوچ کر اتنا بڑا فیصلہ کیا ہے حالانکہ میرے باذل کے لیے لڑکیوں کی کمی نہیں تھی..." عادتاً" طنز بھی کر ڈالا۔

"تائی اماں رشتے تو آسمانوں پر بنتے ہیں اس میں ہمارا کوئی عمل دخل نہیں ہے بس دعا یہ کیا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ سب کے نصیب اچھے کرے۔" اس بار علوینہ بھی چپ نہ رہی۔ تائی اماں منہ بنا کر رہ گئیں۔ ادھر رومیلہ کی بھی بات چیت چل رہی تھی دونوں بہن بھائی کی شادی ساتھ کرنے کا ارادہ تھا۔

آج اکتیس دسمبر تھی اور آج ہی ان کا رشتہ فائنل ہوا تھا جنت اور باذل بہت خوش تھے اور اس دن کو یادگار بنانا چاہتے تھے۔ دونوں نے مل کر ڈھیر ساری باتیں کی' مستقبل کے بارے میں خوب صورت باتیں' وعدے اور ڈھیر سارے دیے جلا کر آج کے دن کو مزید یادگار بنایا بارہ بجے کے بعد باذل اپنے گھر لوٹ گیا اور جنت گنگناتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

دوسرے دن علوینہ اور جنت کچن میں کھانا بنا رہے تھے۔ علوینہ سالن بھون رہی تھی جبکہ جنت سلاد کے لیے گاجر کاٹ رہی تھی۔

"جنت ایک بات بولوں...؟" علوینہ نے سالن

میں چمچہ چلاتے ہوئے پلٹ کر پوچھا۔

"جی بھابی بولیں...!" علوینہ نے چھیلی ہوئی گاجر ٹوکری میں رکھتے ہوئے جواب دیا...

"دیکھو جنت ہم سب کا یہی خیال ہے کہ اب جب کہ تمہارا اور باذل کا رشتہ طے ہو گیا ہے تو تم لوگ ذرا کم ملا کرو... رابطوں میں تھوڑی سی کمی لے آؤ... کیونکہ تم جانتی ہو تائی اماں کس نیچر کی خاتون ہیں خدانخواستہ کسی بات کو ایشو بنا کر کوئی مسئلہ کھڑا نہ کر دیں سمجھ رہی ہو نا میری بات...؟" علوینہ نے بات کرتے کرتے رک کر اس سے سوال کیا۔

"جی... جی... بھابھی سمجھ گئی آپ لوگ ٹھیک کہتے ہیں ہم محتاط ہو جائیں گے۔" جنت کو علوینہ کی بات درست لگی تھی اور وہ اس رشتے میں کوئی دراڑ نہیں آنے دینا چاہتی تھی۔ کسی صورت وہ باذل کو کھونا نہیں چاہتی تھی۔

☼ ☼ ☼

رومیلہ کی شادی کی ڈیٹ فکس ہوئی تو جنت اور باذل کی ڈیٹ فکس نہیں کی گئی تھی اور تیاریاں ہونے لگیں رومیلہ کی شادی میں کچھ ماہ کا عرصہ تھا۔ تب ہی باذل کو جاب کی طرف سے بیرون ملک جانے کا چانس مل گیا۔ وہ تو چاہتا تھا کہ اتنا کما لے کہ اماں اور جنت کو تمام آسائشیں دے سکے۔ جب جنت کو اس بات کا پتا چلا تو وہ رونے لگی... "باذل مجھے کچھ نہیں چاہیے تم یہیں رہ کر جو کماتے ہو بہت ہے تم سے دوری برداشت نہیں کر سکتی میں اور پھر شادی بھی تو ہونے والی ہے..."

"پاگل لڑکی! بس دو سال کی بات ہے میں آجاؤں گا کوئی پتا بھی نہیں چلے گا دو سال یوں گزر جائیں گے۔" اس نے چٹکی بجاتے ہوئے مسکرا کر کہا...

"اور تم کو بھی بلوا لوں گا جلد ہی... چلو میں ایک کام کرتا ہوں...!" وہ کچھ دیر رکا پھر شریر لہجے میں کہا۔

"کیسا کام...؟" جنت نے پوچھا...

"چلو اماں سے کہلوا دوں گا..." وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

"کیسی بات... کیا کہلواؤ گے تم..." اس نے بے چینی سے پوچھا۔

"ایسی باتیں بڑوں کے درمیان اچھی لگتی ہیں... بس سمجھو تمہارے لیے شاکڈ نیوز ہو گی..."

"باذل پلیز! پہیلیاں مت پوچھو بتاؤ نا..." وہ فطری ضدی لہجے میں بولی۔

"نہیں بتا نا! یہ باتیں تمہاری اور میری اماؤں کے درمیان ہوں گی۔" وہ بدستور شرارتی موڈ میں تھا۔

"اب میں چلتا ہوں اماں کو بھیجتا ہوں شام کو تیار رہنا..." وہ اٹھتا ہوا بولا تو جنت نے اسے زور سے مکا مارا وہ ہنستا ہوا باہر کی جانب چلا گیا اور جنت بھی مسکرا دی مگر سوچنے لگی کہ ایسی کون سی بات ہے جو وہ مجھ سے نہیں کہنا چاہتا... خوامخواہ کا ڈرامہ کر رہا ہے... کاندھے اچکا کر وہ بھی اٹھ گئی۔

اور جب دوسرے دن جنت کو علوینہ کی زبانی پتا چلا کہ تائی اماں نے باذل کے کہنے پر یہ بات کی ہے تو جنت کا دماغ گھوم گیا...

"کیا ہوا بھابھی؟ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے بھلا یہ بات ہے کہنے کی وہ لوگ ایسی ڈیمانڈ کیسے کر سکتے ہیں...؟" جنت کو علوینہ کی بات پر یقین نہ آیا تھا...

"یقین تو ہمیں بھی نہیں آ رہا تھا لیکن حقیقت یہی ہے کہ تائی اماں نے یہ باذل کے کہنے پر ہی کیا ہے اور انہوں نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ اگر ایسا نہیں کر سکو تو پھر رشتہ ختم..." علوینہ نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اس کے چہرے پر حزن و ملال کی کیفیت تھی... "اور یہ بھی کہ باذل نے کہہ دیا کہ اگر ایسا نہ کیا گیا اور اس کے مشکل وقت میں اس کا ساتھ نہ دیا تو... اس سے ہمارا کوئی رابطہ' کوئی واسطہ نہ رہے گا..."

"اف!" جنت نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چکراتا ہوا سر تھام لیا... "ایسا کیسے ہو سکتا ہے بھابھی...؟ باذل اتنا گر سکتا ہے...! تائی اماں کی اتنی چھوٹی اور گھٹیا سوچ کیسے ہو سکتی ہے...؟" وہ رو پڑی۔

"ارے پاگل! فکر کیوں کرتی ہے... جو کچھ بھی ہے

ہمارے پاس سب تیرا ہی تو ہے سفیان نے ان کی شرط ماننے کا فیصلہ کرلیا ہے۔۔۔" علوینہ نے اسے سینے سے لگا کر تسلی دی۔

"نہیں بھابھی بالکل نہیں! میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گی اس گھر پر ہم سب کا حق ہے اور میں۔۔۔ میں کسی کی حق تلفی نہیں کرسکتی۔۔۔ آپ اماں سے کہہ دیں کہ رشتہ ختم کردیں۔۔۔" اس کا لہجہ حتمی تھا۔

"جنت سفیان کچھ کرلیں گے تم ایسا فیصلہ مت لو۔۔۔" علوینہ نے ایک بار پھر ملائمت سے کہا۔

"نہیں بھابھی! ایسا کسی صورت نہیں ہوسکتا اچھا ہے کہ ان کی اصلیت پتا چل گئی۔۔۔ میں اتنی کمزور نہیں۔۔۔ پلیز آپ اماں سے صاف صاف کہہ دیں۔۔۔" نہ جانے کیوں وہ کہتے ہوئے پھوٹ کر رو پڑی علوینہ بھی اس کے ساتھ رونے لگی۔ یا اللہ اس معصوم کے ساتھ کیسا مذاق کیا قدرت نے علوینہ نے آنکھیں صاف کرتے ہوئے سوچا۔

بات دراصل یہ تھی کہ باذل کو باہر جانے کے لیے پیسے کی ضرورت تھی اور اس نے گھر کے کاغذات مانگے تھے کہ کہیں رکھوا کر پیسے کا بندوبست کرسکے کیونکہ ان کا اپنا گھر بھی ایسا ہی تھا کیونکہ اس کی اماں نے رفیعہ کی شادی میں دکھاوے کے لیے بے ضرورت اور بے جا اخراجات کرلیے تھے۔

"اے ہے! تمہارے آگے پیچھے ہے ہی کون۔۔۔؟ اور سنا ہے سفیان کے سالے وغیرہ اسے اپنے پاس امریکا شفٹ کروانا چاہتے ہیں تو یہ گھر کس کام کا رہے گا اس سے بہتر کہ یہ گھر جنت کے نام کردو آخر کو اسے ہی ملنے والا ہے نا اور اگر اسے آڑے وقت میں ہمارے کام نہیں آسکتے ہو تو رشتہ ختم سمجھو اور خبردار کوئی رابطہ بھی نہیں کرنا پھر۔۔۔" حد درجہ گھٹیا بات کی تھی تائی اماں نے کتنی چھوٹی اور گندی سوچ تھی ان کی۔۔۔ اماں کے پیروں تلے زمین نکل گئی تھی۔

"تو یہ بات تھی باذل۔۔۔!" رات کو بستر پر لیٹ کر وہ باذل کو یاد کرکے سسک پڑی۔۔۔ "واقعی میرے لیے شاکنگ نیوز ہے کہ تم۔۔۔ تم۔۔۔ نے مجھے چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا ایک فضول سی بات اور ڈیمانڈ کے لیے۔۔۔ باذل تم تو ایسے نہ تھے۔" وہ سسک پڑی۔۔۔ دو تین بار باذل کی کال آئی مگر اس نے سیل آف کردیا۔

بچپن سے وہ اور باذل ایک ساتھ رہے تھے آنا جانا اور ہر ہر بات شیئر کرنا لڑائیاں جھگڑے عید تہوار ہر موقع پر ایک دوسرے سے ضرور ملتے۔ اسی طرح ہنستے کھیلتے دونوں بڑے بھی ہوگئے تب انہیں احساس ہوا کہ وہ ایک دوسرے سے پیار کرنے لگے ہیں۔ اور اس رشتے کو وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک کرنے کے لیے کتنی دعائیں مانگتے تھے اور باذل کو بھی یقین نہ تھا کہ تائی اماں یوں راضی ہوجائیں گی اور جب۔۔۔ سب کچھ آرام سے طے ہوگیا تو پھر یہ۔۔۔ اچانک سے کیسی ڈیمانڈ کی تھی ان لوگوں نے۔

جنت کو جیسے چپ سی لگ گئی تھی سارا دن شور ہنگامہ کرنے والی جنت یکدم سے سنجیدہ ہوگئی تھی۔ اسکول میں جاب کرنے لگی تھی۔ بہت بے رونق سی زندگی ہوگئی تھی ایسے میں۔ کبھی کبھی باذل کی یاد آتی تو ساری رات وہ کروٹیں بدل بدل کر گزار دیتی۔ تائی اماں سے بالکل رابطہ ختم ہوچکا تھا معلوم ہوا تھا کہ روحیلہ کی بھی شادی ہوگئی باذل آسٹریلیا چلا گیا تھا تائی اماں رفیعہ کے پاس اسلام آباد چلی گئی تھیں۔

سال بہ سال گزرتے گئے۔ ہر سال نئے سال کی آمد پر وہ ٹوٹ جاتی اسے باذل کے ساتھ گزارا ایک ایک لمحہ تڑپاتا اور اس کی آنکھیں بھیگنے لگتیں۔

سنو!

جب شام ڈھلتی ہے
مجھے تم یاد آتے ہو
کوئی جب رت بدلتی ہے
مجھے تم یاد آتے ہو
جنوری!
پھر سے لوٹ آئی ہے
پھر ٹوٹ کر مجھ کو تمہاری یاد آئی ہے
کہ!
دن جب ڈھلنے لگتا ہے

سرد ساموسم پہاڑوں پر اترتا ہے
یخ بستہ ہوائیں جب کواڑوں کو بجاتی ہیں
کہر آلود شامیں جب اداسی لے کے آتے ہیں
جنوری کی اداسی جب میرے اندر اترتی ہے
میری رگ رگ میں برف سی جمنے لگتی ہے
تمہارے پیار کی حدت مجھے تب یاد آتی ہے
سنو!
جب رات ڈھلتی
اداسی برف کی صورت میرے اندر اترتی ہے
مجھے تم یاد آتے ہو
مجھے تم یاد آتے ہو

کتنی بار اماں نے شادی کا کہا مگر اس نے صاف انکار کردیا۔۔۔ سب لوگ چپ ہوگئے تھے اس نے خود کو مصروف کرلیا تھا۔

چھ سال کا طویل عرصہ گزر چکا تھا۔ طوبیٰ کے بعد حاذق بھی علوینہ کی گود میں آگیا تھا۔ اماں بھی داغِ مفارقت دے گئی تھیں جنت کو اماں کی بے تحاشا کمی محسوس ہوتی تھی۔۔۔ اماں کی گود میں سر رکھ کر اسے سکون ملتا تھا مگر اب وہ گود نہ رہی تھی۔ اماں کی موت نے اسے توڑ دیا تھا مگر رفتہ رفتہ وہ خود کو حالات میں ڈھالنے لگی تھی۔ علوینہ اس کا بہت زیادہ خیال رکھتی تھی گھر میں کام کے لیے ماسی آتی تھی۔ مگر ایک بے چینی اس کے اندر آج بھی موجود تھی۔

☼ ☼ ☼

آج 31 دسمبر تھی۔ ایمل کی شادی ہوچکی تھی۔ وہ عباس کی زندگی میں آچکی تھی مگر یہ کیسی یادیں تھیں جو اسے کسی صورت چھوڑنے پہ تیار نہ تھیں۔ آہٹ پر اس نے سر جھٹک کر دروازے کی جانب دیکھا مگر صرف آنے والے کے قدموں پر نظر جاٹکی سلور کام کا میرون ناگرہ پہنے کوئی اس کے قریب آرہا تھا اور اتنا قریب آگیا۔۔۔ بیڈ پر ٹک گیا۔ اس نے آنکھیں موند لیں۔۔۔ آنکھیں نم ہونے لگی تھیں۔ عباس۔۔۔ نام لبوں پر نہ آسکا۔

"السلام علیکم!" اف یہ سماعتوں میں آج بھی اس دشمن جان کی آوازیں کیوں براجمان ہیں۔۔۔ "آپ پر سلامتی ہو محترمہ!" دوبارہ آواز آئی تو گھبرا کر آنکھیں کھولیں۔۔۔

اف خدایا۔۔۔ بالکل سامنے اتنا قریب۔۔۔ وہ تو۔۔۔ تو باذل تھا۔۔۔ یاالٰہی چکراتا سر تھام لیا۔

"پلیز۔۔۔ پلیز۔۔۔ یار بے ہوش مت ہوجانا جو عام طور پر ہر ڈرامے اور فلم میں ہوتا ہے۔" برسوں بعد باذل کا وہی شوخ لہجہ سماعتوں سے ٹکرایا۔۔۔

"یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ سب کیا ہے۔۔۔" وہ گھبرا کر اٹھ کے کھڑی ہوگئی۔۔۔ "تم۔۔۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" حواس باختہ ہو کر آگے بڑھی تو بھاری شرارے میں پیر اٹک گیا اور اس سے پہلے کہ وہ گرتی باذل نے آگے بڑھ کر اسے باہوں میں بھرلیا۔۔۔

"چھوڑو مجھے!" وہ تڑپ کر باہر نکلی "تم۔۔۔ تم۔۔۔ یہاں کیسے؟ مجھے نفرت ہے تم سے۔۔۔؟ تمہارے نام سے اور تمہارے وجود سے۔۔۔؟" زہر خند لہجے میں بولی۔

"خدا کے لیے جنت! ایک بار۔۔۔ صرف ایک بار میری بات سن لو پھر جو چاہے مجھے سزا دے لینا۔۔۔"

"تم۔۔۔ تم پاگل کردو گے مجھے۔۔۔"

"نہیں نہیں جنت۔۔۔! ایسا نہیں ہوگا۔۔۔ تمہارا ری ایکٹ کرنا بجا ہے لیکن یقین کرو اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ کوئی غلطی نہیں تھی میری اور تم بھی اپنی جگہ ٹھیک تھیں جو کچھ ہوا وہ سب اماں کا کیا دھرا ہے۔

میں کیا بولوں جنت کہ میں کس قدر شرمندہ ہوں کہ میری مرحومہ ماں نے کیسی گھٹیا حرکت کی ہے کہ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔"

"مرحومہ۔۔۔؟" جنت نے کہا۔

"ہاں! اماں کا انتقال ہوگیا ہے اور مرنے سے پہلے انہوں نے رفیعہ آپا کو تمام حقیقت بتادی تھی مگر۔۔۔ کچھ انہوں نے کیا وہ شاید ہی کوئی ماں کرے گی۔۔۔ بات صرف یہ تھی کہ میں چاہتا تھا کہ آسٹریلیا جانے سے پہلے تمہارا اور میرا نکاح ہوجائے تاکہ کاروائی میں دشواری نہ ہو اور میں تم کو بھی وہاں جلد بلوالوں۔۔۔ کاش میں خود یہ بات کرلیتا۔۔۔ اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ اماں نے اپنے دل میں اتنی نفرتیں پال رکھی ہیں تمہارے خلاف۔۔۔ اتنا کینہ ہے ان کے دل میں کہ انہیں نے اپنے بیٹے کی خوشیاں بھی داؤ پر لگا دیں انہوں نے تم کو بھی نہیں مجھے بھی بہت دکھ دیے بہت تکلیف اور اذیت دی ہے۔۔۔ انہوں نے مجھے یہ بتایا کہ تم لوگوں نے نکاح کرنے سے صاف انکار کردیا ہے کہ کیا تم لوگوں کو ہم پر بھروسہ نہیں ہے اگر تم لوگ اتنے شاکی ہو تو رشتہ ختم کردو۔۔۔ میں نے سنا تو میں تڑپ گیا کہ بھلا یہ کیسی بات کی تم لوگوں نے اور اماں نے صاف کہہ دیا تھا کہ سفیان بھائی بہت غصے میں ہیں اور اب تم لوگ ہم سے کوئی رابطہ نہیں رکھنا چاہتے اس کے باوجود میں نے تمہیں کال کرنے کی کوشش کی مگر۔۔۔ تم نے اپنا سیل آف کردیا۔۔۔ میں نے بہت چاہا کہ جانے سے پہلے ایک بار تم سے بات کرلوں مگر۔۔۔ اور میں آسٹریلیا چلا گیا۔۔۔

یقین کرو جنت ان چھ سالوں میں کوئی دن اور کوئی رات ایسی نہ تھی جب میں نے تمہیں یاد نہ کیا ہو۔۔۔ اور پھر جب رفیعہ آپا نے مجھے رو رو کر کال پر ساری بات بتائی تو میں تو پاگل ہوگیا۔۔۔ سمجھ نہیں آیا کہ کس طرح اور کیسے تم لوگوں کا دل صاف کروں۔۔۔ پھر میں نے پاکستان آکر سفیان بھائی سے رابطہ کیا ان کے آگے ہاتھ جوڑ کر ماں کی طرف سے معافی مانگی۔۔۔ علوینہ بھابھی تمہاری ایک ایک بات سے آشنا تھیں اور جانتی تھیں کہ تم نے نہ مجھ سے پہلے کسی کو چاہا نہ میرے بعد۔۔۔ پھر ہم نے پلان بنایا کہ اس طرح ہماری شادی کردی جائے۔۔۔ اب میں گناہ گار ہوں تمہارا تم جو چاہو مجھے سزا دے دو۔۔۔ اگر میں غلط ہوں تب بھی اور غلط نہ ہوں تب۔۔۔؟"

"یااللہ! یہ سب کیا ہے۔۔۔؟ تائی اماں نے ایسا کیوں کیا۔۔۔؟ اور۔۔۔ اور تم سب لوگوں نے مل کر مجھے پاگل بنایا۔۔۔" جنت نے سر پکڑ کر روتے ہوئے کہا۔۔۔

"پلیز۔۔۔ پلیز جان باذل۔۔۔ رونا نہیں خدا گواہ ہے باذل کے دل میں آج بھی صرف اور صرف جنت ہے اور میں نے آج کے دن خاص طور پر شادی کے لیے رکھا ہے کہ مجھے پتا تھا کہ تم 31 دسمبر کو مجھے کتنا مس کرتی ہو۔۔۔ اور جاناں! میں نے بھی گزشتہ چھ سال کانٹوں پر گزارے ہیں دل کرتا تھا کہ خودکشی کرلوں۔۔۔" اس کا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا۔۔۔ اور جنت تم۔۔۔ تم۔۔۔ میری زندگی ہو۔۔۔! میری جان ہو۔۔۔ میں تمہارے بنا مر جاؤں گا۔۔۔"

"خدا نہ کرے۔۔۔" جنت نے آگے بڑھ کر تڑپ کر اپنا حنائی ہاتھ اس کے لبوں پر رکھ دیا۔۔۔ باذل نے اس کے نرم و ملائم ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھوں میں جکڑ لیے۔

دفعتاً باہر سے بے تحاشا ہوائی فائرنگ کی آوازیں آنے لگیں نئے سال کی ابتدا ہوچکی تھی نئے سال نے اس کی زندگی میں بھی بے پناہ حسین رنگ بھر دیے تھے یوں اچانک سے بہاریں اس کے در تک چلی آئی تھیں جو اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

باہر شور ہنگامہ اور نئے سال کی آمد کا جشن منایا جارہا تھا اور اندر باذل اور جنت ایک دوسرے میں گم پیار بھری سرگوشیوں میں نئے سال کے ساتھ ساتھ نئی زندگی کی شروعات کر رہے تھے۔

☼ ☼

شفق افتخار

مکمل ناول

"علیزے بیٹا ناشتا تیار ہے' جلدی کرو۔" ماما کی پکار پر اس نے ایک تنقیدی نگاہ خود پہ ڈالی اور بیگ اور بکس اٹھا کر باہر نکل آئی تھی۔

"السلام علیکم بابا' ماما۔" بغور اخبار کا مطالعہ کرتے بابا کو صبح کا سلام کیا تھا۔

"وعلیکم السلام۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور اخبار ایک سائیڈ پہ رکھا۔

"ماما پلیز جلدی کریں' مجھے دیر ہو رہی ہے۔" وہ عجلت سے کہتی ہوئی توس پہ جیم لگانے لگی تھی۔ صبح کے وقت وہ ایسی ہی جلدی میں ہوا کرتی تھی۔

"آرام سے ناشتا کرو بیٹا' کبھی تو ڈھنگ سے کچھ کھا پی لیا کرو۔" ماما نے اسے ڈپٹا تھا اور پھر اس کے اور بابا کے لیے چائے بنانے لگیں۔

"ماما میری بس آجائے گی اور آج تو میرا پہلا پیریڈ ہی بہت امپورٹنٹ ہے۔" اس نے دودھ کا گلاس اپنے سامنے سے ہٹایا اور چائے کا کپ اٹھا کر لبوں سے لگا لیا تھا۔

"اونہوں بیٹا' تمہیں کتنی دفعہ کہا ہے ناشتے میں دودھ ضرور پیا کرو۔" بابا نے اسے چائے پیتے دیکھ کر حسب معمول سرزنش کی تھی۔

"بابا پلیز۔ آپ کو پتا ہے مجھے شروع ہی سے دودھ پینے سے کتنی چڑ ہے اور خاص کر ناشتے میں کبھی نہیں۔" وہ جلدی جلدی گرم چائے حلق سے اتارتی رہی۔

"اچھا میں چلتی ہوں' میری بس آنے والی ہوگی۔" وہ بات نالتی بیگ اور بکس اٹھا کر دونوں کو خدا حافظ کہتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ "پتا نہیں یہ لڑکی کب سدھرے گی۔" ماما اسے دیکھتے ہوئے تاسف سے بولیں۔

"کیوں بھئی کیا ہوا ہے میری بیٹی کو' اتنی لائق بھلا کسی کی بیٹی ہو سکتی ہے' آپ اپنے صاحب زادے کی فکر کیجیے' غالباً" آج ان کا انٹرویو ہے اور وہ ابھی تک گھوڑے گدھے بیچ کر سو رہے ہیں' جائیے انہیں اٹھائیے۔" بابا نے ہمیشہ کی طرح اس کی طرف داری کی تھی اور معاذ کو سخت سست سنائی تھی۔

ماما' معاذ کو اٹھانے اس کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں اور بابا مسکراتے ہوئے ناشتا کرنے لگے تھے۔ محبت تو وہ دونوں سے ہی بے پناہ کرتے تھے' مگر علیزے کی بات الگ تھی' کامیابی کے ہر میدان میں نمایاں ان کو اپنی یہ بیٹی بہت عزیز تھی۔

☼ ☼ ☼
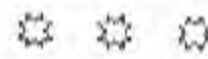
"ہیلو' ہیلو کیا ہو رہا ہے بھئی۔" دھاڑ سے کمرے کا دروازہ کھلا اور علینہ اندر داخل ہوئی تھی۔

"ارے علینہ تم' آؤ' آؤ' کہاں تھیں بھئی اتنے دنوں سے۔" علیزے نے آس پاس بکھرے نوٹس سمیٹتے ہوئے کہا تھا۔

"میں تو کہیں بھی تھی' مگر مجھے پتا تھا کہ تم یہیں کتابوں کے درمیان ہی ملوگی۔"

وہ اس کے قریب ہی بیڈ پہ بیٹھ گئی تھی۔ لیکن علیزے کچھ بھی بولے بغیر کتابیں سمیٹتی رہی تھی۔ وہ شروع ہی سے ایسی تھی' اپنے آپ میں مگن' کچھ پڑھی سی' مگر علینہ اس سے بالکل مختلف تھی' بے حد بولڈ اور حاضر جواب' پچھلے سال ہی وہ لوگ علیزے لوگوں کے پڑوس میں شفٹ ہوئے تھے اور تب سے اب تک مختلف نیچر کے باوجود ان دونوں کی اچھی بنتی تھی۔

"تم اب بس بھی کرو' کیا ہر وقت کتابوں میں گھسی رہتی ہو۔" علینہ چڑ کر بولی تھی۔ خود تو وہ پڑھنے کی ایسی چور تھی کہ کالج سے آنے کے بعد کتابوں کو ہاتھ بھی نہیں لگاتی تھی۔ بقول اس کے اتنی مغز ماری کر کے مجھے اپنی خوب صورت آنکھوں کو خراب کرنا ہے' اسے ہر وقت اپنی خوب صورتی کا بہت احساس رہتا تھا۔ کالج بھی بس وہ شوقیہ ہی جایا کرتی تھی۔

"تمہیں دیکھتے ہی میں نے کتاب بند کر دی تھی' اس لیے تم فکر نہ کرو اور شروع ہو جاؤ' مجھے پتا ہے تم جو بات کہنے آئی ہو' جب تک کہہ نہیں لوگی' تمہیں چین نہیں آئے گا۔"

اس نے سارے نوٹس سمیٹ کر سائیڈ ٹیبل پہ رکھے اور پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہوگئی۔ پچھلے دنوں علینہ کی کسی کزن کی منگنی تھی اور وہ اسی سلسلے میں مصروف تھی اور علیزے بہت اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ ہر فنکشن میں کتنا آگے آگے رہتی ہے۔ اس کے بعد جو وہ بولنا شروع ہوئی تو مسلسل آدھے گھنٹے تک بولتی ہی رہی تھی اور علیزے اسے اتنی تیزی سے بولتا ہوا صرف دیکھ رہی تھی' سن تو بہت کم رہی تھی۔

"تمہیں تو پتا ہے' میں جہاں چلی جاؤں' وہاں کسی اور کی ضرورت ہی نہیں ہوتی' سارے خاندان کے لڑکے بس میرے گرد ہی چکراتے رہتے ہیں اور لڑکیاں صرف مجھے دیکھ کر جیلس ہوتی ہیں۔" وہ مغرور انداز میں شانوں پر پھیلے سلکی براؤن بالوں کو ایک ادا سے جھٹکتے ہوئے بولی تھی۔

"اور پتا ہے' دو' تین عورتیں تو میرے گھر کا ایڈریس پوچھتے پوچھتے میرے گھر تک پہنچ گئی تھیں' پر میں نے بھی ممی سے کہہ دیا کہ میں کسی ایسے ویسے لڑکے سے شادی نہیں کروں گی' اونہہ جسے دیکھو منہ اٹھائے چلا آتا ہے' ارے علینہ وقار کسی ایسے ویسے بندے کے لیے نہیں بنی ہے۔ میں صرف اس سے ہی شادی کروں گی' جو مجھے پسند ہوگا۔" علیزے کو اس سے وہ بہت مغرور لگی تھی۔

"اس طرح نہیں کہتے علینہ بری بات ہوتی ہے تم اور میں نہیں جانتے کہ ہماری قسمت میں کیا ہے۔" علیزے اسے سمجھانا چاہتی تھی' مگر علینہ نے اسے بیچ میں ہی روک دیا تھا۔

"پلیز علیزے تم میری دوست ہو' دوست ہی رہو' لیکچر نہ دیا کرو' علینہ وقار اپنی قسمت خود بنانا چاہتی ہے' اس لیے پلیز نو لیکچر' اب تم اٹھو اور فٹافٹ مجھے اچھی سی چائے پلواؤ۔" وہ بے زاری سے کہتی ہوئی اپنے ریشمی بالوں میں انگلیاں چلانے لگی تھی۔

اسے تو آج تک اس کے ماں' باپ نہیں سمجھا سکے تھے تو بھلا علیزے اسے کیا سمجھاتی' وہ ٹھنڈی سانس بھر کر کمرے سے باہر جانے کے لیے کہنے چلی گئی تھی اور علینہ کسی میگزین کی تلاش میں ادھر ادھر نگاہیں دوڑا رہی تھی کہ علیزے کے بجتے ہوئے سیل فون نے اسے اپنی طرف متوجہ کرلیا تھا' اصولاً" تو اسے کال ریسیو نہیں کرنی چاہیے تھی' لیکن اس نے پھر بھی فون آن کرکے کان سے لگالیا تھا۔

"ہیلو۔" وہ اک ادا سے بولی تھی۔

"السلام علیکم!" دوسری طرف سے ابھرنے والی مردانہ آواز بہت شائستہ تھی۔

"وعلیکم السلام!" مردانہ آواز سنتے ہی اس کی آواز میں مٹھاس گھل گئی تھی۔

"علیزے بات کررہی ہیں۔" دوسری طرف سے پوچھا گیا تھا۔

"نہیں' آپ کون بات کررہے ہیں۔" وہ آواز سن کر ہی بہت متاثر ہوگئی تھی۔

"جی میں حمزہ بات کررہا ہوں' علیزے سے بات ہوسکتی ہے۔" "کیوں نہیں' میں ابھی انہیں بلاتی ہوں' ویسے میں اس کی فرینڈ علینہ بات کررہی ہوں۔" اس نے اپنا تعارف کرانا ضروری سمجھا تھا۔

"جی وہ تو ٹھیک ہے' مگر مجھے علیزے سے بات کرنی ہے۔"

دوسری طرف اسے کوئی اہمیت ہی نہیں دی گئی تھی اور اسے یوں خود کو نظرانداز کیے جانا بہت کھلا تھا' وہ علیزے کو بلانے جانا چاہتی ہی تھی کہ وہ خود ہی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تھی۔ اس نے تقریباً" پٹخنے والے انداز میں فون سائیڈ ٹیبل پہ رکھا تھا اور اسے اطلاع دی تھی اور پھر سے کسی میگزین کی تلاش میں سرگرداں ہوگئی تھی۔ تقریباً" ایک یا دو منٹ بات کرنے کے بعد علیزے نے فون آف کیا تھا۔

"علیزے' یہ حمزہ تمہارا کلاس فیلو ہے۔" وہ جو بہت بے چینی سے اس کے فون بند کرنے کا انتظار کررہی تھی' فوراً" بول پڑی تھی۔

"نہیں مجھ سے سینئر ہے' کیوں؟" وہ سائیڈ ٹیبل کی دراز میں کچھ تلاش کرتے ہوئے بولی تھی۔

"بندہ کچھ مغرور سا نہیں۔" وہ اپنے نیل پالش لگے لمبے لمبے ناخنوں پہ نگاہیں جمائے ہوئے تھی۔

"نہیں مغرور تو نہیں' بس ذرا ریزرو سا ہے' اب پلیز تم اسے بخش دینا' کیونکہ وہ لڑکیوں سے ذرا دور ہی رہتا ہے۔" اس نے اب دوسری دراز کھول لی تھی۔

"لڑکی تو تم بھی ہو۔" وہ طنزیہ انداز میں بولی تھی۔

"مگر میں اسے اور لڑکیوں سے مختلف لگتی ہوں' اس لیے وہ مجھ سے بات کرتا ہے اور اس نے مجھے فون صرف باتیں بگھارنے کے لیے نہیں کیا تھا بلکہ اسے کچھ نوٹس چاہیے تھے' جو کہ اسے یقین تھا کہ میرے پاس ضرور ہوں گے اور میرا نمبر بھی اس نے میری فرینڈ سے لیا تھا' جس کے لیے وہ مجھ سے معذرت کررہا تھا۔" علیزے نے یک دم ہی وضاحت کردی تھی' کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے ذہن میں کوئی الٹی سیدھی سوچ آئے۔ وہ اس طرح کی باتیں نہ خود کرتی تھی اور نہ ہی اپنے بارے میں کسی کے منہ سے سننا پسند کرتی تھی۔

"اچھا یار' ناراض کیوں ہوتی ہو' میں تو صرف یہ معلوم کرنا چاہ رہی تھی کہ مختلف نظر آنے کی کوئی تو وجہ ہوگی نا۔" وہ اب بھی باز نہیں آئی تھی۔

"وجہ یہ ہے مائی ڈیئر فرینڈ کہ نہ تو میں اس کی پرسنالٹی سے امپریس ہوں اور نہ ہی ان لڑکیوں کی طرح اسے دیکھ کر ٹھنڈی آہیں بھرتی ہوں' اس نے بات کرلی تو ٹھیک' ورنہ اس کی راہ میں پلکیں بچھائے نہیں بیٹھی ہوئی اور تم مجھے جانتی نہیں ہو کیا۔" وہ برہمی سے بولی تھی۔

"ارے یار میں تو مذاق کررہی ہوں۔ تم تو خواہ مخواہ ناراض ہورہی ہو اور یہ تمہاری چائے ابھی تک نہیں آئی۔" وہ بات کو ٹالتے ہوئے بولی تھی۔

"ہوں' تو چلو ایسا کرتے ہیں کہ لاؤنج میں چلتے ہیں' وہیں بیٹھ کر پی لیں گے۔" وہ مطلوبہ نوٹس ہاتھ میں لیے ان پہ نگاہ دوڑاتے ہوئے بولی تھی۔

"ہاں ٹھیک ہے چلو۔" وہ صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

علیزے بھی نوٹس بیڈ پہ رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ علینہ نے ایک نظر اسے نکلتے ہوئے دیکھا تھا اور سرعت سے اس کا سیل فون اٹھالیا تھا۔ ریسیو کال میں جگمگاتے نمبر کو اس نے سیکنڈز میں اپنے سیل میں save کرلیا تھا اور پھر کمرے سے باہر نکل آئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"ایکسکیوزمی علیزے۔" وہ یونیورسٹی کے لان میں بیٹھی کچھ لکھنے میں مصروف تھی۔

جب حمزہ کی آواز پہ اس کے چلتا قلم رک گیا تھا۔

"آپ بزی ہیں؟" حمزہ نے اس کے لکھنے کی رفتار سے اندازہ لگایا تھا۔

"نہیں بزی تو نہیں ہوں' آپ کہیں۔" علیزے نے سر اٹھا کر اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا تھا۔

"کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں۔" کہنے کے ساتھ ہی اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ بیٹھ گیا تھا۔

"میں صبح سے آپ کو ڈھونڈ رہا ہوں' پوری یونیورسٹی چھان ماری' لیکن آپ تو جیسے غائب ہی ہوگئیں ... بائی دا وے کہاں تھیں آپ؟" وہ بغور اسے دیکھتے ہوئے بولا تھا۔ بالکل لائٹ پنک کے سوٹ میں سادہ سی وہ بہت فریش لگ رہی تھی۔ حمزہ کو نہ جانے کیوں یہ لڑکی دل کے بہت قریب محسوس ہوئی تھی۔

"دراصل صبح سے میرا کوئی بھی پیریڈ فری نہیں تھا۔ ابھی فری پریڈ تھا' سو یہاں چلی آئی۔ آئی ایم سوری' آپ کو میری وجہ سے زحمت اٹھانی پڑی۔" ایک پل کو اس کی دھڑکنیں منتشر ضرور ہوئی تھیں' لیکن اگلے ہی پل وہ نارمل تھی' وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ اسے بھی اور لڑکیوں کی طرح سمجھے۔

"ارے نہیں' اٹس اوکے' کوئی بات نہیں' وہ آپ سے میں نے نوٹس مانگے تھے۔" وہ سنبھل کر بولا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ انتظار کا کوئی بھی جگنو قبل ازوقت اس کے ہاتھ میں تھمائے۔ مگر یہ تو اس نے بہت اچھی

طرح جان لیا تھا کہ اگر اس کی زندگی میں کوئی خاص ہے تو وہ علیزے ہی ہے۔

"مگر پلیز' یہ مجھے واپس ضرور کر دیجیے گا' کیونکہ مجھے اکثر ان کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔" علیزے نے بیگ سے نوٹس نکال کر اسے تھمائے تھے۔

"او شیور' کیوں نہیں۔" حمزہ نے نوٹس کا پلندہ تھام لیا تھا۔

"علیزے آپ سے ایک بات کہوں۔" حمزہ نے کاغذوں پہ ایک نگاہ ڈالتے ہوئے کہا تھا۔ علیزے نے بنا کچھ کہے اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا تھا۔

"آپ اتنا پڑھ پڑھ کر تھکتی نہیں ہیں؟" وہ مسکراہٹ لبوں میں دبائے پوچھ رہا تھا۔ وہ بے اختیار ہی اس کی بات' اس کے انداز پہ ہنس پڑی تھی اور ہنستے ہوئے وہ اس قدر اچھی لگ رہی تھی کہ حمزہ کتنے ہی پل اسے دیکھتا رہا تھا۔ وہ اس کے اس طرح دیکھنے پہ پزل سی ہو گئی تھی۔

"علیزے' آپ ہنستی ہوئی بہت اچھی لگتی ہیں۔" وہ ابھی تک اس لمحے کی گرفت میں تھا' وہ نگاہیں جھکا گئی تھی۔

"علیزے کیا ہم دوست نہیں بن سکتے۔" جانے اس پل میں کیا تھا کہ وہ اپنے دل کی بات کہہ گیا تھا۔

"دوست تو ہیں۔" وہ بلاوجہ ہی اپنے بیگ میں کچھ ڈھونڈنے لگی تھی۔

"ہاں واقعی دوست تو ہیں۔" چند لمحے اسے خاموشی سے دیکھنے کے بعد حمزہ کے لبوں سے نکلا تھا۔ بالآخر وہ اس پل کے سحر سے آزاد ہو ہی گیا تھا۔

"او مائی گاڈ۔" گھڑی دیکھ کر جیسے وہ اچھل ہی پڑا تھا۔ وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی تھی۔

"میری گیارہ بجے کلاس ہے' میں چلتا ہوں' بعد میں ملتے ہیں۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"ہوگی نا ملاقات۔" حمزہ نے ایک پل کو اسے دیکھا تھا۔ وہ منتظر تھا' اس کے جواب کا اور پھر اس کا اثبات میں ہلتا سر دیکھ کر وہ مطمئن سا اسے ہاتھ ہلا تا کلاس روم کی طرف بڑھ گیا تھا۔ علیزے کتنے ہی لمحے اس کے قدموں کے نشان کو دیکھتی رہی تھی۔ دل زور و شور سے اس کی طرف کھنچ رہا تھا اور دماغ مسلسل اس کی نفی کر رہا تھا۔ اس نے دماغ کی سنی اور سر جھٹک کر دوبارہ سے لکھنے میں مصروف ہو گئی تھی۔

یونیورسٹی کے پہلے دن ہی اس کی ملاقات حمزہ سے ہوئی تھی۔ اسے اپنے فارم وغیرہ جمع کرانے تھے اور وہ یونیورسٹی میں پہلی دفعہ آئی تھی۔ معاذ اسے گیٹ پر ہی چھوڑ کر جا چکا تھا۔ اسے کوئی ضروری کام تھا اور وہ اسے پیچھے سے پکارتی بھی رہی تھی۔ ایڈمنسٹریشن آفس کے پاس ایک لمبی لائن تھی اور علیزے وہاں پریشان سی کھڑی تھی۔ ایسے میں ایک حمزہ ہی تھا' جس نے اس کی ہر کام میں مدد کی تھی اور آج تک مدد کر رہا تھا۔ شاید پہلے ہی دن کیوپڈ نے اپنا اثر دکھا دیا تھا۔ دونوں کو اتنی بھیڑ میں ملا دیا تھا اور حمزہ کو بھی یہ خاموش سی لڑکی اوروں سے مختلف لگی تھی۔ لیکن کچھ بھی کہنے کی ہمت دونوں میں ہی نہیں تھی' آج یہ پہلا موقع تھا کہ ان دونوں میں اتنی تفصیلی بات ہوئی تھی۔ ورنہ تو ہیلو ہائے سے زیادہ کبھی بات بڑھی ہی نہیں تھی۔

☼ ☼ ☼

"او مائی گاڈ' اتنی تیز بارش' اب کیا کروں۔" علیزے پریشان سی آسمان کو دیکھنے لگی تھی۔

وہ یونیورسٹی کے کوریڈور میں کھڑی بارش رکنے کا انتظار کرنے لگی تھی۔ گاڑی بھی ایک ہفتے سے ورکشاپ میں تھی' ورنہ کم از کم فون کر کے گاڑی ہی منگوا لیتی اور اسے پتا تھا کہ معاذ تو کبھی بھی اتنی تیز بارش میں اسے لینے نہیں آئے گا اور یونیورسٹی سے بس اسٹاپ تک جانا گویا اپنی شامت آپ بلوانا تھا۔

"اف اب کیا کروں۔" وہ وہیں لگے بینچ پر سر پکڑ کر بیٹھ گئی تھی۔ پندرہ' بیس منٹ اسی چویشن میں گزرے تھے۔ بارش رکنا تو دور' کم بھی نہیں ہو رہی تھی۔ وہ مایوسی سے ادھر ادھر دیکھنے لگی تھی۔ موبائل کے سگنل بھی نہیں آ رہے تھے۔ اردگرد کچھ اسٹوڈنٹس خوش گپیوں میں مصروف تھے اور کچھ اسی

کی طرح کنوینس پرابلم میں' قریب ہی آفس سے نکلا حمزہ اسے اس طرح بیٹھا دیکھ کر رک گیا تھا۔ بے اختیار ہی مسکراہٹ نے اس کے چہرے کا احاطہ کیا تھا۔

"علیزے۔" وہ اس کے قریب آکے کچھ فاصلے پہ رک گیا تھا۔ اس نے بے اختیار ہی سر اٹھایا تھا۔

"پریشان ہو۔" وہ سمجھ تو گیا تھا کہ گھر جانے کی وجہ سے پریشان ہوگی۔ مگر پھر بھی پوچھنے لگا۔

"آف کورس۔" وہ دھیرے سے بولی تھی۔ بارش اسے پسند تو بہت تھی' مگر اس بے وقت کی بارش نے اسے کوفت میں مبتلا کر دیا تھا۔

"میں ڈراپ کر دوں' گاڑی ہے میرے پاس۔" وہ بہت آسانی سے اس کا پرابلم حل کر گیا تھا۔

"وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر..." ایک پل کو اس کے چہرے پہ اطمینان سا اتر آیا تھا۔ مگر دوسرے ہی پل وہ کچھ تذبذب کا شکار تھی۔

"کوئی پرابلم ہے۔ تم مجھ پہ اعتماد کر سکتی ہو علیزے۔" وہ بے حد اپنائیت سے کہہ رہا تھا۔

"اوکے چلیں۔" وہ بیگ اور بکس سنبھال کر کھڑی ہو گئی تھی۔

دونوں بچتے بچاتے پارکنگ تک پہنچے تھے۔ علیزے نے گاڑی میں بیٹھ کر سکون کا سانس لیا تھا۔ حمزہ نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی' کنوینس پرابلم حل ہوئی تو وہ بھاگتے دوڑتے بارش کے سنگ بھیگتے نظاروں کو انجوائے کرنے لگی تھی۔

"علیزے ایک بات پوچھوں۔" حمزہ نے گیئر بدلتے ہوئے پوچھا تھا۔

"جی پوچھیں۔" وہ اب بھی مکمل طور پہ باہر متوجہ تھی۔

"اس دن میں نے تمہیں فون کیا تھا' تو تمہاری کسی فرینڈ نے اٹینڈ کیا تھا' مجھے اس لڑکی کا attitude بہت عجیب سا لگا۔" وہ جیسے کچھ یاد آجانے پر پوچھ رہا تھا۔

"میری فرینڈ۔" وہ سوچنے لگی تھی۔

"اچھا ہاں' علینہ نے اٹینڈ کیا تھا' کیوں کیا کہا اس نے' اس نے کوئی بدتمیزی کی آپ کے ساتھ۔" وہ پریشانی سے پوچھنے لگی تھی۔

"نہیں کچھ خاص نہیں' مگر اول تو اسے یوں کسی کا پرسنل فون اٹھانا نہیں چاہیے اور اگر اٹھا ہی لیا تھا تو اتنا فرینک ہونے کی کیا ضرورت ہے' میں نے تمہیں بلانے کو کہا تو جواب میں اپنا تعارف کرانے لگیں محترمہ' یہ بھی کوئی بات ہوئی بھلا' جب میں آپ سے بات ہی نہیں کر رہا تو خوامخواہ میں اپنا تعارف کرانے کی کیا ضرورت ہے۔" وہ مکمل توجہ ڈرائیونگ پہ رکھے ہوئے تھا۔

"اچھا لیکن مجھ سے تو اس نے کچھ نہیں کہا۔" وہ شرمندہ سی کہہ رہی تھی۔

"مجھے ایسی لڑکیاں بہت بری لگتی ہیں جو خوامخواہ فضول میں فری ہونے کی کوشش کرتی ہیں اور اس کی بولڈنیس دیکھو ذرا کل اس نے مجھے کال کی' میں نے بھی اسے اچھی خاصی سنا دیں۔" وہ اس کے اشارے موڑ کاٹتے ہوئے بولا تھا۔ حمزہ کے چہرے پہ ناگواری کے تاثرات بہت نمایاں تھے۔

"آئی ایم سوری حمزہ' وہ ہے تو بہت بولڈ' مگر میں نہیں سمجھتی تھی کہ وہ کوئی ایسی حرکت کرے گی' اسے بھلا آپ کو فون کرنے کی کیا ضرورت تھی۔" علینہ کی حرکت نے اسے شرمندہ کر دیا تھا۔

"اٹس اوکے۔ تم کیوں اتنا شرمندہ ہو رہی ہو' اس میں تمہارا کیا قصور ہے' لیکن پلیز تم اسے سمجھا ضرور دینا کہ آئندہ وہ ایسی کوئی حرکت نہ کرے۔" اس نے گاڑی لا کر عین اس کے گھر کے سامنے روک دی تھی۔ علیزے ابھی تک حیران پریشان سی تھی' چلو اس کو اپنا نام بتا دیا تھا' مگر اس کو فون کرنے کی کیا ضرورت تھی' کیا سوچتا ہوگا وہ میرے بارے میں کہ اس کی کیسی فرینڈز ہیں اور پھر اسے نمبر کہاں سے ملا۔ یقیناً اس نے میری لاعلمی میں میرے فون سے لیا ہے۔ وہ ان ہی سوچوں میں تھی' اسے احساس ہی نہ ہوا کہ حمزہ نے گاڑی روک دی تھی۔

"علیزے' تمہارا گھر آگیا ہے۔" حمزہ نے اسے گم

صم بیٹھے دیکھ کر پکارا تھا' وہ چونک سی گئی تھی۔

"اٹس اوکے یار... اس میں بھلا تمہارا کیا قصور ہے۔ چلو اترو' گھر والے ویٹ کر رہے ہوں گے۔" وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"اگر آپ کے پاس ٹائم ہو تو آپ بھی چلیں' ایک کپ چائے ہو جائے۔" وہ اب خاصی ریلیکس لگ رہی تھی۔

"نہیں علیزے تھینک یو' بس اب میں چلوں گا۔"

"جی نہیں' پھر کبھی نہیں' بلکہ ابھی' آپ کم از کم میری اتنی سی بات تو مان ہی سکتے ہیں۔"

بے حد اپنائیت سے کہتی وہ اس سے حمزہ کو اپنے بہت قریب محسوس ہوئی تھی' اسے ماننے ہی بنی تھی۔ دونوں آگے پیچھے ہی گھر میں داخل ہوئے تھے۔ آج اتفاق سے بابا بھی جلدی گھر آگئے تھے اور معاذ بھی خلاف توقع گھر پہ تھا۔ اماں پریشانی کے عالم میں شوہر اور بیٹے کی فرمائشیں بھی پوری کر رہی تھیں اور اس کے انتظار میں ہول بھی رہی تھیں۔ جانے کتنی بار معاذ سے کہہ چکی تھیں کہ جا کے اسے لے آئے۔ مگر وہ بھی اپنے نام کا ایک تھا' جا کے ہی نہ دیا۔ اب اسے آتے دیکھا تو اطمینان سا آگیا تھا۔ حمزہ نے ماں کی محبت کو پہلی بار محسوس کیا تھا۔ ورنہ ماں کی ممتا کو' اس کے لمس کو' وہ ہمیشہ ترستا ہی رہا تھا۔ علیزے نے سب سے اس کا تعارف کرایا تھا۔ سب ہی اس سے مل کر خوش ہوئے تھے۔ ماں کی آنکھوں میں تو خوش فہمیوں نے جنم لینا شروع کر دیا تھا۔ حمزہ ان لوگوں سے مل کر بہت خوش ہوا تھا۔

ماما نے ایک ہی ملاقات میں اسے اپنا بیٹا بنا لیا تھا۔ جب انہیں پتا چلا کہ اس کی ماں نہیں ہے تو انہوں نے فوراً کہا کہ وہ انہیں اپنی ماں سمجھے اور جب جی چاہے ان سے ملنے چلا آئے۔ بارش تھم چکی تھی۔ سو وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ علیزے اسے باہر تک چھوڑنے آئی تھی۔

"تھینک یو علیزے' اچھا ہوا تم مجھے اندر لے آئیں' ورنہ کبھی بھی میں اتنے محبت کرنے والوں لوگوں سے نہ مل پاتا اور خاص کر ماما سے' تمہاری ماما دنیا کی بہترین ماما ہیں۔" وہ بہت خوش لگ رہا تھا۔

"مائیں تو ساری ہی بہترین ہوتی ہیں' لیکن میری ماما واقعی بہت نائس ہیں' جو بھی ان سے ملتا ہے' بہت امپریس ہوتا ہے۔" دھیمی مسکراہٹ سے وہ کہہ رہی تھی۔

وہ دونوں ابھی وہیں کھڑے تھے' جب گیٹ کھلا اور ایک خوب صورت سی لڑکی اندر داخل ہوئی تھی۔ پینٹ شرٹ میں ملبوس' ریشمی براؤن بال شانوں پہ جھول رہے تھے۔ بڑی بے نیازی سے علیزے کی طرف بڑھی تھی' مگر جیسے ہی حمزہ پہ نگاہ پڑی تو ٹھٹک کر وہیں رک گئی تھی' علیزے کو اس کی بے وقت کی آمد بہت کھلی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ حمزہ سے ملے' کیونکہ پتا ملتے ہی وہ اس سے بہت خائف تھا' لیکن اب وہ کیا کہہ سکتی تھی۔

"تم نے انٹروڈکشن نہیں کرایا علیزے۔" اس نے ایک ادا سے بال جھٹکے تھے۔

"او سوری... حمزہ احمد میرے یونیورسٹی فیلو ہیں اور یہ میری فرینڈ ہیں علینہ وقار۔" اس نے دونوں کا تعارف کرایا تھا۔

"ہیلو... حمزہ نائس ٹو میٹ یو۔" وہ ایک ادا سے اس کی طرف ہاتھ بڑھائے کھڑی تھی۔

"سیم ہیئر۔" اس نے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو یکسر انداز کر دیا تھا۔

"اوکے علیزے' میں چلتا ہوں' کل ملاقات ہوگی' اللہ حافظ۔" وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا گیٹ پار کر گیا تھا۔

"علیزے' یہ وہی حمزہ تھا نا جس نے تمہیں فون کیا تھا۔" علینہ ابھی بھی اس طرف دیکھ رہی تھی' جس طرف وہ گیا تھا۔

"ہاں وہی تھا' علینہ تم نے اسے فون کیا تھا۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی تھی۔

"ہاں کیا تھا' کیوں۔" وہ بہت ناگواری سے بولی تھی۔

"نہیں کرنا چاہیے تھا علینہ' اسے بہت برا لگا ہے' وہ اس قسم کا بھی نہیں ہے اور تم نے اس کا نمبر کہاں سے لیا۔" وہ اسے رسان سے سمجھانا چاہتی تھی۔

"وہ جس قسم کا بھی ہے' اسے اس قسم کا بننے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ نمبر بھی میں نے تمہارے ہی فون سے لیا تھا اور یقین کرو اسے آج برا لگا ہے نا کل بہت اچھا لگنے لگا اور رہی بات کہ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا تو میں تم سے زیادہ اچھی طرح سمجھتی ہوں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں' تم میری دوست ہو' دوست ہی بن کر رہو' ہیڈ ماسٹر بننے کی کوشش مت کرو پلیز' انڈر اسٹینڈ۔" بدتمیزی سے کہتی وہ گیٹ پار کر گئی تھی۔ علیزے گہری سانس لے کر رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

"ہیلو' ہیلو کدھر گم ہو بھئی۔" شہوز نے تکیے میں منہ چھپائے لیٹے ہوئے حمزہ کا کندھا ہلایا تھا۔ آج وہ یونیورسٹی نہیں آیا تھا اور اس کے بغیر شہوز کا پورا دن بہت بور گزرا تھا۔ اس لیے یونیورسٹی آف ہوتے ہی وہ فوراً" سیدھا حمزہ کے پاس چلا آیا تھا۔ کیونکہ اگر وہ دونوں ایک دن بھی ایک دوسرے سے نہ ملیں تو ان کا کھانا ہضم نہیں ہوتا تھا اور نہ ہی دن گزرتا تھا۔ شہوز کے پکارنے پر بھی وہ اسی طرح بے سدھ پڑا رہا تھا۔

"حمزہ کیا ہوا ہے' اس طرح کیوں لیٹے ہو' کوئی بات ہوئی ہے کیا۔" اب کے وہ پریشانی سے بولا تھا۔

"نہیں یار' ٹھیک ہوں میں' کیا بات ہونی ہے بھلا۔" وہ سیدھا ہو کر لیٹ گیا تھا۔

"پھر تمہارے چہرے پہ یہ بارہ کیوں بج رہے ہیں۔" شہوز نے اس کے چہرے کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"شہزی' میں نے تم سے علیزے کی فرینڈ علینہ وقار کا ذکر کیا تھا نا۔" حمزہ جانتا تھا کہ وہ جانے بغیر نہیں مانے گا۔ اسی لیے اسے بتانے لگا تھا اور ویسے بھی وہ دونوں کوئی بھی بات ایک دوسرے سے چھپاتے نہیں تھے۔

"ہاں کہا تو تھا' کیوں کیا ہوا ہے اسے۔" وہ بھی پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

"یار اس نے مجھے کل سے بڑا پریشان کر رکھا ہے۔" وہ دائیں ہاتھ سے اپنا ماتھا سہلانے لگا تھا۔ شہوز سمجھ گیا تھا کہ بات پریشانی کی ہے' کیونکہ یہ حمزہ کا انداز تھا کہ جب بھی وہ کبھی کسی پریشانی میں ہوتا تھا تو یوں ہی دائیں ہاتھ سے اپنی پیشانی سہلانے لگتا تھا اور اب بھی وہ یہی کر رہا تھا اور شہوز اچھی طرح اس کی عادات سے واقف تھا۔

"اس نے کل رات سے مجھے بہت تنگ کر رکھا ہے' کچھ سمجھ نہیں آ رہا کیا کروں' کل رات سے وہ مجھے لاتعداد کالز کر چکی ہے۔" وہ بہت پریشان لگ رہا تھا۔ وجیہہ چہرے سے پریشانی چھلک رہی تھی۔

"کیا کہتی ہے وہ۔" شہوز بھی اب سنجیدگی سے اس کی سننے لگا تھا۔

"بس اس کی ایک ہی رٹ ہے کہ آپ مجھے اچھے لگتے ہیں۔ میں آپ سے دوستی کرنا چاہتی ہوں۔ اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ آپ زبردستی کسی سے دوستی کر لیں' ضروری تو نہیں' اگر وہ آپ کو اچھا لگتا ہے تو آپ بھی اسے اچھے لگیں۔ جب میں نے اسے کہا کہ میں لڑکیوں سے دوستی نہیں کرتا تو کہتی ہے کہ علیزے بھی تو لڑکی ہے۔ اب میں اسے کیسے سمجھاؤں اور کیوں بتاؤں کہ اس کی بات الگ ہے۔ وہ میرے لیے بہت خاص ہے۔" وہ ساری تفصیل بتا کر اسے بتاتا چلا گیا تھا۔

"تو تم ایسا کرو کہ اسے بتا دو کہ علیزے سے تمہارا کیا تعلق ہے۔" شہوز نے بڑی آسانی سے اس کے مسئلے کا حل نکال لیا تھا۔

"قطعی نہیں' وہ بہت تیز لڑکی ہے' نہ جانے اس بات کو کس انداز سے لے اور علیزے سے کیا کچھ کہہ دے۔ اس طرح تو جو تعلق ابھی پوری طرح سے بنا ہی نہیں ہے' وہ بننے سے پہلے ہی ختم ہو جائے گا' ہرگز نہیں۔ میں یہ رسک نہیں لے سکتا۔" حمزہ نے فوراً" ہی اس کی بات کو رد کر دیا تھا۔

"تو پھر ایسا کرو تم اس سے دوستی کر لو' دوستی کرنے میں حرج ہی کیا ہے' اسپیشل فیلنگ تو تم صرف علیزے کے لیے ہی رکھتے ہو نا۔" شہوز نے بڑا مخلصانہ مشورہ دیا تھا جو حمزہ کو تپا گیا تھا۔

"میں ایسا نہیں کر سکتا شہزی۔" حمزہ نے کہا۔

"او کے مت کرو' پھر ایسا کرو اسے علیزے کے بارے میں بتا دو' پھر دیکھنا جب اسے پتا لگے گا تو وہ جس جوش سے تمہاری طرف بڑھی ہے نا' اس سے کہیں زیادہ تیزی سے پیچھے ہٹ جائے گی اور اب بس کرو یار' چھوڑ اب۔ تم اٹھ رہے ہو یا اکیلے میں ہی باہر جا کر کھانا کھا لوں' قسم سے یار' مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے۔" وہ اچھا بھلا بات کرتے کرتے پھر سے بھوک کی دہائی دینے لگا تھا تو حمزہ کو بھی اٹھنا ہی پڑا تھا' ورنہ بھوک اسے قطعی نہیں تھی۔

☼ ☼ ☼

"علیزے پلیز رکیں۔" وہ کلاس روم سے نکل کر لائبریری کی طرف جا رہی تھی کہ شہوز کی آواز نے اس کے قدم روک لیے۔ مڑ کر دیکھا تو حمزہ بھی ساتھ تھا۔ اسے رکتا دیکھ کر وہ دونوں تیزی سے اس کی طرف بڑھ آئے تھے۔

"کیسی ہو علیزے۔" حمزہ نے پوچھا تھا۔ اسے دیکھ کر حمزہ کی آنکھوں میں جو چمک اتر آئی تھی وہ اکثر اسے ڈسٹرب کر دیا کرتی تھی۔

"ٹھیک ہوں۔" وہ ان روشنیوں کی تاب نہ لاتے ہوئے نگاہیں جھکا گئی تھی۔

"کہاں ہیں بھئی آپ' ہم صبح سے آپ کو ڈھونڈ رہے ہیں۔" اس طلسم کو شہوز کی آواز نے توڑا تھا۔

"خیریت' کوئی کام تھا۔" وہ حیران سی پوچھ رہی تھی۔

"جی جناب' بالکل خیریت ہے' بس آپ کو ایک انوی ٹیشن دینا ہے۔" شہوز نے فضول میں اپنے لہجے میں سسپنس پیدا کیا تھا۔

"کس قسم کا انوی ٹیشن۔"

"دراصل کل میرا برتھ ڈے ہے اور فرینڈز کے کہنے پہ میں نے یہیں کینٹین میں ایک چھوٹی سی گیٹ ٹو گیدر ارینج کی ہے۔ آپ سے گزارش ہے کہ آپ اس میں شرکت فرما کر اس تقریب کو رونق بخشیں۔" وہ شرارتی انداز میں کہتا ہوا کورنش بجا لانے والے انداز میں اس کی طرف جھکا تھا۔ اس کے اس طرح کہنے پر جہاں مسکراہٹ حمزہ کے چہرے پہ پھیلی تھی وہیں پر علیزے بھی بے ساختہ ہنس پڑی تھی۔ حمزہ کو اس پل یوں لگا کہ جیسے اس کے اردگرد روشنی سی کوند گئی ہو۔

"تو پھر آپ کل آ رہی ہیں نا علیزے۔" شہوز نے پوچھا تھا۔

"لیکن شہوز بھائی' وہاں سارے آپ کے فرینڈز ہوں گے' تو میں وہاں کیا کروں گی۔" وہ ذرا سا ہچکچائی تھی۔

"اب آپ مجھے ناراض کر رہی ہیں' آپ بھی تو ہماری دوست ہیں' اگر آپ اس لیے پریشان ہیں کہ گفٹ دینا پڑے گا' تو آئی سویئر گفٹ نہیں چاہیے' بس آپ آ جائیے گا۔" وہ شرارت سے گویا ہوا تھا۔ کیونکہ علیزے کے انکار پہ اس نے حمزہ کا فیوز ہوتا چہرہ دیکھ لیا تھا۔

"علیزے آپ کل آ رہی ہیں۔ یہ ایک چھوٹی سی خواہش ہے ہماری یا پھر ریکوئسٹ' ہم آپ کا انتظار کریں گے۔" حمزہ دھیمے سے کہہ کر وہاں رکا نہیں تھا' بلکہ تیزی سے چلا گیا تھا اور شہوز بھی اس کے پیچھے ہو لیا تھا' کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اب علیزے ضرور آئے گی۔ علیزے کو اس کے لہجے کا استحقاق بہت سی باتوں کا احساس دلا گیا تھا۔ وہ اس کے قدموں کے نشانوں کو دیکھتی دل ہی دل میں وہاں جانے کا فیصلہ کر چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

فون کی بیل مسلسل ہو رہی تھی' لیکن کی بورڈ پہ چلتی انگلیوں کی رفتار میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ کیونکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اسکرین پہ آنے والا

نمبر کس کا ہے۔ فون بج بج کر خود ہی بند ہو گیا تو وہ ایک نظر فون پہ ڈال کر پھر سے اپنا کام کرنے لگا۔ کل سے اس نے کوئی کال ریسیو نہیں کی تھی۔ بلکہ کل سے مسلسل فون آف کر رکھا تھا مگر آج پھر بجتے فون نے کام سے اس کی یکسوئی ختم کر دی تھی۔ ایک دو منٹ کے وقفے سے فون نے پھر سے بجنا شروع کر دیا تھا۔ اب کے وہ لیپ ٹاپ آف کر کے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"ہیلو۔" غصہ اور بے زاری اس کی آواز میں بہت نمایاں تھی۔

"اتنی دیر سے فون کر رہی ہوں، آپ اٹھاتے کیوں نہیں ہیں۔" دوسری طرف سے بہت اپنائیت سے کہا گیا تھا۔

"دیکھیے مس۔" حمزہ نے کہنا چاہا۔

"علینہ وقار۔" وہاں سے بہت نخرے سے اپنا نام بتایا گیا تھا۔

"جی مس علینہ وقار۔" لہجے میں طنز خود ہی اتر آیا تھا۔

"آخر آپ کو بات سمجھ کیوں نہیں آتی ہے، جب میں آپ سے بات کرنا نہیں چاہتا تو آپ بار بار مجھے کیوں تنگ کرتی ہیں۔" حمزہ نے غصے سے کہا تھا۔

"جب مجھے بات سمجھ نہیں آتی تو آپ بار بار مجھے کیوں سمجھاتے ہیں۔" وہاں اب بھی وہی انداز تھا۔

"مجھے تو یہ سمجھ نہیں آتا کہ آپ کس قسم کی لڑکی ہیں۔" وہ جیسے تھک کر بولا تھا۔

"میں جس قسم کی بھی لڑکی ہوں، بس اتنا سمجھ لیں کہ جو کہتی ہوں وہ کرتی ضرور ہوں اور آپ بھی کس قسم کے انسان ہیں، ایک لڑکی آپ کو خود اپنے منہ سے کہہ رہی ہے کہ آپ مجھے اچھے لگتے ہیں، خود آپ کی طرف ہاتھ بڑھا رہی ہے کہ آپ ہیں کہ نخرے کر رہے ہیں۔ کہیں آپ کو علیزے نے تو منع نہیں کیا۔" بات کرتے کرتے اس کے لہجے میں شک سا اتر آیا تھا۔

"جی نہیں، ایسی کوئی بات نہیں، علیزے کا ذکر آپ بیچ میں مت لائیں، جب آپ کو اپنی خواہش پوری ہوتی نظر نہ آئی تو اس پر الزام لگا دیا۔" وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ علیزے کے بارے میں کوئی الٹی سیدھی بات کرے۔

"تو پھر آخر کیا بات ہے، آپ مجھ سے اتنا بے زار کیوں رہتے ہیں، پتا ہے میں نے آپ کی وجہ سے یونیورسٹی میں مائیگریشن کرا لیا ہے اور کل میرا فرسٹ ڈے ہے۔" وہ بہت خوش تھی۔

"مجھ پہ یہ احسان کرنے کی کیا ضرورت تھی۔" وہ اب مکمل طور پر بے زار ہو چکا تھا۔ کل شہوز کی برتھ ڈے پارٹی تھی اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس میں کوئی بدمزگی ہو اور پھر وہاں علیزے بھی ہوگی۔

"بس میرا دل چاہا تو کر دیا، چلیں آپ بھی اب مجھ پہ ایک احسان کر دیں، کل یونیورسٹی میں میرا پہلا دن ہے اگر آپ نے مجھے دیکھ کر منہ نہ پھیرا تو میں سمجھوں گی کہ آپ نے میری آفر قبول کر لی ہے اور اگر منہ پھیر لیا تو میں آئندہ کبھی بھی آپ کو تنگ نہیں کروں گی، ٹھیک ہے۔" اس نے اپنی طرف سے ایک آسان سا حل پیش کیا تھا۔

"ٹھیک ہے، مجھے منظور ہے، لیکن وعدہ کریں، اس کے بعد مجھے تنگ نہیں کریں گی۔" حمزہ کو بھی اس کا آئیڈیا اچھا لگا، کم از کم کسی کو دیکھنا نہ دیکھنا تو اس کے اپنے اختیار میں تھا اور اسے یقین تھا کہ کل کے بعد وہ اسے کبھی تنگ نہیں کرے گی۔

"وعدہ رہا میں آپ کو پھر تنگ نہیں کروں گی۔" جانے حمزہ کے معاملے میں اس کی ساری اکڑ کہاں چلی گئی تھی۔

"اوکے۔" حمزہ نے مزید اس کا جواب سنے بغیر ہی فون بند کر دیا تھا۔ اور اطمینان سے پھر سے بیٹھ کر اپنا کام کرنے لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

صبح وہ بہت دل لگا کر تیار ہوئی تھی۔ بلیک اور بلو کنٹراس کے سوٹ میں نکھری نکھری سی علیزے بہت فریش لگ رہی تھی۔ حمزہ نے پہلی بار چاہت کا یقین کا کوئی پھول اس کے ہاتھ میں تھمایا تھا۔ وہ بہت خوش

تھی۔ وہ بھی اسے اسی شدت سے چاہتا ہے اس کی آنکھوں میں بھی محبت کو پا لینے کی خواہش کروٹیں لیتی ہے۔ یہ احساس ہی خوش کن تھا۔ آج اس نے بنا کسی چوں چرا کے بابا کے کہنے پر ناشتے میں دودھ بھی پی لیا تھا۔ شرارت سے معاذ کے بال بھی بکھیرے تھے۔ جس پر وہ بہت چڑا بھی تھا۔ ماما، بابا کو خدا حافظ کہہ کر ان کی دعائیں سمیٹ کر جب وہ یونیورسٹی پہنچی تو اسے ہر چیز نئی نئی سی لگ رہی تھی۔ ایک ہی رات میں اس کے چہرے پر گلاب سے کھل گئے تھے۔ بڑا سا کلف لگا دوپٹہ سنبھالتی اعتماد سے چلتی علیزے کو دیکھتے ہی سامنے کھڑے حمزہ کی آنکھوں میں ایسی روشنی اتر آئی تھی۔ جسے دیکھ کر علیزے ہمیشہ پلکیں جھکا جایا کرتی تھی۔ کلاس روم تک پہنچ کر نظروں کی تپش پر جب اس نے مڑ کر دیکھا تو محویت سے تکتے حمزہ کو دیکھ کر اس کے چہرے کے گلابوں میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ مسکراتی ہوئی مڑی اور کلاس میں چلی گئی تھی۔

حمزہ کا مسکراتا چہرہ سامنے سے آتی علینہ کے سامنے تھا۔ اس مسکراہٹ کو اس نے اپنے لیے سمجھا تھا۔ اسے اپنی منزل بے حد قریب محسوس ہوئی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ حمزہ کی طرف جاتی شہوز کے بلانے پر وہ تیز تیز قدموں سے چلتا کلاس روم کی طرف چلا گیا تھا۔

"ابھی تو پورا دن پڑا ہے بعد میں مل لوں گی۔" وہ دل ہی دل میں سوچتی آگے بڑھ گئی تھی اور حمزہ دھنک کے رنگوں میں بسا چہرہ نگاہوں میں لیے کلاس روم میں جا بیٹھا تھا۔ مگر اسے یہ خبر نہیں تھی کہ اس کا مسکراتا چہرہ کسی اور کو کیا معنی دے گیا ہے۔

☼ ☼ ☼

کوئی گیارہ بجے کے قریب علیزے کلاس لے کر نکلی تو کلاس روم کے باہر علینہ کھڑی تھی اور کسی لڑکی سے علیزے کے ہی بارے میں پوچھ رہی تھی۔ علیزے اسے دیکھ کر حیران رہ گئی کیونکہ اس دن کے بعد سے اس کی علینہ سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔

"ہائے علیزے۔" وہ کہتی ہوئی اس کے پاس آگئی تھی۔

"علینہ تم یہاں کیسے۔" جانے کیوں علیزے کو اس کا یہاں آنا اچھا نہیں لگا تھا۔

وہ جانتی تھی کہ وہ اب حمزہ سے ملنے کی ضد کرے گی۔ مگر وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ بالا ہی بالا تمام پرابلمز خود ہی حل کر چکی ہے۔

"میں نے یہاں انگلش ڈپارٹمنٹ میں مائیگریشن کرا لیا ہے۔" وہ مسکرا کر بولی تھی۔

"علیزے، حمزہ کا پتا ہے کہاں ہے وہ؟ کب سے اسے ڈھونڈ رہی ہوں۔ حالانکہ اسے بتایا بھی تھا کہ آج یونیورسٹی میں میرا فرسٹ ڈے ہے۔" وہ ادھر ادھر نگاہ دوڑا رہی تھی۔

"اسے پتا ہے تمہارے یہاں آنے کا۔" اس کے گرد جیسے اندھیرا سا چھا گیا تھا۔

"ہاں اس نے تمہیں بتایا نہیں اچھی دوستی ہو گئی ہے ہماری۔"

اس کی آواز میں پا لینے کا غرور سا تھا۔

"میں نے تو تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ علینہ وقار زیر کرنے کا ہنر جانتی ہے۔"

اس نے بہت غور سے علیزے کا دھواں ہوتا چہرہ دیکھا تھا۔ لہجے میں غرور کہیں زیادہ بڑھ گیا تھا۔

"علیزے، آپ یہاں کھڑی ہیں اور وہاں سب لوگ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"

شہوز اسے ڈھونڈتا ہوا یہاں آن پہنچا تھا۔

"یہ!!!......" علینہ کو دیکھ کر وہ رک سا گیا تھا۔

اتنا مکمل حسن دیکھ کر وہ مبہوت ہی تو رہ گیا تھا۔

"مجھے علینہ وقار کہتے ہیں۔" وہ تنفری بولی تھی۔

"او تو آپ ہیں علینہ وقار" وہ دل ہی دل میں اسے سراہتا ہوا معنی خیزی سے بولا تھا۔

"مجھے شہوز عباس کہتے ہیں۔ آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں۔"

شہوز نے تعارف کے ساتھ ہی اسے دعوت بھی دی تھی۔

"لیکن کہاں۔" اس نے اک ادا سے بالوں میں انگلیاں پھیری تھیں۔
"دراصل میرا برتھ ڈے ہے۔ تو کینٹین میں فرینڈز کی ایک گیٹ ٹو گیدر ہے۔ علیزے کو بھی اسی سلسلے میں بلانے آیا تھا۔ آپ بھی چلیں۔"
"علیزے آپ کیا سوچ رہی ہیں۔" وہ اسے بتاتے بتاتے علیزے کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ جو اتنی دیر سے خاموش کھڑی تھی۔
"حمزہ بھی وہاں پر ہے۔" علیزے کے کچھ بھی کہنے سے پہلے ہی وہ بول پڑی تھی۔
"ہاں وہیں پر ہے۔ آپ چل رہی ہیں۔" شہروز نے کہا تھا۔
"شیور کیوں نہیں۔ چلیں" بھلا ایسا ہو سکتا تھا کہ حمزہ وہاں تھا اور وہ نہ جاتی۔
"علیزے، چلیں۔" شہروز ایک بار پھر اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔
"اں' ہاں چلیں۔" وہ ایک خواب کی سی کیفیت میں ان دونوں کے پیچھے چل پڑی تھی۔
کینٹین پہنچنے تک ان دونوں نے آپس میں کیا باتیں کی تھیں اس نے کچھ نہیں سنا تھا اس کے کانوں میں بس علینہ کی ہی باتیں گونج رہی تھیں۔ جو اس نے حمزہ کے متعلق کہیں تھیں۔
"ہماری اچھی دوستی ہوگئی ہے اس نے تمہیں نہیں بتایا۔ اسے پتا تھا کہ آج میرا فرسٹ ڈے ہے۔"
وہاں کینٹین میں سب لوگ ہی ان کے منتظر تھے۔ علینہ کو ساتھ دیکھ کر حمزہ کی آنکھوں میں غصے کی لہر آئی تھی۔ مگر دوسرے ہی پل وہ دوستوں کا خیال کرکے نارمل ہو گیا تھا۔
"ارے علیزے اب آجائیں بھئی۔ کب سے آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔"
"ادھر آئیں بیٹھیں۔" حمزہ نے علینہ کو قطعی نظر انداز کرکے علیزے سے کہا تھا۔
وہ چاہتا تھا کہ وہ اس کے برابر بیٹھے لیکن وہاں علینہ بنا کہے ہی بیٹھ چکی تھی۔ علیزے نے ایک خاموش نگاہ اس پہ ڈالی اور سامنے والی چیئر پہ جا بیٹھی تھی۔ علینہ کے چہرے پہ چھائی خوشی اور علیزے کے چہرے کی خاموشی حمزہ کو بہت کچھ سمجھا گئی تھی۔
علینہ اپنی فطری بولڈنیس کی وجہ سے ان کے گروپ میں چند ہی لمحوں میں مکمل مل گئی تھی۔ جبکہ علیزے اپنی بھرپور پرسنالٹی کے باوجود ان چند لمحوں میں ہی پس منظر میں چلی گئی تھی۔ وہاں تقریباً" سارے ہی ارینجمنٹ مکمل تھے۔ ٹیبل پہ بڑا سا کیک بھی رکھا تھا وہاں پر اس کے فرینڈز کے علاوہ جتنے لوگ بھی کینٹین میں موجود تھے انہیں جب پارٹی کا پتا لگا تو وہ سب ہی اس کی برتھ ڈے سیلبریٹ کرنے آن پہنچے تھے۔ جب کیک کٹ چکا تو علینہ نے سرو کرنے کی ذمہ داری خود لی تھی اور سب کو سرو کرنے لگی تھی۔
"چلیں اب کچھ انجوائے منٹ ہو جائے۔" شہروز نے سب کو ہی اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔
"یقیناً" آپ لوگ جانتے ہیں کہ مائی بیسٹ فرینڈ حمزہ احمد کتنا اچھا ماؤتھ آرگن بجاتے ہیں۔ سو آج میری پارٹی میں وہ میری فرمائش پہ کوئی اچھی سی دھن سنائیں گے۔"
شہروز نے بہت خوبصورتی سے اسے گھیرا تھا۔ وہ اسے روکنا چاہ رہا تھا۔ لیکن سب لوگوں نے شہروز کی تائید کی تھی۔
"لیکن میں۔۔۔" اس نے کچھ کہنا چاہا تھا۔
"پلیز سنا دیجیے نا۔ سب اتنا اصرار کر رہے ہیں۔" علینہ نے بہت مان سے فرمائش کی۔ علیزے کے دل میں بہت زور سے جیسے کوئی کنکر سا چبھا تھا۔ وہ اٹھنا ہی چاہتی تھی کہ حمزہ نے اسے روک لیا تھا اور اس کی آواز سن کر قدم اٹھنے سے ہی انکاری ہوگئے تھے۔ اسے دوبارہ بیٹھنا پڑا تھا اس نے "جگنو اور آنچل" کی دھن اپنے ماؤتھ آرگن پر سنا کر گویا ماحول پر ایک سحر سا طاری کر دیا تھا۔ وقفے وقفے سے اس کی جگنو بھری نگاہیں علیزے کے صبیح چہرے پر بھی کئی بار ٹھہری تھیں اور اتنی ہی بار علینہ نے بے چینی سے پہلو بدلا تھا۔ پھر سب نے ہی شہروز کی فرمائش پہ کچھ نہ کچھ سنایا تھا۔

"شہروز بھائی۔ میں چلوں گی میری کلاس ہے۔" علیزے گھڑی دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔
"ارے یار' چھوڑو نا آج کلاس مس کر دو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"
اس کی دوست مدیحہ نے اسے روکنا چاہا تھا۔
"نہیں یار۔ سر شمس کی کلاس ہے اور تمہیں پتا تو ہے وہ کتنے سخت ہیں۔"
اور وہ اپنا بیگ اور کتابیں اٹھائے کھڑی تھی۔
"اور ویسے بھی اتنے سارے لوگوں کی موجودگی میں آپ کو میری کمی بھلا کہاں محسوس ہوگی۔"
وہ کہہ کر رکی نہیں تھی بلکہ تیزی سے وہاں سے چلی گئی تھی اور اس کی یہ سرگوشی حمزہ کو بے چین کر گئی تھی۔ چند لمحوں بعد ہی وہ بھی وہاں سے اٹھ آیا تھا اور علینہ پھر بھلا وہاں کیا کرتی اور یوں آہستہ آہستہ سب لوگ ہی اٹھتے چلے گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

جس شخص کو دیکھ کر ایسا لگے کہ یہی زندگی کا حاصل ہے خوشیوں کا محور ہے۔ ایسا بھی لگے کہ پوری دنیا میں صرف اس ایک شخص پر ہی اعتبار کیا جا سکتا ہے اور پھر ایسا ہو کہ بے اعتباری کے کنکر یکے بعد دیگرے دل میں چبھتے چلے جائیں تو دل سے لہو رسنے لگتا ہے علیزے کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ جو محبت کے جگنو ابھی اس کے ہاتھوں میں تھمائے گئے تھے وہ ایک ہی جھٹکے میں اس بری طرح سے واپس کھینچ لیے گئے تھے کہ وہ فقط خالی ہتھیلی کو دیکھتی ہی رہ گئی تھی اور پھر علینہ کس طرح ہر دم دوست' دوست کی مالا جپنے والی اسے ہر بات سے بری الذمہ ٹھہرا کر خود ہی سارے پرابلمز حل کر گئی تھی۔ آج وہ کتنے شوق سے یونیورسٹی گئی تھی کہ یقیناً" آج کا دن بھی شہروز کی برتھ ڈے پارٹی کی وجہ سے بہت اچھا گزرے گا مگر وہاں علینہ کو دیکھ کر اور پھر اس کے چند جملوں کی بازگشت نے اسے پورا وقت پریشان رکھا۔ اس کے خواب اس کی پلکوں پر ہی دم توڑ گئے تھے۔
"تو تم بھی وہی عام سے نکلے حمزہ احمد میں نے تو تمہیں بہت خاص جانا تھا۔" ضبط سے اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔
ہم لڑکیاں بھی کتنی عجیب ہوتی ہیں نا۔ بالکل اس پیاسی زمین کی طرح جو بارش کے پہلے قطرے سے لے کر آخری قطرے کو بھی اپنے اندر جذب کر لینا چاہتی ہے لیکن چند دنوں بعد اس کی پیاس پھر سے عود آتی ہے۔ ان قطروں کو اپنے اندر جذب کرتے کرتے یہ بھول جاتی ہے کہ اس بارش کو کہیں اور بھی برسنا ہے اور میں بھی شاید یہ بھول گئی تھی کہ وہ بھی ایک ایسا ہی مرد ہے جو ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتا ہے۔ پر وہ اس دل کا کیا کرتی کہ جس کے شہر کا ایک وہی مکین تھا۔ لیکن اس نے اب جان لیا تھا کہ یہ شہر اگر خالی رہے تو زیادہ بہتر ہے۔

☼ ☼ ☼

اس نے جلدی سے بالوں میں برش پھیر کر واپس رکھا' ایک تنقیدی نگاہ آئینے پہ ڈالی بلیو جینز اور بلیک شرٹ میں وہ ہمیشہ کی طرح بہت وجیہہ لگ رہا تھا۔ مطمئن ہو کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ کی اسٹینڈ سے گاڑی کی چابی اٹھائی۔ بوا کو بتانے کے لیے ادھر ادھر نگاہ کی لیکن وہ کہیں نظر نہ آئیں۔ کچن میں جھانکا وہاں بھی نہیں تھیں۔ وہ لاؤنج سے باہر نکل آیا۔ باہر اکتوبر کی اوائل دنوں کی بہت سہانی شام تھی۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے نے اس کے پرجوش استقبال کیا تھا۔ مسکراتے لبوں کے ساتھ سامنے نگاہ کی تو بابا لان چیئر پہ بیٹھے تھے اور بوا انہیں چائے سرو کر رہی تھیں۔ بابا کی نظر اس پہ پڑی تو مسکرا کر اسے پکارا تھا۔ وہ ان کے پاس چلا آیا تھا۔
"السلام علیکم بابا۔" اس نے بابا کی پیشانی کو چومتے ہوئے شام کا سلام کیا تھا۔
"وعلیکم السلام جیتے رہو۔" جواباً" بابا نے بھی اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھامتے ہوئے اس کی پیشانی کا

بوسہ لیا تھا اور اسے دعا دی تھی وہ باپ بیٹا ایسی ہی محبت کرتے تھے ایک دوسرے سے "ماما کی ڈیتھ کے بعد روتے بلکتے حمزہ کو انہوں نے ہی اپنے محبت بھرے سینے میں بھینچ لیا تھا اور محبت سے سینچ کر ہی اتنا مضبوط بنایا تھا۔ یہ ان ہی کا بخشا ہوا اعتماد تھا جو آج وہ اتنا کامیاب تھا۔

"کہاں کے ارادے ہیں برخوردار۔" بابا نے اس کی تیاری پہ نظر ڈالتے ہوئے کہا تھا۔

"بابا سچ سچ بتاؤں۔" اس نے ایک نظر بابا کے چہرے پر ڈالی تھی۔

"اگر بتانا چاہو تو۔" انہوں نے اخبار لپیٹ کر ایک طرف رکھا اور پوری توجہ سے اس کی بات سننے لگے تھے۔

"بابا" میں علیزے کی طرف جا رہا تھا۔ آج وہ یونیورسٹی نہیں آئی تھی تو اس لیے سوچا کہ ـــــ" حمزہ نے بات کرتے کرتے انہیں دیکھا کہ مبادا انہیں برا نہ لگ جائے۔

"علیزے شہاب۔"

علیزے کے نام پہ حمزہ کی آنکھوں میں چمکتے جگنو ان سے پوشیدہ نہ تھے۔ اس لیے انہوں نے تصدیق کرنا ضروری سمجھا تھا۔ کیونکہ حمزہ نے انہیں علیزے کے بارے میں بتا رکھا تھا اور یہ بھی کہ وہ ان کے گھر بھی جا چکا ہے۔

"جی بابا!" وہ بلاوجہ ہی فرش کو گھورنے لگا تھا۔

اس سے باپ سے نگاہیں ملانا مشکل لگ رہا تھا۔

"کیا وہ بہت اچھی ہے۔" انہوں نے چائے کا کپ ہونٹوں سے لگا لیا تھا۔

بیٹے کے چہرے کی چمک انہیں بہت کچھ سمجھا گئی تھی۔

"نہوں۔ بہت اچھی ہے۔"

دل میں اس کی خوبصورت ہنسی اب بھی گونجتی ہوئی جلترنگ بجا رہی تھی۔

"تو پھر مجھے کب ان کے گھر لے کر چل رہے ہو۔ میں بھی تو دیکھوں آخر وہ کیسی ہے کہ جس کے نام سے میرے بیٹے کے چہرے پر یوں روشنی پھیلتی ہے۔"

انہوں نے فوراً" ہی دل میں کوئی فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کے لاڈلے بیٹے کے چہرے پر یہ روشنی' یہ خوشی ہمیشہ یونہی پھیلی رہے۔

"رئیلی بابا' آپ میرے ساتھ چلیں گے۔" وہ خوشی کے ساتھ تھوڑا بے یقین بھی ہوا تھا۔

"کیوں بھئی۔ کیا میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتا۔" انہوں نے خالی کپ میز پہ رکھا تھا۔

"تو پھر ٹھیک ہے ابھی چلیں اس وقت انکل بھی گھر پر ہوں گے۔ ان سے بھی مل لیجیے گا۔ مگر پلیز ابھی کوئی بھی بات مت کیجیے گا۔" وہ فوراً" ہی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"کیا مطلب' ابھی کوئی بات کیوں نہ کروں۔" وہ اٹھتے سے پھر بیٹھ گئے تھے۔

"ابھی نہیں نا بابا بس جب بات کرنی ہو گی میں آپ کو تب خود ہی بتادوں گا۔ آپ ابھی چلیں تو سہی۔" حمزہ نے ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں کھڑا کر دیا تھا۔

"اچھا یار۔ اٹھتا ہوں۔ کپڑے تو بدل لوں میں دو منٹ میں ابھی آتا ہوں۔"

وہ ہاتھ چھڑا کر اندر چلے گئے تھے۔ وگرنہ شاید وہ انہیں اسی حلیے میں لے جاتا اور پھر جتنی دیر وہ اندر رہے۔ اس نے گاڑی میں ان کا انتظار کرتے ہوئے جانے کتنی بار ہارن بجایا تھا۔

جب وہ لوگ وہاں پہنچے تو شہاب صاحب اور ماما چائے پی رہے تھے۔ معاذ حسب معمول عجلت میں چائے پی رہا تھا اور کہیں جانے کو تیار کھڑا تھا۔ البتہ علیزے وہاں موجود نہیں تھی۔ معاذ نے حمزہ کو دیکھا تو اس کے استقبال کو آگے بڑھ آیا تھا۔

"بابا یہ علیزے کے بابا ہیں شہاب زیدی۔" حمزہ نے ان کا تعارف کرایا تھا۔

"شہاب زیدی۔ اگر میری یادداشت ٹھیک کام کر رہی ہے تو تم وہی شہاب زیدی ہو نا جو اسکول میں میرے برابر بیٹھا کرتے تھے اور جسے سر حمید ناصر سے

بہت ڈر لگتا تھا۔"

انہوں نے ہنستے ہوئے چھیڑا تھا۔

"احتشام احمد وہی احتشام احمد نا جس کی آنکھیں ہمیشہ ایک انوکھی شرارت کے عکس سے چمکتی رہتی تھیں اور جو اپنے ساتھ بیٹھنے والوں کے ساتھ ساتھ ٹیچرز کا بھی ناک میں دم کر دیا کرتا تھا۔" وہ بھی انہیں پہچان کر بے اختیار ہی ان کی طرف بڑھ آئے تھے۔ ان کے قریب آتے ہی احتشام احمد نے انہیں کھینچ کر سینے سے لگا لیا تھا اور پھر کتنی ہی دیر دونوں دوست ایک دوسرے کو بھینچے گلے شکوے کرتے رہے۔ ان دونوں نے اکٹھے ہی میٹرک کیا تھا۔ کالج میں سبجیکٹ چینج ہونے کی وجہ سے الگ الگ ہوئے پہلے تو کبھی کبھار ملاقات ہو جاتی تھی۔ مگر بعد میں جب پریکٹیکل لائف میں آئے تو یہ کبھی کبھار کی ملاقات بھی ختم ہوئی اور آج اتنے دنوں بعد ایک دوسرے سے مل کر دونوں کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ کتنی ہی دیر ایک دوسرے کے گلے لگے کھڑے رہے۔

"او بے وقوف لڑکے تم نے بتایا کیوں نہیں کہ تمہارے انکل شہاب زیدوا کے شہاب زیدی ہیں۔"

انہوں نے حمزہ کو لتاڑا تھا۔

"بابا مجھے کیا پتا تھا کہ آپ دونوں دوست ہیں۔" اس نے فوراً" ہی اپنا دفاع کیا تھا۔

"ہاں واقعی یار اسے کیا پتا تھا۔ لیکن یہ بات تو طے ہے کہ ہمیں ملانے کا سارا کریڈٹ اسے ہی جاتا ہے۔" انکل نے اس کی پیٹھ پہ تھپکی دی تھی۔

"ارے میں تم لوگوں کا تعارف کرانا تو بھول ہی گیا۔ یہ میری بیگم مسز آصفہ شہاب اور میرا بیٹا ہے معاذ ایم کام کرنے کے بعد آج کل محترم نوکری کے لیے دفتروں کی خاک چھانتے پھر رہے ہیں اور علیزے کو تو تم جانتے ہی ہو۔" انہوں نے تعارف کرایا تھا۔ معاذ بھی انہیں بالکل حمزہ کی طرح ہی لگا تھا۔ انہوں نے بے اختیار ہی اسے بانہوں میں بھرا اور اس کی پیشانی چوم کر اسے دعائیں دی تھیں۔ حمزہ تو جب سے آیا تھا مستقل ماما کے پہلو سے لگا بیٹھا تھا اور ساتھ ساتھ معاذ سے باتیں بھی جاری تھیں۔

"علیزے کہاں ہے۔" بابا نے حمزہ کے دل کی بات کہہ دی تھی۔

"وہ اپنے کمرے میں پڑھ رہی ہے بھائی صاحب' جاؤ معاذ بہن کو بلا کر لاؤ۔"

ماما نے جواب دینے کے ساتھ ہی معاذ کو دوڑایا تھا۔

تقریباً" پانچ منٹ بعد ہی وہ معاذ کے ساتھ لڑتی ہوئی آئی تھی کہ اگر مہمان آئے ہیں تو ماما کو بلاؤ۔ مجھے کیوں تنگ کر رہے ہو۔ کیونکہ معاذ نے اسے نہیں بتایا تھا کہ کون آیا ہے اور جب اس کی نظر حمزہ پہ پڑی تو وہ خاموش سی ہو گئی تھی۔ آنکھوں میں پانی اترا تو وہیں دل میں بھی چبھن سی ہونے لگی تھی۔ حمزہ کی پر شوق نگاہوں کے تعاقب میں بابا نے نگاہ کی تھی تو انہیں علیزے بہت پیاری لگی تھی۔ بابا نے جب علیزے کا تعارف کرایا تو اس نے حمزہ کو قطعی نظرانداز کرتے ہوئے صرف بابا کو ہی سلام کیا تھا۔ سلام کا جواب دے کر انہوں نے اسے اپنے پاس بٹھا لیا تھا اور پھر اس سے اس کی پڑھائی وغیرہ کے بارے میں پوچھنے لگے تھے۔ ماما نجانے کب ان لوگوں کو باتیں کرتا چھوڑ کر کچن میں چائے وغیرہ کا انتظام کرنے چلی گئی تھیں۔

"اچھا بیٹا یہ تو بتاؤ یہ حمزہ کیسا اسٹوڈنٹ ہے۔"

باتیں کرتے کرتے انہوں نے اچانک ہی علیزے سے پوچھا تھا۔ علیزے نے گھبرا کر حمزہ کو دیکھا تھا کہ کیا کہے۔ اس کے چہرے پہ ایک شریر سی مسکراہٹ رقصاں تھی اور آنکھوں میں چمکتے وہی جگنو جو ہمیشہ ہی علیزے کو ڈسٹرب کر دیا کرتے تھے۔

"گھر میں تو میرے سامنے بڑی پڑھائیاں کرتا ہے ہر وقت کمپیوٹر سے چپکا رہتا ہے۔ پوچھنے پر پتا چلتا ہے کہ برخوردار نوٹس بنا رہے ہیں شہروز کو اکثر آتا رہتا ہے۔ پر وہ بے چارہ اس کی دوستی میں ہمیشہ ہی مارا جاتا ہے جب بھی کوئی بات ٹھیک سے بتانے لگتا ہے اس کی ذرا سی آنکھیں دکھانے پر فوراً" ہی بات بدل جاتا ہے۔ اس لیے میں نے سوچا آج تم سے پوچھوں۔" وہ مسکرائے تھے۔

"انکل یونیورسٹی میں تو ٹھیک ہیں۔ باقی کلاس کا مجھے زیادہ نہیں پتا۔ کیونکہ یہ ایم بی اے میں ہیں اور میں بی۔ ایس سی آنرز کر رہی ہوں۔ ہاں ان کے ٹیچرز وغیرہ بہت تعریف کرتے ہیں۔ پر ٹیچرز کا کیا ہے وہ تو ہر اسٹوڈنٹ کی ہی تعریف کرتے ہیں۔ تاکہ ان کی حوصلہ افزائی ہو۔" وہ شرارت سے مسکرائی تھی۔

میرون کلر کے سوٹ میں ملبوس شرارت سے بولتی ہوئی وہ اس لمحے حمزہ کو اپنے دل کے بہت قریب محسوس ہوئی تھی۔

"اچھا تو یہ گدھا تمہارا سینئر ہے۔" انہوں نے پیار بھری نگاہوں سے بیٹے کو دیکھا تھا۔ جانتے تھے وہ کتنا ہونہار ہے۔ بس ایسے ہی علیزے کی رائے جاننے کے لیے اس سے پوچھ رہے تھے۔

"جی انکل اس لیے ان کی تعریف کرنا میری مجبوری ہے۔"

وہ آج سارے بدلے چکانے پر مصر تھی۔

"علیزے تم کیوں میرے بابا کو میرے خلاف بھڑکانے پہ تلی ہوئی ہو۔ وہ شہوز کیا کم ہے جب بھی آتا ہے ایک نئی بات انہیں بتا جاتا ہے اور اب تم بھی یار مجھے تم سے ایسی امید نہیں تھی۔" وہ یونہی ذرا خفگی سے بولا تھا۔

"بیٹا جی آج تو تمہارے سارے پول کھل رہے ہیں۔ اب تو علیزے مجھے ساری باتیں بتایا کرے گی۔ کیوں بیٹے۔" انہوں نے حمزہ سے بات کرتے کرتے علیزے کی طرف دیکھا تھا۔ اس نے جھٹ اثبات میں سرہلایا تھا۔

"علیزے، پلیز ایسے نہ کرنا۔ میں اپنے بابا کو بہت اچھا والا بیٹا ہوں۔ میری ریپوٹیشن اس طرح خراب مت کرو۔" وہ گھبرا کر بولا تھا۔

"ارے یار تمہیں کیا پتا۔ یہ ہمیشہ اپنے نمبرز بڑھانے کے چکر میں اس طرح کرتی ہے۔ میں پچھلے کئی سالوں سے اس کے زیر عتاب ہوں۔" معاذ نے بھی اپنے دل کی بات کی تھی اور اپنے چہرے پر خوامخواہ کی مسکینیت طاری کی تھی۔

"تمہاری تو یہ بالکل ٹھیک شکایت کرتی ہے۔ تمہاری تو حرکتیں ہی ایسی ہیں۔"

اب انکل شہاب نے بھی گفتگو میں حصہ لیا تھا۔

"بابا آپ بھی کمال کرتے ہیں کیا کیا ہے میں نے کہ آپ کو میری حرکتیں مشکوک لگنے لگی ہیں۔" وہ ذرا برا مان کر بولا تھا۔

"ارے اب کیا ہو گیا۔ آپ پھر میرے بیٹے کو ڈانٹ رہے ہیں۔"

ماما نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا تھا۔ ملازمہ چائے کی ٹرالی لیے ان کے پیچھے ہی آرہی تھی۔

"ماما دیکھیں آپ کے اکلوتے بیٹے کے ساتھ یہاں کیسا سلوک ہو رہا ہے۔"

معاذ نے دہائی دی تھی۔ انداز بڑا غمگین تھا۔ سب ہی ہنس پڑے تھے۔ پر تکلف سی چائے بہت خوشگوار ماحول میں پی گئی تھی۔ کچھ پرانی، کچھ نئی باتیں کرتے ہوئے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ جب وہ لوگ کھانا کھانے کے بعد جانے کے لیے اٹھے تو رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ علیزے کا موڈ بے حد خوشگوار ہو چکا تھا۔ وہی جگنو جو اسے دیکھتے ہی حمزہ کی آنکھوں میں چمکنے لگتے تھے ان کا عکس اب اس کے چہرے پر بہت نمایاں تھا۔

"تم ہنستی ہوئی بہت اچھی لگتی ہو غصہ تمہارے چہرے پر قطعی سوٹ نہیں کرتا اور ہاں آئندہ کبھی ناراض نہ ہونا۔ یہ دل اپنی دھڑکنیں کھونے لگتا ہے۔ کل یونیورسٹی میں انتظار کروں گا۔"

جاتے وقت حمزہ کی کی گئی سرگوشی ابھی بھی اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ اس کے آس پاس گنگنا رہی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے تکیے میں منہ چھپا لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

بے انتہا خوشگوار موڈ کے ساتھ حمزہ گھر واپس آیا تو اس کی خوشنما آنکھوں میں علیزے کا رنگ بے حد نمایاں تھا۔ اس کے لبوں پہ بے حد پیاری مسکراہٹ

کھیل رہی تھی۔ بابا کو گڈ نائٹ کہہ کر وہ اپنے کمرے میں چلا آیا تھا۔ جانے کیوں اسے یقین سا ہو چلا تھا کہ علیزے اس کے مقدر میں لکھ دی گئی ہے۔ وہ پرکشش سی لڑکی جس کی آنکھوں میں بارہا اس کا دل ڈوب ڈوب جاتا ہے۔ اس کے لیے ہی بنائی گئی ہے۔ وہ اس کی ہو جائے گی اور یہ تصور ہی نہایت خوش کن خوشگوار تھا۔ وہ فریش ہونے کے بعد حسب معمول اپنا لیپ ٹاپ آن کر کے بیٹھ گیا تھا۔ تب ہی فون کی بیل نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ اس نے بنا اسکرین پہ نگاہ ڈالے بے حد خوش دلی سے فون ریسیو کیا تھا لیکن دوسری طرف سے آتی آواز سن کر اس کے مسکراتے لب بھنچ گئے تھے۔

"کیسے ہیں آپ حمزہ؟" دوسری جانب علینہ کی چہکتی ہوئی آواز تھی۔

"ٹھیک ہوں۔" جواب بے حد مختصر تھا۔

اس وقت وہ قطعی طور پہ ڈسٹرب نہیں ہونا چاہتا تھا۔ مگر ڈسٹرب کر دیا گیا تھا۔

"تھینک یو سو مچ حمزہ۔" دوسری جانب جانے کس بات کا شکریہ ادا کیا گیا تھا۔

"تھینک یو بٹ وائے!" اس نے حیرانی سے پوچھا۔

"تھینک یو فور یور اسمائل فیس آپ اپنا وعدہ بھول گئے شاید" یاد دلایا گیا تھا۔

"لیکن آج تو میں نے پورے دن آپ کو کہیں دیکھا ہی نہیں۔" اسے بالکل یاد نہیں آرہا تھا کہ اس نے کب علینہ کو دیکھا وہ بھی مسکراتے۔

"اچھا اب اتنے بھی انجان مت بنیے آپ!" اک ادا سے کہا گیا تھا۔

"آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں آپ سے کوئی تعلق رکھنا نہیں چاہتا ہوں۔"

اس نے دو ٹوک بات کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

"تعلق رکھنا بھی نہیں چاہتے اور دیکھ کر مسکراتے بھی ہیں۔ واہ آپ مرد لوگ بھی کتنے عجیب ہوتے ہیں نا۔" وہ ہنسی تھی۔

"تھینک مس علینہ وقار۔" اس کی آواز قدرے بلند تھی۔

"او مائی گاڈ آپ کے منہ سے اپنا نام سننا کتنا اچھا لگتا ہے میں آپ کو بتا نہیں سکتی۔ تو پھر حمزہ آج سے ہم دوست ہوئے نا۔"

"او مائی گاڈ یہ لڑکی۔" وہ سر پکڑ کر بیڈ کے کنارے بیٹھ گیا تھا۔ اسے ابھی بھی ایسا کچھ یاد نہیں آرہا تھا جس سے اسے یہ غلط فہمی ہوئی تھی۔

"بولیے نا حمزہ۔" مزید اصرار ہوا تھا۔

یکایک اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا تھا۔

"بائے دی وے۔ آپ مجھے بتا سکتی ہیں کہ مجھ سے یہ غلطی کس وقت سرزد ہوئی۔"

بڑے چبھتے ہوئے انداز میں حمزہ نے اس سے پوچھا تھا۔

"صبح میں جیسے ہی یونیورسٹی میں انٹر ہوئی تو آپ نے مجھے دیکھا اور اسمائل بھی پاس کی۔" علینہ نے تفصیلاً بتایا تھا۔

کسی اور کی طرف دی گئی مسکراہٹ کو یہ لڑکی اپنے لیے سمجھی تھی۔

"اف یہ لڑکی کس قدر خوش فہم ہے۔"

اب اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اسے کیا جواب دے۔

"بتایئے نا حمزہ آپ چپ کیوں ہیں۔" اس کی بے تابی عروج پر تھی۔

"ہم ابھی بعد میں بات کرتے ہیں۔"

حمزہ نے یہ کہہ کر فون رکھ دیا تھا۔ وہ اب سنجیدگی سے اس مسئلے کا حل نکالنا چاہتا تھا۔ وہ اس لڑکی سے جتنا چڑ رہا تھا۔ پیچھا چھڑا رہا تھا، وہ اتنا ہی اس کے پیچھے پڑ رہی تھی، اپنے مخصوص انداز میں ماتھا سہلاتے ہوئے وہ گہری سوچ میں غرق تھا۔

☼ ☼ ☼

اگلے دن اتوار تھا۔ چھٹی والے دن بھی وہ ہمیشہ دس، ساڑھے دس بجے تک اٹھ جایا کرتا تھا۔ لیکن

رات دیر تک جاگتے رہنے کی وجہ سے وہ آج بارہ بجے تک سو رہا تھا۔ بابا کافی دیر سے ناشتے پہ اس کے انتظار کر رہے تھے ہمیشہ چھٹی والے دن چاہے کتنی ہی دیر کیوں نہ ہو جائے۔ وہ دونوں ہمیشہ اکٹھے ہی ناشتا کرتے تھے۔ بوا دوبار اٹھا کر واپس آچکی تھیں۔ مگر اب بھی وہ بے خبر سو رہا تھا۔

"حمزہ بیٹا۔"

بابا نے اس کے منہ سے کمبل ہٹا کر بڑے پیار سے آواز دی تھی۔ مگر جواب ندارد۔

"حمزہ اٹھ جاؤ بیٹا۔"

انہوں نے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے پھر سے آواز دی تھی۔ اس نے کسمسا کر کروٹ بدل لی۔

"حمزہ بچے اٹھ جاؤ بارہ بج گئے ہیں۔ چھٹی کا دن صرف سونے کے لیے نہیں ہوتا۔" تنگ آکر انہوں نے اس کے اوپر سے کمبل اتارا اور بازو سے پکڑ کر اسے اٹھا کر سیدھا بٹھا دیا۔

وہ شرمندہ سا اٹھ کر بیٹھنے کی بجائے ڈائریکٹ کھڑا ہوا اور جلدی سے واش روم میں گھس گیا۔

فریش ہونے کے بعد ڈائننگ ہال میں آیا تو بابا اخبار پڑھنے کے ساتھ ساتھ اس کا انتظار کر رہے تھے۔

"گڈ مارننگ بابا۔" حمزہ نے حسب معمول ان کی پیشانی چوم کر صبح کا سلام کیا تھا۔

"گڈ مارننگ بابا کی جان" جواباً" بابا نے بھی اس کی پیشانی چوم کر جواب دیا اور ہاتھ پکڑ کر اسے سامنے والی چیئر پر بٹھا دیا تھا۔

"حمزہ!"

"جی بابا۔" اس نے پراٹھا اٹھا کر اپنی پلیٹ میں رکھا تھا۔

"میں نے ایک فیصلہ کیا ہے۔" وہ گھونٹ گھونٹ چائے پی رہے تھے۔

"وہ کیا بابا۔" اس نے نوالہ منہ میں رکھا۔

"میں نے سوچا ہے کہ ـــــ" وہ رک سے گئے تھے۔

جانے اس کا ردعمل کیا ہو۔

"وہ کہیے نا بابا، رک کیوں گئے۔" وہ ہاتھ روک کر انہیں دیکھنے لگا تھا۔

"میں نے سوچا ہے کہ تمہاری شادی کر دوں۔" وہ مسکرا کر بولے تھے۔

"جی!" اورنج جوس حلق میں اٹک سا گیا تھا۔ پھر وہ ہنس پڑا تھا۔

"اس میں اتنا حیران ہونے کی کیا بات ہے؟"

"مگر کس سے بابا، اور پھر ابھی میری ایجوکیشن بھی مکمل نہیں ہوئی ہے۔"

ذرا حواس بحال ہوئے تو وہ بولا تھا۔

"علیزے سے۔" بابا کی طرف سے بڑا مختصر سا جواب آیا تھا۔

"واٹ؟ کیا کہا بابا آپ نے" وہ حیرت سے بولا تھا۔

"ہاں بھئی وہ تمہیں اچھی لگتی ہے نا۔"

"ہاں مگر بابا، آپ نے یہ سب کیسے جان لیا۔ میں نے آج تک کبھی آپ کو کھل کر تو کچھ نہیں بتایا۔" وہ اتنی شاکنگ نیوز سن کر ناشتا کرنا یکسر بھول چکا تھا۔

"تمہارے دل میں کیا ہے بیٹا جانی یہ بھلا مجھ سے بہتر کون جان سکتا ہے۔ تمہاری آنکھوں میں اس کے نام پہ اترتے رنگ میں نے اول دن ہی محسوس کر لیے تھے۔ جب تم نے پہلی بار اس کا نام لیا تھا۔ اس دن میں نے جان لیا تھا۔ میں آج ہی اس کے باپ سے بات کرتا ہوں۔ یقیناً" وہ انکار نہیں کرے گا۔"

وہ اپنے تئیں سب فیصلے کر کے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"آئی لو یو بابا۔" وہ پیچھے سے آکر ان سے لپٹ گیا تھا۔

"آئی لو یو ٹو میری جان۔" انہوں نے اس کے ہاتھ تھپتھپا کر چومے تھے۔

"جاؤ ناشتا کرو۔" وہ اسے بھیج کر خود اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے تھے۔ اب وہ کچھ دیر آرام کرنا چاہتے تھے۔

وہ مسرور سا ڈائننگ چیئر پر آکر بیٹھا تو وہ بے انتہا خوش تھا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اپنی خوشی کا اعلان پوری دنیا

میں کر دے۔ اس کی پلکوں پہ بہت سے خواب بہت سے ارمان اتر آئے تھے۔ اس پل اسے لگا کہ وہ سامنے کھڑی اس کی بے قراری پہ مسکرا رہی ہے۔ لیکن جھپک کر دیکھا تو کچھ بھی نہ تھا۔ اپنی بے تابی پر وہ ہنس پڑا تھا اس نے ایک پل کو چاہا کہ وہ کال کرکے اسے بھی خوش خبری سنائے مگر پھر رک گیا تھا۔ سوچا اس کے لیے یہ سرپرائز رہنے دیتے ہیں۔ پھر اسے شہروز کا خیال آیا تھا۔ تو وہ اسے بتانے کے لیے فوراً" ہی اٹھ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

بابا تو آج ہی جانے کے لیے تیار تھے مگر کال کرنے پر پتا چلا کہ وہ لوگ آج کسی دعوت میں انوائیٹڈ ہیں اس لیے کل کا پروگرام سیٹ کر لیا گیا تھا۔ رات ڈنر پر بھی وہ دیر تک حمزہ سے اس موضوع پر ہی بات کرتے رہے تھے اور بے انتہا خوش تھے۔ ڈنر کے بعد بابا کو گڈ نائٹ کہنے کے بعد کافی کا مگ تھامے وہ اپنے کمرے میں آیا تو کمرے کی ہر چیز جیسے نئی نئی لگ رہی تھی گنگنا رہی تھی، مسکرا رہی تھی وہ ٹیرس پہ نکل آیا تھا۔ چاند پہ نگاہیں ٹکائے وہ دیر تک اسے سوچنا چاہتا تھا۔ اس کے احساس کو محسوس کرنا چاہتا تھا۔

الارم نے بارہ بجنے کا اعلان کیا تو وہ اٹھ کر کمرے میں چلا آیا تھا۔ ٹھنڈی ہوا اسے کمرے تک چھوڑنے چلی آئی تھی۔ اس نے مسکرا کر اس کا خیر مقدم کیا اور ٹیرس کا دروازہ کھلا ہی رہنے دیا تھا۔ حسب معمول کمپیوٹر آن کر کے بیٹھا تو دل چاہا کہ وہ اسے ایک خوبصورت سا کارڈ بھیجے۔ جس میں اس کے احساسات ہوں، جذبات ہوں، جسے پڑھ کر اس کی آنکھیں جگمگا اٹھیں۔ لب مسکرا اٹھیں اور پھر اس کا تصور کر کے نظر ٹھہر جائے اس نے ایک بے حد خوبصورت کارڈ ڈیزائن کیا اور اسے سینڈ کر دیا تھا اس کے نزدیک کسی حد تک اپنے جذبات' احساسات پہنچانے کا بہترین طریقہ یہ تھا۔ وہ خوش تھا بے انتہا خوش۔

☼ ☼ ☼

"علیزے بیٹا' ناشتا تیار ہے۔"

وہ اپنے کمرے میں جلدی جلدی یونیورسٹی جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ ساتھ ہی اس نے کمپیوٹر بھی آن کر رکھا تھا۔ اسے کچھ نوٹس ڈاؤن لوڈ کرنا تھے۔ جن میں سے کچھ تو وہ رات کو ہی کر چکی تھی لیکن لائٹ چلے جانے کی وجہ سے آدھا کام بیچ میں رہ گیا تھا۔ وہ انہیں یو۔ ایس۔ بی میں ٹرانسفر کر رہی تھی کہ اسے یہ نوٹس مدیحہ سے بھی شیئر کرنے تھے اور باہر سے ماما مسلسل آوازیں لگا رہی تھیں۔ جلدی سے اس نے بالوں کو بینڈ میں جکڑا اور تیزی سے جوتے پہننے لگی تھی۔ اتنی دیر میں اس کے کام بھی ختم ہو گیا۔ یو ایس بی نکالتے ہوئے بس ایک لمحے کو اس نے اپنا میل باکس چیک کرنے کو کھولا تھا اور وہاں بکس میں موجود ایک نہایت خوبصورت کارڈ اس کے سامنے تھا۔

"پتا نہیں کس نے بھیجا ہے۔" وہ حیرانی سے بڑبڑائی تھی۔ پھر تیزی سے پڑھنے لگی تھی۔

"حمزہ احمد" وہ زیر لب بڑبڑائی تھی۔

اس کے لبوں پہ بہت پیاری سی مسکراہٹ پھیلی تھی۔

"علیزے جلدی کرو بیٹا۔ تمہاری بس آنے والی ہے۔"

ماما کی آواز ایک بار پھر سے آئی تھی۔

"آرہی ہوں ماما۔" اس نے جلدی سے کمپیوٹر آف کیا۔

بیگ اور بکس لیے وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل آئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"حمزہ احمد۔" نام لیتے ہی اس کے لبوں پہ دل نشین سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

وہ زندگی سے بھی حسین شخص تھا۔ جس کی مسکراہٹ دل میں پھول کھلا دیتی ہے۔ روح میں اسے دیکھتے ہی سکون سا پھیل جاتا ہے۔ دید کی پیاسی آنکھوں کو قرار مل جاتا ہے۔ اس کا ہنسنا' بولنا' اس کا ہر ہر انداز دل میں اتر جاتا ہے۔ گھر کر جاتا ہے۔

اس نے تکیہ اٹھا کر بازوؤں میں بھر لیا تھا۔ حسین آنکھوں میں نشہ سا تھا۔

"اب تمہیں پانا ہی علینہ وقار کی زندگی کا اولین مقصد ہے۔ کیونکہ جب بھی میں نے کچھ بھی حاصل کرنا چاہا ہے اسے حاصل کر کے ہی دم لیا ہے۔ تمہیں بھی ایک نہ ایک دن میں اپنے حسن کا دیوانہ بنا ہی لوں گی۔ تمہارے دل سے علیزے شہاب کو بھلا نہ دیا تو میرا نام بھی علینہ وقار نہیں ہے۔ اس کی ہر یاد میں تمہارے دل سے مٹادوں گی۔ پھر تم صرف میرے ہو گے صرف میرے۔" اس نے ایک ادا سے بال جھٹکے تھے۔

حسین آنکھوں میں ابھی سے فتح کا سرور کروٹیں لینے لگا تھا۔ یہ سوچتے ہوئے وہ بھول چکی تھی کہ چیزیں حاصل کرنا آسان ہے مگر انسان نہیں۔ ابھی وہ اس بارے میں مزید کچھ سوچنا چاہتی تھی' ابھی مزید وہ اس سرور میں رہنا چاہتی تھی۔ لیکن بجتے ہوئے سیل نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ وہاں بابا کو چھوڑنے آیا تھا۔ سورج غروب ہو چکا تھا لیکن شام کے سائے ابھی پوری طرح سے گہرے نہیں ہوئے تھے۔ وہ بابا کو باہر ہی سے ڈراپ کر کے آگیا تھا اور ان کو کہہ آیا تھا کہ جب واپس جانا ہو تو مجھے کال کر دیجیے گا میں آجاؤں گا۔ اب وہ سلو ڈرائیو کرتا شام کے دھندلکے کو انجوائے کرتا بے انتہا خوشگوار موڈ میں جا رہا تھا کہ اچانک ہی کوئی اس کی گاڑی کے سامنے آگیا تھا۔ اگرچہ رفتار بہت کم تھی لیکن پھر بھی اگر وہ بروقت بریک نہ لگاتا تو ایکسیڈنٹ ہونا لازمی تھا۔

"روڈ کو کیا باپ کی ملکیت سمجھ رکھا ہے دیکھ کر گاڑی نہیں چلا سکتے۔" وہ لڑکی ہاتھ سے گرے شاپنگ بیگز جھک کر اٹھانے کے ساتھ چلائی تھی۔

"آئی ایم رئیلی سوری۔ میں تو بہت سلو ڈرائیو کر رہا تھا آپ ہی اچانک سامنے آگئیں۔"

وہ فوراً" ہی گاڑی سے اتر آیا تھا۔

"آپ کو کہیں چوٹ تو نہیں لگی۔" وہ پاس آتے ہوئے بولا تھا۔ ریشمی بالوں نے مکمل طور پر لڑکی کا چہرہ ڈھانپ رکھا تھا۔

"لگی تو نہیں ہے اگر لگ جاتی تو اور آپ کیا چاہتے ہیں کہ لگ جاتی کیا؟ ارے حمزہ آپ؟"

وہ تمام بیگز سنبھال کر کھڑی ہوئی۔ بالوں کو چہرے سے جھٹکتے ہوئے سامنے نظر آتے چہرے پہ نظر پڑی تو وہ کھل اٹھی تھی۔

"او یہ آپ!!" وہ لمحہ بھر کو کوفت زدہ ہوا تھا۔

"جی میں' جناب آپ نے تو مجھے مارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ حالانکہ ہم تو پہلے ہی گھائل ہو چکے ہیں۔" وہ ایک ادا سے کہتی قریب چلی آئی تھی۔

"آئی ایم سوری۔ ویسے غلطی میری نہیں تھی۔" وہ اس سے اس وقت بات کرنا نہیں چاہ رہا تھا۔ مگر اب کچھ کہنا تو تھا ہی۔

"اٹس اوکے آئی ایم آل رائٹ۔ آپ کیسے ہیں؟"

وہ لاپروائی سے اس کی گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔

"آئی ایم فائن۔ ایکسکیوزمی پلیز ڈونٹ مائنڈ مجھے کہیں جانا ہے۔" حمزہ اسے قطعی نظر انداز کر کے گاڑی کا ڈور کھولنے لگا تھا۔

"جی نہیں" آپ نہیں جا سکتے۔" علینہ نے اس کے ہاتھ سے گاڑی کی چابی لے لی تھی۔

حمزہ نے خفگی سے اس کی بے تکلفی کو دیکھا تھا۔

"علینہ پلیز' مجھے یہ سب پسند نہیں ہے۔" حمزہ نے اس کے ہاتھ سے چابیاں لینی چاہیں۔

"پلیز حمزہ' آپ میری اتنی سی بات نہیں مان سکتے۔" وہ روہانسی ہوئی تھی۔

حمزہ نے ایک نگاہ اس کے خوبصورت چہرے پر ڈالی تھی۔

"پلیز حمزہ۔"

"بلیک جینز اور بلیک ہی شرٹ میں ملبوس حمزہ احتشام اس وقت پوری طرح اس کے حواسوں پہ چھا رہا

تھا۔ وہ کچھ پل اس کے ساتھ بیٹھنا چاہتی تھی۔ وہ بے تکلفی سے اس کا بازو تھامے کھڑی تھی۔ ارد گرد سے گزرتے کتنے ہی لوگوں نے انہیں دیکھا تھا۔ حمزہ کو بہت عجیب لگ رہا تھا۔

"اوکے۔" حمزہ نے ہار مان لی تھی۔

صرف اس لیے کہ وہ کہیں بیٹھ کر اطمینان سے اسے سمجھا سکے کہ جیسا وہ چاہتی ہے ویسا نہیں ہو سکتا اور پھر کچھ ماحول اور جگہ بھی ایسی بن گئی تھی کہ حمزہ کو ماننی ہی پڑی تھی۔

"او تھینک یو حمزہ۔ اس ریسٹورنٹ میں چلیں۔"

وہ بچوں کی طرح خوش ہوتی سامنے روڈ کے پار بنے ریسٹورنٹ کی طرف اشارہ کرتے لگی تھی۔

"وہاں کی کافی بہت زبردست ہوتی ہے۔ میں وہیں تو جا رہی تھی کہ آپ مل گئے۔" وہ اس کے ساتھ ریسٹورنٹ میں چلا آیا تھا۔ کافی پیتے ہوئے بھی وہ بار بار اپنی خوشی کا اظہار کر رہی تھی۔ جبکہ حمزہ نے اپنی کافی بس چند گھونٹ پینے کے بعد چھوڑ دی تھی اور بس مگ کے کنارے انگلی پھیرتے ہوئے بے دھیانی سے اسے سن رہا تھا۔ سارا دھیان تو بابا کی طرف لگا تھا کہ وہاں کیا ہو رہا ہو گا۔

"میرا خیال ہے علینہ کہ اب ہمیں چلنا چاہیے۔" تقریباً" آدھے گھنٹے بعد حمزہ نے اسے کہا تھا۔

"او شیور میں جانتی ہوں حمزہ کہ آپ کو برا لگا کہ میں یوں آپ کو یہاں لے آئی۔ آئی ایم سوری مگر میں کیا کروں۔ میں اپنے دل کے ہاتھوں بار بار مجبور ہو جاتی ہوں۔"

وہ فوراً" ہی اپنی براؤن آنکھوں میں آنسو بھر لائی تھی۔

"اٹس اوکے بٹ آئندہ خیال رکھنا۔ لڑکیوں کا یوں خود کو ارزاں کرنا مجھے قطعی پسند نہیں ہے اور بہتر یہی ہو گا کہ تم ابھی سے خود کو سنبھال لو۔"

حمزہ نے بل کے پیسے ٹیبل پہ رکھے اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"گلٹی فیل کرنے کی بجائے خود کو سنبھالو۔ خوامخواہ خود کو ضائع مت کرو۔ یوں کسی کے پیچھے بھاگنے سے ہم اس کی اہمیت تو ضرور بڑھا دیتے ہیں جس کے پیچھے بھاگ رہے ہوتے ہیں مگر اس دوڑ میں ہم اپنا آپ کہیں بہت دور چھوڑ آتے ہیں۔ خود کو بہت پیچھے دھکیل دیتے ہیں اور پھر ہماری اہمیت نہ اپنی نظروں میں رہتی ہے اور نہ کسی اور کی نظروں میں سو بہتر یہی ہے کہ تم اپنی اہمیت کو مت ختم کرو۔ تھینکس فور کافی۔" حمزہ نے ایک نظر اس کے جھکے سر پہ ڈالی اور چابی اور موبائل اٹھاتا اس سے پہلے ہی ریسٹورنٹ سے باہر نکل آیا تھا۔

"اہمیت کس کی بڑھتی ہے اور کس کی گھٹتی ہے یہ تو تمہیں وقت ہی بتائے گا حمزہ احتشام۔ علینہ وقار نے کبھی ہارنا نہیں سیکھا اور اس بار بھی جیت میرا ہی مقدر ہو گی۔"

علینہ نے اپنے اکلوتے آنسو کو انگلی کی پور سے اڑایا تھا اور مسکرا دی تھی۔

☼ ☼ ☼

"یار شہاب' آج میں تمہارے پاس ایک بہت ضروری کام سے آیا ہوں اور امید ہے تم مایوس نہیں لوٹاؤ گے۔" احتشام احمد نے علیزے کے ہاتھ سے چائے کا کپ تھامتے ہوئے کہا تھا۔

"ہاں تم نے فون پہ کہا تو تھا کہ تمہیں کوئی ضروری بات کرنا ہے۔ کیا بات ہے بتاؤ۔"

شہاب زیدی نے سوالیہ نگاہوں سے انہیں دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

اس وقت ڈرائنگ روم میں سب ہی موجود تھے اور منتظر تھے کہ وہ کیا بات کرتے ہیں۔

"یار مجھے تو تم جانتے ہی ہو اور حمزہ کو مجھ سے بھی ملنے سے پہلے ہی جانتے ہو۔ سب کچھ تمہارے سامنے ہے۔ کچھ بھی چھپا ہوا نہیں ہے۔ بس آج میں تم سے بہت امید سے کچھ مانگنے آیا ہوں۔"

انہوں نے علیزے کو اپنے پاس ہی بٹھا لیا تھا

نجانے کیوں علیزے کو دیکھتے ہی انہیں اپنائیت کا احساس ہوتا تھا۔

"کیا مطلب بھائی صاحب' ہم سمجھے نہیں۔" آپ کے ماما نے ان سے پوچھا تھا۔

"بھابھی میری دلی خواہش ہے کہ آپ علیزے کو میری بیٹی بنادیں۔ آپ لوگ تو جانتے ہیں کہ میرے گھر میں کوئی عورت نہیں ہے۔ اگر ہوتی تو شاید ہم لوگ تمام رسم و رواج کے ساتھ آپ سے علیزے کو مانگتے۔ مگر اب سب کچھ مجھے ہی کرنا ہے اور میں جب سے علیزے سے ملا ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ میرا گھر اس کے بغیر ادھورا ہے۔ اگر آپ لوگوں کو کوئی اعتراض نہ ہو تو۔"

یہ سب اتنا اچانک کہا تھا انہوں نے کہ کوئی بھی ابھی اس بات کے لیے تیار نہ تھا۔ علیزے تو فوراً ہی وہاں سے اٹھ گئی تھی۔

"تمہاری خواہش سر آنکھوں پہ مگر احتشام ابھی تو بچوں کی پڑھائی بھی پوری نہیں ہوئی اور ــــ" شہاب زیدی نے کچھ کہنا چاہا تھا۔

"میں مانتا ہوں شہاب تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ بس اگلے مہینے حمزہ کے فائنل ایگزام ہیں۔ اس کے بعد تو وہ میرا بزنس مکمل طور پہ سنبھال لے گا اور اب بھی کافی حد تک ذمہ داری اس نے ہی اٹھا رکھی ہے اور جہاں تک بات علیزے کی پڑھائی کی ہے تو ہماری طرف سے اس پہ کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں ہوگی۔ وہ جب تک جہاں تک چاہے پڑھ سکتی ہے۔ ہمیں کوئی جلدی نہیں ہے اور پھر آپ لوگ اچھی طرح سوچ لیں پھر جیسا آپ مناسب سمجھیں فی الحال ہم منگنی کردیں گے۔ ہاں یار مجھے مایوس مت کرنا۔ چند دن میں ہی علیزے مجھے بہت عزیز ہو گئی ہے اور پھر حمزہ کی بھی یہی خواہش ہے۔ آگے آپ لوگوں کی مرضی۔"

وہ اتنے خلوص سے یہ سب باتیں کررہے تھے کہ وہ لوگ کچھ کہہ ہی نہیں پائے تھے۔

"ٹھیک ہے احتشام میں تمہاری خواہش کا پُرخلوص محبت کا دل سے احترام کرتا ہوں مگر ہمیں تھوڑا ٹائم دو۔ دراصل علیزے کے ماموں کی بھی کافی عرصے سے یہی خواہش ہے۔ سو ــــ تم سمجھ رہے ہوناں۔" شہاب زیدی نے ایک نظر بیگم پہ ڈالی اور ان سے کہا تھا۔ ماما تو مکمل اٹھی تھیں ان کی بات سن کر انہیں تو ویسے ہی حمزہ بہت پسند تھا۔ پر ایک دم سے فیصلہ بھی تو نہیں کیا جاسکتا تھا ناں آخر بیٹی کا معاملہ تھا۔

"ٹھیک ہے شہاب میں منتظر رہوں گا۔" وہ خوش دلی سے مسکرائے تھے۔

"آپ اور چائے لیں ناں بھائی صاحب۔ آپ نے تو کچھ کھایا ہی نہیں بس باتیں کیے جارہے ہیں آپ لوگ۔"

ماما نے ان سب کا دھیان بٹایا تھا۔

"بس بھابھی' بہت شکریہ میں اب چلوں گا۔ وہ گدھا بے چینی سے میرا انتظار کررہا ہوگا۔ چھوڑ کے بھی خود گیا ہے اور لینے بھی محترم خود ہی آئیں گے۔ اس لیے اب مجھے اجازت۔"

انہوں نے بتانے کے ساتھ حمزہ کو میسج بھی کردیا تھا کہ وہ انہیں لینے آجائے۔

"اچھا وہ آیا تھا آپ کو چھوڑنے تو اندر کیوں نہیں آیا۔" ماما کچھ خفگی سے بولیں۔

"میں نے منع کردیا تھا بھابھی۔" انہوں نے ہنس کر کہا اور سب سے مل کر باہر چلے آئے تھے۔ جہاں گھر سے دور گاڑی میں حمزہ ان کا انتظار کررہا تھا۔ سب کو گیٹ پہ بابا کے ساتھ آتے دیکھا تو وہ سب سے ملنے گاڑی سے اتر آیا تھا۔ آصفہ نے پیار بھری سرزنش کے ساتھ اس کی پیٹھ تھپتھپائی تھی سب سے ملنے کے بعد اس نے بابا کے پہلو میں کھڑی علیزے پہ ایک مسکراتی نگاہ ڈالی تھی۔ وہ مزید سمٹ کر ماما کے پیچھے جا چھپی تھی۔ ہتھیلیوں میں پسینہ اتر آیا تھا۔ وہ شوخ سی نگاہ اس پہ ڈال کر بابا کے ساتھ گاڑی میں آبیٹھا تھا۔

"کیا بات ہے حمزہ اتنے خاموش کیوں ہو بیٹا۔" کتنی ہی دیر اس کی خاموشی کو محسوس کرنے کے بعد بابا نے اس سے پوچھا تھا۔

ورنہ وہ سوچ رہے تھے کہ وہ بے تابی سے ایک ہی سانس میں ان سے سب پوچھ ڈالے گا۔

"کچھ نہیں بابا بس ویسے ہی۔"

پتا نہیں کیوں اس سے اسے علینہ وقار کی آنکھوں کی سی گلٹ میں جتلا کررہی تھی۔

"اچھا' ویسے میں تو سوچ رہا تھا کہ تم بے صبری سے میرا انتظار کررہے ہوگے۔ مگر تمہیں تو کوئی جلدی نہیں ہے۔" بابا نے مسکراتی نگاہ اس پہ ڈالی تھی۔ وہ بھی مسکرا دیا تھا۔

"میں نے سوچا بابا' آپ خود ہی بتادیں گے۔ اگر میں خود سے پوچھوں گا تو آپ کہیں گے کہ اسے بہت جلدی ہے۔" یکدم ہی دل میں خوشگواری سی در آئی تھی۔

"اچھا چلو پھر ٹھیک ہے آرام سے رات کو کھانے کے بعد بات کریں گے۔ ٹھیک ہے۔"

وہ بے نیازی سے کہہ کر باہر دوڑتے مناظر کو دیکھنے لگے تھے۔

"اچھا بابا' بتائیں ناں تنگ نہ کریں۔" بالآخر اس نے خود ہی پوچھ لیا تھا۔

"انہیں تھوڑا ٹائم چاہیے۔" اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوگئے تھے۔

"کیوں۔" وہ سوالیہ نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگا تھا۔

"دراصل بات یہ ہے بیٹا کہ علیزے کے ماموں کی بھی یہی خواہش ہے اس لیے بیٹا اور پھر ایسی باتیں یوں لمحوں میں طے نہیں ہوتیں کچھ وقت تو لگتا ہے ناں۔ آخر پوری زندگی کا معاملہ ہے۔"

وہ بہت غور سے حمزہ کو دیکھ رہے تھے وہ تھوڑا سا اپ سیٹ ہوا تھا۔ ان کی بات سن کر۔

"تم کیوں پریشان ہوتے ہو بیٹا۔ اللہ پہ بھروسہ رکھو وہ سب ٹھیک کردے گا اور وہ چاند ہمارے گھر ہی اترے گا' ان شاء اللہ' تم اپنی پڑھائی پر توجہ دو سب ٹھیک ہوجائے گا۔ میں نے اسی خدشے کے پیش نظر شہاب کے کان میں بات ڈالی تھی۔ اب وہ فیصلہ کرنے سے پہلے سوچے گا ضرور ورنہ مجھے بچوں کی پڑھائی کے دوران ایسی باتیں قطعی پسند نہیں ہے۔ اب تم منہ مت لٹکاؤ یار۔" انہوں نے اسے سمجھایا تھا۔

اب وہ قدرے ریلیکس تھا۔ بابا ہمیشہ یونہی اس کی ہر پریشانی منٹوں میں دور کردیتے تھے۔

"ویسے بابا اگر میں فائنل ایگزام میں فیل ہوگیا تو۔" وہ قدرے پریشانی سے بولا تھا۔

"تو بیٹا' میرے تو تم بیٹے ہو۔ برداشت کرلوں گا مگر علیزے کے لیے ایسا کوئی لڑکا ڈھونڈ لوں گا جو کم از کم اپنے فائنل ایگزام کلیئر کرچکا ہو۔ اب وہ ایسے نکمے لڑکے سے تو شادی کرنے سے رہی۔"

"بابا۔" وہ حیرت سے چلایا تو وہ ہنس پڑے تھے اور محبت سے اس کی پیٹھ تھپتھپائی تھی اور دل ہی دل میں اسے کتنی ہی دعائیں دے ڈالی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"پھر کیا سوچا آپ نے؟ احتشام بھائی کو کیا جواب دیا جائے۔ کتنے ہی دن گزر گئے ہیں۔"

آصفہ نے رات کے کھانے کے بعد چائے کا کپ انہیں تھماتے ہوئے پوچھا تھا۔

"آپ بتائیے آپ نے کیا سوچا۔" انہوں نے کپ تھام کر ان سے پوچھا تھا۔

"میں کیا بتاؤں مجھے تو اس رشتے میں کوئی کمی نظر نہیں آئی۔" وہ ــــ ان کے پاس ہی بیٹھ گئیں۔

"میں تو آپ کی وجہ سے ہی خاموش ہوں۔ میں نے سوچا کہ آپ کے بھائی کی بھی یہی خواہش ہے۔ تو جیسا آپ کو مناسب لگے۔ آپ علیزے کی ماں ہیں اسے بہتر سمجھتی ہیں۔"

انہوں نے فیصلہ کرنے کا حق انہیں سونپ کران کا مان بڑھا دیا تھا۔ وہ خوش دلی سے مسکرادیں۔

"سچ کہوں تو فرحان ہے تو میرا بھتیجا پر اس حساب سے مجھے کچھ خاص پسند نہیں ہے۔ ٹک کر کوئی کام نہیں کرتا کبھی ایک کام تو کبھی دوسرا۔ بھائی کی ریٹائرمنٹ کے بعد بڑے محسن نے ہی سب کچھ

سنبھال رکھا ہے۔ وہاں میرا دل نہیں مانتا عجیب لاپروا سا لڑکا ہے وہ۔" انہوں نے کھل کر اپنے دل کی بات کی تھی۔

"ہاں خیال تو میرا بھی یہی ہے پھر سوچا بھائی کو کہیں برا نہ لگ جائے۔ انہوں نے بہت پہلے سے کہہ رکھا ہے" وہ گھونٹ گھونٹ چائے پیتے ہوئے کچھ سوچ رہے تھے۔

"اس میں برا لگنے کی کیا بات ہے علیزے ہماری بیٹی ہے پوری زندگی کا معاملہ ہے سوچ سمجھ کر ہی فیصلہ کریں گے نا اور پھر بھائی صاحب خود فرحان سے نالاں رہتے ہیں۔ میں خود ہی انہیں سنبھال لوں گی آپ کو جو فیصلہ کرنا ہے بے فکر ہو کر کریں اور سچ پوچھیں تو میرے دل کو حمزہ نے موہ لیا ہے۔ بہت ہی پیارا سمجھدار بچہ ہے۔"

کب سے ان کی خواہش تھی کہ ایسا ہو جائے اور اب جبکہ خدا نے موقع دیا تھا تو وہ کیونکہ ناشکر کرتیں۔

"ہاں یہ تو ہے چلو پھر ایسا کرو —— ایک بار علیزے سے بات کرلو۔ دیکھو وہ کیا کہتی ہے۔ پھر ہمارے لیے ہی فیصلہ کرنا آسان ہو جائے گا۔"

"ہاں یہ تو ہے بہت فرماں بردار اور سمجھدار ہے میری بیٹی۔" وہ محبت سے بولے تھے وہ مسکراتی ہوئی خالی کپ اٹھا کر کچن میں رکھنے چلی آئیں۔ کپ کچن میں دھو کر رکھا پلٹ کر اپنے کمرے میں آرہی تھیں کہ علیزے کے کمرے کی لائٹ جلتی دیکھی تو وہیں چلی آئیں سوچا یہ کام نمٹ جائے تو اچھا ہے۔

"علیزے کیا کر رہی ہو بیٹا۔" وہ دستک دے کر اندر چلی آئیں۔ جہاں حسب معمول وہ کتابیں پھیلائے پڑھنے میں مصروف تھی۔

"کچھ نہیں ماما۔ بس سونے ہی لگی تھی آپ کو کوئی کام تھا تو مجھے بلا لیا ہوتا۔"

وہ بیڈ سے کتابیں سمیٹ کر ان کے لیے جگہ بنانے لگی۔

"کیوں بھئی میں اپنی بیٹی کے پاس نہیں آسکتی؟"

وہ وہیں اس کے پاس ہی بیٹھ گئیں۔

"ارے نہیں ماما میں تو یوں ہی کہہ رہی تھی۔" وہ ہنس پڑی تھی۔ اس سے آصفہ نے اسے بہت غور سے دیکھا تھا۔ کتنی جلدی بڑی ہو گئی تھی ان کی ننھی سی بیٹی۔ ابھی کل کی ہی بات لگتی تھی کہ جب اس نے پہلا قدم اٹھایا تھا۔

"علیزے بیٹا تم جانتی ہو نا اس دن احتشام بھائی آئے تھے تو وہ کس وجہ سے آئے تھے تم نے سن تو لیا تھا نا کہ ان کی کیا خواہش ہے۔"

"جی ماما۔" ماما نے اس سے اس کی آنکھوں میں کتنے ہی جگنو روشن دیکھے تھے۔

"تو بیٹا' میں اور تمہارے بابا جاننا چاہتے ہیں کہ تمہارا فیصلہ کیا ہے۔ تمہارے ماموں بھی ایسا ہی چاہتے ہیں۔ فرحان کو تو تم جانتی ہی ہو مگر ہمارا زیادہ جھکاؤ حمزہ کی طرف ہے اب تم بتاؤ" انہوں نے محبت سے اس کے بکھرے بال سمیٹے تھے۔ وہ یکدم ہی سر جھکا گئی تھی۔

"جو آپ کی مرضی ماما جیسا آپ لوگ چاہیں۔ مجھے آپ کا ہر فیصلہ قبول ہو گا۔"

دھیمے سے وہ بولی تو آصفہ نے اس کی پیشانی چوم لی تھی۔

"مجھے معلوم تھا میری بیٹی کا یہی جواب ہو گا اور تم بے فکر رہو بیٹا ہم ہمیشہ تمہارے لیے بہترین ہی چاہیں گے اور ان شاء اللہ اللہ بھی ہمارا ساتھ دے گا۔"

انہوں نے محبت سے اسے کہا تو اس نے ماں کے سینے میں منہ چھپا لیا تھا۔ لبوں پہ مسکراہٹ آپ ہی در آئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"تم علیزے سے شادی کر رہے ہو۔"

اپنا فائنل پروجیکٹ جمع کروانے کے بعد حمزہ جیسے ہی آفس سے باہر اپنی گاڑی کی طرف آیا وہ غراتی ہوئی اس کے پاس آئی تھی۔

"تم مجھ سے یہ سوال کیوں کر رہی ہو۔" وہ ٹھٹک کر وہیں رکا تھا۔

"مجھے میری بات کا جواب چاہیے۔ تم علیزے

سے شادی کر رہے ہو یا نہیں۔"

آج بڑے دنوں بعد وہ یونیورسٹی آئی تو یہ اڑتی اڑتی خبر اس تک پہنچی تھی۔ تب سے وہ جھلس رہی تھی۔

"ہاں تو۔" حمزہ نے سرسری سا پوچھا تھا۔

وہ جتنا اس سے چڑتا تھا وہ اتنا اس کے پیچھے آتی تھی۔

"کیوں۔" بڑے عجیب سے لہجے میں اس نے پوچھا تھا۔

"تم یہ سب کیوں پوچھ رہی ہو۔" حمزہ کو بہت برا لگا تھا اس کا یوں بات کرنا۔

"کیوں میں تم سے محبت کرتی ہوں حمزہ احتشام اور اس بات کا اظہار میں بارہا کر چکی ہوں۔" وہ انگلی سے اس کی طرف اشارہ کرتی جانے کیا باور کرا رہی تھی۔

"تو یہ تمہارا مسئلہ ہے میرا اس سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ میں اپنی زندگی ان ہی لوگوں کے ساتھ گزارنا پسند کرتا ہوں۔ جو مجھے پسند ہیں اور جن سے میں محبت کرتا ہوں اور تم ان میں سے نہیں ہو۔ مائنڈ اٹ۔" کہنے کے ساتھ ہی وہ چند قدم آگے بڑھ آیا تھا۔

"تم میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہے ہو۔" چند لمحوں کو علینہ وقار کا لہجہ دھیما پڑا تھا۔

"تم کیا کہہ رہی ہو میں سمجھ نہیں پا رہا۔ میں نے کب تمہیں کوئی امید دلائی یا کب تمہیں کوئی محبت کا خواب دکھلایا۔ میں نے بہت پہلے تمہیں سمجھا دیا تھا کہ ویسا نہیں ہو سکتا جیسا تم چاہتی ہو۔ پھر بھی تم نے اگر اپنی آنکھوں میں میرے خواب سجا لیے تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ لیکن میں زبردستی کے رشتے نہیں نبھاتا۔ بہتر یہی ہے کہ تم آئندہ میرے راستے میں نہ آؤ۔" وہ پلٹ کر اس کے پاس آیا ضرور تھا۔ مگر بہت کچھ باور کرا گیا تھا۔

"ایسا کیا ہے اس میں جو مجھ میں نہیں ہے۔"

وہ اس کے قریب آئی تو وہ چند قدم پیچھے کو ہٹا تھا۔ جانے کیوں حمزہ کو اس سے اس کی دیوانگی سے خوف آرہا تھا۔

"میں تمہارے ہر سوال کا جواب دینے کا پابند نہیں ہوں۔ پھر بھی اتنا ضرور کہوں گا کہ اس دل کی ہر دھڑکن صرف ایک ہی نام ہے اور وہ ہے علیزے شہاب۔"

وہ ایک ہی جملے میں سب کچھ کہتا زن سے گاڑی نکال لے گیا تھا اور علینہ وقار بیچ پاس وہیں کھڑی تھی۔

☼ ☼ ☼

"ہائے سویٹی کہاں تھیں صبح سے۔"

علینہ جیسے ہی گھر میں داخل ہوئی تو خالہ کہیں جانے کے لیے بالکل تیار تھیں۔

"میں یونیورسٹی گئی تھی آنٹی۔" وہ تھکی تھکی سی تھی۔

"او اچھا ٹھیک ہے۔ تم لنچ کر لینا' تیار ہی ہو گا مجھے کہیں ضروری جانا ہے اور ہاں جاذب گھر پہ ہی ہے اوکے۔" وہ اس کے گال پہ پیار کرتی اپنی ساڑھی سنبھالتی باہر چلی گئی تھیں۔

"اوکے آنٹی۔" وہ لاؤنج میں رکھے صوفے پہ ڈھیر سی ہو گئی تھی۔

پورے وجود پہ عجیب پژمردگی سی چھائی ہوئی تھی۔

"ہائی سویٹ ہارٹ کہاں کھوئی ہوئی ہو۔"

جاذب اپنے کمرے سے نکل کر اس کے برابر آکر بیٹھ گیا تھا۔

"کہیں نہیں تم آج گھر پہ کیسے" وہ سیدھی ہو بیٹھی تھی۔

بلیک جینز اور بلیک سلیولیس شرٹ میں وہ غضب ڈھا رہی تھی۔

"بس آج زیادہ کام کرنے کا موڈ نہیں تھا۔ اس لیے آفس سے جلدی گھر آگیا۔"

جاذب نے بہت غور سے اس کے چہرے کو دیکھا تھا۔

علینہ اپنے پیرنٹس کے آؤٹ آف کنٹری جانے کی وجہ سے آج کل اپنی خالہ کے گھر رہ رہی تھی۔ جاذب' خالہ کا چھوٹا بیٹا تھا۔ بڑا بیٹا جہاں زیب شادی

شدہ تھا اور اپنی بیوی کے ساتھ الگ گھر میں رہتا تھا۔ انکل بزنس کے سلسلے میں کبھی کہیں تو کبھی کہیں اور انکل کی غیر موجودگی میں جاذب ہی ان کا بزنس سنبھالتا تھا۔ جاذب بالکل ویسا ہی تھا۔ جیسے امیر ماں باپ کی بگڑی ہوئی اولاد ہوتی ہے ایک بگڑا ہوا امیر زادہ جو اپنی ساری زندگی عیاشی میں گزارنا پسند کرتا ہے بنا کسی نفع نقصان کے اور آج کل اس کی نظر کرم علینہ وقار پہ تھی۔

"تمہیں کیا ہوا ہے۔ اتنی اپ سیٹ کیوں ہو۔"

جاذب نے انگلی سے چہرے سے اس کے بال ہٹائے تھے۔

"کچھ نہیں، مجھے بھلا کیا ہوگا۔" وہ کسی سوچ میں غرق تھی۔

ویسے بھی وہ اپنے پرسنلز کسی سے کم ہی شیئر کیا کرتی تھی۔

"ایک بات کہوں علینہ" جاذب اس لمحے اس کے انتہائی قریب بیٹھا تھا اور اسے احساس تک نہیں تھا۔

"ہوں بولو۔" وہ کسی اور ہی دھیان میں تھی۔

"تم بہت خوب صورت ہو بالکل کسی کانچ کی نازک گڑیا کی مانند جو ذرا سا ہاتھ لگانے سے میلی ہو جائے بے حد حسین۔" جاذب نے دھیرے سے اس کا ہاتھ تھاما تھا۔

"بہت پرانی خبر ہے یہ تمہیں آج پتا چلا ہے۔" اس کی خود پسندی عود آئی تھی۔

"تم سے محبت کرنے لگا ہوں یار۔ آج کل میرا دل صرف تمہیں دیکھ کر دھڑک اٹھتا ہے۔ میں تمہارے لیے کچھ بھی کر سکتا ہوں کچھ بھی۔"

وہ اس کا ہاتھ اپنے لبوں تک لے جانا ہی چاہتا تھا کہ علینہ نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا تھا۔

"کچھ بھی۔" اس سے علینہ کی آنکھیں میں ایک چمک سی اٹھی تھی۔

"ہوں کچھ بھی۔ جیسا تم کہو۔" وہ اس لمحے مکمل طور پہ اس کے کنٹرول میں تھا۔

"تو پھر اپنی بات یاد رکھنا۔ تمہیں تب ہی علینہ وقار کی محبت نصیب ہوگی جب تم اس کے لیے کچھ کر کے دکھاؤ گے اور تمہیں کیا کرنا ہے یہ میں تمہیں جلد ہی بتاؤں گی۔ تب تم ثابت کرنا کہ تمہیں مجھ سے کتنی محبت ہے۔"

وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اسے جاذب سے کیا کام لینا ہے۔

"او کے میری جان بندہ حاضر ہے۔ جب کہو اور جیسا کہو ہم پیچھے ہٹنے والوں میں سے نہیں ہیں۔"

وہ اس کے آگے سر جھکائے کھڑا تھا۔ وہ قہقہہ لگا کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔ اب اس کی ٹینشن کسی حد تک کم ہو چکی تھی۔

☆ ☆ ☆

برقی قمقموں سے سجے گھر کی آرائش آج دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ پورا گھر جگ مگ کر رہا تھا۔ زرق برق آنچل ہر طرف لہرا رہے تھے۔ قہقہے اور خوشیاں ہر سو بکھری تھیں۔ دلہن بنی علیزے شہاب کی چھب ہی نرالی تھی۔ سہیلیوں کے جھرمٹ میں گھری علیزے اس وقت شرمائی شرمائی سی بے حد حسین لگ رہی تھی۔ بس کچھ ہی دیر میں اس کے سسرال والے منگنی کی رسم ادا کرنے آنے ہی والے تھے۔ اس کی آنکھوں میں چمکتی خوابوں کی دھنک اسے بہت دلکش لگ رہی تھی۔ مانگ میں سجی افشاں میں قوس و قزح کے سارے ہی رنگ تھے۔ کانوں میں سجے آویزوں کا ایک ایک نگ آنے والے کا انتظار کر رہا تھا۔ بالآخر انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں۔ کسی نے کان میں سرگوشی کی کہ وہ لوگ آچکے ہیں۔ لبوں پہ شرمیلی مسکراہٹ آپ ہی کھل اٹھی تھی سب ہی لڑکیاں باہر چلی گئی تھیں۔

"ہیلو علیزے؟"

ان سب لڑکیوں کے جانے کے چند سیکنڈ بعد لاریب اندر کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ لاریب علیزے کی چچا زاد تھی اور اس کی بہت اچھی دوست بھی۔ چند مہینے قبل ہی اس کی شادی ہوئی تھی۔ علیزے نے ایک غصے بھری نگاہ اس پہ ڈالی تھی اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی لاریب خود ہی صفائیاں پیش کرنے لگی تھی۔

"آئی ایم ویری سوری یار۔ مجھے پتا ہے تم بہت ناراض ہو۔ لیکن تم جانتی ہو نا کہ آشان ہمیشہ دیر کروا دیتے ہیں۔" اسے گلے لگا کر بڑی محبت سے پوچھنے لگی تھی۔

"ناراض تو تھی لیکن تمہارے نہ آنے تک۔ اب تم آگئی ہو تو ساری ناراضی ختم۔"

علیزے نے مسکرا کر اس کے ہاتھ تھامے تھے۔

"حمزہ کو دیکھا۔" لاریب نے شرارت سے پوچھا تھا۔

"اونہوں۔" وہ سر جھکا گئی تھی۔

"اللہ رے شرمانا ہیں۔ ویسے میں اندر آتے ہوئے ملاقات کر آئی ہوں اس سے۔ بڑا زبردست لگ رہا ہے۔ ویسے کم تو تم بھی نہیں لگ رہیں۔" لاریب نے پیار سے اس کی ٹھوڑی چھوئی تھی۔ علیزے کے چہرے پہ اس لمحے بڑی خوب صورت مسکراہٹ بکھری تھی۔ ابھی لاریب اسے مزید جتا ہی رہی تھی کہ ماما نے پیغام بھجوایا۔

"لاریب، علیزے کو لے کر باہر آجاؤ۔" جب لاریب اسے لے کر باہر آئی تو داخلی دروازے سے لان تک دونوں اطراف لڑکیاں پھول تھامے کھڑی تھیں۔ اس نے جیسے ہی باہر قدم رکھا تو اسے لگا کہ جیسے کسی نے اس پہ پھولوں کی بارش کر دی ہو۔ ہر طرف خوشبو ہی خوشبو بکھری تھی۔ وہ لاریب کے ساتھ لان کے ایک طرف بنے اسٹیج کے پاس پہنچی تو بابا نے آگے بڑھ کر اس کی پیشانی پہ بوسہ دیا۔ ماما نے اسے محبت سے گلے لگانے کے بعد اسے حمزہ کے پہلو میں ذرا فاصلے پہ بٹھا دیا تھا کہ منگنی کی رسم مشترکہ ہی ہونی تھی۔ حمزہ کو اس نے اپنا پہلو روشن محسوس ہوا تھا۔ اس کا معصوم سجا سنورا حسن اس لمحے آنکھوں کو خیرہ کر رہا تھا۔ تو اس بلیک تو پیس میں حمزہ بھی بہت ڈیشنگ لگ رہا

"شہاب تم سے ایک بات کرنا تھی۔"

سب کو علیزے اور حمزہ میں مصروف دیکھ کر احتشام انکل انہیں ایک کونے میں لے آئے تھے۔

"ہاں بولو کیا بات ہے۔" وہ یکدم پریشان سے لگنے لگے تھے۔

"دراصل میں چاہتا ہوں کہ آج ہم منگنی کی بجائے نکاح کر دیں تو زیادہ بہتر نہیں ہوگا۔ رخصتی علیزے کی پڑھائی ختم ہونے کے بعد کریں گے۔"

"مگر کیوں بات تو منگنی کی ہوئی تھی نا۔" اس قدر اچانک اس بات پہ وہ گھبرا گئے تھے۔

"کیا بات ہے آپ لوگ یہاں کیا کر رہے ہیں۔"

آصفہ ان دونوں کو وہاں نہ پا کر ڈھونڈتی ہوئی ان تک آن پہنچی تھیں۔ تو جواب میں انہیں بھی ساری بات بتا دی گئی تھی۔

"مگر بھائی صاحب اتنی جلدی کیا ہے۔" سن کر وہ بھی سٹپٹا گئیں۔

"دیکھیں بھابھی نکاح تو ہونا ہے نا اگر آج ہو جائے تو کیا برا ہے پھر موقع بھی ہے۔" وہ بضد تھے۔

"ٹھیک ہے احتشام جیسے تمہاری مرضی علیزے اب تمہاری بیٹی ہے۔ جیسا تم چاہو۔"

انہوں نے یکدم ہی کوئی فیصلہ کیا تھا اور آصفہ کو بھی اشارے سے سمجھا دیا تھا۔

"تھینک یو یار مجھے پتا تھا تم میرا مان رکھو گے اس لیے میں نکاح خواں کا بندوبست کر کے آیا تھا بس ابھی انہیں فون کر کے کنفرم آنے کو کہہ دیتا ہوں۔"

وہ شہاب زیدی کے گلے لگ گئے تھے۔ تو وہ بھی مسکرا دیئے تھے اور پھر محض ایک گھنٹے بعد ہی وہ دونوں نکاح جیسے مقدس اور اٹوٹ بندھن میں بندھ چکے تھے۔

یہ سب کچھ اتنی اچانک ہوا کہ علیزے ابھی تک حیران تھی جبکہ حمزہ مطمئن تھا۔ کیونکہ وہ یہ سب جانتا تھا۔ کل رات ڈنر کے دوران جب منگنی کی تمام تیاریاں مکمل تھیں۔ نجانے کس خدشے کے پیش نظر اس نے بابا سے اس خواہش کا اظہار کیا تھا۔ وہ پہلے تو نہیں مانے۔ پھر مان گئے تھے اور اب وہ مطمئن تھا۔ پھر

نکاح کے کچھ دیر بعد جب علیزے نے لاریب سے کہا کہ وہ اپنے کمرے میں جانا چاہتی ہے تو یک دم ہی حمزہ نے صوفے پہ رکھے اس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔ شاکنگ پنک اور ریڈ کنٹراس کے سوٹ میں وہ اس کے دل میں اتری جارہی تھی۔

"ابھی نہیں۔ تھوڑی دیر رکو۔" دھیمے سے اسے کہتا وہ اپنے کوٹ کی جیب سے کچھ نکالنے لگا تھا۔

"سوری سب کچھ بہت جلدی میں ہوا۔ خفا مت ہونا کیونکہ یہ سب میری خواہش پہ ہوا ہے۔" منگنی کے لیے لائی جانے والی انگوٹھی اس نے علیزے کے ہاتھ میں پہنا دی تھی۔

"تھینک یو۔" وہ آسودگی سے مسکرا دی تھی۔

☼ ☼ ☼

آج فائنل کی کلاسز کا پہلا دن تھا۔ پڑھائی اتنی زیادہ نہیں ہو رہی تھی۔ پہلی دو کلاسز کے بعد جب تیسرا پیریڈ فری ملا تو علیزے بھی کلاس روم سے باہر نکل کر لائبریری کی طرف جارہی تھی کہ سامنے کوریڈور سے اسے علینہ آتی دکھائی دی تھی۔ کتنے دنوں بعد اسے دیکھا تھا۔ سو علیزے وہیں رک کر اس کے پاس آنے کا انتظار کرنے لگی تھی کیونکہ سبجیکٹ مختلف ہونے کے باوجود بھی ان دونوں کی اچھی دوستی ہو گئی تھی۔

"کیسی ہو علینہ۔" اس کے قریب آنے پہ علیزے نے بہت محبت سے پوچھا تھا۔

"ٹھیک ہوں تم کیسی ہو۔" وہ بمشکل اس کے قریب رکی تھی۔ ایسے جیسے اس کے پاس رکنا نہ چاہتی ہو۔

"میں بھی بالکل ٹھیک ہوں تم کہاں ہو اتنے دنوں سے، میں نے کتنی بار تمہارا نمبر ٹرائے کیا مگر ہر بار تمہارا نمبر آف ہی ملا۔" علیزے نے محسوس ہی نہیں کیا کہ وہ کچھ اکھڑی اکھڑی سی ہے۔

"ہاں میں نے نمبر چینج کرلیا ہے۔ تم حمزہ سے لے لیتیں اس سے تو تقریباً روز ہی میری بات ہوتی ہے۔" علینہ نے گلاسز بالوں پہ ٹکاتے ہوئے علیزے کا دھواں دھواں ہوتا چہرہ بہت غور سے دیکھا تھا اس کا تیر نشانے پہ لگا تھا کہنے کو تو اس نے کہہ دیا کہ حمزہ سے اس کی روز ہی بات ہوتی ہے۔ مگر یہ نہیں کہا کہ وہ کبھی اس کی کال اٹینڈ ہی نہیں کرتا، چاہے وہ کتنے ہی نمبر بدل بدل کر اسے فون کرتی مگر وہ ہر بار اس کی آواز سنتے ہی فون کاٹ دیتا تھا۔

"مبارک ہو تمہیں سنا ہے تمہارا اور حمزہ کا نکاح ہوگیا ہے تم تو بہت خوش ہوگی۔" وہ ابھی تک اپنی بات کا بہت گہرا اثر ہوتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

"ہاں ہاں تھینک یو۔" علیزے نے بدقت خود کو سنبھالا تھا۔

"میں نے تمہیں بھی انوائٹ کرنا تھا مگر تم گھر پہ نہیں تھیں اور تمہاری آنٹی کا ایڈریس میرے پاس نہیں تھا۔ تمہارے پیرنٹس واپس آگئے۔" علیزے نے اپنا دھیان ہٹانے کو بات ہی بدل دی۔

"نہیں فی الحال ان کا کوئی ارادہ نہیں ہے واپس آنے کا اور ہوسکتا ہے کچھ عرصے تک میں بھی واپس چلی جاؤں۔" علینہ نے اس لمحے اسے بہت غور سے دیکھا تھا ایسا کیا تھا اس میں جو علینہ وقار میں نہ تھا۔

"سچ کہتے ہیں محبت اندھی ہوتی ہے اور جب دل کے دروازے کھلتے ہیں تو آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔" علینہ دل ہی دل میں سوچتے ہوئے ہنس دی تھی۔

"اوکے علیزے میں چلتی ہوں مجھے کچھ کام ہے۔" علینہ اس سے ہاتھ ملانے کے بعد آگے بڑھ گئی تھی۔

"جس طرح ابھی تمہاری خوشی کو خاک میں ملایا ہے اس طرح تمام عمر کے لیے تمہیں خوشیوں کے لیے نہ ترسا دیا تو میرا نام علینہ وقار نہیں۔"

وہ گلاسز آنکھوں پہ ٹکاتی اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئی تھی اور علیزے وہیں اسے جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ جانے کیوں اسے کبھی کبھار علینہ سے اس کی باتوں سے خوف سا محسوس ہوتا تھا کبھی کبھی اس کا لہجہ بہت سخت اور عجیب سا ہو جاتا تھا۔ وہ اپنے اور حمزہ کے حوالے سے ہر بار کوئی نہ کوئی بات ایسی کر جاتی تھی

دو دنوں تک علیزے کو پریشان کیے رکھتی تھی وہ سر جھٹک کر لائبریری کی طرف آگئی تھی مگر اس کا ذہن الجھا الجھا سا تھا اور پھر وہ جلد ہی گھر واپس آگئی تھی۔

☼ ☼ ☼

ابھی ابھی ریسیپشن سے سہد نے اسے بتایا کہ اس سے کوئی ملنے آیا ہے اور اب دروازہ ناک کرنے کے بعد جو شخصیت اندر داخل ہوئی اسے آتے دیکھ کر حمزہ کی پیشانی پہ بل پڑ گئے تھے۔ اس کی اتنی ہمت اور بے باکی، دیکھ کہ وہ اب اس کے آفس تک آن پہنچی تھی۔

"آپ یہاں؟" وہ ایک دم سے اپنی چیئر سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"کیوں میں یہاں نہیں آسکتی کیا۔" وہ شاہانہ انداز میں کہتی اس کے قریب چلی آئی تھی۔

"آپ کو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا یہ میرا آفس ہے۔" حمزہ کو اس کا اس طرح یہاں آنا بہت برا لگا تھا۔

"تو میں اور کیا کرتی نہ آپ کہیں ملتے ہیں نہ فون پہ بات کرتے ہیں تو مجبوراً مجھے یہاں آنا پڑا۔" وہ بے تکلفی سے اس کے بالکل پاس آکھڑی ہوئی۔ جانے ایسی کیا بات کیا کشش تھی حمزہ احتشام میں کہ وہ اس کے پاس کھنچی چلی آتی تھی اور وہ اس سے اتنا ہی دور بھاگتا تھا۔

"دیکھو علینہ خدا کے لیے میرے پیچھے آنا چھوڑ دو کتنی دفعہ کہوں تم سے۔" وہ غصے سے قدرے بلند آواز میں بولا تھا۔

"جن سے محبت کی جاتی ہے نا حمزہ انہیں چھوڑا نہیں جاتا۔ ہمیشہ ان کے ساتھ ساتھ رہا جاتا ہے جیسے تم علیزے کے ساتھ ہو ہمیشہ، زندگی بھر کے لیے۔" محبت سے کہتے کہتے علیزے کے نام پر اس کے لہجے میں کاٹ سی اتر آئی تھی۔

"اس کی بات الگ ہے۔ تم اس سے مقابلہ کرنا چھوڑ دو۔ وہ میری بیوی ہے۔ اس کا بہت خاص مقام ہے میری زندگی میں۔ تم اس کی جگہ کبھی نہیں لے سکتیں۔"

"کیوں اس کی بات الگ ہے۔ اس کی جگہ میں بھی ہوسکتی تھی اگر تم چاہتے تو۔ بولو ہو سکتی تھی نا۔" وہ غصے سے اس کی بات کاٹ گئی تھی۔

"دیکھو علینہ تم اس کی جگہ کبھی نہیں ہو سکتی تھیں کیونکہ وہ جگہ کبھی تمہاری تھی ہی نہیں۔ تم اس وقت ہوش میں نہیں ہو جاؤ یہاں سے اور دوبارہ کبھی یہاں مت آنا۔" حمزہ کو اس لمحے اس کے لہجے سے عجیب سا خوف محسوس ہوا تھا جانے اس کی دیوانگی اسے کہاں تک لے جائے گی کیا رنگ دکھائے گی۔

"ٹھیک ہے میں یہاں سے چلی جاتی ہوں۔ لیکن اگر تم میرے نہیں ہوسکتے نا تو میں تمہیں بھی اس علیزے کا بھی نہیں ہونے دوں گی یاد رکھنا۔" وہ اسے دھمکاتی جانے کو مڑی تھی اور پھر جاتے جاتے روم کے دروازے پہ۔ جس والہانہ انداز میں اس سے ملتی ہوئی گئی تھی وہ منظر لنچ آور ہونے کی وجہ سے سب کے ساتھ ساتھ بابا کی نظروں کی گرفت میں بھی آچکا تھا۔ بلیو جینز اور وائٹ سلیولیس ٹاپ کے قابل اعتراض حلیے میں وہ کہیں سے بھی مہذب نہیں لگ رہی تھی۔

"اس امیر زادی کے سر سے ابھی تک تمہارے عشق کا بخار نہیں اترا۔" لنچ کے لیے اس کے پاس آتا شہروز اس کے پاس ہی رک گیا تھا۔

"نہیں یار یہ تو میری جان کو آگئی ہے پاگل ہو گئی ہے بالکل کچھ سمجھتی ہی نہیں ہے۔ سمجھ نہیں آتا کیا کروں۔ عجیب عجیب باتیں کرتی ہے۔" وہ اس وقت قدرے پریشان تھا۔

"حمزہ کون تھی یہ؟" بابا اس کے پاس کب آکر کھڑے ہوئے اسے پتا ہی نہیں چلا تھا۔

"بابا وہ۔۔۔ یونیورسٹی فیلو تھی۔" وہ گھبرا گیا۔

"میں نہیں جانتا تھا کہ تم اپنے سب یونیورسٹی فیلوز سے اتنے فرینک ہو۔" بابا کے انداز سے ان کی خفگی کا صاف پتا لگ رہا تھا کیونکہ وہ اس طرح تبھی بات کیا کرتے تھے جب انہیں کوئی بات سخت بری لگتی تھی۔

"ج۔۔۔ جی بابا وہ۔۔۔" وہ سٹپٹایا تھا۔

"دراصل بابا اسے جاب چاہیے تھی اور اسے

معلوم نہیں تھا کہ یہ ہمارا آفس ہے۔" وہ کیسے انہیں سب کچھ بتا دیتا۔ کیونکہ یہ بات شہروز کے علاوہ کوئی اور نہیں جانتا تھا۔

"اس کا مطلب ہے وہ جہاں جاب کے لیے جائے گی سب سے اسی طرح ملے گی یا یہ فرینک نیس خاص تمہارے لیے تھی بہرحال آئندہ وہ مجھے دوبارہ یہاں نظر نہ آئے۔ انڈر اسٹینڈ۔" وہ سخت لہجے میں تنبیہہ کر رہے تھے۔

"جی بابا!" وہ شرمندہ سا قصور نہ ہونے کے باوجود سر جھکائے کھڑا تھا۔

"لنچ کے بعد میرے کیبن میں آؤ ضروری کام ہے۔"

"جی بابا۔" وہ کہہ کر چلے گئے تو اس نے کھل کر سانس لی تھی۔ آج اس علینہ وقار کی وجہ سے اسے کتنا کچھ سننا پڑا تھا۔

"اب کیا کریں؟" شہروز اس تمام عرصے میں خاموش کھڑا تھا۔ انکل کا غصہ دیکھ کر وہ بھی ڈر گیا تھا۔

"کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔" حالانکہ دل تو چاہ رہا تھا کہ ابھی اسی وقت جا کر اس لڑکی کو اتنی کھری کھری سنائے کہ عمر بھر کے لیے یہ محبت کا بھوت اس کے سر سے اتر جائے۔

"انکل کو سب بتا دو۔" شہروز نے مشورہ دیا تھا۔

"لگتا ہے ایسا ہی کرنا پڑے گا۔ کم از کم ان کے سامنے میری پوزیشن تو کلیئر ہو جائے گی نا۔ تم چلو ڈائننگ ہال میں بابا کی بات سن کر وہیں آتا ہوں۔" لنچ تو اب خاک اچھا لگتا وہ شہروز کو بھیج کر بابا کے پاس چلا آیا تھا۔ پر بہت چاہنے پر بھی وہ یہ سب کچھ انہیں بتا نہیں پایا تھا۔

☼ ☼ ☼

حمزہ پندرہ دن کے لیے آفس کے کام سے اسلام آباد جا رہا تھا۔ وہ اور شہروز مل کر کوئی نیا بزنس اسٹارٹ کر رہے تھے اور وہ جانے سے پہلے علیزے کو ڈنر پہ لے جانا چاہتا تھا اور نکاح کے بعد اس نے پہلی بار علیزے سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا اور یہ کوئی ایسی معیوب بات بھی نہیں تھی اس لیے بابا نے اجازت "فوراً" ہی دے دی تھی اور ساتھ میں اسے تاکید کی تھی کہ وہ علیزے کے والدین سے ضرور اجازت لے لے اور حمزہ نے باخوشی ان کی یہ بات مانتے ہوئے کل رات ماما سے فون پر بات کر لی تھی۔ علیزے سے نکاح کے بعد وہ آصفہ کو ماما ہی کہنے لگا تھا۔ اس کے ساتھ ڈنر پہ جانے کا سن کر کچن میں رات کے کھانے کی تیاری کرتی علیزے کے ماتھے پہ یکدم ہی پسینہ پھوٹ پڑا تھا۔ ہاتھوں میں لرزش سی اتر آئی تھی اور آج جب وہ کنفیوژ اور قدرے کونشس سی ڈنر پہ جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی تو بار بار ماما سے پوچھ رہی تھی کہ میں ٹھیک تو لگ رہی ہوں نا اور ماما نے اس کی پیشانی چوم کر اسے یقین دلایا تھا کہ وہ بہت پیاری لگ رہی ہے۔

اب اسی کنفیوژن میں وہ حمزہ کے سامنے ہوٹل میں بیٹھی تھی اور حمزہ بہت دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ کس قدر اچھی اچھی سی لگ رہی تھی وہ اس وقت ریڈ شیفون کے اسٹائلش سے ڈریس میں اپنی تمام تر جاذبیت سمیت حمزہ کے دل میں اترتی جا رہی تھی۔ یہ شاید بدلتے رشتے کا اثر تھا کہ علیزے کو آج حمزہ کی نگاہیں بدلی بدلی سی محسوس ہو رہی تھیں مکمل استحقاق لیے۔

"کیسا لگ رہا ہے۔ اس طرح میرے ساتھ یہاں آنا۔" حمزہ نے بہت غور سے اس کے کان میں جھولتی بالی کو دیکھا تھا۔

"اچھا لگ رہا ہے۔" وہ اب بھی نگاہیں جھکائے ہوئے تھی۔

"صرف اچھا۔" وہ شاید کچھ اور بھی سننا چاہ رہا تھا۔

"نہیں بہت اچھا لگ رہا ہے۔ کم از کم مجھے اب محسوس نہیں ہو رہا ہے کہ کوئی اگر یہاں مجھے آپ کے ساتھ دیکھ لے گا تو کیا کہے گا۔"

"ان کو نہ رہنے دو۔ اچھے لگ رہے ہیں۔" بولتے بولتے چہرے کے دونوں اطراف بکھری لٹوں کو ہاتھ سے ہٹانے لگی تو یکدم ہی حمزہ نے ٹوک دیا تھا۔ وہ جھینپ کر مسکرا دی تھی جب سے یہاں آئے تھے تب سے حمزہ کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اس کی بکھری لٹوں کو ہاتھ سے سنوار دے جو بے تکلفی سے اس کے چہرے کو اپنے حلقے میں لیے ہوئے تھیں۔

"میں یہ نہیں کہتا علیزے کہ تم کوئی بہت خوب صورت، بہت حسین ہو، پر تم میں ایک عجیب سی جاذبیت، عجیب سی کشش ہے جو مقابل کو اپنے گھیرے میں لے لیتی ہے سحر زدہ کر دیتی ہے۔" کھانے کے دوران ہی حمزہ نے اس کی کسی بات کے جواب میں کہا تھا تو علیزے نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا تھا کہ سامنے بیٹھا یہ پرخلوص شاندار سا مرد صرف اس کا ہے وہ آسودگی سے مسکرا دی تھی۔

"یہاں کی کافی بہت زبردست ہوتی ہے پیو گی نا۔" کھانے کے بعد کافی آرڈر کرتے ہوئے حمزہ نے اسے بتایا تھا۔

"ہیلو حمزہ۔" ابھی انہوں نے کافی کا بمشکل ایک سپ ہی لیا ہو گا کہ انہیں اپنے عقب سے آواز سنائی دی تھی آنے والی شخصیت کو دیکھ کر حمزہ کا سارا موڈ خراب ہو گیا تھا۔ یکدم ہی اس نے علیزے کی طرف دیکھا تھا۔ مگر حمزہ کو اس کے چہرے پہ کوئی خفگی بھرے تاثرات نظر نہیں آئے تھے وہ علینہ کو دیکھ کر خوش دلی سے مسکرا رہی تھی۔ اگر کبھی اسے پتا چل جائے کہ یہ لڑکی کس طرح اس کی زندگی میں زہر گھولنے کی کوشش کر رہی ہے تو کیا تب بھی اس کے تاثرات یہ ہی رہیں گے وہ سوچتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا کہ علینہ کی پکار پہ اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ جو اپنے ساتھ کھڑے شخص کا اس سے تعارف کروا رہی تھی۔

"حمزہ یہ جاذب اظہر میرے کزن اور جاذب یہ حمزہ الشام ہیں۔" وہ علیزے کو یکسر نظر انداز کر کے صرف حمزہ کا تعارف کروا رہی تھی۔

"اور یہ علیزے ہیں میری وائف ہمارا نکاح ہو چکا ہے۔" جاذب کی نظریں مسلسل علیزے پر جمی دیکھ کر حمزہ نے اسے بتانا ضروری سمجھا تھا۔ حمزہ کی بات سن کر علینہ کے چہرے پہ کتنے ہی رنگ ٹھہر کر بدلے تھے۔ علیزے نے اس لمحے بہت غور سے علینہ کو دیکھا تھا۔ صرف اس لیے کہ آیا جو وہ سمجھ رہی ہے وہ ٹھیک ہے یا صرف اس کا وہم ہے مگر علینہ کے چہرے پہ صاف صاف لکھا تھا کہ یہ اس کا وہم نہیں ہے۔ وہ ٹھیک سمجھ رہی ہے وہ سر جھٹک کر علینہ کی طرف متوجہ ہوئی تھی جو جاذب سے کہہ رہی تھی۔

"جاذب تم جاؤ۔ میں یہیں اپنے فرینڈز کو جوائن کروں گی اور بعد میں حمزہ مجھے ڈراپ کر دیں گے۔ کیوں حمزہ ٹھیک ہے نا۔"

اسے بیٹھتا دیکھ کر حمزہ کو مروتاً" سر ہلانا پڑا تھا۔ اسے اچانک ہی یاد آیا تھا کہ یہ ریسٹورنٹ علینہ کا فیورٹ ہے اور اکثر یہاں کافی پینے آتی ہے اور کچھ عرصہ پہلے وہ حمزہ کو بھی زبردستی یہیں لے کر آئی تھی وہ کتنی ہی دیر اس لمحے کو کوستا رہا جب وہ علیزے کو لے کر یہاں آیا تھا۔ جاذب اسے چھوڑ کر جا چکا تھا ان لوگوں کے ساتھ کافی پیتے ہوئے چند لمحے علیزے کے ساتھ بات کرنے کے بعد وہ اسے نظر انداز کیے مسلسل حمزہ کی طرف ہی متوجہ تھی اور علیزے کو یہ بات بہت بری لگ رہی تھی اور حمزہ صرف علیزے کو ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ اسے برا لگ رہا ہے اسے بھی برا لگا تھا اس کا یوں بن بلایا مہمان بن جانا۔

"میرا خیال ہے اب گھر چلنا چاہیے۔ ماما انتظار کر رہی ہوں گی۔" علیزے یکدم ہی اٹھ کھڑی ہوئی تھی اس کا موڈ بری طرح آف ہو چکا تھا۔ حمزہ بھی فوراً" ہی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ وہ بھی جلد از جلد اس مصیبت سے چھٹکارا پانا چاہتا تھا۔ حمزہ نے اس سے ایڈریس پوچھنے کے علاوہ اور کوئی بات نہیں کی تھی اسے اس کی آنٹی کے گھر ڈراپ کر کے وہ تیزی سے وہاں سے گاڑی نکال لایا تھا۔

"مجھ سے کیوں ناراض ہو رہی ہو میں نے کیا کیا۔" اس نے ایک نظر اس کے خفا خفا سے چہرے پر ڈالی تھی۔

"میں آپ سے خفا نہیں ہو رہی، مجھے بہت برا لگا

علینہ کا یوں ہمیں جوائن کرنا‘ اس میں اتنی تمیز نہیں ہے کہ جب دو لوگ بیٹھے ہوں تو اس طرح سے آکر بیچ میں نہیں بیٹھتے جب تک وہ خود دعوت نہ دیں۔“ وہ خفا خفا سی بولتی ہوئی اس سے بہت اچھی لگ رہی تھی۔

”اسپیشلی کپل۔“ حمزہ نے شرارت سے اسے دیکھا۔ اس نے اک نگاہ حمزہ کو دیکھ کر منہ پھیر لیا تھا۔

”تمہارے لیے۔“ سگنل پہ گاڑی رکی تو حمزہ نے ریڈ روز کا بکے لے کر اس کی طرف بڑھایا تھا وہ چاہتا تھا کہ علینہ کے بارے میں علیزے کو بتا دے پر اس کے ری ایکشن کا سوچ کر وہ خاموش ہو گیا تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ آج کی اتنی خوب صورت شام کا اختتام ذرا بھی برا ہو۔

”تھینک یو۔“ وہ خفا خفا سی تھامتے ہوئے بولی تھی۔

”اب اتنے پھولے منہ کے ساتھ تو تھینک یو مت کہو۔ یار اب اس میں میرا کیا قصور ہے برا تو مجھے بھی لگا۔ اسے ہمارے ایٹی ٹیوڈ سے سمجھ لینا چاہیے تھا کہ ہم اسے شریک نہیں کرنا چاہ رہے پر واقعی کچھ لوگوں میں سینس کی کمی ہوتی ہے یا وہ جان بوجھ کر ایسا کرتے ہیں۔ فارگیٹ اٹ۔

اچھا یہ بتاؤ تمہیں جیلسی ہو رہی ہے نا۔“ وہ شرارت سے اس کی سمت ذرا سا جھکا تھا۔

”ہاں تو کوئی لڑکی اتنے دھڑلے سے میرے شوہر کے ساتھ آکے بیٹھ جائے تو کیا مجھے جیلسی نہیں ہوگی۔“ وہ کہتے کہتے خود ہی جھینپ کر منہ پھیر گئی تھی۔ کیونکہ جواب میں حمزہ نے شوخ نظروں سے اسے دیکھا تھا زندگی میں پہلی بار آج وہ بلا سوچے سمجھے بولی تھی۔ حمزہ نے اس کی شخصیت کا یہ روپ پہلی دفعہ دیکھا تھا۔

”اچھا اب اس میں اتنا شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس میں غلط کیا ہے بلکہ مجھے اچھا لگا تمہارا یوں اپنے لیے حق سے بات کرنا۔“ حمزہ نے اس کی گھبراہٹ کو انجوائے کرنے کے ساتھ ساتھ اسے بتایا تھا۔ ہوا سے کتنی ہی لٹیں اڑ اڑ کر اس کی چہرے کا طواف کر رہی تھیں اور حمزہ کے دل میں اس وقت یہ خواہش شدت سے سر اٹھا رہی تھی کہ وہ ان آوارہ لٹوں کو سنوار دے۔

”علیزے۔“ گھر کے سامنے گاڑی رکتے ہی وہ اترنے لگی تو حمزہ کی پکار نے اسے روک لیا تھا وہ رک کر اسے دیکھنے لگی تھی۔

”ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا تمہاری جگہ کبھی بھی کوئی بھی نہیں لے سکتا۔ میرے دل میں تمہارا مقام بہت خاص‘ بہت اونچا ہے اور اس تک کوئی نہیں پہنچ سکتا۔“ ایک لٹ جو کب سے اسے پریشان کر رہی تھی۔ وہ بار بار اسے جھٹک رہی تھی۔ حمزہ نے اس لمحے دل کی خواہش پہ لبیک کہا تھا اور اسے پل بھر کو اپنے ہاتھ سے سنوارا تھا وہ گھبرا کر سمٹی تھی۔

”تھینک یو حمزہ۔ آپ بہت اچھے ہیں بہت خاص‘ میں دعا کرتی ہوں کہ آپ ہمیشہ میرے ساتھ اسی طرح رہیں۔ اتنے ہی اچھے‘ اتنے ہی خاص۔“ کتنے ہی ستارے ایک ساتھ اس لمحے علیزے کی آنکھوں میں جگمگائے تھے۔

”ان شاء اللہ اب جاؤ ماما انتظار کر رہی ہوں گی۔“ بے قابو ہوتے دل کو اس نے بمشکل ہی سمجھایا تھا۔

”اللہ حافظ۔“ کتنے ہی اقرار کے خوب صورت جگنو اپنے دامن میں سمیٹے وہ گاڑی سے اتر گئی تھی اور پھر جب تک وہ گیٹ سے اندر نہیں چلی گئی وہ اسے دیکھتا رہا تھا۔ پھر میوزک آن کرتے ہوئے اس نے گاڑی آگے بڑھا دی تھی۔

☼ ☼ ☼

فون کی مسلسل بجتی ہوئی بیل نے اس کی گہری نیند میں خلل ڈالا تھا۔ اس نے آنکھیں کھولنے کی پوری کوشش کی تھی۔ مگر نیند کا غلبہ اس قدر طاقت ور تھا کہ وہ پل میں پھر سے غافل ہو گیا تھا مگر ایک تواتر سے بجتے فون نے بالآخر اس کی نیند کو توڑ ہی ڈالا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر سائیڈ ٹیبل پہ رکھا موبائل اٹھایا اور بنا نمبر دیکھے ہی آن کر کے کان سے لگا لیا تھا۔ لیکن دوسری طرف سے آتی آواز سن کر پل میں اس کی ساری حسیات بے دار ہوئی تھیں۔

”تم نے اس وقت کیوں فون کیا ہے؟“ حمزہ نے رسٹ واچ اٹھا کر ٹائم دیکھا تو رات کے دو بج کر پینتیس منٹ ہو رہے تھے۔

”بس آپ کی یاد آرہی تھی۔ سوچا آپ کی آواز سن لوں اور شکر ہے بہت مشکلوں سے آپ کی آواز سننے کو ملی ہے۔“ ایک ادائے دلربائی سے کہا گیا تھا جیسے دوسری طرف وہ رات کے اس پہر اسی کے فون کا انتظار کر رہا تھا۔

”تمہیں بالکل شرم نہیں آتی ایسی حرکتیں کرتے ہوئے اور اتنی رات گئے ایک غیر مرد کو فون کرتے ہوئے۔“ نیند کی جگہ اب بےزاری اور غصے نے لے لی تھی۔ کس مٹی کی بنی تھی وہ کچھ سمجھتی ہی نہیں تھی۔

”آپ غیر کہاں ہیں۔ آپ تو میرے دل کے بہت قریب ہیں۔ بہت خاص۔“

”دیکھو میں تمہارا بہت لحاظ کر رہا ہوں۔ بہت برداشت کر رہا ہوں صرف اس لیے کہ تم ایک لڑکی ہو اور میرا غصے میں اٹھایا گیا کوئی بھی قدم تمہارے لیے نقصان دہ ہو سکتا ہے تو بہتر یہی ہے کہ تم اپنے بڑھتے قدموں کو روک لو۔“ اس کی بات سن کر حمزہ کو آگ ہی لگ گئی تھی۔ دل تو چاہ رہا تھا کہ اگر وہ سامنے ہوتی تو کھینچ کر ایک تھپڑ اس کے منہ پہ رسید کرتا۔ برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔

”ضبط کی آخری حد سے تو میں گزر رہی ہوں۔ تمہیں اتنی آسانی سے کسی اور کا ہوتا دیکھ کر۔“ وہ چبا کر غصے سے بولی تھی۔

”ہاں ہاں‘ فون بند مت کرنا ورنہ ساری رات تمہیں فون کرتی رہوں گی میری دیوانگی سے ابھی تم پوری طرح واقف نہیں ہو۔“ حمزہ فون آف کرنے ہی لگا تھا کہ اس نے فوراً ہی روکا تھا۔ جانتی تھی آج بھی وہ ہمیشہ کی طرح فون بند کر دے گا آج کتنے ہی دنوں بعد تو حمزہ نے اس کی کال ریسیو کی تھی۔

"تم آخر چاہتی کیا ہو؟" وہ جیسے تھک کر بولا تھا۔ اپنے مخصوص انداز میں پیشانی سہلاتے ہوئے وہ اس وقت ازحد پریشان تھا۔

"میں کیا چاہتی ہوں۔ تم اچھی طرح جانتے ہو حمزہ۔ میں صرف تمہیں چاہتی ہوں اور میں چاہتی ہوں کہ تم بھی مجھی کو چاہو۔" ایک عجیب سے حسرت تھی اس کی لہجے میں۔

"ایسا ناممکن ہے۔ تم زبردستی مجھے خود سے محبت کرنے پہ مجبور نہیں کر سکتیں۔" آج بھی اس کا لہجہ پہلے دن کی طرح اٹل تھا۔

"بہت چاہتے ہو نا تم علیزے کو۔ سوچو اگر وہ کبھی تمہاری زندگی میں نہ رہے تو تم کیا کرو گے؟"

"اپنی بکواس بند کرو۔ ان شاء اللہ ایسا کبھی نہیں ہو گا تمہاری یہ خواہش کبھی پوری نہیں ہوگی چاہے تم جتنی کوشش کرلو۔" ایک پل کو تو اس کی بات سن کر حمزہ کے پورے وجود میں سرسراہٹ سی دوڑ گئی تھی مگر دوسرے ہی پل حمزہ نے اسے جھڑک دیا تھا۔

"اسی طرح بالکل اسی طرح میں بھی تڑپتی ہوں تمہارے لیے۔ تمہیں پانے کے خواب دیکھتی ہوں دیکھنا ایک دن آئے گا کہ تم بھی اس کے لیے اسی طرح تڑپو گے تب تمہیں میری تڑپ کا احساس ہو گا اور وہ دن میرا ہو گا علینہ وقار کا۔ تمہیں میرے پاس آنا ہی ہو گا۔"

"تم پاگل ہو اور مجھے بھی کر دو گی۔"

عجیب انداز تھا اس کا چیلنج کرتا ہوا۔ حمزہ نے فون آف کر دیا تھا۔ کتنی ہی دیر وہ سر تھامے بیٹھا رہا تھا اور پھر وہ ساری رات اس نے کروٹیں بدلتے ہوئے گزار دی تھی تبھی اس کی سرخ آنکھیں اور تھکا چہرہ دیکھ کر صبح آفس میں شہروز نے اس سے پوچھا تھا۔

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے حمزہ کیا رات سوئے نہیں ہو ٹھیک سے۔"

"نہیں یار، میں بہت پریشان ہوں۔" اور پھر اس نے شہروز کو پوری بات بتا دی تھی۔

"میرا خیال ہے حمزہ تم انکل کو بتا دو۔ تاکہ اگر کل کو کوئی اونچ نیچ ہو جائے تو کم از کم وہ سنبھال تو سکیں گے ورنہ سارا الزام تم پر آئے گا۔" شہروز نے پوری بات سننے کے بعد کہا تھا۔

"ہاں تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں بھی کل رات سے یہی سوچ رہا ہوں۔ مگر خدا گواہ ہے شہروز میں نے کبھی بھی علینہ کے بارے میں ایسا کچھ نہیں سوچا ہے۔ میں پہلے دن سے ہی علیزے سے۔۔۔" وہ پریشانی کے مارے بات ہی ادھوری چھوڑ گیا تھا۔

"میں جانتا ہوں حمزہ تم پریشان مت ہو پاگل ہے وہ لڑکی۔ سب ٹھیک ہو جائے گا تم انکل کو پوری بات بتا دو۔ اس طرح تم بھی ریلیکس ہو جاؤ گے۔"

شہروز نے بڑھ کر اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دی تھی۔ تو وہ اثبات میں سر ہلا گیا تھا۔ مگر چاہنے کے باوجود وہ اگلے کئی روز تک پاپا سے کچھ نہیں کہہ پایا تھا کہ جانے وہ کیا خیال کریں مگر خاموشی اس مسئلے کا حل نہیں تھی۔

☼ ☼ ☼

"ہیلو ماما' ہائے سوئٹی۔"

جاذب نے کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے بیک وقت دونوں کو مخاطب کیا تھا۔ علینہ تو مسکرا کر اسے وش کرنے کے بعد دوبارہ سے اپنی پلیٹ پہ جھک گئی تھی۔ جبکہ ماما پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں۔

"تم کل رات کہاں تھے جاذب"

"دوستوں کے ساتھ تھا ماما۔" وہ بے نیازی سے کہہ کر اپنی پلیٹ میں سلاد ڈالنے لگا تھا۔

"یہ کیسے دوست ہیں تمہارے جو ساری رات تمہیں گھر آنے نہیں دیتے۔" وہ غصے سے بولیں۔

"او کم آن ماما بس دوستوں کے ساتھ تھا تو وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا پھر بھی میں صرف آپ کا خیال کر کے چار بجے گھر آگیا تھا۔" وہ ابھی بھی لاپروائی سے بولتا کھانا کھانے میں مگن تھا۔

"او مائی گاڈ چار بجے! کیا ضرورت تھی مجھ پہ اتنا بڑا

احسان کرنے کی اور میری بات غور سے سنو جاذب کل صبح تمہارے پاپا بزنس ٹور سے واپس آرہے ہیں اور تم جانتے ہو اچھی طرح سے کہ وہ تمہاری ان حرکتوں سے کتنا چڑتے ہیں۔ سو ابھی تمہیں کہیں باہر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنے کمرے میں جاؤ اور آرام کرو اور صبح ٹائم سے آفس پہنچ جانا۔ تم جانتے ہو وہ ہمیشہ ایئرپورٹ سے سیدھے آفس جاتے ہیں اور پھر گھر آتے ہیں۔ انڈرسٹینڈ۔" وہ اس کی بے توجہی نوٹ کر گئی تھیں۔

"اوکے ماما اب کھانا کھالوں۔" زہر لگتی تھیں اسے یہ روک ٹوک کرتیں 'لیکچر والی باتیں' وہ ہمیشہ ہی ایسی باتیں ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیا کرتا تھا۔ اس وقت بھی یہی کیا تھا۔

"دھیان رکھا کرو بیٹا اچھا لگتا ہے تمہیں جب تمہارے پاپا سب کے سامنے تمہیں غیر ذمہ داری پہ ڈانٹتے ہیں کم از کم مجھے تو بہت برا لگتا ہے۔" وہ ہمیشہ ہی اسے ڈانٹ ڈپٹ کرنے میں احتیاط سے کام لیتی تھیں کہ اگر بڑے بیٹے کی طرح یہ بھی انہیں چھوڑ کر چلا گیا تو وہ بالکل اکیلے رہ جائیں گے۔

"اوکے ماما' آئندہ خیال رکھوں گا" وہ خلاف توقع جلد ہی مان گیا تھا اور پھر کھانے کے بعد اپنے کمرے میں چلا گیا۔ مگر اسے پانچ بجے سے پہلے نیند کہاں آتی تھی اور پھر ابھی تو صرف ساڑھے گیارہ ہی بجے تھے۔ اس نے ٹی وی آن کیا پھر بور ہو کر بند کر دیا اور پھر باہر نکل آیا۔ اس کا ارادہ علینہ کے کمرے میں جا کے اس سے گپ شپ لگانے کا تھا۔ مگر وہ لاؤنج میں ہی مل گئی۔ وہ فون پہ بزی تھی اسے اپنی طرف آتا دیکھا تو گفتگو مختصر کر کے فون بند کیا اور اس کے پاس آگئی تھی۔

"کس سے بات ہو رہی تھی۔" جاذب نے وہیں صوفے پر بیٹھ کر ٹی وی آن کر کے میوزک چینل لگا دیا تھا۔

"ماما سے۔" وہ مختصر سے جواب کے بعد سامنے ہی آ بیٹھی تھی۔

"اچھا کب آرہی ہیں وہ۔" جاذب نے یونہی پوچھا تھا۔

"فی الحال تو ان کا واپسی کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ جاذب تم سے ایک بات پوچھوں۔"

وہ ابھی بھی اپنے موبائل میں الجھی تھی اور بات اس سے کر رہی تھی۔

"پوچھو۔" جاذب نے ایک گہری نگاہ اس پر ڈالی تھی۔

رات کے اس پہر جب گھر پہ بھی اتنی حسین کمپنی مل جائے تو بھلا باہر جانے کی کیا ضرورت ہے۔

"تم نے ایک بار کہا تھا کہ تم میرے لیے کچھ بھی کر سکتے ہو۔ یاد ہے۔" موبائل سائیڈ پہ رکھ کر اب وہ مکمل طور پہ اس کی طرف متوجہ تھی۔

"یہ کوئی بھولنے والی بات ہے۔ یہ تو میں اب بھی کہتا ہوں۔"

اس وقت جاذب کا انداز نثار ہونے والا تھا کیونکہ بلاشبہ علینہ بہت خوب صورت تھی۔

"تو اب وہ وقت آگیا ہے کہ تم ثابت کرو کہ تم میرے لیے کیا کر سکتے ہو۔"

وہ خوب اچھی طرح جانتی تھی کہ اسے کب اور کہاں کیا کرنا ہے۔ کیونکہ اب یہ معاملہ محبت اور چاہت سے بڑھ کر ضد اور انا کا بن چکا تھا۔

"تم ایک بار کہو تو سہی پھر دیکھو میں کیا کرتا ہوں۔ کہو تو اپنی جان دے دوں تمہاری ان حسین آنکھوں میں ڈوب جاؤں۔"

"نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے اب فضول مت بولو اور میری بات دھیان سے سنو۔"

وہ فوراً" ہی اسے ٹوک گئی تھی۔

"ہاں کہو۔" اب کے جاذب کو بھی احساس ہوا کہ معاملہ واقعی سنجیدہ ہے۔

"تمہیں وہ لڑکی یاد ہے، جو اس دن ہمیں وہاں ہوٹل میں ملی تھی۔"

"کون سی لڑکی؟" باوجود کوشش کے بھی جاذب کو یاد نہیں آیا تھا کہ علینہ کس لڑکی کی بات کر رہی ہے۔

"وہی لڑکی جو تمہیں وہاں ریسٹورنٹ میں حمزہ کے ساتھ ملی تھی اور میں نے انہیں وہاں جوائن کر لیا تھا اور تمہیں کہا تھا کہ واپسی پہ یہ لوگ مجھے ڈراپ کر دیں گے۔"

علینہ کے یاد دلانے پہ جاذب کی آنکھوں میں پہچان کے تاثرات ابھر آئے تھے۔

"ہاں ہاں' اچھا وہ لڑکی' جس کے لیے حمزہ نے کہا تھا کہ وہ اس کی بیوی ہے۔ کیوں کیا ہوا اسے؟" لمحے بھر کو جاذب کی نگاہوں میں علیزے کا بھرپور سراپا لہرا گیا تھا۔

"کچھ ہوا تو نہیں پر کچھ نہ کچھ تو ہونا چاہیے۔"

"کیا مطلب میں سمجھا نہیں۔" واقعی نہیں سمجھا تھا کہ علینہ کیا چاہتی ہے اور جواب میں علینہ نے اسے پوری بات بتا دی تھی اپنے اور حمزہ کے متعلق' حمزہ اور علیزے کے متعلق اور اس دوران اس کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو جاذب بہت غور سے دیکھتا رہا تھا۔

"تو اب تم کیا چاہتی ہو۔" پوری بات سننے کے بعد جاذب نے اس سے پوچھا تھا۔

"اور اس سے کیا ہوگا۔" علینہ کا پلان سننے کے بعد جاذب نے اس سے پوچھنا ضروری سمجھا تھا۔

"اور کچھ نہیں سہی مگر مجھے سکون ضرور مل جائے گا۔ میری انا کی تسکین تو ہو جائے گی۔ جتنی بے عزتی میں نے سہی ہے اس کا کچھ تو ازالہ ہوگا۔ تم کر سکتے ہو میرا یہ کام یا نہیں۔"

اس نے جاذب کے ہاتھ سے جلتا سگریٹ لے کر ایش ٹرے میں مسل دیا تھا۔

"کر سکتا ہوں کوئی اتنا مشکل نہیں ہے۔ میرے دوستوں کے لیے تو یہ روز کا معمول ہے پر تم سوچ لو اگر کوئی پرابلم ہو گئی تو۔"

بالآخر جاذب نے اس حسن کی دیوی کے سامنے گھٹنے ٹیک ہی دیے تھے۔

"بعد کی مجھے کوئی پروا نہیں ہے۔ جو بھی ہو۔ آئی ڈونٹ کیئر۔"

وہ لاپروائی سے بولی تھی۔ کیونکہ اس کے بعد اسے نہ حمزہ سے کوئی سروکار تھا اور نہ علیزے سے۔

"دو کے دن میں سب سنبھال لوں گا' موقع دیکھ کر تمہارا کام ہو جائے گا اور بدلے میں مجھے کیا ملے گا اتنا تو بتا دو۔" وہ اس کے مقابل کھڑے ہوتے ہوئے بولا تھا۔

"جو تم کہو۔" وہ بے تکلفی سے اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

"علینہ وقار۔" جاذب نے اسے کاندھوں سے تھام لیا تھا۔

"دو کے دن مگر کام ہونے کے بعد جو تم کہو گے ملے گا۔ اب باقی کی پلاننگ تم کرو میں جا رہی ہوں سونے جب کام ہو جائے تو بتا دینا پھر میں بتاؤں گی کہ اب آگے کیا کرنا ہے۔ گڈ نائٹ۔"

وہ دھیرے سے اس کے ہاتھ ہٹاتے ہوئے مست سی چال چلتی اپنے کمرے میں چلی گئی تھی اور جاذب کتنی ہی دیر وہاں کھڑا سوچتا رہا تھا۔

"چلو کرتے ہیں کچھ۔" وہ کندھے اچکا کر اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔

مگر یہ سوچ کر کہ اسے یہ کام ہر حال میں کرنا ہے۔

☼ ☼ (باقی آئندہ)

"بہت بری بات ہے بھابھی گل! ہم اتنی دور سے چل کر آگئے اور آپ ہمیں ٹائم ٹیبل سمجھا رہی ہیں۔" چھوٹی نند پشمینہ کھنکتے لہجے میں اسے غیرت دلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"میں ہر کام طریقے سے کرنے کی عادی ہوں پیاری پشمینہ!" اس نے ذرا اثر نہ لیا۔

"ہائے اللہ! میری اور دادا (بڑا بھائی) کی شادی طریقے سے باہر ہے۔ آپ دیکھ رہی ہیں آپا گل!" پشمینہ نے بڑی بہن کو شکایت لگائی۔

"دیکھ رہی ہوں۔ اور سچ بات تو یہ ہے کہ مجھے بھی دیر تک بازاروں میں رہنا پسند نہیں ہے۔ وزیرے ٹھیک کہتی ہے۔" گوری چٹی سنہری آنکھوں والی آپا گل کو بھابھی کی کوئی بات بری لگتی نہ تھی۔ سلیقہ شعار پڑھی لکھی خوب صورت وزیرہ ان کی ہی پسند تھی۔ جو بعد میں سب کی پسند بن گئی۔

"مورو! خالہ صحیح کہتی ہیں اتنی صبح تو اسکول جاتے ہیں یا دفتر۔ کم از کم شاپنگ پر نہیں جاتے۔" آپا گل کی پندرہ سالہ بیٹی کی جانب سے نکتہ اعتراض آیا۔

"اور جانے کی بھی خیر ہے مگر ڈھائی بجے سے پانچ منٹ پہلے واپسی کیسے ممکن ہوگی۔"

"اس کی فکر تم مت کرو ناممکن کو ممکن بنانا ہمیں آتا ہے۔ تم یہ چائے لو اور ساتھ اخروٹ کا حلوہ۔"

وزیرہ نے ٹرے اس کے عین سامنے رکھ دی۔

"چائے اور حلوے کی خوشبو نتھنوں سے ٹکرائی تو زیر بحث موضوع سے توجہ ہٹ گئی۔ وزیرہ اوون سے کباب بھی نکال لائی۔ آتش دان میں کوئلے چٹخ رہے تھے۔ کمرا گرم تھا۔ مگر وہ ٹھنڈے ہاتھوں کے باعث کپکپا گئی تھی۔ سی سی کرتی گرم کمبل میں گھس گئی۔

"اب اتنی بھی سردی نہیں ہے بھابھی گل!" پشمینہ نے چھیڑا۔

"ہاں ہاں بالکل نہیں ہے۔ بالکل بھی نہیں ہے۔" وزیرہ نے اختلاف سے گریز کیا اور ساتھ ہی ذرا سا آگے ہو کر اپنے دونوں ہاتھ پشمینہ کے گالوں پر چپکا دیے۔ وہ کرنٹ کھا کر پیچھے سرکی۔

وزیرہ نے جب گردن پکڑی تو پشمینہ چیخیں مارتی پیچھے کو سرکی۔ وزیرے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے اور آگے ہوئی۔

"اب میں یہ ہاتھ تمہارے پیٹ پر لگانے والی ہوں کیونکہ سردی بالکل نہیں ہے۔"

"بچائیں آپا گل! بچائیں۔ بھابھی گل ظالم ہو گئی ہیں۔" پشمینہ کو اب سردی سے زیادہ گدگدی کی فکر ہوئی۔ اسے گدگدی کے خیال سے ہی ہنسی آنے لگی تھی۔ وزیرہ اور چھوٹی فائزہ پہلے ہی ہنس رہی تھی۔ وزیرہ اپنی ہنسی ہی سے تھک گئی۔ جسم میں لہو بھی گرم ہو گیا۔ آپا گل بھی ہنس رہی تھیں۔

"بھابھی ظالم نہیں ہوئی۔ نند گرم کمرے کی گرم رضائی میں بیٹھ کر بے حس ہو گئی ہے۔ پتا ہے لائٹ نہیں تھی۔ گیزر کام نہیں کر رہا اور تلکوں سے گویا برف نکل رہی ہے۔ انگلیاں اکڑ گئیں میری۔" وہ ہاتھ آپس میں رگڑنے لگی۔

"آپ دیکھ رہی ہیں آپا گل! بھابھی گل نے ہمیں جتا دیا کہ ہمارے لیے چائے بنانے سے انہیں کتنی سردی لگی ہے۔ حالانکہ ہمیں آئے ابھی ڈیڑھ گھنٹہ بھی نہیں ہوا۔ توبہ توبہ۔" پشمینہ کی آنکھیں شرارت سے بھری ہوئی تھیں۔

"اور آپ دیکھ رہی ہیں آپا گل! کہ اس ڈیڑھ گھنٹے میں اس نے کتنی بار میری شکایت لگائی ہے اور فساد ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ ایسی فتنہ پرور نند۔ توبہ توبہ۔"

"اللہ ماہی! آپ کتنی اچھی باتیں کرتی ہیں۔" فائزہ نے یکدم اس کے ہاتھوں کو عقیدت مندی سے تھام لیا۔ پشمینہ نے گھور کر بھانجی کو دیکھا پھر آپا گل کو جو بڑی محبت سے وزیرہ کو دیکھ رہی تھیں۔ اور چہرے سے یہ بھی پتا لگتا تھا کہ وزیرہ کے خیالات سے متفق ہیں۔ وزیرہ بے نیازی سے چھت کے پنکھے کو گھور رہی تھی۔ جیسے گرد و پیش سے بے خبر ہو۔

پشمینہ نے ایک مکا بنا کر وزیرہ کے شانے پر ٹھوک دیا۔ وزیرہ زور سے ہنس دی۔

"اور یہ "دیکھ رہی ہیں آپا گل!" والی حرکتیں چھوڑ دو۔ پتا ہے۔ نئے نئے دولہا کی ہر بات پر تم صدائیں لگاؤ۔ دیکھ رہی ہیں آپا گل۔ اب آپا گل دیکھنے کے لیے کراچی تک کی دوڑیں لگائیں گی کیا؟"

پشمینہ جھینپ کر رہ گئی۔ فائزہ نے قہقہہ لگایا جبکہ آپا گل نے بمشکل چائے کا گھونٹ حلق سے اتارا۔ اور پھر ایک فلک شگاف قہقہہ لگا کر بولیں۔

"اللہ کی قسم میں خود بھی دو تین دن پہلے یہی سوچ رہی تھی۔"

پشمینہ شرمانے کے بعد اب خفا ہونے کا تاثر دینے کے لیے ذرا منہ موڑ گئی۔ وزیرہ نے جلدی سے پلیٹ بنا کر چائے کا کپ دیا۔

"جلدی جلدی چائے ختم کرو پھر پروگرام بھی تو سیٹ کرنا ہے۔ یہ تو بتایا نہیں کہ کتنی شاپنگ کرنی ہے کتنی ہو گئی ہے۔ بس باتیں ہی باتیں۔"

پشمینہ نے ناراض رہنے کا تاثر برقرار رکھا۔ آپا گل شروع ہو گئیں۔ وزیرہ بھی سنجیدہ ہو گئی۔

"پہلے تو گرم کپڑوں کی خریداری کی فکر تھی مگر آغا جی کا فون آ گیا۔ انہوں نے کہا بے کار ہوں گے سارے کپڑے۔ کراچی میں لوگ فل پنکھا چلا کر سردی سردی کرتے ہیں۔ عورتیں لان کے سوٹ پر گرم شال لیتی ہیں۔ میں نے تو یہ بات سنتے ہی سارے گرم کپڑے کاٹ دیے لسٹ میں سے۔ کوئی سستے ہوتے ہیں گرم سوٹ اور سوئٹر شالیں۔"

وزیرہ سر ہلانے لگی۔ فائزہ کا چہرہ تمتمانے لگا۔ اسے کچھ یاد آ گیا تھا۔

"جامنی رنگ کا شرارہ لیا ہے آغا جی لوگوں نے اور آسمانی رنگ کا پشواز سوٹ بھی۔ اور تین تو کڑھائی والے پلازو ہیں چوڑی دار پاجامے بھی۔ اور مورو نے مجھے نہیں بنانے دیے۔" وہ افسردہ بھی ہو گئی۔

"پشمینہ کو کراچی میں پہننے ہیں وہ سب کپڑے اور تم نے گاؤں میں۔ جیسا دیس ویسا بھیس کرنا چاہیے فائزہ۔"

فائزہ چپ ہو گئی۔ ماں بھی اتنے دن سے سہی سمجھا رہی تھی۔

تھوڑی دیر تک ناراض رہنے کے بعد پشمینہ بھی گفتگو میں شامل ہو گئی۔ اسے اس ایک ہفتے کے اندر ساری کی ساری شاپنگ کرنی تھی۔ آپا گل اور پشمینہ وزیرہ کے شوہر سعد اللہ کی چچازاد بہنیں تھیں۔ سعد اللہ اکلوتے تھے اور جوائنٹ فیملی سسٹم کی بنا پر ان دونوں کی اہمیت سگی نندوں سے بھی بڑھ کر تھی۔ سعد اللہ آپا گل کا ماؤں جیسا احترام کرتے اور پشمینہ کے لاڈ بیٹیوں والے تھے کہ خود اپنے دو بیٹے تھے۔ بیٹی دانیہ تو کوئی چھ سال پہلے آئی تھی۔

وزیرہ اور سعد اللہ پشاور شہر میں رہائش پذیر تھے بوجوہ ملازمت جبکہ باقی سارا خاندان گاؤں میں تھا۔ پشمینہ اور دادا (پشمینہ سے بڑے بھائی) کی شادی کی تیاریوں کے سلسلے میں ان تینوں کی آمد ہوئی تھی۔ وزیرہ خود بھی بہت پرجوش تھی۔ اس کی اپنی فیملی اسلام آباد میں تھی اور وہ سب چھٹیوں میں آیا کرتے۔ ادھر سسرال والے بھی گاؤں سے بہت مجبوری کے عالم میں نکلتے تھے۔

وزیرہ کو شاپنگ کا شوق تھا۔ خواہ اپنے لیے۔ یا کسی کے لیے۔ مگر اس شوق و جوش سے پرے۔ اس کے کچھ اصول و ضوابط تھے۔ جو اب پشمینہ اور فائزہ کو ناگوار گزر رہے تھے۔ آپا گل بھی اعتراض تو کرتی تھیں مگر پھر کچھ سوچ کر چپ ہو جاتیں۔

اور کڑے اصول و ضوابط کے پیچھے ظاہر ہے کہ مضبوط جواز تھے۔ بہت سا وقت گزر جانے کے بعد بھی وزیرہ ان سب چیزوں سے ابھر نہیں سکی تھی۔ پڑھی لکھی تھی۔ بہت معقول شخصیت کی مالک تھی۔ ہر رشتے کو نبھانے کے معاملے میں آئیڈیل کہی جا سکتی تھی۔

مگر ایک وہم جو اس کی زندگی کو شاید گھن کی طرح چاٹ رہا تھا کہ اس کے بچوں کو کچھ ہو نہ جائے۔ وہ اس سے ابھر نہیں پائی تھی۔ اتنا وقت گزر جانے کے بعد کچھ ٹھہراؤ تو آ گیا تھا۔ مگر وہ اپنے اندر یقین اور بھروسا نہیں پال سکی تھی۔

اٹھارہ اکتوبر کے زلزلے میں وزیرہ کے خاندان کا کوئی جانی اور مالی نقصان نہیں ہوا تھا مگر وزیرہ نے ذہنی نقصان کو جھیلا تھا اور اب تک اسی کے زیر اثر زندگی گزار رہی تھی۔

ان دنوں سعد اللہ کی پوسٹنگ اسلام آباد میں تھی جب صبح زمین نے ہلکی سی کروٹ لی اور زمین کے اوپر دھری ہر شے تہس نہس ہوگئی۔ وزیرہ کچن میں تھی۔ سعد اللہ دفتر جا چکے تھے۔ دونوں بیٹے پانچ سالہ علی اور چھ سالہ ولی سو رہے تھے۔ اسے بچوں کے اٹھنے سے پہلے ان کے لیے ناشتا تیار کرنا تھا۔

اس نے چمچوں کے اسٹینڈ پر ملتے چمچے دیکھے۔ دیوار کے سہارے کھڑی کی گئی اسٹیل کی چند پلیٹیں زمین پر گری تھیں۔ کچن کیبنٹ کے اندر بہت سے برتن آپس میں ٹکرائے۔ اسے اپنا سر چکراتا محسوس ہوا تھا۔ اس نے سر کو تھاما۔ کیوں بھلا؟ وہ روزے سے تھی مگر ٹھنڈے روزے اور ابھی تو صبح ہی ہوئی تھی۔

لیکن اس معمولی سے اچنبھے کے بعد اس پر یک دم حقیقت آشکار ہوئی۔ زلزلہ۔ آہ سر نہیں چکرا رہا تھا۔ زلزلہ تھا۔

وہ بجلی کی سی تیزی سے مڑی تھی۔ اس کے بچے۔ بے خبر پرسکون نیند سوتے بچے۔ وہ دروازے کی جانب لپکی تھی اور اگلا قدم باہر ہونے کو تھا۔ جب کچن کے سامنے والی راہداری کی دیوار اس کے سامنے ریت کی دیوار کی طرح ڈھے گئی اور ساتھ ہی چھت نے گر کے آگے جانے کا راستہ بند کردیا۔ دیوار ریت کی طرح گری ضرور تھی مگر وہ ریت کے ذرات میں نہیں بدلی تھی۔ وہ پتھر اور اینٹوں کے ڈھیر کی صورت تھی۔ وہ اسے پھلانگ لیتی شاید۔ مگر راہداری سے نکلنے کا واحد راستہ چھت سے گر کے یوں بند ہوا تھا جیسے کسی غار کا دہانہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جاتا ہے۔

وہ کچن کے دروازے کے ستون کے نیچے تھی اور مضبوط ستون جوں کا توں تھا اس کے پیچھے ایک اور دھماکا ہوا تھا کچن کے سامنے والی دیوار میں دراڑیں پڑی تھیں اور کیبنٹس کا پورا چوکھٹا زمین بوس ہو گیا تھا۔ تمام برتن نیچے گرے تھے اور ان میں سے بیشتر چکنا چور ہو گئے تھے۔ اسے چیخنے چلانے کا موقع نہیں ملا تھا کہ ابھی تو وہ کچھ سمجھ ہی نہیں سکی تھی کہ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔

وہ بہت آرام سے کھڑی تھی۔ گرد و غبار کا سرمئی، گلے کو چھیرتا دھواں اس کی ناک اور حلق تک سب میں مٹی گھس گئی تھی۔ اس کے کانوں میں شیشے ٹوٹنے کی آوازیں آرہی تھیں اور چیزیں گرنے کی آوازیں۔ صورت حال خراب تھی سمجھ میں آگیا۔ کتنی زیادہ خراب ہے۔ ولی کی آواز سنتے ہی یقین آگیا اور یہ بھی کہ کتنی بری ہونے والی تھی۔

"مما۔ مماجی۔"

زلزلے نے اس کے جسم کو کچھ نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ مگر زلزلے نے اس کے دل اور روح کو نوچ لیا تھا۔ اسی پل لگا دوسری آواز علی کے رونے کی تھی وہ اسے پکار رہا تھا۔ کمرے ہی سے۔ وہ بند راہداری کے دوسری طرف آکھڑا ہوا تھا۔

وہ پھنسی ہوئی تھی مگر کونے سے لگی ہوئی نہیں کھڑی تھی۔ جگہ بدل سکتی تھی۔ چل پھر سکتی تھی۔ اس کے چہرے اور لباس اور بالوں پر اتنی مٹی تھی کہ وہ بھوت نظر آتی۔ وہ خود کو جھٹکنا بھول کر تیزی سے گری چھت کے ملبے تک آئی تھی۔ ننگے پیر تھی اور پیروں میں پتھر چبھے تھے۔ ملبہ اوپر تک تھا اور اتنا راستہ نہ تھا کہ وہ نکل جاتی نہ اتنی ہمت تھی کہ ملبہ ہٹا سکتی مگر اتنی جھریاں ضرور تھیں کہ اسے بری طرح روتا حیران پریشان ولی نظر آرہا تھا۔ اس نے بہت تیزی سے ہاتھوں سے پتھر ہٹا کر جھری کو بڑا کرنے کی کوشش کی پھر اس سے ہونٹ جوڑ کر پکارا۔

"ولی۔ ولی! ادھر دیکھو! مما ادھر ہیں۔"

ولی نے حیرت سے آواز سنی پھر گھوم پھر کے دائیں بائیں دیکھا۔ ماں کی آواز تو آئی تھی۔ ماں نظر نہیں آئی تھی۔

"ولی!" وہ پوری طاقت سے چلائی تو گرد و غبار سانس کے ساتھ اندر تک چلا گیا۔ اسے کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔

ولی کو کھانسی نے متوجہ کیا اسے ماں نظر آگئی۔ وہ تیر کی تیزی سے دوسری جانب جھری کے نزدیک آگیا۔ کھانستی ماں ایسے کیوں بیٹھی تھی۔ اس نے چھوٹی نرم انگلیاں اندر ڈالیں۔

"مما! آپ ادھر کیوں بیٹھی ہیں۔ مماجی۔ مماجی! ہمارا گھر کس نے توڑ دیا۔ مماجی باہر آؤ۔"

"میں باہر نہیں آسکتی ولی!" وہ کھانسی پر قابو پا کر نزدیک آئی۔

"کیوں؟"

"بس ابھی نہیں۔" وزیرہ نے سر اٹھا کر کنکریٹ کے ٹوٹے ڈھیر کو دیکھا۔ وہ سو سال لگا کر بھی اس سب کو ایک انچ بھی نہیں سرکا سکتی۔ اس نے ایک اور جھری تلاش کرنے کی کوشش کی۔ جو اوپر جا کر مل گئی۔ ذرا بڑی مگر یہاں سے ولی دکھائی نہیں دیتا۔ مگر اسے یہ نظر آیا کہ سامنے ٹی وی زمین بوس تھا اور کھڑکی کے شیشے ٹوٹے تھے اور کانچ زمین پر پڑے تھے۔ کارنر اسٹینڈ سے تمام ڈیکوریشن پیس گر چکے تھے اور...

"مما باہر آؤ۔ مماجی!"

وزیرہ لپک کر پہلی جھری کے پاس جھک گئی۔ ولی ایک آنکھ لگائے اسے دیکھ رہا تھا اور آنکھ بھیگی تھی۔ وزیرہ کا دل مسل گیا۔ اسے یک دم احساس ہوا بہت برا ہو چکا ہے۔ وہ ایک مصیبت میں گرفتار ہو چکی ہے۔ اور یہ زلزلہ ہی تھا نا۔ وہ زلزلے کی ہیبت کو کبھی فراموش نہ کرتی اور ایک عام انسان کی طرح چیخ و پکار مچانا شروع کر دیتی۔ مدد کی صدائیں لگاتی، روتی کرلاتی مگر ولی کی آواز نے اسے یہ سب کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔

انسان خوف کھاتا ہے۔ رد عمل کا اظہار کرتا ہے مگر ولی کی پکار نے اسے انسان سے ہٹا کر صرف ماں کر دیا تھا۔ وہ اپنی بپتا بھول کر ہر شے کو فراموش کرے بس اس جھری کے پاس آرکی تھی۔

وہ انسان نہیں رہی تھی فقط ماں تھی اور ماؤں کی فکریں۔

"مما! باہر آئیں ناں۔"

"میں باہر نہیں آسکتی ولی! میں۔" وزیرہ رونے لگی۔

"تو مجھے اندر بلا لیں مما!" وہ بولا۔ دوسری طرف علی کے رونے کی آواز میں شدت آگئی۔ اسے آنکھ کھلتے ہی فیڈر کی عادت تھی۔ پانچ سال کا ہونے کے باوجود صبح کا آغاز فیڈر سے ہوتا تھا۔ وزیرہ کے ہوش اڑ گئے۔ اسے ساتھ ہی خیال آیا۔ وہ اوپر والی چوڑی جھری سے فیڈر باہر پھینک سکتی ہے۔ وہ تیزی سے اٹھی۔ اونچے نیچے پتھروں کا ڈھیر تھا۔ پورے کچن کے فرش پر مٹی اور ٹوٹے برتنوں کی کرچیاں تھیں۔ اس کے بنائے ہوئے ناشتے پر مٹی کی تہ جم چکی تھی۔ فیڈر تیار کرنے میں اسے کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ وہ گرتی پڑتی دوبارہ سب سے اونچے ڈھیر پر چڑھی۔ اس نے فیڈر نیچے پھینکا پھر تیر کی سی تیزی سے نیچے آئی۔ ولی حیرانی سے فیڈر کو دیکھ رہا تھا۔

"یہ فیڈر علی کو دو ولی! علی کے منہ میں دے دو۔ جلدی جاؤ اچھے بیٹے۔" ولی ہنوز کھڑا تھا جیسے کچھ سمجھ نہیں پا رہا۔

"بھائی بھوکا ہے ولی!" وہ تڑپی۔

"مجھے بھی بھوک لگی ہے مما!"

"تم بھائی کو دے کر آؤ۔ میں تمہیں بھی ناشتا دوں گی۔" وہ تیار تھی۔

"یہیں سے دیں گی سوراخ سے۔" بچے کو دلچسپی محسوس ہوئی۔

"ہاں یہیں سے دوں گی۔" وزیرہ کو شدید کھانسی ہو رہی تھی۔ وہ رونے سے تھی۔

"اچھا پھر جلدی سے دے دیں۔"

"تم بھائی کے پاس جا کر بیٹھو ولی! میں تمہیں آواز دے دوں گی۔"

"نہیں۔ میں یہیں رہوں گا۔" وزیرہ نے اس بحث میں الجھنے کے بجائے ناشتا دینے کا فیصلہ کیا۔ اس نے تلا ہوا انڈا بریڈ مکھن ایک تھیلی میں کر کے جھری کے سرے پر رکھ اسے جھری سے بڑھا دیا۔ پلیٹ بھی نکال دی۔

چھ سالہ بچے کے لیے یہ سب دلچسپی سے بھرپور تھا۔ وہ وہیں پھسکڑا مار کے بیٹھ گیا۔ اور وزیرہ جھری کے پاس بیٹھ گئی۔ وہ اب ذرا تحمل سے سانس بحال کرتے ہوئے صورت حال پر غور کرنے لگی۔

تو یہ زلزلہ تھا۔ اور اگر زلزلہ ہے تو سارے اسلام آباد میں ہی برپا ہوا ہوگا۔ تو یقیناً" سعد اللہ بھی بے خبر نہ ہوں گے اور وہ جلد ان کا حال جاننے کے لیے آئیں گے بلکہ آتے ہی ہوں گے۔ تو پھر یہ کہ وزیرہ سعد اللہ تمہیں تحمل سے بیٹھ کر انتظار کرنا ہوگا۔ اور دعا کرنی ہوگی کہ سب ٹھیک رہے۔ سعد اللہ بہت ہی دیر سے آئیں تو ڈیرہ گھنٹہ لگ جائے گا۔ اور وہ بچوں کو ناشتا دے چکی ہے۔ اور بچے اسے اور وہ بچوں کو دیکھ سکتی ہے۔

سعد اللہ کے احساس ذمہ داری نے وزیرہ کے دل کو سکون دیا۔ علی فیڈر خاموشی سے انجوائے کرتا تھا۔ ولی دونوں ہاتھوں سے نوالے لے رہا تھا۔ اور وہ اپنے گھر میں پیدا ہو جانے والے کھنڈر پر چڑھ کر بیٹھ گئی تھی۔ تباہی مگر سکون اور پھر وہ رونے لگی اور روتی چلی گئی۔ بیٹھے بٹھائے صبح سویرے یہ کیسی مصیبت پڑی' یہ کیسی آفت' کیسی ناگہانی تھی۔ وہ سوچنے لگی یہ کیسا زلزلہ ہے جس نے اتنے مضبوط گھر کے درمیان والی دیوار کو ایسے گرا دیا جیسے برادہ۔ اس نے زلزلے کے جھٹکوں کا زندگی میں دو ایک بار پہلے بھی تجربہ کیا تھا۔ اتنا کہ ٹیبل پر پڑا گلاس لرز اٹھا یا الماری کے اندر ہینگرز آپس میں ٹکرانے لگے۔ بس۔ یا پھر بعض اوقات بس اتنا سا کہ خبروں میں سنا اور سوچا۔ اچھا۔ کب۔ پتا ہی نہیں چلا۔

اور اس بار پہلے سے وہ بے خبر تھی کہ کتنی بڑی تباہی ہو چکی ہے مگر اندازہ بہرحال لگا رہی تھی کہ یہ زلزلہ وہی زلزلہ ہے جو عذاب کی ایک قسم ہے' جس سے پناہ مانگی جاتی ہے۔ وہ زیر لب دعائیں پڑھنے لگی۔ اس نے اپنے بالوں اور چہرے کو بھی جھاڑا تھا۔ اسے یقین تھا کہ سعد اللہ جلد پہنچ جائیں گے لیکن یونہی خیال آیا اگر سعد اللہ بھی کسی ایسی صورت حال میں پھنس گئے ہوں یا اللہ۔۔۔ اچھا تو پھر اس کا اپنا بھائی۔ یا پھر پڑوسی۔

لیکن سوال تو وہی آ گیا کہ اگر وہ سب بھی تو۔۔۔ تو اے وزیرہ احمق تمہیں سعد اللہ کے بجائے اللہ کو پکارنا چاہیے۔ ہاں۔ سوری اللہ۔ مجھے معاف کر دیجیے مجھ سے غلطی ہو گئی آپ مجھے اس مصیبت سے نکالیے۔

وہ رونے لگی اور اب یہ رونا بند نہیں ہو رہا تھا۔ اسی رونے اور خوف کے درمیان اس نے علی کو دیکھا۔ جو حیرت سے اپنے گھر کو دیکھ رہا تھا اور پھر شدید اچنبھے سے اس جھری کے نزدیک آ گیا۔ جہاں سے ماں کا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔

"ہمارا گھر کس نے توڑا؟" وہ ماں اور بھائی دونوں سے پوچھ رہا تھا۔ ہاتھ میں فیڈر مگر بہت رعب اور غصہ۔

"اللہ نے۔" وزیرہ کے رونے میں شدت آ گئی۔

"اللہ گھر توڑ بھی دیتے ہیں۔" ولی حیران تھا۔

"ہاں' غصے میں آ جاتے ہیں تو توڑ دیتے ہیں۔" وزیرہ بڑبڑائی تھی۔

"اللہ تعالیٰ غصے میں ہیں۔" علی نے حیرت سے بھائی کو دیکھا۔ ولی نے بڑے پن سے تصدیق کی۔ دونوں بھائیوں کے لیے گھر کی ہیئت کذائی دلچسپی کا باعث بن گئی۔ وہ ماں کا حال بھول کر گھر میں بے فکری سے گھومنے لگے۔ وزیرہ سر جھکا کر رونے لگی پھر آنسو پونچھ کر دعائیں مانگنے لگی۔ معافی مانگنے لگی۔ یا اللہ خیر۔ سعد اللہ اسے فون تو کریں۔ یا پھر یہ کہ وہ ہیں ہی بے خبر کہ ادھر گھر میں کیا ہو گیا۔ اے اللہ سعد اللہ کو بھیج دے۔ ارے نہیں اللہ بس تو مدد کر دے۔ تیرا شکر کہ اتنی بڑی تباہی میں بھی تو نے مجھے خراش بھی نہ آنے دی اور میری بچوں کو محفوظ رکھا اور اس قابل رکھا کہ میں نے بچوں کو کھانا کھلا دیا۔ ورنہ میری بھوکے بچے۔ اے اللہ! مجھے اس مشکل سے تو ہی نکالے گا۔

وہ سوچوں کے عجیب مرحلے پر تھی۔ کبھی منفی ہوتی کہ مثبت۔

پتا نہیں کتنا وقت بیتا۔ بچوں کی مگن آوازیں اس کی طمانیت کا باعث تھیں۔ اس نے یہ بھی سوچا کہ جب

اللہ نے اسے اتنا بچا لیا تو آگے بھی خیر ہوگی مگر اسے ایک بار پھر دیواریں ہلنے کا گمان ہوا اور سامنے والے کونے سے پلستر جھڑ کر نیچے گر گیا۔ یہ آفٹر شاکس تھے۔ وہ پہلی بار بری طرح خوف زدہ ہو گئی۔

"علی! ولی! تم دونوں باہر لان میں چلے جاؤ۔ لان میں کھیلو۔"

مگر بچوں نے منع کر دیا۔۔۔ اندرونی دروازہ بند تھا۔ وہ نہیں کھول سکتا۔ پھر تھوڑی دیر بعد وہ کرسی رکھ کے اوپر چڑھا اور دروازہ کھول لیا۔

"لان میں کھیلنا علی۔۔۔!" وہ جھری سے چلائی۔

"نہیں مما! ہم دیکھیں گے اللہ تعالیٰ اور کن کن لوگوں پر غصہ ہیں کہ گھر توڑ دیتے ہیں۔" وہ بڑے پن سے کہتا باہر کو لپکا اور علی بھی اس کے پیچھے تھا۔ وزیرہ چلانے لگی۔

"گھر سے باہر نہ نکلنا علی۔۔۔ ولی گھر کے اندر آؤ۔"

مگر بچے باہر جا چکے تھے اور ان کی آوازیں معدوم ہو گئیں۔ وزیرہ نے دھاڑیں مار مار کے رونا شروع کر دیا۔ وہ بھاگ کر کھڑکی تک گئی اور پوری طاقت سے چلائی۔

"علی۔۔۔ ولی! باہر مت نکلنا۔"

وزیرہ کی زندگی کے قیامت کے پل تب شروع ہوئے۔ وہموں' خدشوں کا آغاز۔ انہیں اس علاقے میں آئے ابھی مہینہ بھی نہیں ہوا تھا اور اس کے بچے اپنے دروازے کی پہچان تک نہیں رکھتے اور وہ گھر سے باہر نکل چکے تھے اور واپسی کی راہ۔۔۔

وزیرہ کو پہلی بار خود پر پڑنے والی افتاد کا اندازہ ہوا۔ اس کے دل میں خیال آیا۔ اس نے اپنے بچوں کو آخری بار دیکھا ہے بس۔۔۔ وہ حلق کے بل چلانے لگی۔

"علی۔۔۔ ولی کوئی ہے جو میری آواز سنے اور علی ولی کو روک دے۔ پکڑے۔۔۔ آپ کہاں ہیں سعد اللہ۔۔۔ امی! بابا! بھائی۔۔۔! ارے اللہ۔۔۔ اللہ! میرے بچوں کی حفاظت فرما۔"

اس کے پیٹ میں گرہیں پڑنے لگیں۔ وہ کبھی اوپر والی جھری سے آواز لگاتی کبھی نیچے بیٹھ کر صدائیں دیتی۔ کبھی چھوٹی سی کھڑکی کے پاس آ جاتی اور پھیپھڑوں کا پورا زور لگا کر انہیں پکارتی' جن کا دور دور تک نام و نشان نہیں تھا۔ اس کا سسرالی محلہ ہوتا تو دس چاچے تائے بچوں کو سمیٹ لیتے۔

بابا کا گھر ہوتا تو سب جانتے۔ یہ وزیرہ سعد اللہ کے بیٹے ہیں۔ مگر یہاں تو ابھی تک کسی کو خبر نہیں تھی کہ یہ بچے کس کے ہیں۔

"اے اللہ مدد بھیج!" وہ رو رو اور چلا چلا کر ادھ موئی ہو گئی۔

ہر گزرتا پل اسے بچوں سے دور کر رہا تھا۔ نئی نئی کالونی میں ساتھ کے دو گھر خالی تھے۔ سامنے میدان تھا اور گھر دوسرے گھر سے دور تھے کچھ خالی پلاٹ اور یہاں روڈ کے اختتام پر گند نالا۔۔۔

جیسے جیسے اس کے خدشات میں اضافہ ہوتا' وہ چیخیں مارنے لگتی۔ جسم کی پوری طاقت لگا کر انہیں پکارتی۔

اس علاقے کی خاموشی جو سکون بخش لگتی تھی۔ اسے اب موت کا سناٹا لگ رہی تھی۔ بچے عام حالات میں گھر سے نکلتے تو شاید وہ اتنی پاگل نہ ہوتی مگر اس طرح اس صورت حال کو عام حالات میں سمجھنا بہت مشکل تھا۔ لیکن وزیرہ جس مصیبت میں تھی۔ اس کا چیخنا چلانا بے دم ہونا سب فطری تھا۔ دفعتاً" گاڑی گزرنے کی آواز سنائی دی' پھر کہیں دور ایمبولنس کا ہوٹر بجا تھا۔ اور پھر اسے محسوس ہوا کہ دو تین گاڑیوں کے ایک ساتھ بجتے ہوٹر تھے۔ اس کے دل میں شدت سے برے برے خیال ابھرے۔ وہ پاگلوں کی طرح ذرا سی جگہ پر بھاگنے لگی۔ وہ راستہ بنانے کی کوشش کرنا چاہتی تھی اور یہ وہ اینٹیں تھیں' جنہیں ڈرل کیا جاتا تھا۔ یا کئی مزدوروں نے اٹھانا تھا۔

وہ یہ جانتی تھی کہ وہ کچھ نہیں کر سکے گی مگر پوری جان لگا کر بلاوجہ کی محنت کر رہی تھی۔ چھوٹے سائز کے کچھ پتھر ادھر کر دیے کچھ ادھر۔ پھر اٹھا کر مارنے لگی۔ ہانپنے لگی۔ اپنے نہ بال نوچنے لگی۔ سینہ کوبی

کرنے لگی۔
کاش بچے اس کے ساتھ اندر ہی ہوتے اور اس نے ان سے کیوں کہا کہ وہ لان میں جائیں۔ جانتے بوجھتے کہ دونوں کو گھر سے باہر نکلنے کا کتنا شوق تھا۔ لیکن اس نے تو اس لیے کہا تھا کہ آتش فشاں سے کوئی اور چھت دیوار گر گئی تو وہ خدانخواستہ کچلے جاتے۔ لان میں کم از کم ایسا تو نہ ہوتا۔
لیکن وہ کہاں چلے گئے میرے بچے۔۔۔ میرے اللہ مجھے نکال دے ادھر سے۔۔۔ نہیں بلکہ میرے بچوں کو کچھ نہ کرنا اور علی نے صرف فیڈر ہی رکھا ہے۔ اللہ اسے تیز بھوک لگنے لگے اور وہ گھر لوٹ آئیں۔ مگر انہیں تو ابھی گھر کے دروازے کی بھی پہچان نہیں۔۔۔ گھر کے ارد گرد ہوتے تو اب تک آچکے تھے۔
علی اتنی دیر بھوکا نہیں رہ سکتا۔ ہائے کہیں نالے میں تو نہیں گر گئے یا کوئی انہیں پکڑ کر لے گیا ہو۔ یا اللہ میں کیا کروں۔
وہ ہار کر بیٹھی۔ ایک بار پھر اٹھی۔ مسالا پیسنے والی ڈنڈے سے دیوار پر ٹھوکریں مارنے لگی۔ چمچوں سے جیسے راستہ کھودنے لگی۔ دونوں ہاتھوں سے دیواروں کو مارنے لگی۔ کبھی ایک دیوار کی جانب جاتی۔۔۔ کبھی دوسری ڈھیری کے پاس۔
اس کے دل کو یقین ہو گیا تھا کہ اس کے بچے گم ہو چکے ہیں یا گندے نالے میں آپ۔ اسے صرف اپنی پڑی تھی۔ اسے قطعاً" خبر نہیں تھی کہ پورے ملک پر قیامت ٹوٹی پڑی تھی اور مائیں اپنے سامنے اپنے جگر گوشوں کو مرتا دیکھ رہی تھیں۔ قیامت صغریٰ بپا تھی۔ ایک دیوار سے دوسری دیوار کرتی نجانے کب وہ کہیں گر پڑی تھی۔

☼ ☼ ☼

اسے ہوش آگیا تھا۔ وہ بخیر تھی۔ اسپتال کا صاف ستھرا بیڈ۔ اس کے دائیں بائیں ماں باپ بھائی اور سعد اللہ تھے اور عین سامنے ہنستے مسکراتے علی۔۔۔ اور ولی۔
لیکن وہ خوش ہونے کے بجائے ہسٹریائی ہونے لگی۔ اس کے بچے سامنے تھے مگر وہ چلائے جاتی تھی کہ وہ گم ہو گئے ہیں۔۔۔ وہ دونوں گندے نالے میں گر گئے تھے۔ اسے جسمانی چوٹیں نہیں آئی تھیں۔۔۔ ہاں بہت جنون کے عالم میں مٹی کھودنے سے پتھر اٹھانے سے انگلیاں فگار تھیں۔ مگر وہ شدید ذہنی صدمے کا شکار ہو چکی تھی۔ اور یہ بہت خطرناک صورت حال تھی۔ بچے اس کی گود میں ہی بٹھائے گئے۔۔۔ بچے اسے پکارتے سب اسے یقین دلاتے مگر وہ بس چلاتی۔ کمرے کے بند دروازے سے خوف کھاتی چھت دیکھ کر حواس باختہ ہو جاتی۔ سوتے سے اٹھ کر کھلے میں چلی جاتی۔ اونچی اونچی آواز سے علی اور ولی کو پکارتی اور بالکل اسی انداز سے چلاتی، التجائیں کرتی جیسے زلزلے کے اس روز کرتی تھی۔
ماہر نفسیات نے مرض قابل علاج قرار دیا مگر بہت دھیرے دھیرے صبر آزما۔
اور یہاں کسی کو جلدی نہیں تھی۔ وزیرہ کے ذہن پر ان چند گھنٹوں نے قبضہ جمالیا تھا۔ ہر جانب سے اس کے لیے توجہ تھی محبت تھی۔ اسے جتایا گیا کہ وہ اور اس کے بچے معجزاتی طور پر بچ گئے۔ ہر لحاظ سے ٹھیک ٹھاک ہیں جبکہ کتنی مائیں خالی گود لیے بیٹھی تھیں۔۔۔ کتنے بچے گودوں کو ترس رہے تھے۔ وزیرہ نرم دل تھی۔ حقیقت پسند تھی۔ اسے خود پر اللہ کی کرم نوازی کا اندازہ تھا۔ مگر ذہن سے وہ اندوہناک منظر سرک ہی نہ سکا تھی۔ مگر صدمہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو انسان زندگی کے جھمیلوں میں پڑ کر مگن ہو ہی جاتا ہے۔ وقت ذرا زیادہ لگا مگر اسے بھی حقیقت حال میں لوٹنا پڑا۔ جہاں اس کی خوشگوار زندگی تھی۔ سب اچھا تھا۔
بظاہر سب کچھ ٹھیک ہو گیا۔ مگر وزیرہ سعد اللہ بہت وہمی ہو گئی۔ اسے ہر پل لگتا اس کے بچوں کے ساتھ کچھ برا ہو جائے گا۔ وہ ہر چیز سے خوف کھاتی۔
اس نئی زندگی اور سوچ میں وہ تنہا تھی۔ اس لیے کہ کچھ سننے کو تیار نہ تھی۔ بس جو دل میں سما گیا، وہی درست ہے۔ کسی کا یقین نہ کرتی۔ سائے کی طرح ساتھ رہتی۔ کھانسی کو کالی کھانسی تک سوچ لیتی۔ پھوڑا پھنسی کینسر لگتا۔ خارش کو خطرناک الرجی تک لے جاتی۔ ہر بخار، ڈینگی، ملیریا اور ایبولا لگتا۔ ملازمین پر بھروسا نہ کرتی۔ اس واقعہ کے بعد سے وہ بچوں کے کمرے میں سوتی تھی۔ وہ ان سے یوں چپکی رہتی جیسے گوند ہو۔ انہیں واش روم کا دروازہ نہ بند کرنے کی سخت ہدایت تھی۔ اس نے لوگوں سے ملنا جلنا چھوڑ دیا۔ بچوں کو ہر تفریح گھر میں دیتی اور بچوں کو چڑ جانے پر رونے لگتی۔
رشتے داروں سے ملنا جلنا بند کر دیا کہ ان کے بچے جب کھیل ہی کھیل میں لڑ پڑتے تو یہ چیل کی طرح بچوں کو جھپٹ لیتی۔ اپنے بچوں کی غلطی تو سکتی ہی نہیں تھی۔ دوسروں سے لڑنے لگتی۔ وہ ایک دائرے میں قید ہوتی جا رہی تھی مگر یہ قید اسے پسند تھی۔
اسے خبطی کہا جانے لگا۔ وہ خود بھی چاہتی کہ اتنی شدت سے باز آجائے مگر اس سوچ پر کبھی عمل در آمد نہ کر سکی' نہ کوئی کروا سکا۔
بچے اسکول جاتے تو گیٹ پر بیٹھ جاتی۔ سعد اللہ نے بمشکل اس امر سے باز رکھا۔ پھر اسے وین ڈرائیور مشکوک لگا۔ پھر اسے نئے وہم نے گھیرا۔ گاڑیوں میں سلنڈر پھٹ جاتے ہیں۔ پھر اس نے سوچا اسکول سے نزدیک ترین گھر لے لیا جائے۔
اس نے بازار جانا چھوڑ دیا تھا۔ جو بھی لائے سعد اللہ ہی لائے۔ یہ جنون خطرناک تھا اور بچے ماں سی بے زار ہونے لگے تھے۔ وانیہ کی پیدائش نے کافی بہتری پیدا کی مگر بالکل صراط مستقیم والی بات نہیں تھی۔
وانیہ ایک پیدائشی کمزور بچی تھی۔ جو ماں کی پوری توجہ چاہتی تھی۔ پہلے وہ وہم میں بچ کر پریشان ہوتی تھی۔ اب وانیہ ایک حقیقی پریشانی تھی۔ جس نے اس کا دھیان فالتو کی سوچوں سے ہٹا دیا۔
سعد اللہ وانیہ کو سچ مچ رحمت کہتے تھے جس نے آکر ان کی زندگی کو دوبارہ سے اعتدال کی راہ پر ڈالا۔ وانیہ سے پہلے کی جنونی کیفیت تو ختم ہو گئی۔ مگر اب اس کے اپنے اصول و ضوابط تھے۔

☼ ☼ ☼

سب شکر ادا کرتے کہ وہ تو سال پہلے والی حالت سے ابھر چکی تھی۔ ایک خوشگوار زندگی۔۔۔ الحمد للہ۔۔۔
مگر ابھی پشمینہ اور فائزہ اعتراض اٹھائے بیٹھی تھیں۔
وزیرہ نے کہہ دیا تھا۔ وہ صبح دس بجے کے قریب گھر سے نکلیں گی اور ڈھائی بجے گھر کے اندر ہونا ہو گا۔ کیونکہ دو بج کر پینتیس منٹ پر بچے آجاتے ہیں۔ آپا گل خاموش رہی تھیں جبکہ پشمینہ کا کہنا تھا کہ دو بجے کے بعد ہی تو شاپنگ شروع کی جاتی ہے اور وہ گھر واپس آجائیں۔ ایسے میں شاپنگ مکمل ہی نہ ہو پائے گی۔
وزیرہ نے تسلی دی سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو گا۔
دونوں کے درمیان بحث ہو گئی۔ پشمینہ کا کہنا تھا کہ بچے اب اتنے چھوٹے نہیں ہیں۔ چودہ اور پندرہ برس کے علی اور ولی اور سات برس کی وانیہ۔۔۔ دونوں بڑے بھائی بڑے آرام سے گھر میں رہ سکتے ہیں اور بہن کو بھی سنبھال سکتے ہیں۔ گھر سے محفوظ جگہ کون سی۔
وزیرہ کا جواب انکار تھا۔ وہ کسی بڑے کی موجودگی کے بغیر بچوں کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔
"بچے اب بڑے ہو چکے ہیں بھابھی گل!" پشمینہ نے کہا۔ "اور اپنے گھر کا دروازہ بند کر کے بیٹھ جانے میں تو امان ہی امان ہے۔"
"نہیں۔۔۔ وہ اکیلے ہوں گے۔ میں انہیں اکیلا چھوڑ ہی نہیں سکتی۔ سو خطرے۔۔۔"
"کیسے خطرے بھابھی گل۔۔۔"
"ایک تو یہ شرارتی بہت ہیں۔" (یہ سراسر الزام تھا۔ وہ انہیں کھیلنے بھی نہ دیتی تھی کہ چوٹ لگے گی۔ یہ ہو گا اور وہ ہو گا۔ بس چلتا تو اسٹیچو بنا کر بٹھا دیتی)
"تکیوں سے لڑتے ہیں۔ ریسلنگ کا شوق ہے۔ ایک دوسرے کو پنچ مارتے ہیں اور یہ وانیہ بلاوجہ جا کر ان کی ٹانگوں میں گھستی ہے۔"
"وہ تو کھیلتی ہے وزیرے۔۔۔!" آپا گل نے رسانیت سے کہا۔
"نہیں آپا گل! دھکا لگتا ہے۔ ایک بار تو میز کا کونا لگ گیا۔"
"اچھا تو ہم انہیں کہہ دیں گے۔ اسکول سے آکر

کھانا کھالیں اور آرام سے ٹی وی لگا کر دیکھیں۔ یا سو جائیں۔"

"نہیں نہیں۔۔۔ اگر شارٹ سرکٹ ہو گیا اور ایک بار تو یو پی ایس میں آگ کے شعلے بھڑک اٹھے تھے۔ تو پھر۔۔۔"

"اور آج کل تو اندھیرا ہی ہوتا ہے گیس لیمپ جلا لیں گے موم بتی۔" فائزہ نے آرام سے کہا۔

"ارے نہیں۔۔۔!" وزیرہ کا رنگ سفید ہو گیا۔ "اگر جل گئے۔ موم بتی تو اکثر گر جاتی ہے اور کارپٹ آگ پکڑ لیتے ہیں۔"

"اللہ نہ کرے۔" پشمینہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"اپنی حفاظت تو انسان کے اندر خود ہوتی ہے۔ اللہ بچاتا ہے انسان کو۔۔۔ موت خود زندگی کی حفاظت کرتی ہے۔ ہم وقت کو ٹال نہیں سکتے بھابھی۔۔۔!"

"کیسی باتیں کر رہی ہو۔ اچھے لفظ بولو پشمینہ۔۔۔" وزیرے کا رنگ پھر اڑا۔

"وہ لڑکے ہیں۔ تم انہیں باندھ کر نہیں رکھ سکتیں وزیرے۔۔۔!"

"میں باندھتی تو نہیں ہوں۔ بس میں ان کے سامنے رہوں۔ وہ اکیلے نہ ہوں۔" وزیرے نے انگلیاں ملنی شروع کردیں۔ وہ اس چیز کو سمجھتی تھی۔ مگر اپنے آگے بے بس تھی۔

بچے چڑتے تھے۔ سعد اللہ کہتے۔ "وہ بڑے ہو رہے ہیں۔ ان کی اپنی پرائیویسی ہو گی ایسے تو تم انہیں مفلوج کر دو گی۔ مردانگی ختم کر دو گی۔ عورت بن جائیں گے گھر کے اندر رہ رہ کر۔" وزیرہ رونا شروع کردیتی۔

اسے سب سمجھ تھی مگر وہ مجبور تھی۔

"پتا ہے سعد اللہ کے دوست کے گھر کا چلتا پنکھا گر گیا۔ بچے کے بازو کا پورا گوشت پھٹ گیا۔" اس نے یاد آنے پر بتانا ضروری سمجھا۔

فائزہ ہنسی۔ "اتنی سردی میں پنکھا کون چلائے گا امی جان۔۔۔؟"

"اور اگر پنکھا گرنا ہی ہو گا تو آپ کیسے روکیں گی؟"

پشمینہ نے نکتہ اٹھایا۔

"روک تو نہیں سکتی۔" وزیرہ نے اس بات پر بہت سوچا تھا۔ "مگر میں فرسٹ ایڈ تو دے سکتی ہوں۔"

"پنکھا تم پر بھی گر سکتا ہے خدانخواستہ۔۔۔!" آپا گل کو اس کے چہرے پر پھیلے خوف پر ترس آنے لگا تھا۔

"ہاں آپا گل۔۔۔!" وہ تیزی سے سیدھی ہوئی۔ "مجھ پر گر جائے مگر۔۔۔" وہ رونے لگی۔ آگے بولا ہی نہ گیا۔ ہچکیاں بندھ گئیں۔ تینوں اس کے نزدیک سرک آئیں۔

"اللہ پر بھروسا کیوں نہیں کرتیں۔"

"کرتی ہوں۔۔۔ مگر۔" وہ بمشکل بول پا رہی تھی۔ آپا گل نے وزیرے کو خود سے چپکا لیا۔

"اچھا اب رونے کی ضرورت نہیں۔ ابھی طے کر لیتے ہیں۔ جن چیزوں میں میرا جانا ضروری نہیں ہو گا۔ اس میں میں نہیں جاؤں گی اور تم لوگ پورا دن بے فکر ہو کر شاپنگ کرنا۔ میں گھر میں رہوں گی پورا دن بچوں کے ساتھ۔"

"ٹھیک ہے' باقی دن یاد رہے۔ دو بج کر تیس منٹ پر گھر کے اندر کیونکہ دو بج کر پینتیس منٹ پر۔۔۔" پشمینہ نے فائزہ کو دیکھا۔

"بچے آجاتے ہیں۔" فائزہ نے ہنس کر جملہ مکمل کیا۔

"ویسے امی جان! مجھے تو حیرت اس بات پر ہے کہ آپ اسکول تک کیسے بھیج دیتی ہیں۔ بچے تقریباً" تو گھنٹے دور رہتے ہیں آپ کی نظروں سے۔ تب نہیں آپ کا دل ہولتا۔"

وزیرہ آنکھیں پونچھتے پونچھتے چونکی' پھر ذرا حیرت سے فائزہ کو دیکھا' جیسے فائزہ کو بے وقوف سمجھا۔

"اسکول میں کیا فکر۔۔۔ وہاں تو اتنے لوگ ہوتے ہیں۔ چوکیدار ہوتا ہے۔ ٹیچرز ہوتے ہیں اور اتنے سارے بچے۔۔۔ وہاں کوئی اکیلے تھوڑی ہوتے ہیں چار دیواری میں محفوظ ہوتے ہیں۔ میں نے تو پرائیویٹ گاڑی لگوا رکھی ہے صرف ہمارے تین بچوں کو چھوڑتی' لیتی ہے اور اگر کبھی دیر سویر ہو جائے یا گاڑی ٹریفک

میں پھنس کر لیٹ ہو جائے یا سو اور مسئلے۔۔۔ ہم نے چوکیدار سے کہہ دیا ہے' آندھی آئے طوفان آئے۔ کچھ بھی ہو۔ بچے اسکول کے اندر رہیں گے اور بچوں کو بھی کہہ رکھا ہے۔ بڑی سے بڑی مصیبت ہو۔ گیٹ سے باہر قدم نہیں رکھنا۔ اسکول میں کیا فکر' مجھے تو بس یہ ہے بچے اکیلے نہ ہوں' بس سب کی نظروں کے سامنے رہیں۔"

وہ بہت یقین سے تیز تیز بولنے لگی تھی۔ فائزہ نے دونوں ہاتھ سامنے کھڑے کر کے مزید بولنے سے باز رکھا۔

"ہمیں یقین آگیا امی۔۔۔ بالکل آگیا۔ وہی ہو گا جو آپ چاہیں گی۔ آپ کا گھر ہے جیسے آپ کہیں گی ہم ویسے ہی رہیں گے ویسے ہی کریں گے۔ جس دن مومو نے جانا ہو گا میں گھر پر رکوں گی۔ کوئی نہ کوئی گھر پر رہے گا ورنہ ڈھائی بجے سے پہلے واپسی پتھر پر لکیر ہے۔۔۔ ٹھیک ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" وزیرہ مسکرائی۔ "مجھے کوئی بہت ضروری کام کرنا ہو' جانا آنا ہو میں سب اس طرح سے سیٹ کرتی ہوں کہ بچوں کے ساتھ ہی تقریباً" نکل جاتی ہوں اور ان کے آنے سے پہلے لوٹ آتی ہوں فکر ہی نہیں ہوتی۔"

آپا گل اور پشمینہ مسکرائیں۔

وزیرہ نے زندگی ایسے ہی گزارنی تھی۔ اسے سمجھایا نہیں جاسکتا تھا۔

"اور تم کون سی اتنی بڑی ہو جو انہیں سنبھال لو گی۔ ان شاء اللہ وہ تمہیں درست کر دیں گے۔" وزیرہ اب ہلکی پھلکی تھی۔ فائزہ کو دیکھ کر مسکرائی۔ فائزہ سولہ برس کی تھی۔ دبلی پتلی لمبی۔۔۔ علی ولی سے سال بھر ہی بڑی تھی۔ مگر جبرا" خود کو آپا گل کہلواتی۔ علی ولی یہ موٹے اور لمبے۔

"ایسے کیسے درست کردیں گے۔ ہاتھ میں ڈنڈی پکڑوں گی اور زیادہ تنگ کیا تو رسی سے باندھ دوں گی۔ آپ کے آنے تک ایک ہی جگہ بیٹھے رہیں گے۔"

اس نے حل سوچ رکھا تھا جبکہ وزیرہ کی آنکھیں ابل پڑیں اور سانس خشک ہو گیا۔

"ارے۔۔۔ ایسا نہ کرنا۔ تم ادھر ادھر ہو گئیں اور وہ بندھے ہی رہ گئے اور کچھ ہو گیا۔ بجلی چلی گئی یا آگ لگ گئی یا۔۔۔؟"

"ارے۔۔۔ ارے وزیرے۔۔۔ ایسا کچھ نہیں ہو گا۔ مذاق کر رہی ہے بے وقوف۔۔۔!" آپا گل اور پشمینہ پریشان ہوئیں۔ فائزہ بھی خجل ہو گئی۔

"نہیں ناں آپا گل! باندھنے سے تو وہ ہل ہی نہیں سکیں گے ناں تو۔۔۔" وہ بچوں کی طرح ہراساں ہو رہی تھی۔

آپا گل اور پشمینہ نے فائزہ کو دیکھا اور وزیرے کی تشفی کرانے لگیں۔ جس کی سوچ کی سوئی اٹک گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

پھر آج پتا لگا ہم نعمتوں کا شکر ادا نہیں کر سکتے کہ ہم نعمتوں کا ادراک ہی نہیں رکھتے۔ فرزانوں کو کیا خبر کہ دیوانے کس عیش میں جیتے ہیں۔

کیسا لطف ہے دیوانگی میں۔۔۔ جب وہ ہوش کھو دیتا ہے۔ سوچ و فہم سے ماورا ہو جاتا ہے۔

تو ہوش و خرد کو چھوڑ دینا بھی ایک نعمت ہے کہ پتا ہی نہیں کیا قیامت ٹوٹی۔ کیوں کیسے کب سارے سوال بے معنی رہ جاتے ہیں کہ ہم ہوش میں نہیں اور سعد اللہ اس خبر کے بعد ایسی بے خبری کی نعمت سے مالا مال ہو گئے تھے۔ مرد ہو کر اتنی کم ہمتی۔۔۔ کہ سنا' سمجھے اور ڈھے گئے۔

ہاتھ جھاڑے۔۔۔ جان چھوٹی۔

مگر وہ جس کے بارے میں گمان تھا کہ اس کا دل بند ہو جائے گا۔ وہ آگاہی کے عذاب میں مبتلا کر دی گئی تھی۔ ہوش و خرد تو اس کا انواسا بنتا تھا۔ دیوانوں کی طرح سر پر خاک ڈال کر در در گھومنا تو اب اس کا مقدر تھا۔ مگر وہ ہوش مندی سے کھڑی تھی اور ایسے ایسے سوال کرتی تھی کہ کسی دانا کے پاس جواب نہ تھا۔

وہ ہاتھ جوڑتی' روتی پیٹتی ہر ایک کے آگے جاتی تھی۔

سوال دہراتی تھی۔ جواب چاہتی تھی۔ مگر یہاں سب کی زبانیں گنگ تھیں۔ کسی کے پاس جواب نہ تھا اور یہ کوئی اتنے مشکل سوال بھی نہیں تھے۔ سیدھے سادھے عام فہم سے سوال۔۔۔

مگر پتا نہیں یہ لوگ۔۔۔ اور سارے لوگ۔۔۔ ساری دنیا آنکھ چراتی تھی۔ جواب دینا نہیں چاہتی تھی یا ان سب کے پاس جواب تھے ہی نہیں۔

"کیسے مر گئے۔۔۔ میں نے تو اسکول بھیجے تھے۔" اس نے ایک ریسکیو ورکر کا گریبان پکڑ کے پوچھا۔ "میں نے تو پڑھنے بھیجے تھے۔ میں نے تو۔۔۔"

ایک میڈیا رپورٹر نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور بھاگتے ہوئے اپنا مائیک اس کے منہ کے نزدیک کردیا۔ اس نے رپورٹر کے دونوں ہاتھ مائیک سمیت پکڑ لیے۔

"اسکول کی تو دیواریں اونچی تھیں ناں۔۔۔ اندر بہت سے لوگ تھے۔ دروازے پر چوکیدار تھا۔ پھر کیسے مر گئے۔

میں نے گھر سے زیادہ بھروسا کیا تھا اسکول پر۔۔۔ میں نے تو پڑھنے کے لیے بھیجا تھا۔ اسکول بھیج کر میں سکون سے سو جاتی تھی۔۔۔ بے فکر۔۔۔

ہر آنے والے کو جانا ہے۔۔۔ میں جانتی ہوں۔۔۔ مگر ایسے زبردستی کوئی کیسے بھیج سکتا ہے۔

ظالمو! قبروں پر جو پھولوں کی چادریں چڑھتی ہیں۔ ان میں بھی پورے کھلے پھول پروتے ہیں۔ تم نے کلیاں مٹی میں مل دیں۔

اور ماؤں کو لاڈ کرنا سکھایا نہیں جاتا۔ بس وہ بولنا شروع کرتی ہیں اور ہونٹوں سے محبت جھڑنا شروع ہوجاتی ہے۔ اسی طرح ماؤں کو بین کرنے کی تربیت بھی نہیں دی جاتی۔ مگر جب اپنی کوکھ سے جنے کے مرنے کی خبر سنتی ہیں تو بس بولنا شروع کردیتی ہیں۔ پھر عرش بھی ہلتا ہے اور فرش بھی۔ کم فہم کم آمیز مائیں ایسے ایسے شاہکار جملے کہتی ہیں کہ بڑے بڑے علم دان دانتوں میں انگلیاں ڈال لیں، سر پر خاک ڈالیں اور کسی ایسی جگہ جا چھپیں جہاں کچھ سنائی نہ دے۔ یہ تو ایک ماں کا ماتم تھا کہ جب میں نے بچے اسکول بھیجے ۔جب 132 مائیں یک زبان کرلائیں۔۔۔ پچھتائیں اور چلائیں۔ اس صبح صرف وزیرہ سعد اللہ کی کوکھ تو نہیں اجڑی تھی اسکول کے حملے نے 132 ماؤں کو زندگی بھر کے دکھ اور پچھتاوے میں مبتلا کردیا تھا۔ میں نے بچہ اسکول بھیجا تھا۔ وہ اپنا منہ سر پیٹتی ہیں، ہائے کیوں بھیجا تھا۔

اور ہوش میں آنے کے بعد سعد اللہ کا صبر و ضبط کمال کا تھا۔ انہوں نے کیمرا کے سامنے آکر اپنے بچوں کی شہادت پر فخر کیا تھا اور انہیں ملک و قوم پہ وار دیا تھا۔ مگر بعد میں تنہا ہونے پر انہوں نے سوچا اور زندگی بھر سوچیں گے۔

تحفہ تو دل کی خوشی سے بصد احترام دیا جاتا ہے ایسے جبراً" لے لیے جانے کو بھی کیا تحفہ کہتے ہیں۔

اور وزیرہ سعد اللہ ننھی وانیہ کے سوال پر کہ بھائی کہاں چلے گئے۔ خالی آنکھوں سے دیکھتی ہے۔ بچی بہت دیر انتظار کے بعد سوال دہراتی ہے۔ تب اس کا منہ سے یہی نکلتا ہے۔

"میں نے تو اسکول بھیجے تھے۔"

اور یہ صرف وزیرہ سعد اللہ کی خود کلامی بے فکری یقین اور پچھتاوا تو نہیں تھا۔ پتا نہیں کتنی مائیں جن کے بین تکیوں اور رضائیوں کے اندر گھٹ گھٹ گئے۔

☆ ☆

سرورق کی شخصیت

ماڈل ـــــــ عروہ
میک اپ ـــــــ روز بیوٹی پارلر
فوٹوگرافر ـــــــ موسیٰ رضا

ناولٹ

راشدہ رفعت

ایسا ہی ہوتا ہے

مما نے ماتھا چھو کر اس کا بخار چیک کرنا چاہا تھا۔

"بخار تیز ہو رہا ہے جانو! ڈاکٹر کے پاس چلو اور دیر ہو جائے گی تو ڈاکٹر واسطی کلینک بند کر کے چلے جائیں گے۔"

"ڈاکٹر واسطی کو انجکشن لگانے کا بہانہ چاہیے ہوتا ہے مما۔ وہ تو نزلے' زکام میں انجکشن ٹھونک دیتے ہیں۔ آج تو ہر صورت انجکشن لگا دیں گے۔ رات کو پاپا آفس سے واپس آئیں گے تو میں ان کے ساتھ ڈاکٹر فرید کی طرف چلی جاؤں گی۔" وہ کسی طور ڈاکٹر واسطی کے پاس جانے کو تیار نہ ہوتی شمائلہ اس حقیقت سے واقف تھیں لیکن لاڈلی بیٹی کا تیز ہوتا بخار انہیں تشویش میں مبتلا کر رہا تھا۔ ڈاکٹر واسطی کا کلینک گھر کے بالکل قریب تھا۔ وہ اس کے ساتھ پیدل وہاں تک جا سکتی تھیں جبکہ ڈاکٹر فرید کے پاس توقیر ہی بیٹی کو لے جا سکتے تھے۔

"اچھا میں تمہارے پاپا کو فون کرتی ہوں کہ آفس سے جلد آجائیں۔" انہوں نے آخر مسئلے کا یہی حل سوچا تھا اور پاپا کو فون کرنے کی دیر تھی کہ پریشان ہو کر دادا پاپا سے بھی پہلے گھر پہنچے تھے۔

"توقیر تو گھنٹہ لگا دیتا آنے میں۔ بخار اتنا تیز ہو رہا ہے۔ تم پہلے مجھے فون نہیں کر سکتی تھیں۔" انہوں نے پوتی کا ماتھا چھو کر دیکھا پھر بہو کو مخاطب کیا۔

"چلو اٹھو شاباش ڈاکٹر واسطی ابھی بیٹھے ہوں گے۔" شمائلہ کا جواب سننے سے پہلے ہی انہوں نے پوتی کو مخاطب کیا۔ ان کا انداز اتنا قطعیت بھرا تھا کہ اسے اٹھتے ہی بنی۔

"دادا' میں انجکشن ہرگز نہیں لگواؤں گی۔" اس نے منہ بسورتے ہوئے انہیں آگاہ کیا۔

"بی اے کی اسٹوڈنٹ ہو اور بچوں کی طرح انجکشن سے ڈرتی ہو۔ اگر ڈاکٹر نے ضروری سمجھا تو انجکشن بھی لگے گا اور کڑوی کسیلی دوا بھی پینی پڑے گی چلو اٹھو شاباش۔" انہوں نے خود ہی جھک کر بیڈ کے نیچے سے اس کے سلیپر باہر نکالے پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھنے میں مدد دی تھی۔

"آپ اتنے اسے دوا دلوا کر لائیں ابا جی میں اس کے لیے کھچڑی بنا لیتی ہوں۔" شمائلہ سسر کے آنے سے مطمئن ہو گئی تھیں پتا تھا کہ اب اپنی لاڈلی کو وہ خود ہی سنبھال لیں گے۔ انہوں نے کچن کی راہ لی۔ خلیل احمد پوتی کا ہاتھ تھام کر اسے ڈاکٹر کے لے گئے تھے۔

"کتنے مریض ہیں اندر۔" ڈاکٹر کے کلینک پر پہنچ کر انہوں نے ڈسپنسر سے دریافت کیا۔

"اندر میڈیکل ریپ بیٹھے ہیں بزرگوار وہ آجائیں تو میں آپ کو اندر بھیج دوں گا۔" خلیل احمد نے ایک نگاہ ڈاکٹر کے کمرے کے بند دروازے پر ڈالی دوسری نگاہ ڈسپنسر پر اور تیسری نگاہ اپنی لاڈلی پوتی کے بخار سے تمتماتے چہرے پر۔

"میڈیکل ریپ بیٹھے ہیں تو بیٹھے رہیں۔ ہم نے تو بس اپنی پوتی کا چیک اپ کروانا ہے۔ یوں گئے اور یوں آئے چلو بیٹی۔" ڈسپنسر ارے ارے کرکے روکتا ہی رہ گیا اور دادا اس کا ہاتھ پکڑ کر بے دھڑک ڈاکٹر کے کمرے کا دروازہ کھولتے اندر داخل ہو گئے تھے۔ پرانی تعلق داری تھی ادھیڑ عمر ڈاکٹر واسطی گرم جوشی سے دادا سے ملے تھے پھر اسے اپنے قریب پڑے اسٹول پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

ڈاکٹر کے سامنے بیٹھا میڈیکل ریپ جس کو پہلے ہی ڈاکٹر سے ملنے کے لیے طویل انتظار کرنا پڑا تھا ان دادا' پوتی کی آمد پر جز بز تو ہوا تھا لیکن صبر اس کے پروفیشن کا بنیادی تقاضا تھا سو خاموشی سے ڈاکٹر کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ گاہے بگاہے ڈاکٹر کے پاس بیٹھی اس بے تحاشا خوب صورت لڑکی پر بھی نگاہیں ڈال لیتا جس کے دادا ڈاکٹر سے اپنی پوتی کی شکایتوں میں مصروف تھے۔

"اپنا بالکل خیال نہیں رکھتی یہ۔ کھٹی چیزوں سے اس کا گلا فوراً پکڑا جاتا ہے۔ لاکھ بار سمجھایا ہے کہ الٹی سیدھی چیزیں مت کھایا کرے۔ میں تو اس کے حساس گلے کے پیش نظر گھر میں اچار کا جار تک نہیں آنے دیتا لیکن اللہ جانے کالج میں کیا الا بلا کھا کر آتی ہے۔ صبح میں اور توقیر دفتر گئے تو بخار کا نام و نشان نہ تھا بس گلا

تھوڑا تھوڑا دکھ رہا تھا۔ اب بہو کا فون آیا کہ تیز بخار چڑھ گیا ہے تو میں تو بھاگا بھاگا۔" دادا نان اسٹاپ بول رہے تھے میڈیکل ریپ کا جی چاہا کہ تھرمامیٹر مریضہ کے بجائے بزرگوار کے منہ میں گھسیڑ دیا جائے۔ آخر دادا کی تقریر ختم ہوئی تو ڈاکٹر صاحب نے نسخہ لکھنے کے لیے رائٹنگ پیڈ آگے کیا۔

"بٹیا کا نام؟" انہوں نے مشفق لہجے میں دریافت کیا۔

"نصیبن بی بی۔" اس کے کچھ بولنے سے پہلے ہی دادا نے اس کا نام بتانے کا فریضہ بھی ادا کیا۔ سامنے بیٹھے میڈیکل ریپ کی حیرت سے پھٹی آنکھیں نصیبن کی نگاہوں سے پوشیدہ نہ رہ پائی تھیں۔ یہ حیرت اس کے لیے نئی نہ تھی۔ جب سے ہوش سنبھالا تھا اپنا نام بتانے پر ہر نئے شخص کی آنکھوں میں امڈنے والی حیرت سے واسطہ پڑتا ہی تھا اس وقت اسے غصہ ڈاکٹر واسطی پر آرہا تھا بچپن سے دادا اس کی انگلی پکڑ کر اسے ڈاکٹر واسطی کے کلینک پر لا رہے تھے اور انہیں اب تک اس کا نام یاد نہیں ہوا تھا حالانکہ اس کا نام ایسا تو نہ تھا کہ لوگوں کی یادداشت سے محو ہو جائے۔

نصیبن بی بی یہ نام اس کی پڑدادی کا تھا اور دادا نے اپنی پیاری ماں کا نام ہی جان سے پیاری پوتی کے لیے منتخب کیا تھا۔ پاپا دادا کے اکلوتے بیٹے تھے اور جب مما' پاپا کی شادی کے سات سال بعد بھی اولاد نہ ہوئی تو پاپا کو مستقل چپ لگ گئی اور مما کو ڈپریشن کے دورے پڑنے لگے۔ صرف دادا تھے جنہیں اللہ کی رحمت پر پورا بھروسہ تھا وہ مما کو لے کر بڑے سے بڑے ڈاکٹر کے پاس گئے سب کا ایک ہی جواب ہوتا تھا کہ مما میں ماں بننے کی صلاحیت نہیں اگر بچے کا زیادہ شوق ہے تو بچہ ایڈاپٹ کر لیا جائے ورنہ پاپا کی دوسری شادی کر دی جائے۔

مما نے تو روتے دھوتے پاپا کو دوسری شادی کی اجازت بھی دے دی تھی۔ پاپا نے چپکے چپکے اپنے کسی دوست کی ہمشیرہ کو دوسری زوجہ محترمہ بنانے کے لیے منتخب بھی کر لیا تھا دادا کو پتا چلا تو مما اور پاپا دونوں کو

زبردست قسم کی جھاڑ پلائی۔ نصیبن کو یہ تمام واقعات مما کی زبانی پتا چلے تھے۔

"تم ہوتی کون ہو اسے دوسری شادی کی اجازت دینے والی' بیوی ہو تو بیوی بن کر رہو۔ اس گدھے کا باپ بننے کی ضرورت نہیں۔ جب تک اس کا باپ زندہ ہے دوسری شادی کے لیے اسے تمہاری نہیں میری اجازت درکار ہو گی۔" دادا کی غضب ناکی دیکھنے کے لائق تھی۔

پاپا چپکے سے ہو گئے مما کو مورل اسپورٹ تو ملی لیکن ان کا ڈپریشن کم نہ ہوا۔ دادا ان کا ڈپریشن دور کرنے کی غرض سے جس سائیکالوجسٹ کے پاس لے کر گئے۔ اسی نے انہیں ایک حکیم کے پاس جانے کا مشورہ دیا۔

"بات تو عجیب سی ہے خلیل صاحب کہ میں اس دور میں آپ کو حکیم کے پاس جانے کا مشورہ دے رہا ہوں لیکن میری اپنی بھانجی کا وہاں سے علاج ہوا تو اللہ نے اولاد کی نعمت سے نواز دیا ورنہ ڈاکٹرز نے تو جواب دے دیا تھا۔ آپ وہاں جا کر دیکھیں اگر اللہ نے کرم کر دیا تو پھر میرے پاس مریضہ کو لانے کی ضرورت نہیں اس کا ڈپریشن اپنے آپ ختم ہو جائے گا' ہاں مٹھائی لے کر ضرور آیئے گا۔" اور پورے تین مہینے بعد دادا مٹھائی کا ٹوکرا لے کر سائیکالوجسٹ کے ہاں پہنچ گئے تھے۔

اللہ نے کرم کر دیا تھا۔ شمائلہ امید سے ہو گئی تھیں۔ شمائلہ اور توقیر کی خوشیوں کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہ تھا لیکن خلیل احمد کی خوشی دیکھنے کے لائق تھی ان کی اپنی بیوی کے انتقال کو ایک مدت بیت چکی تھی لیکن انہوں نے ایک تجربہ کار اور مشفق ساس کی طرح شمائلہ کا خیال رکھا تھا اور جب شمائلہ نے صحت مند اور انتہائی خوب صورت بچی کو جنم دیا تو خلیل احمد ہسپتال کے فرش پر ہی سجدہ ریز ہو گئے۔

"مجھے پتا تھا ہمارے گھر اللہ کی رحمت ہی آئے گی پرسوں رات خواب میں والدہ مرحومہ کی زیارت ہوئی تھی۔ ان کی گود میں بچی تھی اور وہ اسے دیکھ کر مسکرا رہی تھیں میں جانتا تھا اللہ مجھے پوتی سے ہی نوازے

گا۔" ان کی آنکھوں میں بے پناہ مسرت اور خوشی کے آنسو چمک رہے تھے۔ ہسپتال کی نرسیں دادا کی پوتی سے محبت دیکھ کر متاثر ہوئے جارہی تھیں۔

"آپ کے سسر بچی سے بہت لاڈ کر رہے ہیں۔ رات کو بھی آپ کے میاں تو نیچے میٹرس بچھا کر سو رہے تھے آپ دوائیوں کی غنودگی میں تھیں۔ بے چارے باباجی منی کے رونے پر اسے کاٹ میں سے اٹھا کر فیڈر پلا رہے تھے۔" نرس نے شمائلہ کا بی پی چیک کرتے ہوئے بتایا تھا۔ شمائلہ نقاہت سے مسکرادیں۔

"ہم تو اللہ کی رحمت سے مایوس ہوگئے تھے۔ اباجی نے ہی اللہ سے دعائیں کر کے پوتی منگوائی ہے۔" شمائلہ نے مسکراتے ہوئے نرس کو بتایا۔

"بہت پیار کرنے والے شخص ہیں باباجی۔" نرس متاثر ہوئی تھی اور پھر پیار کرنے والے دادا نے پوتی پر اپنا پہلا پیار بھرا حق جتایا تھا۔

"تم دونوں کو اعتراض نہ ہو تو اپنی پوتی کا نام میں رکھ دوں۔" انہوں نے شمائلہ اور توقیر کو مخاطب کیا۔

"کیسی باتیں کرتے ہیں آپ اباجی۔" توقیر سے پہلے شمائلہ ہی بول اٹھی تھیں۔

"آپ کی پوتی ہے نام بھی آپ ہی تجویز کیجیے۔" شمائلہ نے محبت بھرے لہجے میں سسر کو مخاطب کیا تو توقیر نے بھی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔

"بس پھر اس کا نام اس کی پڑدادی کے نام پر رکھتا ہوں۔ اس کی پیدائش سے پہلے اماں مرحومہ خواب میں نظر آئی تھیں میں نے سوچ لیا تھا پوتی ہوئی تو اماں کے نام پر ہی پوتی کا نام رکھوں گا۔ یہ آج سے **نصیبن** بی بی ہے۔ اللہ اس کے نصیب اچھے کرے۔" انہوں نے پوتی کی پیشانی پر محبت بھرا بوسہ دیتے ہوئے کہا۔ شمائلہ اور توقیر کے لیے یہ نام اتنا غیر متوقع تھا کہ وہ ہکابکا رہ گئے۔ خلیل احمد بیٹے، بہو کے تاثرات دیکھ ہی نہ پائے کہ وہ پیار بھری نگاہوں سے اپنی پوتی کو تک رہے تھے۔

"بہت دیر سے بچی بھوکی ہے اسے فیڈ کرواؤ میں نماز پڑھ کر آتا ہوں۔" منی تھوڑا سا کسمسائی تو انہوں نے بہت احتیاط سے اسے بہو کو پکڑایا اور نماز کی ادائیگی کے لیے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد توقیر اور شمائلہ نے بے بسی سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

"اتنی پیاری بچی ہے ہماری اور اتنا آؤٹ ڈیٹڈ اور آؤٹ آف فیشن نام نہیں جچتی ہم یہ نام نہیں رکھیں گے تم اباجی کو کہہ دو کہ تمہیں نام پسند نہیں وہ کوئی اچھا سا نام تجویز کریں۔" توقیر نے شمائلہ کو مخاطب کیا۔

"واہ جی واہ۔ میرے کندھے پر بندوق رکھ کر چلا رہے ہیں۔ آپ خود کیوں نہیں کہہ دیتے۔" شمائلہ چمک کر بولی تھیں۔

"تم چہیتی بہو ہو اپنے سسر کی تمہاری بات آسانی سے مان لیں گے۔ میں خود تو صاحب اولاد ہوگیا لیکن ان کے لیے گدھا نالائق اور احمق ہی ہوں۔" توقیر خفا خفا سے انداز میں بولے۔

"میں کیسے کہوں گی اباجی سے اتنے پیار سے انہوں نے نام رکھا ہے۔ ان کا مان ٹوٹ جائے گا۔" شمائلہ کو بھی نام ذرا سا پسند نہ آیا تھا لیکن سسر سے بات کرتے ہوئے وہ ہچکچا رہی تھیں۔

"تو پھر کیا کریں اپنی بیٹی کا نام یہی رکھ دیں **نصیبن بی بی**؟" توقیر طنزیہ انداز میں مخاطب ہوئے۔

"ایسے چبا چبا کر نام تو نہ لیں۔ آپ کی مرحومہ دادی کا نام ہے۔" شمائلہ نے شوہر کو ٹوکا۔

"میری مرحومہ دادی کے زمانے میں یہ نام قطعاً آؤٹ آف فیشن نہ ہوگا اس وقت ایسے ہی نام رکھے جاتے ہوں گے اب ایک صدی بعد پیدا ہونے والی بچی کا نام ان کے نام پر رکھ دیں۔ ایسے کیسے ہو سکتا ہے۔" توقیر جھنجلا رہے تھے۔

"پھر کیا کروں۔" شمائلہ ہولے سے بولیں۔

"اباجی سے بات کرو۔ میری تو کبھی نہیں مانیں گے تم جانتی تو ہو۔" توقیر نے ساری ذمہ داری بیوی کے کندھوں پر ڈالی اور شمائلہ نے اس دن کے بعد کتنی دفعہ اباجی سے اس بارے میں بات کرنے کی کوشش کی تھی لیکن سچ تو یہ تھا کہ ان کی ہمت ہی نہ پڑتی وہ سسر سے کوئی اور نام تجویز کرنے کا کہہ سکتیں۔

"**میلی پالی پالی نصیبن ہے یہ میلی چھوٹی سی گڑیا۔** شہزادی (میری پیاری پیاری نصیبن ہے یہ میری چھوٹی گڑیا شہزادی)" خلیل احمد پوتی کو گود میں اٹھائے اس کے واری صدقے جاتے رہتے تو توقیر شمائلہ کو اور شمائلہ توقیر کو دیکھتے رہ جاتے۔

شمائلہ احسان فراموش نہ تھیں۔ باپ جیسے سسر کی محبت اور شفقت وہ کیسے بھلا پاتیں یہی خلیل احمد تھے جنہوں نے بیٹے کو دوسری شادی کا سوچنے پر ہی اس بری طرح لتاڑا تھا کہ پھر توقیر احمد کبھی خواب میں بھی دوسری شادی کرنے کا نہ سوچ سکے تھے۔ یہی خلیل احمد تھے جنہوں نے انتہائی ڈیپریشن کا شکار اپنی بہو کا ساتھ کبھی نہ چھوڑا ہر لمحہ ان کی دل جوئی کی۔

اسے سمجھاتے رہے کہ وہ خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہو اور جب انہوں نے دیکھا کہ ان کا سمجھانا بے اثر جا رہا ہے تو وہ بہو کو لے کر سائیکالوجسٹ کے پاس پہنچ گئے اور پھر یہی خلیل احمد تھے جو بیٹے کی طنزیہ گفتگو کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے بہو کو حکیم کے پاس بھی لے گئے توقیر کو حکیم کے علاج پر قطعاً یقین نہ تھا وہ شمائلہ کو حکیم صاحب کی دی گئی دوا کی پڑیا پھکتی دیکھ کر مذاق اڑاتے۔ شوہر کی باتیں سن کر شمائلہ کا اپنا یقین متزلزل ہو جاتا۔

یہ خلیل احمد کا اللہ پر بے پناہ یقین تھا کہ آج وہ اور توقیر صاحب اولاد تھے۔ شمائلہ اتنی بے شعور ہرگز نہ تھیں کہ وہ دادا سے اس کی پوتی کا نام تجویز کرنے کا حق واپس لے لیتیں۔ پوری دلی آمادگی کے ساتھ نہ سہی مگر پھر بھی انہوں نے خلیل احمد کا منتخب کردہ نام قبول کر لیا تھا اور پھر یہی بات اپنے میاں کو بھی سمجھانی چاہی تھی۔

"اباجی کو اپنی خوشی پوری کرنے دیں۔ ان کی پوتی ان کی **نصیبن** ہے تو ہم اپنی بیٹی کو صبا کہہ کر پکار لیں گے۔ یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ تو نہیں جتنا ہم نے سمجھ لیا ہے۔" شمائلہ نے کیا خوب درمیان کی راہ نکالی تھی۔ توقیر بیوی کی فہم و فراست کا قائل ہوگئے اور پھر وہ واقعی ماں باپ کی صبا بن گئی تو دادا کی لاڈلی **نصیبن**۔

خلیل احمد نے کبھی بیٹے بہو سے یہ استفسار نہ کیا کہ وہ اسے صبا کہہ کر کیوں بلاتے ہیں۔ ان کے نزدیک ماں باپ کا بڑا حق ہوتا ہے وہ اولاد کو جو مرضی کہہ کر پکاریں ہاں برتھ سرٹیفکیٹ میں تو بچی کا اصل نام ہی درج کروانا ضروری تھا نا۔ توقیر کے پاس کہاں ان کاموں کی فرصت تھی۔ خلیل احمد خود بہت چاؤ سے اس کا برتھ سرٹیفکیٹ بنوا کر لائے تھے۔

نصیبن بی بی ولد توقیر احمد اور پھر ایک برتھ سرٹیفکیٹ پر ہی کیا موقوف **نصیبن** کے سارے کام اس کے دادا کے توسط انجام پائے۔

وہی اس کی انگلی پکڑ کر اس کا اسکول میں داخلہ کروانے گئے۔ اس کا ب فارم بھی خلیل احمد ہی بنوا کر لائے۔ وہ صرف مما، پاپا کی ہی صبا تھی۔ باقی ہر جگہ اس کا نام **نصیبن** ہی درج ہوا اور **نصیبن** ہی پکارا جاتا۔

شروع شروع میں تو رشتہ داروں اور جاننے والوں کو بھی اس کا نام بہت عجیب اور دقیانوسی لگا۔ لیکن پھر سب ہی عادی ہوگئے۔ **نصیبن** صرف خوب صورت نہ تھی بلکہ بے تحاشا حسین تھی وہ اپنے گھر والوں کے لیے بھی بہت نصیبوں والی ثابت ہوئی خلیل احمد اور توقیر احمد کا معمولی سا کاروبار اس کی پیدائش کے بعد چمک اٹھا تھا۔ گھر میں روپے پیسے کی فراوانی ہوگئی۔ گھر میں وہ کسی شہزادی کی طرح پرورش پارہی تھی۔

اسکول میں بھی اپنی خوب صورتی کی وجہ سے دوسری بچیوں میں نمایاں اور ممتاز نظر آتی لیکن جیسے جیسے اس نے ہوش سنبھالا اور لوگوں کے چہروں کے تاثرات اور رویوں کی سمجھ آنے لگی تو پتا چلا کہ صرف خوب صورتی ہی اس کی امتیازی خاصیت نہیں اس کا نام بھی سب سے منفرد ہے۔ اتنا منفرد کہ یہ نام سن کر پہلے پہل لوگوں کے چہروں پر حیرت در آتی ہے پھر ہنسی، طنزیا ترس کے تاثرات ابھر آتے۔

"تمہارا نام تمہاری شخصیت سے بالکل مطابقت نہیں رکھتا **نصیبن** اتنی خوب صورت اور ماڈرن لگتی ہو تم اور نام بالکل پرانا اور دقیانوسی سا۔ آخر تمہارے پیرنٹس نے کیا سوچ کر یہ نام رکھا۔" کوئی بے تکلف سہیلی حیرت سے استفسار کرتی۔

"یہ نام میرے دادا جان نے رکھا تھا اپنی مدر کے نام پر" نصیبن پھیکی ہنسی ہنستے ہوئے وضاحت کرتی شمائلہ کی زبانی اسے اپنا نام رکھے جانے کے پس منظر سے پوری طرح آگاہی ہو چکی تھی۔ وہ دل ہی دل میں دادا سے اس بات پر خفا کی تو ہوتی کہ آخر انہوں نے اس کے لیے ایسا اولڈ فیشن نام کیوں منتخب کیا لیکن یہ بھی سچ تھا کہ وہ ان سے برملا یہ شکایت کرکے ان کا دل نہ دکھا سکتی تھی۔

اس میں دادا کی جان تھی تو وہ بھی اپنے دادا کو دیوانہ وار چاہتی تھی۔ اس نے دور و نزدیک میں اتنا لونگ اور کیئرنگ دادا کسی کا نہ دیکھا تھا۔ نصیبن کی پیدائش کے بعد شمائلہ پھر کبھی ماں نہ بن سکی تھیں لیکن نصیبن کو کبھی بہن بھائیوں کی کمی یا محرومی محسوس نہ ہوئی۔

☼ ☼ ☼

دادا اپنی نصیبن کے لیے چوبیس گھنٹے آن ڈیوٹی رہتے۔ وہ ان کے ساتھ کھیلتی۔ ان کے ساتھ سیر کو جاتی۔ ان سے کہانیاں سنتی۔ فرمائشیں کرتی' ضدیں منواتی اور اکثر تو ان ہی کے کمرے میں سو جاتی۔ اتنے پیارے دادا نے اگر اپنی پسند سے اس کا نام رکھ ہی دیا تھا تو یہ ان کا حق تھا مگر کاش دادا اس کا نام اپنی والدہ کے نام پر رکھنے کے بجائے کچھ اور رکھ دیتے اور اگر پڑدادی کے نام پر اس کا نام رکھا ہی جانا تھا تو کاش پڑدادی کا نام ہی کچھ اچھا ہوتا۔

اس کی زندگی میں نام کے حوالے سے بہت سارے کاش اکٹھے ہو چکے تھے مگر اس سب کے باوجود زندگی گزر رہی تھی اور شاید مزے میں ہی گزر رہی تھی مگر جب بھی کوئی نیا بندہ اس کا نام سنتا تو نام سننے کے بعد اس کے چہرے پر ابھرنے والے تاثرات نصیبن کو نئے سرے سے احساس شرمندگی میں مبتلا کر دیتے ویسے تو وہ کوشش کرتی کہ ہر کسی کو اپنا نام صبا ہی بتائے مگر جب دادا ساتھ ہوتے تو اس کی ایسی کوشش کو نادانستگی میں ہی سہی مگر بہت کامیابی سے ناکام بنا دیتے تھے۔ اس سب کے باوجود اس کا بیشتر وقت اپنے پیارے دادا کے ساتھ ہی گزرتا اس دن بھی وہ اور دادا حسب معمول شام کے وقت چہل قدمی کی غرض سے گھر کے قریبی پارک میں گئے۔ دادا تھوڑی سی واک کے بعد تھک گئے تھے۔

"چلو بھئی اب بیٹھ کر گپیں لڑاتے ہیں۔" وہ بنچ پر بیٹھ گئے تھے۔

"آپ کا فٹنس لیول کم ہوتا جا رہا ہے دادا۔ چلیں اٹھیں ایک چکر اور لگاتے ہیں۔"

"تمہارا دادا بڈھا بھی تو ہوتا جا رہا ہے۔ اب فٹنس لیول کیسے برقرار رکھے۔" دادا گہرا سانس کھینچتے ہوئے اٹھ گئے تھے۔

"آپ اس عمر میں بھی پاپا سے زیادہ اسمارٹ ہیں خبردار جو اپنے آپ کو بڈھا کہا۔" اس نے دادا کو مصنوعی خفگی سے گھورا تھا۔ دادا مسکرا دیے۔

"موسم اتنا پیارا ہو رہا ہے نا۔ بس ایک راؤنڈ لے کر پھر یہیں بیٹھیں گے۔ گپیں لڑائیں گے اور واپسی پر آپ مجھے ٹھیلے والے سے لے کر گول گپے کھلائیں گے۔"

"گول گپوں کا ذکر گول کرو کتنی مشکل سے تمہارا گلا ٹھیک ہوا ہے اب میں تمہاری کوئی الٹی سیدھی فرمائش پوری نہیں کروں گا۔" دادا نے اسے صاف صاف بتا دیا تھا۔

"چلیں یہ تو وقت بتائے گا۔" وہ چلتے چلتے مسکرائی تھی۔ دادا نے اس کی پیاری مسکراہٹ کو بہت پیار سے دیکھا تھا لیکن پھر اچانک دادا کے چہرے کے تاثرات بدلے تھے۔ وہ تھوڑا سا لڑکھڑائے تھے پھر قریبی درخت کا سہارا لیا تھا۔

"کیا ہوا دادا۔ آر یو آل رائٹ۔" نصیبن نے بری طرح گھبرا کر ان کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

"ایک دم سے چکر آ گئے۔" دادا بمشکل بولے تھے۔

"آئیں چلیں واپس بنچ پر بیٹھیں۔" وہ انہیں سہارا دینے کی کوشش کرتی بمشکل بنچ پر لائی تھی۔ دادا

کا وجود بہت ڈھیلا ڈھیلا لگ رہا تھا۔

"آپ ٹھیک تو ہیں نا۔" وہ روہانسی ہو کر پوچھ رہی تھی۔

"موبائل بھی گھر بھول آئی۔ پاپا کو فون کر کے بلوا لیتی کیا کروں۔ آج تو پانی کی بوتل تک ساتھ نہیں لائی۔ دادا بتائیں نا۔ اب ٹھیک ہیں آپ۔" وہ بے قراری سے ان کے ہاتھ سہلانے لگی۔ آنکھیں پانیوں سے لبریز ہو گئی تھیں۔

"ٹھیک ہوں۔ ابھی چلیں گے گھر۔ ذرا سانس لے لوں" دادا نے پوتی کو تسلی دینے کی کوشش کی لیکن ان کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ ٹھیک نہیں ہیں۔ اتنے میں ہی ایک ڈیسنٹ سی خاتون اس کے پاس آ گئی تھیں۔

"کیا بات ہے بیٹی۔ ابھی آپ لوگ واک کر رہے تھے اور پھر آپ نے ایک دم سے پریشان ہو کر انہیں یہاں بٹھایا ہے خیریت تو ہے کون ہیں یہ طبیعت زیادہ خراب تو نہیں۔" خاتون پر خلوص لہجے میں استفسار کر رہی تھیں۔

"میرے دادا ہیں یہ' ذرا دیر پہلے ہی ہم پارک میں آئے تھے تھوڑی سی واک کی پھر شاید انہیں چکر آ گئے۔ آپ کے پاس موبائل فون ہے آنٹی۔ میں اپنے گھر فون کر لوں۔ آج میں موبائل ہی گھر بھول آئی۔" نصیبن کو وہ آنٹی رحمت کا فرشتہ لگی تھیں۔ ان سے مدد مانگنے میں اس نے کوئی عار نہ سمجھا۔

"میرے بیٹے کے پاس ہو گا فون تم پریشان مت ہو۔ میں تمہیں فون دیتی ہوں۔" خاتون نے اس کے حواس باختہ چہرے کو دیکھ کر تسلی دی تھی پھر گردن موڑ کر ذرا فاصلے پر کھڑے اپنے بیٹے کو اشارے سے پاس بلایا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں بیٹا جانی ابھی گھر چلیں گے۔" دادا نے نقاہت بھرے لہجے میں اسے تسلی دی تھی۔

"میں فون کر کے پاپا کو بلوا رہی ہوں دادا۔ آپ پلیز ریلیکس رہیں۔" وہ مسلسل دادا کے ہاتھ سہلا رہی تھی۔ اتنے میں خاتون کا بیٹا بھی قریب آ گیا تھا۔ وہ ایک خوبرو دراز قد نوجوان تھا جس کا ہیئر کٹ اس کے فوجی ہونے کا پتا دے رہا تھا۔ نصیبن نے ایک سرسری نگاہ اس پر ڈالی تھی۔ خاتون نے بیٹے سے موبائل لے کر اسے تھمایا تھا۔ اس نے جلدی سے پاپا کا نمبر ملایا۔ لیکن شاید پاپا کا موبائل آف تھا۔ پاپا اکثر نماز پڑھنے مسجد جاتے تو موبائل آف کر دیتے اور پھر آن کرنا ہی بھول جاتے۔ دوبارہ ٹرائی کرنے کے بجائے اس نے گھر کا نمبر ملایا۔ ایک بار نہیں دو بار' تین بار مگر کسی نے فون ریسیو نہیں کیا۔

"شاید مما کچن میں ہوں۔" وہ شرمندگی بھی محسوس کر رہی تھی لیکن پریشانی کا احساس دیگر تمام احساسات پر حاوی تھا۔ دادا کی طبیعت بالکل صحیح نہیں تھی ورنہ وہ مضبوط قوت ارادی کے مالک تھے ذرا سی بھی بہتری محسوس کر رہے ہوتے تو اٹھ کر چل پڑتے لیکن اب بالکل ڈھیلے ڈھالے وجود کے ساتھ بیٹھے تھے اس نے آخری کوشش کرتے ہوئے اپنے سیل فون کا نمبر ملایا تھا۔ لیکن جب مما کے کانوں تک لاؤنج کے چنگھاڑتے ہوئے فون کی آواز نہ پہنچی تھی تو اس کے بیڈروم میں پڑے موبائل کی مدھری گھنٹی انہیں کہاں سنائی دیتی۔

"یس آنٹی تھینک یو۔" اس نے موبائل خاتون کو واپس کیا ساتھ ہی پلکیں جھپک کر بے تحاشا امڈنے والے آنسوؤں کو روکنے کی بھی کوشش کر رہی تھی۔ دراز قد فوجی نے ایک سرسری سی نگاہ اس کانپتی لڑکی پر ڈالی تھی وہ انتہائی پریشان اور حواس باختہ تھی لیکن اپنے آپ کو کمپوز کرنے کی کوشش میں مصروف تھی۔

"چلو ٹھیک ہوں میں' اب گھر چلتے ہیں۔" دادا اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"اگر آپ مناسب سمجھیں تو ہم آپ لوگوں کو ڈراپ کر دیتے ہیں یقینا" آپ لوگوں کا گھر قریب ہی ہو گا۔" خاتون نے گویا بیٹے کے دل کی بات کہہ دی تھی۔ نصیبن نے دادا کو دیکھا۔

"گھر تو قریب ہی ہے بیٹا لیکن جانے کیوں ٹانگیں بے دم سی ہو رہی ہیں آپ لوگوں کو زحمت نہ ہو تو

ڈراپ کر دیجیے۔" دادا نے ان کی آفر قبول کر لی۔ خاتون کے بیٹے نے بغیر کچھ کہے دادا کو سہارا دے دیا تھا۔ ہولے ہولے قدم اٹھاتے وہ پارکنگ تک آئے تھے آج خلاف توقع پارک میں ایک بھی شناسا صورت نظر نہیں آئی تھی یہ اجنبی لوگ رحمت کا فرشتہ بن کر آ گئے تھے وہ اور دادا گاڑی کی پچھلی نشستوں پر بیٹھ گئے تھے۔

"میں اور میرا بیٹا یہاں کسی سے ملنے آئے تھے غلطی یہ ہوئی کہ آنے سے پہلے میزبانوں کو انفارم نہیں کیا۔ گھر بند ملا تو میزبان کو فون کیا۔ انہوں نے کہا ہم بازار گئے ہیں بس پندرہ منٹ میں واپس پہنچتے ہیں۔ اب پندرہ منٹ گھر کے سامنے کھڑے ہو کر کیسے گزارتے۔ آتے ہوئے پارک کے سامنے سے گاڑی گزری تھی سوچا پندرہ بیس منٹ کا وقت ہم ماں بیٹا پارک میں واک کر کے گزار لیں۔" وہ مشفق سی خاتون دھیمے لہجے میں نصیبن سے مخاطب تھیں لیکن نصیبن کا سارا دھیان دادا کی طرف تھا۔

"غلطی میری ہے دادا۔ آپ تھکے تھکے لگ رہے تھے پھر بھی میں مصر تھی کہ آپ مزید واک کریں۔ آپ مجھے پہلے ہی ٹوک دیتے۔" وہ اپنے دادا سے مخاطب تھی۔

"بھلا چنگا ہوں میں۔ بس ذرا چکر آ گئے تھے اب تم ٹینشن لینا بند کرو۔ اللہ نے ان بھلے مانس لوگوں کو مدد کے لیے بھیج دیا۔ ابھی گھر پہنچ جائیں گے۔" دادا نے پوتی کو تسلی دی اتنے میں ہی گاڑی میں موبائل کی مدھر ٹون گونجی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان خاتون کے بیٹے نے السلام علیکم کہہ کر فون ریسیو کر تو لیا تھا مگر اگلے ہی پل پلیز ہولڈ کیجیے کہہ کر فون اپنے برابر بیٹھی ماں کو پکڑا دیا۔

"یہ لیجیے پکڑا دیں ممی ان کے گھر سے فون ہے۔" انہوں نے فون نصیبن کو پکڑایا اس نے جلدی سے فون کان سے لگایا تھا۔ دوسری طرف شمائلہ تھیں۔

"مما کہاں تھیں آپ میں نے کتنے فون کیے۔ دادا کی طبیعت اتنی خراب ہو گئی تھی۔ اپنا موبائل میں گھر بھول گئی تھی۔ ایک آنٹی سے مانگ کر پہلے پاپا کو فون کیے پھر آپ کو کسی نے بھی فون ریسیو نہیں کیا۔ اب وہی آنٹی ہمیں گھر ڈراپ کر رہی ہیں۔" نصیبن نے ماں کو صورت حال سے آگاہ کیا۔

"ٹھیک ہے آپ اور پاپا ڈاکٹر واسطی کے کلینک پر پہنچیں۔ ہم بھی وہیں اتر جاتے ہیں۔" چند لمحوں تک ماں کی بات سننے کے بعد وہ بولی تھی اور پھر اللہ حافظ کہہ کر کال ڈسکنکٹ کر دی۔

"پلیز رائٹ سائیڈ پر ٹرن لیں۔ یہاں ڈاکٹر صاحب کا کلینک ہے آپ ہمیں وہیں ڈراپ کر دیجیے۔" اس نے ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان لائٹ براؤن آنکھوں والے سمارٹ سے شخص کو مخاطب کیا تھا اس نے دھیرے سے اثبات میں گردن ہلا دی نصیبن پھر دادا کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"پاپا بھی ابھی گھر پہنچے ہیں دادا۔ مما اور پاپا ڈاکٹر واسطی کے پاس آ رہے ہیں۔ ہم بھی وہیں اتر کر پہلے آپ کا چیک اپ کروائیں گے پھر گھر چلیں گے ٹھیک ہے نا۔" اسے دادا کے سوا کسی کا ہوش نہ تھا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔" دادا نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ "بس وہ مسجد کے سامنے ڈاکٹر صاحب کا کلینک ہے۔ وہیں گاڑی روک دیجیے۔" نصیبن نے پھر اسے مخاطب کیا۔

"اگر آپ کہو بیٹا تو آپ کے مما' پاپا کے پہنچنے تک ہم آپ کے پاس رکیں۔" گاڑی ڈاکٹر واسطی کے کلینک کے سامنے جا رکی تو خاتون نے شفقت بھرے لہجے میں اسے مخاطب کیا۔

"نہیں آنٹی تھینک یو۔ ہمارا گھر یہاں سے بالکل قریب ہے۔ میرے مما' پاپا بس پہنچنے والے ہوں گے اور ڈاکٹر صاحب بھی ہمارے فیملی ڈاکٹر ہیں دادا سے پیدل چلنا مشکل تھا۔ آپ کی بہت مہربانی کہ آپ لوگوں نے ہمیں یہاں تک ڈراپ کیا اب کوئی مسئلہ نہیں تھینک یو سو مچ۔" اس نے ممنونیت سے اس فرشتہ صفت خاتون کا شکریہ ادا کیا تھا۔

"تم بار بار شکریہ ادا کر کے شرمندہ کر رہی ہو بیٹا

مشکل وقت میں انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔" خاتون نے اسے ملائمت سے مخاطب کیا۔ وہ انہیں ممنونیت سے دیکھ کر رہ گئی۔ جب وہ اور دادا گاڑی سے اتر گئے تو ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان خاتون کے بیٹے نے کھڑکی کا شیشہ نیچے کرتے ہوئے ذرا سا سر باہر نکالا تھا۔

"ایکسکیوزمی مس آپ میرا موبائل واپس کرنا بھول گئیں۔" اور نصیبن پر تو گھڑوں پانی پڑ گیا۔ دادا کی پریشانی میں اس کی عقل ماؤف ہوئی تھی۔ مما سے بات کرنے کے بعد فون واپس کرنے کے بجائے اس نے اپنے ہاتھ میں ہی دبوچ رکھا تھا۔

"سوری' پریشانی میں میری عقل ہی کام نہیں کر رہی' بری طرح شرمندہ ہوتے ہوئے اس نے موبائل اس کے مالک کو تھمایا تھا پھر جلدی سے دادا کا ہاتھ تھام کلینک کی عمارت میں داخل ہو گئی۔ خفت سے برا حال ہو رہا تھا۔

"کیا سوچ رہا ہو گا وہ بندہ میرے متعلق ایسی بھی کیا بدحواسی کہ اس کا موبائل لوٹانا ہی بھول گئی۔" اس نے دل ہی دل میں خود کو لتاڑا تھا پھر تمام سوچوں کو ذہن سے جھٹک کر دادا کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"طبیعت میں کچھ فرق محسوس ہوا دادا؟"

"ہاں اب کچھ بہتر ہوں۔" دادا نے سر ہلایا۔ اتنے میں ہی توقیر اور شمائلہ بھی پہنچ گئے تھے۔ ڈاکٹر واسطی سے دادا کا چیک اپ کروانے کے بعد تینوں نے دادا کی طبیعت کے متعلق سوال کر کر کے ڈاکٹر کا سر کھا لیا تھا۔

"ارے بھئی کہا تو ہے بی پی لو ہو گیا تھا۔ ساتھ ہی شوگر بھی لو ہو گئی۔ پریشانی کی ہرگز کوئی بات نہیں۔ دوا دے دی ہے لیکن دوا سے زیادہ ان کی ڈائٹ کا خیال رکھنا ہے۔ خود ہی بھلے چنگے ہو جائیں گے۔" ڈاکٹر واسطی نے اپنے مخصوص لہجے میں تسلی دی تھی۔ دادا کی طرف سے بے فکر ہو کر جب وہ گھر پہنچے تو نصیبن کو ماں سے خفا ہونے کا خیال آیا۔

"میں بار بار فون ملا رہی تھی مما کہاں تھیں آپ پاپا تو چلو اکثر موبائل آف کر کے آن کرنا ہی بھول جاتے ہیں۔ آپ نے فون کیوں نہیں اٹھایا۔" اس نے خفگی سے دریافت کیا۔

"پڑوس میں تمہاری روبینہ آنٹی کے گھر دو گھڑی کو گئی تھی اس نے باتوں میں لگا لیا۔ گھر واپس آ کر سی ایل آئی پر اجنبی نمبر سے دو چار کالیں دیکھیں تو کال بیک کی اسی وقت تمہارے پاپا بھی گھر پہنچے تھے بس پھر ہم دونوں ڈاکٹر واسطی کے کلینک کی طرف بھاگے۔ میں تو بہت پریشان ہو گئی تھی۔ لیکن شکر ہے اباجی کی طبیعت سنبھل گئی ورنہ میرے ذہن میں تو الٹے سیدھے خیال آنے لگے تھے۔" شمائلہ واقعی اس وقت کافی ریلیکس نظر آ رہی تھیں۔ سچ یہی تھا کہ باپ جیسے شفیق سسر کی طبیعت خرابی کا سن کر کچھ دیر پہلے ان کے اوسان خطا ہو گئے تھے۔

"میرے تو خود حواس کام نہیں کر رہے تھے مما وہ تو ایک فرشتہ صفت آنٹی آ گئیں ورنہ شاید پریشانی کے مارے میرا اپنا بی پی لو ہو جاتا۔" نصیبن نے ماں کو ان خاتون کے بارے میں بتایا تھا۔

"اللہ انہیں خوش رکھے کہاں ہوتے ہیں آج کے دور میں ایسے بندے ہر کسی کو اپنی اپنی پڑی ہوتی ہے۔" شمائلہ نے خاتون کو دل سے دعا دی تھی۔ نصیبن کے ذہن کے پردے پر ایک لمحے کو خاتون کے بیٹے کا بھی عکس جھلملایا۔ بندہ کافی ڈیشنگ اور اسمارٹ تھا لیکن پرائے بندے کو سوچنے کا کیا فائدہ اگلے ہی پل اس نے ذہن میں آنے والی سوچ جھٹک ڈالی تھی۔

☼ ☼ ☼

بی اے کے پیپرز دینے کے بعد نصیبن جی بھر کر اپنی نیندیں پوری کر رہی تھیں اور جب پیپرز کی تھکن اچھی طرح اتر گئی تو اسے محسوس ہوا کہ گھر میں اس کے حوالے سے الگ ہی کھچڑی پک رہی ہے۔ گھر میں نئے نئے مہمانوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی تھی اور اسے بطور خاص مہمان خواتین سے ملوایا جاتا۔ وہ بچی نہ تھی' نہ ہی ناسمجھ۔ معاملہ اس کی سمجھ میں آ گیا تھا۔

"ابھی میری عمر ہی کیا ہے مما۔ آپ لوگوں نے میرا رشتہ بھی تلاش کرنا شروع کردیا۔" وہ ماں کے سامنے ٹھنکی تھی۔

"میری، تمہارے پاپا اور تمہارے دادا کی یہی خواہش ہے کہ تمہیں جلد از جلد اپنے گھربار کا کر دیں۔" شمائلہ نے اسے رسانیت سے مخاطب کیا۔

"میری کون سا ابھی عمر نکلی جارہی ہے۔" وہ خفا ہوتے ہوئے بولی۔

"تمہاری نہ سہی ہماری تو عمر کی نقدی ختم ہونے والی ہے نا بیٹا بس اس لیے چاہتے ہیں کہ جاتے جاتے یہ خوشی بھی دیکھ لیں۔" دادا کی آمد بہت اچانک تھی۔ نصیبن اور شمائلہ دونوں ہی چونکے تھے۔

"دادا کم از کم آپ تو اموشنل بلیک میل مت کریں۔ میں تو آپ کے پاس آرہی تھی کہ آپ مما' پاپا کو سمجھائیں گے کہ ابھی تو ہماری نصیبن بہت کم عمر ہے اس کی شادی وادی کا سلسلہ بعد پر اٹھا رکھو۔" اس نے دادا کو مخاطب کیا۔

"تو کون سا کل تمہاری شادی ہونے جارہی ہے کوئی مناسب رشتہ ملے گا۔ بات پکی ہوگی کوئی منگنی وغیرہ کریں گے پھر جاکر رخصتی کا مرحلہ آئے گا بیٹا جانی۔" دادا نے اسے تسلی دی اور شاید اس سے زیادہ خود کو اپنے جگر کے ٹکڑے کو کسی اور کے حوالے کرنا کب آسان تھا۔

وہ تو دن رات خدا سے یہی دعا کرتے کہ ان کی نصیبن کو پیار کرنے والے قدردان لوگوں کا ساتھ نصیب ہو جائے۔ شمائلہ نے جس رشتہ کروانے والی وچولن کی مدد لی ہوئی تھی۔ خلیل احمد نے اس کے ساتھ ایک میٹنگ خود کی تھی اور اسے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ وہ اوٹنگے بوٹنگے رشتوں کو ہرگز یہاں نہ لائے۔ اسے صرف سلجھے ہوئے معقول لوگوں کو ہی لانے کی اجازت ہوگی اور چونکہ وچولن کو اس کی منہ مانگی فیس بخوشی ادا کردی گئی تھی سو وہ ان کے کہے کے مطابق پڑھے لکھے سلجھے ہوئے خاندانوں کو ان سے ملوانے لارہی تھی پھر بھی جانے کیوں جو ایک بار آتا پھر پلٹ کر نہ آتا۔ یہ بات شمائلہ اور خلیل احمد دونوں کے لیے ہی پریشان کن تھی۔ آخر ایک دن سسر اور بہو نے مل کر وچولن کی کلاس لی تھی۔

"نصرت خالہ میں ہزاروں روپے آپ کو دے چکی پھر کیا وجہ ہے کہ آپ نصیبن کا رشتہ کروانے میں ناکام ثابت ہوتے جارہی ہیں۔"

"ہاں بہن صاف صاف بتاؤ اگر اور پیسے چاہییں تو مجھے کہو تمہیں یک مشت ادا ئیگی کروں گا۔ یہ سلسلہ اتنا دراز کیوں ہوتا جارہا ہے حالانکہ تم نے جتنی فیملیز کو ہم سے ملوایا ہمیں وہ سب ہی معقول لگیں پھر کیوں کوئی پلٹ کر نہیں آتا۔" خلیل احمد نے نصرت بیگم مشکوک انداز میں گھورتے ہوئے دریافت کیا۔

"نہ بابا جی آپ میری نیت پر شک کررہے ہیں آپ کے خیال میں میں آپ سے پیسہ بٹورنے کی خاطر آپ کی پوتی کا رشتہ نہیں ہونے دے رہی۔" نصرت بیگم جو عمر میں خلیل احمد سے دو چار برس ہی چھوٹی ہوں گی وضع داری سے انہیں بابا جی کہہ کر مخاطب کیا ساتھ ہی اپنی خفگی کا بھی اظہار کردیا۔

"میرا یہ مطلب نہیں ہے بہن آپ کے نام اور کام کی دھوم سنی تھی جب ہی ہم لوگوں نے آپ سے رابطہ کیا آپ پر پورا بھروسہ ہے ہمیں لیکن وجہ بھی پتا چلے کہ لوگوں کو میری حسین و جمیل پوتی کیوں پسند نہیں آرہی۔" نصرت بیگم کی خفگی دیکھتے ہوئے خلیل احمد نے اپنی ٹون بدلتے ہوئے پوچھا۔

"صاف بات کہوں بابا جی' پوتی آپ کی لاکھوں میں ایک ہے۔ جو دیکھتا ہے پہلی نظر میں ہی فریفتہ ہو جاتا ہے لیکن اصل مسئلہ کچھ اور ہے۔"

"مطلب؟" خلیل احمد نے ناسمجھی سے بھنویں اچکائیں۔

"لوگوں کو آپ کی پوتی تو پسند آجاتی ہے لیکن جب انہیں بچی کا نام پتا چلتا ہے تو لوگ حیران رہ جاتے کچھ تو ہنسنے لگتے ہیں آج کے دور میں اتنا پرانا نام نصیبن بی بی۔ بس یہی وجہ ہے لوگوں کے پیچھے ہٹنے کی۔" نصرت بیگم نے نصیبن بی بی کو استہزائیہ انداز میں ادا کرکے خلیل احمد کو وجہ سے آگاہ کیا۔ بات اتنی غیر متوقع تھی کہ شمائلہ اور خلیل احمد چپ کے چپ رہ گئے۔

"یہ تو کوئی وجہ نہ ہوئی نصیبن کو ناپسند کرنے کی۔ ٹھیک ہے نام ذرا پرانے زمانے کا ہے لیکن کتنا خوب صورت نام ہے ہم نے اپنی مرحومہ والدہ کے نام پر اپنی پوتی کا نام رکھا تھا اس میں کون سی قابل اعتراض بات ہوگئی۔" خلیل احمد نے کچھ لمحوں کے توقف کے بعد اچنبھے سے دریافت کیا۔

"بات یہ ہے بابا جی کہ آپ کی پوتی کا نام کچھ پرانا نہیں بلکہ کچھ زیادہ ہی پرانا ہے۔ اب لوگوں کو پسند نہیں آتا تو اس میں میرا کیا قصور اور جو خاتون پچھلے ہفتے اپنی بیٹی کے ساتھ آئی تھیں انہیں تو نصیبن اتنی پسند آئی تھی کہ وہ نام پر بھی کمپرومائز کرنے پر تیار ہوگئی تھیں لیکن جب ان کی بیٹی نے اپنے بھائی کو نصیبن کا نام بتایا تو وہ رشتہ کرنے سے انکاری ہوگیا۔ کہہ رہا تھا میں نے اپنے شوسل (سوشل) سرکل میں اپنا مذاق نہیں بنوانا۔" نصرت بیگم آج صاف صاف بات کرنے کے موڈ میں تھیں۔

"لاحول ولا قوۃ۔" خلیل احمد ناگواری سے بس یہی کہہ پائے۔

"اچھا نصرت خالہ اب آپ جائیں ہم اس موضوع پر پھر بات کریں گے۔" شمائلہ نے انہیں دھیمے لہجے میں مخاطب کیا۔

"ہاں چلتی ہوں بیٹی تمہارے سسر نے ذکر چھیڑا تو میں نے بتا دیا ورنہ بابا جی یہی سمجھتے رہتے کہ میں مزید پیسہ بٹورنے کے چکر میں رشتہ نہیں ہونے دے رہی۔" نصرت بیگم اپنا برقعہ سنبھالتی چلی گئی تھیں۔ شمائلہ نے انکھیوں سے سسر کو دیکھا۔ ان کے چہرے پر تفکر اور رنج کے آثار نمایاں تھے۔

"آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں ابا جی۔ جو ہماری نصیبن کے نصیب میں ہے اسے مل کر رہے گا اور پھر ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔" شمائلہ نے سسر کو دلاسہ دیا وہ محض ہنکارا بھر کر رہ گئے۔ اور تین دن بعد خلیل احمد نے شمائلہ کو اپنے کمرے میں بلوایا تھا۔

"تم نصرت بیگم سے کہو کہ وہ آئندہ سے نصیبن کے بجائے صبا نام بتایا کریں۔" انہوں نے بہو کو دھیمے لہجے میں مخاطب کیا۔ شمائلہ کا جی کٹ کر رہ گیا۔ اس نے خلیل احمد کے دکھ کو دل سے محسوس کیا تھا۔

"ابا جی آپ بلاوجہ پریشان۔۔۔"

"میں پریشان نہیں ہو رہا۔۔۔ میں نے حقیقت پسندی سے مسئلے کا حل نکالا ہے۔ تم اور توقیر تو نصیبن کو اکثر صبا کہہ کر ہی بلاتے ہو تو لوگوں کو بھی وہی نام پتا چلنا چاہیے جو اس کے ماں باپ نے رکھا۔ بوڑھے دادا کو وقت کے تقاضوں کا اندازہ ہی نہ تھا۔ ماں کی یاد میں بہت محبت سے پوتی کا نام رکھا تھا پتا ہوتا کہ دادا کا رکھا نام دنیا والوں کو اتنا دقیانوسی لگے گا تو شاید۔۔۔"

"بس کریں ابا جی۔ آپ کی محبت آپ کی پوتی کی زندگی کا قیمتی اثاثہ ہے آپ کا حق تھا کہ آپ پوتی کا نام اپنی پسند سے رکھتے دنیا والے اور ان کی پسند' ناپسند جائے بھاڑ میں۔" خلیل احمد کی آنکھوں میں چمکتی نمی دیکھ کر شمائلہ بھی جذباتی ہوگئی تھیں۔

"اچھا بس میں نے کہہ دیا نا کہ آئندہ رشتے والوں کے سامنے نصیبن کو صبا کہہ کر پکارنا ہے۔ میں بھی کوشش شروع کردیتا ہوں لیکن برسوں سے جو نام زبان پر چڑھا ہے جاتے جاتے ہی جائے گا۔" خلیل احمد نے دو ٹوک انداز میں بہو کو باور کروا دیا تھا ان کا قطعی انداز دیکھ کر شمائلہ تو چپ ہوگئی تھیں لیکن نصیبن کو پتا چلا تو اس نے شور مچا دیا۔ "میں اپنا نام' اپنی شناخت نہیں چھپا سکتی۔ جس نے مجھے پسند کرنا ہے اسی نام سمیت پسند کرے۔"

"اچھا اب تم اوور ری ایکٹ نہ کرو ابا جی پہلے ہی بہت دل گرفتہ ہیں۔ ان کے سامنے بار بار یہ ذکر چھیڑنے کا مطلب انہیں مزید پریشان کرنا ہے اس لیے زیادہ شور مت مچاؤ اور ہمیں دادا کی بات مان لینے دو۔" شمائلہ نے بیٹی کو رسانیت سے سمجھایا تھا اور نصیبن کی سمجھ میں بات آگئی تھی وہ اپنے جان سے پیارے دادا کو کب پریشان یا شرمندہ دیکھ سکتی تھی سو چپ ہوگئی۔

دیجولن نصرت کو کہلوا دیا گیا کہ آئندہ رشتے والوں کو نصیبین کا نام صبا بتایا کرے اور چار دن بعد ہی ایک رشتہ آ گیا تھا مگر یہ رشتہ نصرت بیگم نہ لائی تھیں بلکہ رشتہ مانگنے والوں کے ساتھ ڈاکٹر وسطی تشریف لائے تھے۔

"یہ شریف لوگ کتنے دنوں سے میرے کلینک کا چکر کاٹ رہے تھے۔ کہتے تھے چند ماہ پہلے ہم نے ایک دادا' پوتی کو آپ کے کلینک پر ڈراپ کیا تھا اور پوتی کہتی تھی کہ آپ ان کے فیملی ڈاکٹر ہیں تو براہ کرم ہمیں ان کا ایڈریس دے دیجیے۔

میں نے ان بھلے مانس لوگوں کو بہترا کہا کہ بھئی میرے کلینک پر تو جانے کتنے دادا اپنی پوتیوں' پوتوں کو لے کر آتے ہیں۔ جب تک آپ ان کا نام نہیں بتائیں گے میں پتا کیسے بتا سکتا ہوں لیکن یہ کہتے رہے کہ ڈاکٹر صاحب ذہن پر زور ڈالیں۔ یاد داشت کھنگالیں۔ اب میری یادداشت کا تو آپ لوگوں کو بخوبی علم ہے۔ شکر ہے دوائیوں کے نام یاد رہتے ہیں ورنہ تو پریکٹس بھی بند ہو چکی ہوتی۔" ڈرائنگ روم میں مہمانوں کے ساتھ بیٹھے ڈاکٹر واسطی شگفتگی اور بذلہ سنجی کا مظاہرہ کرتے حاضرین کو سارا قصہ سنا رہے تھے۔ میزبانوں اور مہمانوں کے چہروں پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

"بس آج یہ لوگ دوبارہ آئے تو میں نے کہا چلیں بچی کی عمر ہی بتا دیجیے۔ چار سال' چھ سال' آٹھ سال پھر خاتون ترنت بولیں۔

حد کرتے ہیں ڈاکٹر صاحب' ہمیں بچی کے لیے اپنے بیٹے کا رشتہ لے کر جانا ہے۔ چار چھ سال کی نہیں وہ تو بیس' بائیس برس کی بہت پیاری سی بچی ہے بس پھر کیا تھا اللہ نے کرم کیا میرے ذہن میں فوراً" خلیل بھائی آپ کا اور آپ کی پوتی کا خیال آیا کیا بھلا سا نام ہے ہماری بٹیا کا۔" ڈاکٹر واسطی ذہن پر زور دیتے ہوئے بولے۔

"صبا' صبا نام ہے میری پوتی کا۔" خلیل احمد نے بیٹے بہو کے کچھ بولنے سے پہلے جواب دیا تھا۔

"ماشاء اللہ بہت پیاری بچی ہے۔ بچپن سے اس کے دادا انگلی پکڑ کر اسے میرے کلینک پر لا رہے ہیں بس انجکشن سے بہت ڈرتی ہے۔" ڈاکٹر واسطی نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے جتایا تھا۔ خلیل احمد نے کیا تھا کہ ڈاکٹر واسطی کی یادداشت نے محض اتنا ہی کیا کہ انہیں نصیبین کا انجکشن سے ڈرنا یاد آیا۔ اس کا نام انہیں یاد نہ آیا تھا۔

"خلیل صاحب میں اور میری مسز آپ کے پاس بہت آس لے کر آئے ہیں۔ ہمیں مایوس نہ لوٹائیے گا۔" ڈاکٹر صاحب کے ساتھ آئے ہوئے یہ کرنل ریٹائرڈ منیر تھے جو بہت شائستگی اور عاجزی سے دادا کے سامنے ان کی پوتی کے لیے دست سوال بلند کر رہے تھے۔ ان کی بیگم بھی ان کے ساتھ بیٹھی تھیں وہ گریس فل اور مشفق خاتون جو دادا کی طبیعت خرابی والے دن نصیبین کو ٹکرائی تھیں۔

"کتنے مہینے ہو گئے ہیں ہماری اتفاق ملاقات کو۔ سچ کہوں تو آپ کی پوتی کی شکل میرے ذہن سے گئی نہیں۔ کتنی پیاری' بھولی بھالی بچی ہے اور پھر جس طرح وہ آپ کے لیے فکر مند ہو رہی تھی مجھے اس کے انداز یاد آتے تھے۔ ایسی محبت کرنے والی کیئرنگ بچی' تہذیب یافتہ' تعلیم یافتہ' بچ میں نے تو گھر جا کر کرنل صاحب سے اس کی خوب ہی تعریفیں کیں۔ انہوں نے کہا کہ پھر تو آپ کو بچی کا نام' پتا پوچھنا چاہیے تھا اپنے بیٹے کے لیے آپ ایسی ہی لڑکی کی تو خواہش مند ہیں۔

میں نے خود کو خوب ہی کوسا کہ یہ خیال مجھے کیوں نہ آیا۔ ایک ڈاکٹر صاحب ہی وہ واحد فرد تھے جو ہمیں آپ سے ملوا سکتے تھے ان کے کلینک کے کتنے چکر کاٹ ڈالے پھر خدا کا شکر ہے کہ ان کی یادداشت کام کر گئی اور یہ ہمیں آپ کے پاس لے آئے۔ ہم نے آپ کی خدمت میں اپنی درخواست پیش کر دی۔ اب آپ جلد از جلد ہمیں فیصلہ سنا دیجیے۔" بیگم منیر کی بے تابی ان کے انداز سے ہویدا تھی ان کا بس نہ چل رہا تھا آج کی نشست میں ہی اقرار سن کر اٹھیں۔

"ہمیں آپ لوگوں سے مل کر واقعی بہت خوشی ہوئی ہے لیکن ہمیں سوچنے کی مہلت چاہیے برخوردار میرا تو ایک بار کا دیکھا ہوا ہے لیکن اس روز طبیعت خرابی کی وجہ سے مجھے اپنا ہی ہوش نہ تھا۔ سچ کہوں تو مجھے اس کی شکل تک یاد نہیں میں اور میرے بیٹا بہو اس سے مل لیں پھر ہی آپ کو کسی قسم کا جواب دے سکتے ہیں۔" خلیل احمد نے سلیقے' سبھاؤ سے بات کی تھی۔ توقیر اور شمائلہ نے تائیدی انداز میں گردن ہلا دی۔

"یہ آپ کا حق ہے خلیل صاحب ظاہر ہے بچی کی شادی کا معاملہ بہت نازک معاملہ ہوتا ہے آپ ہمارے بیٹے سے ملیں اس کے متعلق پوری طرح چھان بین کروائیں۔ پورے دلی اطمینان کے ساتھ ہمیں جواب دیجیے گا۔ ہمیں کوئی جلدی نہیں۔" کرنل منیر نے متانت بھرے لہجے میں انہیں مخاطب کیا۔

"مجھے تو بہت جلدی ہے میں اس ویک اینڈ پر خاور کو بلوا لیتی ہوں۔ آپ اسے دیکھ لیجیے گا اور رات کا کھانا بھی ہمارے ہاں کھائیے گا۔" بیگم منیر تو واقعی ہتھیلی پر سرسوں جمانے کے چکر میں تھیں۔ ڈرائنگ روم میں موجود باقی نفوس مسکرا دیے۔ ان کی دعوت قبول کر لی گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

چار دن بعد خلیل احمد' توقیر اور شمائلہ کرنل منیر کا بیٹا دیکھ آئے تھے۔ دراز قد اور خوبرو کیپٹن خاور نصیبین کے گھر والوں کو پہلی نگاہ میں ہی بھا گیا تھا لیکن دادا نے ہاں کرنے سے پہلے اپنے دل کی پوری تسلی کی تھی۔ کرنل منیر کے آس پڑوس سے ان کی فیملی کے بارے میں پتا کروایا۔ سب کی رائے یہی تھی کہ یہ رکھ رکھاؤ والے شریف النفس اور وضع دار لوگ ہیں ان کے بیٹے کے بارے میں بھی سب کی رائے اچھی تھی۔

خلیل احمد خدا کا شکر ادا کرتے نہ تھکتے۔ یہ خدا کا کرم ہی تو تھا کہ گھر بیٹھے بٹھائے ان کی پوتی کا رشتہ ایسے اچھے گھرانے میں طے ہونے جا رہا تھا۔

ایک پروقار اور سادہ سی تقریب میں بیگم منیر نے نصیبین کو اپنے بیٹے کے نام کی انگوٹھی پہنا دی اور اسی تقریب میں انہوں نے شادی کی تاریخ بھی مانگ لی۔ خلیل احمد' توقیر اور شمائلہ تینوں ہی بہت مطمئن اور مسرور تھے۔

خوش تو نصیبین بھی تھی لیکن مطمئن ہرگز نہ تھی۔ پارک میں ٹکرانے والا کیپٹن جس کا خیال بعد میں بھی اسے یونہی بے سبب آ جاتا تھا۔ کتنے خیال سے وہ دادا کو سہارا دے کر پارکنگ تک لایا تھا اور جب وہ اسے اس کا موبائل لوٹا رہی تھی تو کیسے اس کی بھوری آنکھوں میں ایک لمحے کو شرارتی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی بعد میں بھی جس کا تصور کر کے نصیبین خفت زدہ ہوتی رہی تھی لیکن مجموعی طور پر وہ کتنا ڈیسنٹ اور سلجھی ہوئی شخصیت کا مالک لگ رہا تھا۔ جب نصیبین کو پتا چلا کہ اسی شخص کے گھر والے اس کے طلب گار بن کر ان کے گھر کی دہلیز تک آئے ہیں تو اسے اپنی خوش نصیبی پر رشک آیا تھا لیکن نصیبین کے گھر والوں کی ایک چھوٹی سی ہیرا پھیری نے اس کے دل میں کئی طرح کے خدشات کو جنم دے دیا تھا۔

کیپٹن خاور کے گھر والوں کو اس کا نام نصیبین کے بجائے صبا بتایا گیا تھا جب نصیبین کی ساس بہت پیار سے پوچھتی اور صبا بیٹے کیا حال ہے تو اس کا دل برے برے اندیشوں میں مبتلا ہو جاتا آخر ایک دن وہ ماں کے سامنے پھٹ پڑی "آپ کو میمونہ آنٹی کے سامنے غلط بیانی سے کام نہیں لینا چاہیے تھا۔ انہیں میرے اصلی نام سے آگاہ کرنا چاہیے تھا آخر یہ کوئی چھپنے والی بات تو نہیں۔ ایک نا ایک دن انہیں پتا تو لگ ہی جاتا ہے۔"

"تم کیوں فکر کرتی ہو۔ اب شادی میں دن ہی کتنے رہ گئے۔" شمائلہ نے اپنے طور پر اسے تسلی دی۔

"ممّا۔" نصیبین بے یقینی اور افسوس سے ماں کو دیکھ کر رہ گئی۔

"آپ کے کہنے کا مطلب ہے کہ ایک بار شادی ہو

جائے پھر انہیں پتا لگتا بھی ہے تو لگ جائے۔" اس نے ماں سے خفگی سے پوچھا۔

"یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں ہے بیٹے۔ تم خوامخواہ ٹینس ہو رہی ہو۔

وہ لوگ تمہیں پسند کر کے کتنی مشکلوں سے ہمارا گھر ڈھونڈتے 'ڈھانڈتے یہاں تک پہنچے ہیں۔ اتنے پیار اور چاہت سے تمہارا رشتہ مانگا۔ تمہارے نام سے انہیں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔" شمائلہ نے اسے بھرپور انداز میں تسلی دی۔

"اگر نام سے انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا تو نام چھپایا ہی کیوں؟" نصیبن نے چبھتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔ شمائلہ اس بار خاموش رہی تھیں۔

"بس آپ انہیں بتا دیں کہ میرا نام صبا نہیں بلکہ نصیبن بی بی ہے آپ نہیں بتائیں گی تو میمونہ آنٹی کو میں خود بتا دوں گی۔"

"خبردار جو تم نے ایسا کچھ کیا۔ فضول میں رسک لینے کا فائدہ۔ شادی کے بعد تم پیار محبت اور حسن سلوک سے اپنے شوہر اور سسرال والوں کے دل میں جگہ بنا لو گی پھر تھیلے سے بتاتی رہنا نام۔" شمائلہ نے اسے قطعیت بھرے لہجے میں مخاطب کیا۔ سابقہ تجربوں کے پیش نظر ان کی طبیعت وہمی ہو گئی تھی۔

ورنہ نصیبن کے سسرال والے بھلے مانس لوگ تھے۔ شاید انہیں اس کے پرانے زمانے والے نام سے کوئی فرق نہ پڑتا پھر بھی شمائلہ شادی سے پہلے کسی قسم کا کوئی رسک نہیں لینا چاہتی تھیں اور یہی بات انہوں نے دو ٹوک انداز میں نصیبن کو بھی باور کروادی تھی۔ نصیبن نے ماں کے قطعی انداز دیکھ کر مزید بحث سے تو گریز کیا تھا لیکن وہ دل میں ماں سے متفق نہ تھی۔

کچھ ضد سی بھی ہو گئی تھی کہ جو لوگ اتنی چاہت سے رشتہ مانگنے آئے ہیں انہیں آزما کر بھی دیکھے۔ کبھی ذہن میں خیال آتا کہ نکاح نامے پر تو حقیقی نام ہی لکھا جائے گا پھر کیپٹن خاور کا ردعمل کیا ہو گا کہیں اسے سہاگ رات کو ہی شوہر کے سامنے وضاحتیں صفائیاں نہ دینی پڑ جائیں اس صورت حال سے بچنے کا یہی حل تھا کہ کیپٹن خاور کو وہ خود ہی بتا دے کہ اس کی ہونے والی بیوی کا نام نصیبن بی بی ہے۔

کیپٹن موصوف سے منگنی کے باوجود اس کا کوئی آمنا سامنا نہ ہوا تھا حالانکہ وہ دو چار بار اپنے والدین کے ساتھ یہاں آیا تھا لیکن نصیبن کو دادا اور مما کی ہدایت پر مشرقی دوشیزہ ہونے کا ثبوت دینا پڑا تھا وہ خاور کے سامنے نہیں آئی تھی اس کی ساس اور چھوٹی نند اس سے اس کے کمرے میں ہی مل گئی تھیں لیکن اب کیپٹن صاحب سے ملاقات ضروری ہو گئی تھی۔

مسئلہ تو یہ تھا کہ کیپٹن خاور نے بھی مشرقی مرد ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے اس سے ملنا تو درکنار ٹیلی فونک رابطہ تک استوار نہ کیا تھا وہ اسی ادھیڑبن میں تھی کہ خاور سے بات کیسے کرے کہ اس کی مشکل خود ہی آسان ہو گئی۔ اس کی چھوٹی نند روز رات کو اس سے ٹیلی فون پر گپیں لگاتی تھی اس روز بات کے دوران اس نے اچانک کہا۔

"صبا بھابھی آپ مائنڈ نہ کریں تو بھیا آپ سے بات کرنا چاہ رہے ہیں۔" پھر اس کے جواب کا انتظار کیے بنا اس نے ریسیور اپنے بھائی کو تھما دیا تھا۔

"صبا اگر آپ مناسب سمجھیں تو میں آپ کے گھر والوں کی رضامندی کے ساتھ ایک بار آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔" سلام کے بعد کیپٹن خاور نے پہلی بات یہی کی تھی۔ خواہش تو یہ نصیبن کے دل کی بھی تھی لیکن خاور کی آواز سن کر وہ کنفیوز ہو گئی تھی۔ دل نے دھڑک دھڑک کر الگ اودھم مچا دیا تھا۔

"آپ کو میری فرمائش پر غصہ آ گیا؟" کیپٹن صاحب نے کچھ ڈرتے ہوئے دریافت کیا۔

"آپ مما سے پوچھ لیجیے گا۔" اس نے دھیرے سے کہہ کر فی امان اللہ حافظ کہے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا تھا۔ جس شخص کی گمبھیر آواز سن کر گال گلابی ہو گئے تھے اس کا سامنا کب آسان تھا لیکن ملنا بھی ضروری تھا۔

پتا نہیں خاور نے خود شمائلہ سے بات کی یا اپنی والدہ کی سفارش استعمال کی بہرکیف اسے خاور کے ساتھ قریبی ریسٹورنٹ میں لنچ پر جانے کی اجازت مل گئی

خاور نے اسے گھر سے پک کیا تھا۔ شکر ہے دادا اور پاپا گھر پر نہ تھے ورنہ وہ مزید شرم اور گھبراہٹ میں مبتلا ہو جاتی۔ شرم تو خیر اسے اب بھی بہت آ رہی تھی۔

خاور اس کی جھجک محسوس کرتے ہوئے پہلے دوستانہ انداز میں ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ وہ تھوڑا ریلیکس ہوئی تو اس نے پر تکلف سے لنچ کا آرڈر دیا۔ لنچ کے دوران اس نے اسی دوستانہ انداز میں اپنے حال دل سے بھی آگاہ کیا تھا۔

"پہلی ملاقات میں آپ جتنی حواس باختہ اور بوکھلائی ہوئی تھیں آپ کی وہ شکل میرے ذہن سے محو ہی نہیں ہو پا رہی تھی پھر آخر میں نے ممی سے دلی کیفیت شیئر کی ممی نے پاپا کو بتایا اور انہوں نے ہی آپ کی تلاش کا مشورہ دیا۔" وہ مسکراتے ہوئے بتا رہا تھا اور نصیبن کو خود پر رشک آ رہا تھا یہ لو ایٹ فرسٹ سائٹ والا معاملہ تھا اور اس کی ساس ظاہر کرتی تھیں کہ وہ اس پر پہلی نگاہ میں فریفتہ ہو گئی تھیں۔ نصیبن کے لبوں پر بھی مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

"جس پارک میں ہم ملے تھے میں نے وہاں کے درجنوں چکر کاٹ ڈالے بلکہ یوں سمجھیں جب بھی میں چھٹی پر گھر آتا پارک کا چکر بھی ضرور لگاتا حالانکہ اب آپ کو پتا چل گیا ہو گا کہ پارک ہمارے گھر سے کتنے زیادہ فاصلے پر ہے۔ اس روز تو اتفاقاً" ہم پارک چلے گئے تھے لیکن شاید یہ قدرت کی ٹائمنگ تھی اسے ہمیں آپس میں ملوانا مقصود تھا لیکن اس دن کے بعد میں جب بھی وہاں گیا مجھے آپ نظر نہیں آئیں پھر میں نے سوچا کہ آپ نے اپنے دادا کی طبیعت خرابی کے پیش نظر پارک میں آنا چھوڑ دیا ہو گا۔

"ہم نے صرف ٹائمنگ بدلی تھی میں اور دادا صبح فجر کی نماز پڑھ کر واک پر نکلتے تھے۔" نصیبن نے دھیمے لہجے میں اس کی غلط فہمی دور کی۔ وہ ہنس پڑا۔

"بس یہ بات میری عقل میں آ جاتی تو ان مخبوط الحواس ڈاکٹر صاحب کی مدد کیوں مانگنی پڑتی۔ انہوں نے ہمیں بہت خوار کیا لیکن شکر ہے آخر کار انہوں نے دونوں فیملیز کو آپس میں ملوا ہی دیا۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا تھا۔

"آپ کو پتا ہے آج میں نے آپ سے ملنے پر اصرار کیوں کیا۔" وہ پوچھ رہا تھا۔

"اور کیا آپ کو پتا ہے کہ میں آپ سے ملنے پر کیوں راضی ہوئی؟" نصیبن نے جوابی سوال کر ڈالا خاور نے حیرانی سے نفی میں گردن ہلا دی۔

"مجھے آپ کو کچھ بتانا تھا۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"مجھے بھی آپ کو کچھ بتانا ہے۔" خاور بھی ذرا سنجیدہ ہوا۔

"پہلے آپ بتائیے نصیبن نے ذرا کی ذرا نظر اٹھا کر اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں پہلے آپ کہیں جو بھی کہنا ہے میں منتظر ہوں۔" خاور رسانیت سے گویا ہوا۔ نصیبن نے گہری سانس اندر کھینچی۔ کچھ بتانے کو دل نہ کر رہا تھا لیکن بتائے بنا چارہ بھی نہ تھا جو شخص محبت کے دعوے کے ساتھ اس کی زندگی میں شامل ہونے جا رہا تھا اسے اور اس کی محبت کو آزمانا بھی تو ضروری تھا۔ اس نے سب کچھ بتا دیا۔

کیسے دادا نے اپنی مرحومہ ماں کے نام پر اس کا نام رکھا اور کس طرح زندگی میں قدم قدم پر اسے نام کے حوالے سے لوگوں کے طنز' مذاق اور ترحم بھرے فقرے سہنے پڑے۔ وہ حیرت جو اس کا نام سن کر سامنے والے کی آنکھوں میں در آتی تھی وہ اسے کیسے ہرٹ کرتی تھی اور کیسے اس نام کی وجہ سے ہی اسے دو تین فیملیز نے سند قبولیت نہ بخشی۔

"میں اپنے دادا سے جتنی محبت کرتی ہوں آپ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے اور اگرچہ یہ نام پہلے مجھے بھی اچھا نہ لگتا تھا لیکن جیسے جیسے شعور آیا مجھے دادا کے دیے گئے نام سے بھی پیار ہو گیا۔ میرے دادا سراپا محبت ہیں۔ انہوں نے میرے ماں باپ سے بڑھ کر مجھے چاہا ہے ہمیشہ میرے لاڈ اٹھائے۔ مجھے ان کے دیے گئے نام پر قطعاً" کوئی شرمندگی نہیں لیکن اگر آپ کے لیے یہ باعث شرمندگی ہو تو ابھی آپ کے پاس وقت ہے سوچ لیجیے۔" نصیبن نے بات کے آخر میں نظر

اٹھا کر اسے دیکھا۔ کیپٹن خاور کی آنکھوں میں چھپی حیرت اس کے لیے غیر متوقع نہ سہی مگر تکلیف دہ ضرور تھی۔

"آپ کو یہ سب سن کر شاک لگا تا۔" اس نے طنزیہ سے انداز میں پوچھا۔

"آپ کی توقع سے بڑھ کر شاک؟" اس نے تسلیم کیا۔ نصیبن کا دل کہیں اندر ہی اندر ڈوبتا چلا گیا تو گویا اس بہت اپنے اپنے سے لگنے والے بندے کا اس سے تعلق ختم ہوا چاہتا تھا۔ وہ اپنی انگلی میں سے انگوٹھی اتارنے ہی لگی تھی کہ کیپٹن خاور نے والٹ میں سے اپنا شناختی کارڈ باہر نکال کر اس کے سامنے رکھا۔

"اسے دیکھ لیجیے۔" اس نے سنجیدگی سے نصیبن کو مخاطب کیا۔

"کیا ہے یہ میرا مطلب ہے اسے کیوں دکھا رہے ہیں آپ مجھے۔" وہ نا سمجھی سے کیپٹن خاور کو تکنے لگی۔

"میرا آئی ڈی کارڈ ہے یہ اور آپ کو دکھا اس لیے رہا ہوں کہ آپ اس پر درج میرے کوائف پڑھ لیں۔" وہ اب بھی سنجیدہ تھا۔ نصیبن نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی اس کا آئی ڈی کارڈ اٹھالیا۔

مسکراتی ہوئی تصویر والا شناختی کارڈ لیکن جیسے ہی نام پر نگاہ پڑی۔ اس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ اس کے ایک نظر سامنے بیٹھے کیپٹن پر ڈالی پھر دوبارہ کارڈ کو دیکھا اور تیسری نگاہ دوبارہ سامنے بیٹھے شخص پر ڈالی۔

"اتنا حیران مت ہوں۔ میرا ہی کارڈ ہے اور اس پر درج نام بھی میرا ہی ہے۔ میرا اصل نام خیر دین ہی ہے۔" اس نے کارڈ نصیبن کے ہاتھ سے لے کر واپس اپنے والٹ میں رکھا۔

"میرے دادا کا انتقال تو میری پیدائش سے بہت پہلے ہو چکا تھا۔ کبھی آپ سمجھیں کہ آپ کی طرح میرا نام بھی دادا کا رکھا ہوا ہے۔" وہ اب پھر مسکرا رہا تھا۔ نصیبن کچھ نہ بولی بس اسے تکنے لگی تھی۔

"آپ تو جانتی ہیں میرے بابا میری طرح آرمی میں تھے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ میں بابا کی طرح آرمی میں ہوں۔" اس نے ہنستے ہوئے اپنی ہی بات کی تصحیح کی تھی۔

"بابا سینئل سروسز گروپ میں تھے۔ نائب صوبیدار خیر دین بھی اسی گروپ کا حصہ تھے ایک انتہائی مشکل مگر کانفیڈ نشل مہم میں دونوں ساتھ تھے۔ بابا کی قسمت میں زندگی لکھی تھی۔ بچ گئے صوبیدار خیر دین نے جام شہادت نوش کیا کارنامہ منظر عام پر نہ آسکتا تھا سو صوبیدار صاحب کو کوئی تمغہ نہ مل سکا لیکن بابا نے انہیں خراج تحسین پیش کرنے کا یہ طریقہ سوچا کہ اپنے نومولود بیٹے کا نام ان کے نام پر رکھ دیا۔ حالانکہ ممی نے بہت شور مچایا لیکن سچ کہوں تو مجھے آپ کی طرح کبھی اپنے اتنے پرانے سے نام پر کبھی شرمندگی نہیں ہوئی۔

یہ نام میرے لیے ہمیشہ باعث افتخار رہا کیونکہ اسے ایک شہید سے نسبت تھی ہاں ممی بے چاری کو اکلوتے بیٹے کے نام پر سمجھوتہ کرنا پڑا اس کا حل انہوں نے یہ نکالا کہ مجھے خیر دین کے بجائے خاور کہہ کر پکارنے لگیں' حالانکہ خیر دین نام کے افراد کو تو شاید پیار سے خیرو کہہ کر پکارا جاتا ہے۔" وہ پھر اپنی بات سے لطف لیتے ہوئے ہنسا تھا۔

"مجھے آپ کا نام سن کر اسی لیے شاک پہنچا تھا کہ آپ کے اور میرے مسئلے میں کتنی مماثلت ہے میں نے بھی آج آپ کو اسی لیے انوائیٹ کیا تھا کہ آپ کو اپنے اصل نام سے آگاہ کر دوں ورنہ میں نے بھی اپنا نام بتانے پر بہت سی حسیناؤں کے منہ کے زاویے بگڑتے دیکھے ہیں۔"

"آپ کا اور کتنی حسیناؤں سے تعلق رہا ہے۔" نصیبن نے مشکوک انداز میں پوچھا۔ وہ اس کے انداز پر قہقہہ لگا کر ہنسا تو وہ خفیف سی ہو گئی اسی لمحے خیر دین کا موبائل بجا تھا۔

"جی ممی سب خیریت ہے آپ بلاوجہ پریشان ہو رہی تھیں۔ یہ لیجیے اپنی بہو سے بات کریں۔" اس نے موبائل نصیبن کو تھما دیا تھا۔ حال احوال لے کر میمونہ آنٹی نے اللہ حافظ کہہ دیا تھا۔ نصیبن کا دھیان اب بھی اس کی بات میں ہی الجھا ہوا تھا۔

پتا نہیں اس نے اس سے پہلے کتنی لڑکیوں سے چکر چلایا ہو گا یہ فوجی تو ویسے بھی بہت دل پھینک ہوتے ہیں۔ جس بات کو مسئلہ بنا کر وہ یہاں تک آئی تھی وہ نہ صرف حل ہو چکا تھا بلکہ اس وقت تو اس کے ذہن سے محو بھی ہو گیا تھا اس کا ذہن دوسرے ہی خطوط پر سوچنے میں مصروف تھا۔

"آپ کہتی ہیں تو میں آپ کو حلفیہ بیان بھی دینے کو تیار ہوں کہ آپ میری زندگی میں آنے والی پہلی اور آخری لڑکی ہیں۔ جتنا شریفانہ میرا نام ہے میں خود بھی اتنا ہی شریف اور معصوم ہوں۔" وہ نصیبن کے چہرے کے تاثرات سے کیسے اس کے دل کا حال پا گیا تھا جب ہی شرارتی انداز میں صفائی دی۔ وہ شرمندہ سی ہو گئی۔

"شادی میں تھوڑے ہی دن رہ گئے ہیں ممی نے مجھے کہا تھا کہ میں جیولر کو باقی جیولری کے ساتھ آپ کی رونمائی کے لیے کسی بریسلیٹ وغیرہ کا بھی آرڈر کر دوں لیکن مجھے لگتا ہے کہ مجھے آپ کو اچھا سا موبائل تحفے میں دینا پڑے گا۔ آپ کو میرا موبائل اتنا پسند ہے کہ اسے واپس کرنے کو جی نہیں چاہتا۔" وہ اب واقعی شرارت کے موڈ میں تھا۔ اس کی ممی کا فون سننے کے بعد وہ آج بھی اس کا موبائل دینا بھول گئی تھی۔

"یہ لیجیے۔" بے تحاشا سٹپٹاتے ہوئے اس نے اسے اس کا موبائل پکڑایا تھا۔

"پلیز اتنا مت بوکھلایا کریں۔ آپ کے اسی بوکھلائے ہوئے روپ نے چار ماہ سے میری راتوں کی نیندیں اڑا دیں ہیں اور جب کبھی قسمت سے آنکھ لگ جائے تو خواب میں بھی آپ ہی نظر آتی ہیں مجھے تو اب بھی یقین نہیں آ رہا کہ آپ میرے سامنے بیٹھی ہیں تو یہ خواب ہے یا حقیقت۔" کیپٹن صاحب اب رومانس لڑانے کے موڈ میں تھے۔ نصیبن کا دل کانوں میں دھڑکنے لگا۔

"اللہ نے تو آپ کو میرے مقدر میں لکھ رکھا تھا لیکن آپ کو اپنے نصیب کا حصہ بنانے کے لیے مجھے جتنی بھاگ دوڑ کرنی پڑی ہے یہ میں ہی جانتا ہوں۔ میرا جی چاہنے لگا ہے کہ میں آپ کو نصیب ہی کہہ کر بلاؤں آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں۔" وہ مسکراتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"اور اگر میں آپ کو خوش نصیب کہہ کر پکاروں تو آپ کو بھی کوئی اعتراض تو نہیں۔" نصیبن نے اپنا اعتماد بحال کرتے ہوئے ذرا مسکرا کر پوچھا۔ کیپٹن صاحب کا قہقہہ فلک شگاف تھا۔ نصیبن کی شرمیلی سی نقرئی ہنسی کی آواز اس میں دب کر رہ گئی تھی۔

☼ ☼

ندا حسنین

ربیعہ نے ایک مشہور اشتہاری ویب سائٹ پہ اپنے کلینز کا اشتہار لگایا اور پھر مزے سے اپنے کام میں مگن ہوگئی۔ بس غلطی اس سے یہ ہوئی کہ اس نے رابطے کے لیے اشتہار میں اپنا نمبر دے ڈالا۔

☼ ☼ ☼

وہ تینوں کمپیوٹر کے سامنے سر جوڑے بیٹھے کھسر پھسر کرتے ہوئے نہ جانے انٹرنیٹ پہ کیا تلاش کررہے تھے۔

"ابے طارق! وہ ویب سائٹ کھول جو جمال نے بتائی تھی۔" دلاور نے چھالیہ منہ میں ڈالتے کہا۔

"کیوں جگر! کیا ہے اس ویب سائٹ میں؟" اسد نے دلاور کے کندھے پہ ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"ابے وہ جمال بتا رہا تھا وہاں سے لڑکیوں کے نمبر مل جاتے ہیں۔" دلاور نے آنکھ مارتے ہوئے ذو معنی لہجے میں کہا تو طارق کے ساتھ اسد کے چہرے پہ بھی خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

اب طارق کے ہاتھ مزید تیزی سے کی بورڈ پہ چل رہے تھے، جبکہ دلاور اور اسد آنکھیں سکیڑے کمپیوٹر کی اسکرین کو بے تابی سے گھور رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

ربیعہ کی مانو بلی نے دو ماہ قبل دو بچے دیے تھے۔ بچے اپنی ماں کی طرح بڑے بڑے بالوں والے سفید روئی کے گالوں کی طرح گول مٹول پیارے پیارے سے تھے۔ ربیعہ کا دل تو نہیں تھا، مگر اپنے بے پناہ اسٹڈیز اور وقت کی کمی کے باعث اس نے مجبوراً کسی اچھے گھرانے میں بچے دینے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اسی سلسلے میں اس نے اشتہار لگایا تھا اور اتفاق سے شام تک دونوں بچے اپنے نئے گھر میں اپنے نئے مالکوں کے ہمراہ منتقل بھی ہوگئے۔ اب وہ اس ویب سائٹ سے اپنا اشتہار ہٹانے کے مقصد سے لیپ ٹاپ کھول رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"ابے یہ دیکھو یار! اشتہار میں لڑکی کا نمبر ہے۔" دلاور کی نظریں اچانک اسکرین پہ ایک جگہ ٹھہر گئیں اور وہ جوش میں ایسے چلایا جیسے ہفت اقلیم کی دولت مل گئی ہو۔ "اوپن کر، اوپن کر۔" دلاور کے جوش نے اسد میں بھی بجلی بھر دی۔

ان دونوں کے جوش و جذبے کو دیکھ کر طارق ایسا بوکھلایا جیسے کرپٹ سیاستدان میڈیا کے ہاتھوں درگت بننے سے گھبرا جاتے ہیں اور اس بوکھلاہٹ میں وہ اسکرین پہ ادھر ادھر متلاشی نظروں سے اوپن کا آپشن ڈھونڈنے لگا۔

"ابے گدھے! اسی ایڈ پر کلک کرنا!" دلاور جتنا اس نمبر کو حاصل کرنے کے لیے بے تاب تھا۔ سو ایک ہاتھ طارق کی پشت پہ جڑتا ہوا بولا۔

ایڈ کھل گیا تھا۔ وہ تینوں اب جلدی جلدی نمبر نوٹ کررہے تھے۔

"یار نام کیا ہے لڑکی کا۔" اسد نے اچانک یاد آنے پر پوچھا تو طارق غور سے اسکرین پہ نظریں

جمائے نام پڑھنے لگا۔

"ربیعہ... ربیعہ نام ہے۔" اتنی خوشی سے بتایا گیا جیسے نام نہ پتا چلا ہو کسی کروڑپتی تاجر کے بینک اکاؤنٹ کا پاس ورڈ پتا چلا ہو۔

کچھ ہی دیر میں وہ نمبر ان سب کے موبائل میں محفوظ ہوچکا تھا۔ کیونکہ دلاور کے ذریعے ہی وہ اس نمبر تک پہنچے تھے تو سب سے پہلے اس لڑکی سے بات کرنے کی سعادت بھی دلاور ہی کے حصے میں آئی۔ نمبر مل گیا تھا اور بیل جارہی تھی۔

اشتہار ویب سائٹ سے ہٹا کر وہ فارغ ہی ہوئی تھی کہ اس کا موبائل بج اٹھا۔ اس نے اسکرین پہ نظر ڈالی تو انجان نمبر جگمگا رہا تھا۔ کچھ سوچ کر اس نے کال موصول کرلی۔

"السلام علیکم!" اس نے لیپ ٹاپ بیگ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"وعلیکم السلام ربیعہ جی! بلی کے بچے ہیں آپ کے پاس؟" مخاطب اپنے لب و لہجے سے اسے ذرا نہ بھایا۔

"جی نہیں! وہ بک چکے۔" وہ بات ختم کر کے کال کٹ کرنے والی ہی تھی کہ مخاطب کی آواز پھر سے ابھری۔

"کوئی بات نہیں جی۔ آپ یہ بتائیں' مزاج کیسے ہیں آپ کے؟" مخاطب اب اپنے اصل مقصد پر اتر آیا۔

"بدتمیز!" ربیعہ نے ناگواری سے کہہ کر لائن کٹ کردی اور موبائل وہیں چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

لڑکی کی سریلی آواز سن کر دلاور کی باچھیں ایسے کھلیں جیسے غیر ملکی امداد کا سن کر حکمرانوں کی کھل جاتی ہیں۔ اگلے ہی لمحے وہ مطلب کی بات پر اتر آیا۔

"کوئی بات نہیں جی! آپ یہ بتائیں آپ کے مزاج کیسے ہیں۔" دلاور نے اک ادا سے اپنے بالوں پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

مگر جلد ہی اس کی خوشی ہوا میں اڑ گئی۔ وہ اب منہ بنائے موبائل کی اسکرین کو گھور رہا تھا۔

"بدتمیز کہہ کر لائن کٹ کردی یار۔" شرمندگی سے اطلاع دی گئی۔

"ابے تو دوبارہ کال ملا' دل کیوں چھوٹا کر رہا ہے اپنا۔" اسد نے ہمت بندھائی تو دلاور پھر سے کال کرنے لگا۔ مگر سب بے سود رہا۔ دوسری جانب سے کال ریسیو نہیں کی گئی۔ مسلسل کال کرنے پر بھی کوئی جواب نہ ملا تو طارق اور اسد نے دوسرا مشورہ دے ڈالا۔

"ابے گھبراتا کیوں ہے میرے شیر... میسج کر میسج۔"

"بتا یار کیا لکھوں میسج میں۔" دلاور نے ایسے پوچھا جیسے وہ دونوں اس کے استاد ہوں۔

"چل لکھ میرے بھائی! شرمائی کیوں ہیں ربیعہ جی' بات تو کرلیں ہم سے۔" اسد نے تجویز دے کر ایک خباثت بھرا قہقہہ لگایا اور پھر تو دلاور کی انگلیوں میں بھتی قوتوں نے ڈیرہ ڈال لیا ہو۔ ایسی پھرتی سے چلیں کہ کھٹا کھٹ میسج کرنے لگیں۔ طارق اور اسد فقرے کستے جاتے اور وہ ان فقروں کو لفظوں کے روپ میں ڈھالتا چلا گیا۔

☼ ☼ ☼

ربیعہ جب کمرے میں آئی تو میسجز کی ٹون نے اسے اپنی جانب متوجہ کرلیا۔ اس نے موبائل اٹھا کر چیک کیا تو آٹھ مسڈ کالز اور پندرہ میسجز کا نوٹیفکیشن اسکرین پر جگمگا رہا تھا۔ وہ ایک کے بعد ایک میسج کھولتی چلی گئی اور اس کے چہرے کی رنگت بدلتی چلی گئی۔

"ربیعہ جی... کچھ تو بولو... چلو A.B.C.D ہی سنادو... ہاہا۔" یہ پہلا نمونہ تھا۔

"کب تک چپ بیٹھے' اب تو کچھ ہے بولنا' کچھ تم بولو کچھ ہم بولیں او ڈھولنا۔" ایک اور شاہکار میسج نے اس کی نظروں کا استقبال کیا۔

"اور کتنا انتظار کرواؤ گی اپنے دیوانے کو' کیا عزم کر بیٹھی ہو مجھے جان سے مارنے کو۔" منہ چڑاتا شعر اس کا خون ایسے کھولا گیا جیسے تیز آنچ پر پتیلی میں رکھا پانی کھول رہا ہوتا ہے۔ کو ہر میسج اس کے صبر کا امتحان بنتا جا رہا تھا۔ یہ آخری میسج تھا جو کھل کر اس کی نظروں کو خیرہ...

"شرمائی کیوں ہیں ربیعہ جی' بات تو کرلیں ہم سے۔" لاکھ صبر کے باوجود بھی وہ دل ہی دل میں میسج کرنے والے کو کوسنے لگی۔ کچھ دیر تک تو وہ سوچتی رہی کہ کیا کرے' پھر اس نے کھڑے کھڑے ہی وہ نمبر بلاک کردیا اور سکون کا سانس لے کر پڑھنے بیٹھ گئی۔ اب اس نمبر سے نہ کال آسکتی تھی' نہ ہی کوئی فضول پیغام۔

"یار تو ابھی بھی ویسے ہی بیٹھا میسج کر رہا ہے۔ کوئی جواب بھی آیا یا نہیں۔" اسد اور طارق قریبی دکان سے پان لینے گئے تھے۔ واپس آئے تو طارق کو جوں کا توں بیٹھا دیکھ کر بولے۔ "ابے نہیں یار... کوئی جواب نہیں آیا۔" یہ کہہ کر دلاور کال ملانے لگا۔

"آپ کا رابطہ آپ کے مطلوبہ نمبر سے ممکن نہیں۔"

آپریٹر کی سریلی آواز میں موصول ہونے والے پیغام نے دلاور کے ارمانوں پر پانی پھیر دیا۔

"تیرے بھائی کا نمبر ہی بلاک کردیا اس نے۔" دلاور کی شکل بالکل اسی طرح لٹکی تھی جیسے کسی اہم میچ ہارنے اور ایونٹ سے باہر ہوجانے کے بعد پاکستانی ٹیم کی لٹکی ہوتی ہے۔

"یعنی تیری باری تو گئی' اب میری باری... دیکھنا تیرا بھائی کیسے اپنے لفظوں سے گھائل کرتا ہے اس لڑکی کو۔" اسد اپنا کالر جھاڑتا' شیخی بکھیرتا ہوا بولا تو دلاور اندر ہی اندر سلگ کر رہ گیا۔

"دیکھنا تیرا بھائی بالکل عمران ہاشمی کی طرح اس لڑکی کو پٹائے گا۔" اسد کی شوخیاں عروج پر تھیں اور وہ دونوں بے چینی سے اسد کے دعووں کی تکمیل کے منتظر تھے۔

☼ ☼ ☼

کل کالج میں اس کا وائیوا تھا سو وہ تیاری میں بری طرح مصروف تھی کہ اچانک ایک نئے نمبر سے اس کا موبائل گنگنا اٹھا۔ کچھ دیر قبل کے تجربے کے باعث اس نے کال وصول کرنے کا ارادہ ترک کردیا۔ کال کچھ دیر تک مستقل آتی رہی' پھر بند ہوگئی۔ اس سے پہلے کہ وہ سکھ کا سانس لیتی میسجز کا ایک نیا ریلا سیلاب کی طرح اس کے موبائل میں جمع ہونا شروع ہوگیا۔

"ربیعہ جی! میں کوئی ایسا ویسا لڑکا نہیں ہوں' میٹرک پاس ہوں اور شکل سے بالکل عمران عباس لگتا ہوں۔ ہاں! ہیرو گری اپنی بالکل عمران ہاشمی جیسی ہے جی ہاں! جس پر لڑکیاں ہائے اللہ کرتی مرمٹتی ہیں... ہاں تو بن گئی ہوتا میری دوست اب۔" یہ میسج غائبانہ تعارف سے اس کا مذاق اڑا رہا تھا۔

"لوفر کہیں کا۔" غصے میں وہ اتنا ہی بڑبڑا پائی تھی کہ اگلے میسج نے مزید تپا دیا۔

"جواب نہیں دیا اب تک آپ نے' کہیں بے ہوش تو نہیں ہوگئیں میری شخصیت سے متاثر ہوکر۔" اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اس عقل سے فارغ شخص کا دیوار سے ٹکرا کر سر پھاڑ دے۔

"ارے آپ کہو تو فواد خان کی طرح اکڑ کر ڈائیلاگ بھی بول سکتا ہوں۔"

"جی تو چاہ رہا ہے کہ کہہ دوں مرغا بن کر صبح تک بانگ لگاتے پھرو لفنگے۔" وہ زیر لب بڑبڑائی۔

"ارے بات تو کر کے دیکھو میڈم! خود کہو گی واہ! کس ہیرو سے پالا پڑا ہے۔" اس آخری میسج پر وہ اپنا سر پیٹ کر رہ گئی۔ اشتہاری ویب سائٹ پہ وقتی طور پر اپنا نمبر دینے کی جو غلطی اس نے کی تھی' اس کا خمیازہ اسے ان بے ہودہ کالز اور پیغامات کی صورت میں بھرنا پڑ رہا تھا۔ سر تھامے آخر کب تک بیٹھی رہتی۔ کچھ حل تو نکالنا تھا۔ سو یوں طارق میاں بھی ربیعہ بی بی کے ہاتھوں بڑے ہی خونخوار تیوروں کے ساتھ اپنے انجام کو پہنچے۔

اسد کا نمبر بھی بلاک ہوجانے پر دلاور اور طارق کے فلک شگاف قہقہے فضاؤں میں گونج رہے تھے۔

"دکھادی نا تجھے بھی ہری جھنڈی' بڑا آیا تھا عمران ہاشمی۔" دلاور کے دل میں ٹھنڈک سی اتر رہی تھی۔

"ارے یہ تو تم دونوں کی بس کی بات نہیں' دیکھنا اس میڈم کی سیٹنگ تو مجھ سے ہی ہوگی۔" اسد کا لٹکا منہ دیکھ کر طارق کو ایک انجانی سی خوشی مل رہی تھی۔

"چل ملا نمبر' پھر ہوجائے فیصلہ ابھی۔" دلاور کے کچھ زیادہ ہی دل پہ لگ گئی تھی بات۔

"اب تو رات ہوگئی بہت! ابا بھی گھر آگئے ہوں گے' کل میسج ٹرائی کروں گا جگر۔" طارق نے موبائل پہ ٹائم دیکھتے ہوئے کہا۔

"پھر وعدہ کر جو بھی بات کرے گا ہمارے سامنے کرے گا۔ جس طرح ہم نے تمہارے سامنے بات کی ہے تو بھی ایسے ہی بات کرے گا۔" اسد نے کہا تو دلاور بھی تائیدی انداز میں سر ہلانے لگا۔ ان دونوں کو ڈر تھا کہ طارق کی متوقع عزت افزائی سے وہ لوگ محروم نہ رہ پائیں۔ وہ تینوں اب بات بے بات تالی مارتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کی جانب رواں دواں تھے۔

☼ ☼ ☼

دوسرا نمبر بلاک ہونے کے بعد پھر کسی بھی نمبر سے کوئی کال یا میسج نہیں آیا تو وہ بھی اللہ کا شکر ادا کرتی مطمئن سی ہو کر ایک بار پھر سے اپنی پڑھائی کی جانب متوجہ ہو گئی۔

سر عثمان پورے کالج میں اصولوں کے معاملے میں سخت ترین اساتذہ میں سے تھے۔ سونے پہ سہاگا یہ کہ آج ان ہی کا وائیوا تھا۔ ان کی کلاس میں موبائل کے استعمال پہ ممانعت تھی۔

ربیعہ کی باری آنے ہی والی تھی۔ وہ دل ہی دل میں دعائیں کر رہی تھی کہ اس کا وائیوا اچھا ہو جائے۔ سر عثمان نے اب اس کا رول نمبر بمع نام پکارا تھا۔ اس نے موبائل سیٹ پہ ہی رکھ چھوڑا اور آگے بڑھ گئی۔

پہلا سوال، دوسرا سوال، تیسرا سوال، چوتھا سوال۔۔۔ صحیح جوابات دیتے ہوئے وہ قدرے مطمئن تھی۔ اس کا وائیوا مکمل ہو چکا تو وہ واپس جانے کے لیے پلٹی ہی تھی۔ تب ہی اس کے موبائل میں آنے والی کال نے خاموشی بھرے ماحول میں ہلچل مچا دی۔

صبح ایک بار پھر وہ تینوں اپنی مخصوص جگہ پر ملے تو گفتگو کا آغاز ربیعہ کے ذکر سے ہی ہوا۔

"چل طارق بڑے تو نے دعوے کیے ہیں۔ اب شروع ہو جاؤ۔ ذرا ہم بھی تو دیکھیں تو کتنا بڑا ہر فن مولا ہے۔" دلاور نے اسد کو دیکھتے ہوئے آنکھ ماری اور دھمو کا طارق کی پشت پہ جڑ دیا۔ طارق ان دونوں کے اکسانے پر بڑے ہی جوش میں موبائل نکال کر نمبر ملانے لگا۔

"ادھر آئیں مس۔۔۔!" سر عثمان نے عینک ناک پہ ٹکاتے ہوئے اسے واپس بلایا۔

"یس سر۔۔۔" اس نے جلدی سے کال کٹ کرتے ہوئے کہا۔ اندر ہی اندر وہ کانپے جا رہی تھی۔ رات بھر رانگ نمبرز سے کال اور میسجز کا سلسلہ منقطع رہا تو اس نے بے فکری میں موبائل وائبریشن پہ بھی نہیں لگایا تھا۔ اس سے پہلے کہ سر عثمان کچھ کہتے، اسی نمبر سے دوبارہ کال آنے لگی۔ اب تو ربیعہ کے اوسان ہی خطا ہو گئے۔ سر عثمان کے سامنے ہی موبائل زور و شور سے گنگنا رہا تھا۔

"ریسیو کریں کال اور اسپیکر آن کریں۔" سر عثمان نے خشمگیں نظروں سے گھورتے ہوئے کہا تو مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق دل ہی دل میں دعا کرتے ہوئے کال ریسیو کر کے اسپیکر آن کر دیا۔

"ہیلو میڈم! کیسی ہیں آپ، قسم سے کل تو آپ نے بہت ہی ستایا ہمیں، اب ایسی بھی کیا بے رخی کہ میسج کا جواب ہی نہیں دیا۔ ویسے مجھے علم تھا کہ آپ کو میرے دوست پسند نہیں آئیں گے۔۔۔ ارے کچھ کہیے تو۔۔۔ خاموش کیوں ہیں۔۔۔ ہیلو ہیلو۔۔۔" اس گفتگو کے بعد ربیعہ کا دل چاہ رہا تھا کہ زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائے۔ پوری کلاس اسے تضحیک آمیز نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

مگر سر عثمان ایک جہاندیدہ انسان تھے اور سارا ماجرا سمجھ چکے تھے، سو ربیعہ کے ہاتھ سے موبائل لیتے ہوئے انہوں نے مخاطب کو سخت الفاظ میں ڈانٹ پلائی۔

"کیا ہوا یار، بتا نا کیا کہا لڑکی نے۔" طارق کو بات کرتا دیکھ کر وہ دونوں ساری روداد سننے کو بے چین تھے۔

"کچھ نہیں یار، کسی کھڑوس بڈھے نے کال اٹھائی تھی۔" وہ منہ بنا کر خفت زدہ سا بولا تو دلاور اسد کے بے ہنگم قہقہوں سے آسمان گونج اٹھا۔

وائیوا ختم ہوتے ہی وہ تیزی سے کلاس روم سے باہر نکلی اور کوریڈور کی جانب تیز قدموں سے بڑھنے لگی۔ سائرہ اس کی سب سے بہترین دوست، اس کی کیفیت سمجھتے ہوئے جلدی سے اس کے پیچھے لپکی۔

"یہ کیا ماجرا تھا ربیعہ، کون تھا وہ جاہل؟" سائرہ نے نرمی سے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے روکا اور پھر پوچھا۔ سائرہ کے اس طرح پوچھنے پہ ربیعہ کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ اس سے پہلے کہ وہ روتی، سائرہ اسے اپنے ہمراہ لیے ایک کونے میں لے آئی، جہاں لوگوں کی آمد و رفت قدرے کم تھی۔ اب وہ دونوں یہاں آرام سے بات کر سکتی تھیں۔

"ہاں۔۔۔! اب بتاؤ کیا ہوا تھا؟" سائرہ نے اس کی آنکھوں سے آنسو صاف کرتے ہوئے نرمی سے پوچھا۔ ربیعہ نے کل رات سے شروع ہونے والی کالز سے لے کر اب تک کا سارا ماجرا کہہ سنایا۔

"ہونہہ! یہ بات ہے، ان کم بختوں کی تو میں ایسی کی تیسی کرتی ہوں۔ تم مجھے وہ نمبر دو ذرا۔" سائرہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ربیعہ نے جھٹ سے وہ نمبر نکال کر موبائل سائرہ کے حوالے کر دیا۔ سائرہ نے وہ تینوں نمبر اپنے موبائل میں محفوظ کیے اور ربیعہ کو ہدایت دینے لگی۔

"سب سے پہلے تو تم اس آخری نمبر کو بھی بلاک کرو۔" ربیعہ جلدی جلدی بلاک کرنے لگی۔

"اب سنو۔۔۔ آج سے تم کسی بھی پبلک پلیس پہ جاؤ یہ تینوں نمبرز شہنا، مینا اور روبینا کے نام سے لکھ کر آنا اور یہی کام میں بھی کروں گی، پھر دیکھنا جب اپنے جیسوں سے واسطہ پڑے گا تو ان کی عقل کیسے ٹھکانے آئے گی۔ کان کو ہاتھ لگائیں گے، کسی بھی لڑکی کو تنگ کرنے سے پہلے۔" سائرہ نے سارا منصوبہ ربیعہ کے سامنے رکھ دیا، جو کہ اسے بھی بے حد پسند آیا۔

"تو پھر آج سے نہیں سائرہ، ابھی سے۔" ربیعہ نے بیگ سے پین نکال کر اسی وقت دیواروں پہ لکھتے ہوئے کہا۔ ان کا کالج پرائیویٹ تھا۔ لڑکے لڑکیاں دونوں ہی پڑھتے تھے۔ تو امکان تھا کہ جلد یہ نمبرز لڑکوں میں مقبولیت حاصل کر لیں گے۔

پھر یہ سلسلہ رکا نہیں۔ انہوں نے کالج وین کے دروازوں، کھڑکیوں تک پہ نمبر لکھ ڈالے۔ یہاں تک کہ جو لڑکیاں بسوں میں گھر جاتیں انہیں بھی یہ نمبر بسوں کی سیٹوں کے پیچھے اور کھڑکیوں وغیرہ پہ لکھنے کے لیے دے ڈالے۔

"اب پتا چلے گا ان لفنگوں کو کس لڑکی سے پنگا لیا تھا انہوں نے۔" رات سونے سے پہلے ربیعہ نے سارے فضول میسجز ڈیلیٹ کرتے ہوئے دل ہی دل میں کہا۔

☼ ☼ ☼

دن چڑھ چکا تھا مگر دلاور ابھی بھی نیند کی وادیوں میں غرق تھا۔ سرہانے پڑا موبائل وقفے وقفے سے بج رہا تھا۔ ابا حضور کو جب صاحبزادے کی گھر میں موجودگی کا علم ہوا تو نیند میں خلل ڈالنے کے ارادے سے دلاور کے کمرے میں قدم رکھا۔ مسلسل بجتے موبائل نے سب سے پہلے انہیں اپنی جانب متوجہ کیا۔ ایک قہر آلود نظر صاحبزادے پہ ڈال کر کال ریسیو کرلی۔ اس سے قبل کے کچھ کہتے مخاطب نے بڑی بے تابی سے پوچھا۔

"ہیلو شمینا! کیسی ہو؟ سو تو نہیں رہی تھیں کہیں میں نے تمہیں ڈسٹرب تو نہیں کردیا۔" ابا نے غصے سے لائن کاٹی اور طیش کے عالم میں اپنی چپل اتار کر لگے دلاور کی خاطر تواضع کرنے۔ اس اچانک افتاد پر دلاور ہڑبڑا کر اٹھا۔ تشدد کی وجہ دریافت کرنی چاہی مگر ابا حضور نے بغیر کچھ سنے اس کے جرم کی پورے گھر میں منادی کرادی۔

"برخوردار اتنے بگڑ چکے کہ اب لڑکی بن کر لڑکوں سے گفتگو کرتے ہیں۔ ان کا یہ عمل لڑکوں کو بے راہ روی پر مائل کر رہا ہے۔" اس جرم کا سن کر والدہ صاحبہ منہ پر دوپٹا رکھ کر ہکا بکا رہ گئیں۔ سزا کے طور پر دلاور سے اس کا موبائل چھین لیا گیا۔ دلاور اس الزام پر حیران اور سزا کا سن کر پریشان ہو کر رہ گیا۔

اسد نہا کر نکلا ہی تھا کہ چھوٹی بہن مینا کی آواز کان میں پڑی تو وہ چونک گیا۔

"اماں بھائی کے دوست بڑے ہی عجیب ہیں۔ کہہ رہے تھے کہ کیسی ہو مینا؟ ہم سے دوستی کرلو مزے میں رہو گی۔" مینا جھجکتے ہوئے کچن میں کھڑی اماں سے کہہ رہی تھی۔

"ہائے اللہ! کون کم بخت تھا یہ، نام بتا ذرا، ایسی خبر لوں گی کہ چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا۔" اماں تو مینا کی بات سنتے ہی بھڑک اٹھیں۔

"نام نہیں پتا اماں، انجان نمبر سے کال آئی تھی بھائی کے موبائل پر۔" مینا دھیمے سے بولی۔

"وہ کس نے کہا تھا تجھے اس کا موبائل اٹھانے کو۔" اماں کو اب مینا پہ غصہ آرہا تھا۔

"اماں بھائی نہارہے تھے۔ ان کا موبائل کب سے بجا جارہا تھا، تو انہوں نے آواز دے کر کہا تھا مجھے اٹھانے کو۔" مینا اب ڈری سہمی اپنی صفائی بیان کررہی تھی۔

"پوچھتی ہوں اس سے۔ پتا نہیں کیسے کیسے لڑکوں سے دوستی کر بیٹھا ہے یہ لڑکا۔" اماں زیر لب بڑبڑائیں۔

اسد خود حیران تھا کہ ایسا کون سا دوست ہے اس کا جو اس کی بہن سے اس طرح غیر اخلاقی باتیں کررہا تھا۔ اس کا خون کھولنے لگا۔ موبائل جاکر چیک کیا تو کال لسٹ انجان نمبروں سے بھری پڑی تھی، جسے دیکھ کر وہ مخمصے میں پڑ گیا۔

حیدر آباد سے خالہ جان اپنی بیٹی حرا کے ساتھ آئی ہوئی تھیں۔ وہی حرا جو اس کے دل میں بستی تھی اور اس دفعہ خاص مقصد سے یعنی حرا اور طارق کا رشتہ جوڑنے کی نیت سے آئی تھیں۔ سو طارق میاں کی خوشی دیدنی تھی۔ مگر بیزہ غرق ہو ان میسجز کا جو اسے صبح سے موصول ہورہے تھے۔ جس میں اسے وینا کے نام سے پکار کر کافی واہیات باتیں کہی جارہی تھیں۔ لاکھ غصہ دکھایا مگر میسج کرنے والا مستقل مزاجی سے میسج کیے جارہے تھا۔

"بیٹا تمہیں حرا سے رشتہ کرنے پر کوئی اعتراض تو نہیں نا۔" اماں اور خالہ اسے گھیرے بیٹھی پوچھ رہی تھیں۔

"تو بھئی! معاف کرو مجھے۔" ہائے رے بد قسمتی طارق میاں کی جس سوال کا جواب ان کا رواں رواں ہاں میں دے رہا تھا۔ فضول میسجز کے چکر میں بے دھیانی میں انکار کر گئے۔

"ارے کیا بول رہا ہے نامراد، ہوش میں تو ہے؟" اماں کا دل دھک سے رہ گیا، خالہ کا رنگ زرد پڑ گیا اور پردے کی اوٹ سے جھانکتی حرا کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔

"کیا ہوا اماں، ایسا کیا کہہ دیا میں نے۔" موصوف ابھی بھی انجان، جھنجلائے ہوئے بولے۔ ساتھ میں

مسلسل موبائل بھی بجا جارہا تھا۔ اماں نے مشکوک تو ہونا ہی تھا، خالہ بھی مشکوک سی اٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئیں۔ تب کہیں جاکر طارق میاں کو معاملے کی سنگینی کا احساس ہوا۔

"کیا ہوا ہے اماں۔ خالہ کیوں ایسے چلی گئیں اور تو کیوں مجھے ایسے گھور رہی ہے۔"

"اب ہوش آیا تجھے، کس کلموہی کے ساتھ لگا ہوا ہے اتنی دیر سے۔" اماں کی مشکل نظروں نے طارق کو مزید بدحواس کردیا۔

"کسی کے ساتھ نہیں اماں، بتاؤ تو ہوا کیا ہے۔" اماں کی خشمگیں نظریں اسے خطرے کا احساس دلا رہی تھیں۔

"ارے میں کیا بتاؤں، تو بتا! کیوں انکار کیا حرا کے رشتے سے؟" اماں نے طارق کے ہاتھوں کے توتے اڑا دیے۔

"میں نے کب۔" لفظ منہ میں ہی رہ گئے، پھر تو سارا دن طارق کا گھر والوں سے معافی مانگتے اور مناتے گزرا۔ بڑی مشکل سے گھر والے حرا سے دوبارہ رشتہ کرنے پر راضی ہوئے۔

☼ ☼ ☼

دسمبر کی آخری سرد شام میں وہ تینوں اپنی مخصوص جگہ پر تین مرد تین کہانیاں کی تفسیر بنے اپنا اپنا دکھڑا سنا رہے تھے۔

"یار بڑا برا ہوا ہے میرے ساتھ، قسم سے ابا نے اتنا مارا آج، ابھی تک جسم دکھ رہا ہے۔" دلاور اپنے زخم سہلاتا بولا۔

"تجھے تو جسم پر چوٹ لگی نا، میری تو غیرت ہی نشانہ بن گئی یار۔ جانے کون کمینہ تھا جو میری بہن کا نام لے کر چھیڑ رہا تھا۔" اسد کو بھی اپنا غم یاد آیا۔

"ہائے میری تو دل کی دنیا ہی اجڑتے اجڑتے بچی، جانے کس بات کی سزا ملی ہے ہمیں۔" طارق بھی نوحہ کناں تھا۔

"یار ہم بھی تو ایسے ہی دوسروں کی عزتوں کو تنگ کرتے تھے۔ یقیناً اسی کی سزا ملی ہے ہمیں۔" دلاور نادم سا بولا۔

"ہاں یار بڑا غلط کرتے تھے ہم، میں تو توبہ کرتا ہوں اب ان حرکتوں سے۔" اسد بھی پشیمان تھا۔

"ہاں یار! میں بھی معافی مانگتا ہوں اپنے رب سے۔ آج سے ہر خاتون کی عزت کروں گا۔" طارق بھی شرمندہ تھا۔

بات بہت سادہ سی ہے۔ انسان کو تب تک اپنے ظلم و زیادتی کا احساس نہیں ہوپاتا جب تک وہ خود اس کا شکار نہ ہو۔ ان تینوں کی عقل بھی تب ٹھکانے آئی جب ان کے ساتھ نہلے پہ دہلا ہوا۔ سال کے آخری دن، سورج ان کی نادانیاں و کوتاہیاں سمیت غروب ہوچکا تھا اور نئے سال کی صبح ان کے نئے عہد کے ساتھ طلوع ہونے کو بے تاب تھی۔

مصباح علی

جھلملاتا ہوا شفاف سا پانی تھا۔ جس کی سطح پر سارس نے لہرا کر پنجہ مارا۔ بل کھاتے پانی میں دائرے بننے لگے۔ سارس نے اپنے نازک پنکھ پھیلا کر کچھ دائروں کو ڈھک لیا تھا لیکن اس کے جسم میں بجلی بھری ہوئی تھی۔ وہ مست' شرارتی سے موڈ میں تھا۔ جھومتی تیلی گردن اس کے احساسات کی الف لیلوی داستان بنی تھی۔ وہ اڑنے لگا۔ اس کی اڑان تیرتے بادلوں کو چھونے لگی۔ وہ تیز ہوا کو دھکیلتا گھنے درختوں سے بہت اوپر تھا۔ مست دھیمی آواز کے ساتھ ہوا کے سینے پر تخت جمائے بہت اوپر۔۔۔ دھک' دھن' تھک' تھا' تھیا' تھیا۔ اس کا نازک سا تراشیدہ سراپا بجلی بنا گھوم رہا تھا' دلکش' دلنشین' خوب صورت' عنبرین۔ اس کے خوب صورت لمبے مرمری پاؤں ادا سے لہرا کر دائیں' بائیں ہوئے۔ کیا لچک تھی دبلے لمبے جسم میں جیسے مچلتی ہوئی رانی ہو۔ اس کی بھری شاخ جیسی لمبی باہیں موجوں کی طرح تیر رہی تھیں جیسے سورج کی پہلی شعاع دھیرے دھیرے زمین پہ اتر رہی ہو۔ اس کی صندلی انگلیاں لہراتی ہوئی سب کی نگاہوں میں جادو بھر رہی تھیں' اس کی جھومتی گردن' ابھرتی ہنسلی کی ہڈی' کاجل سے سنوری سیاہ نرگسی آنکھیں کسی ساحرہ سے کم نہ تھیں۔ مسکراتے ہوئے کھلے سے عنابی رسیلے ہونٹ ایک دوسرے پر ثبت تھے۔ مگر پھر بھی اس کے تھرکتے پاؤں۔ لچکیلی کمر پر لہراتی لمبی چوٹی جس میں موتیے کے پھول ماہرانہ گوندھے تھے' اس کے کان کا جھولتا بالا' چمکتا لونگ اور غازے سے بھرا اک نقش تصویر سے تصور میں لے جا رہا تھا۔ وہ خمار انگلیاں کیے ایسے گھوم رہی تھی جیسے کائنات کسی غیر مرئی چیز کے گرد چکرا رہی ہو۔ وہ اپنے محور سے ہٹی نہیں تھی۔ اس کی گھیر دار بلو فراک کسی تنبو کی طرح تنی تھی۔ وہ سراپا محورِ رقص تھی۔ چمکتے اسٹیج پر فوکس لائٹ میں بلو فراک پر جڑے سفید نگ کسی جگنو کی طرح لشکارہ مارتے۔ تالیوں کی گونج سے انجان بنی وہ صرف موسیقی کے تار' طبلے کی دھمک پر بنا ہونٹ کھولے بھنورے کی طرح چکرا رہی تھی۔ یک لخت وہ پنجے کے بل گھومی اور ایک گھٹنا ٹیکتے ہوئے مورنی کی طرح اٹھلاتے ہوئے بیٹھی اور اپنی ماہ جبیں جھکاتے ہوئے دوسرے پاؤں کا موسیا پنجہ بہت زور سے اسٹیج پر مارا گھنگروں کی دھمک نے فضا میں مسحور کن ارتعاش پیدا کیا تھا۔ سارا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ فوکس لائٹ ہٹائی گئی تھی۔ وہ ماہ تاباں رقاصہ وہاں سے جا چکی تھی۔ مگر بھیگے پونم کی اس شب میں مظہر شاہ کا دل بھی قطرہ' قطرہ بھیگ گیا۔ وہ کوئی دل پھینک شخص نہیں تھے۔ مگر جانے ماسنتوشہ میں ایسا کیا تھا وہ اسے جب بھی دیکھتے تو نیم وا ہونٹوں سے دیکھتے رہ جاتے۔ یہ سنگاپور کی سنٹرل آرٹ اکیڈمی کے زیرِ اہتمام کلچرل شو تھا۔ جس میں مختلف ممالک کے رقص پیش کیے گئے تھے۔ جاپان' تھائی لینڈ' ملائیشیا' سنگاپور اور بہت سی جگہوں کی ثقافت دکھائی گئی تھی۔ ماسنتوشہ سنگاپوری بہترین کلاسیکل رقاصوں میں سے تھی اور اس نے کتھک میں وہاں کی ثقافت پیش کی تھی۔

مظہر شاہ پہلے بھی کئی بار اس کی پرفارمنس دیکھ چکے تھے غالباً" پچھلے دو سال سے وہ سنگاپور باقاعدگی سے آ رہے تھے وہ ہر چار' پانچ ماہ بعد دو تین دن کے لیے وہاں آ جاتے تھے ظاہری بہانہ تو بزنس تھا مگر حقیقتاً" وہ صرف اور صرف اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے وہاں جاتے تھے کبھی اسے سنٹرل آرٹ اکیڈمی میں آتے جاتے دیکھ کر ہی واپس پلٹ جاتے تو کبھی پرفارمنس شو میں۔ وہ کتنا ہی خود کو سمجھاتے کہ یہ سب ٹھیک نہیں ہے' یہ ان کی شخصیت کو زیب نہیں دیتا۔ وہ کوئی نو عمر لڑکا نہیں ہے بلکہ پینتیس' چھتیس سالہ بھرپور مرد ہیں۔ مگر جب وہ خود کو سمجھاتے' سمجھاتے تھک جاتے' خود پر اختیار کھو دیتے تو پھر ادھر چلے آتے اور صرف چند لمحے اس کی جھلک دیکھ کر ہی واپس پلٹ جاتے لیکن اس بار ان کے پاؤں جکڑ سے گئے تھے' آخر انہوں نے شو کی انتظامیہ سے ماسنتوشہ کا کانٹیکٹ لیا تھا۔

وہ گرینڈ سنٹرل ہوٹل کے پانچویں فلور پر تھے اور گلاس ونڈو سے پھسلتی صبح کی کرنیں ان کے کمرے کو

مکمل ناول
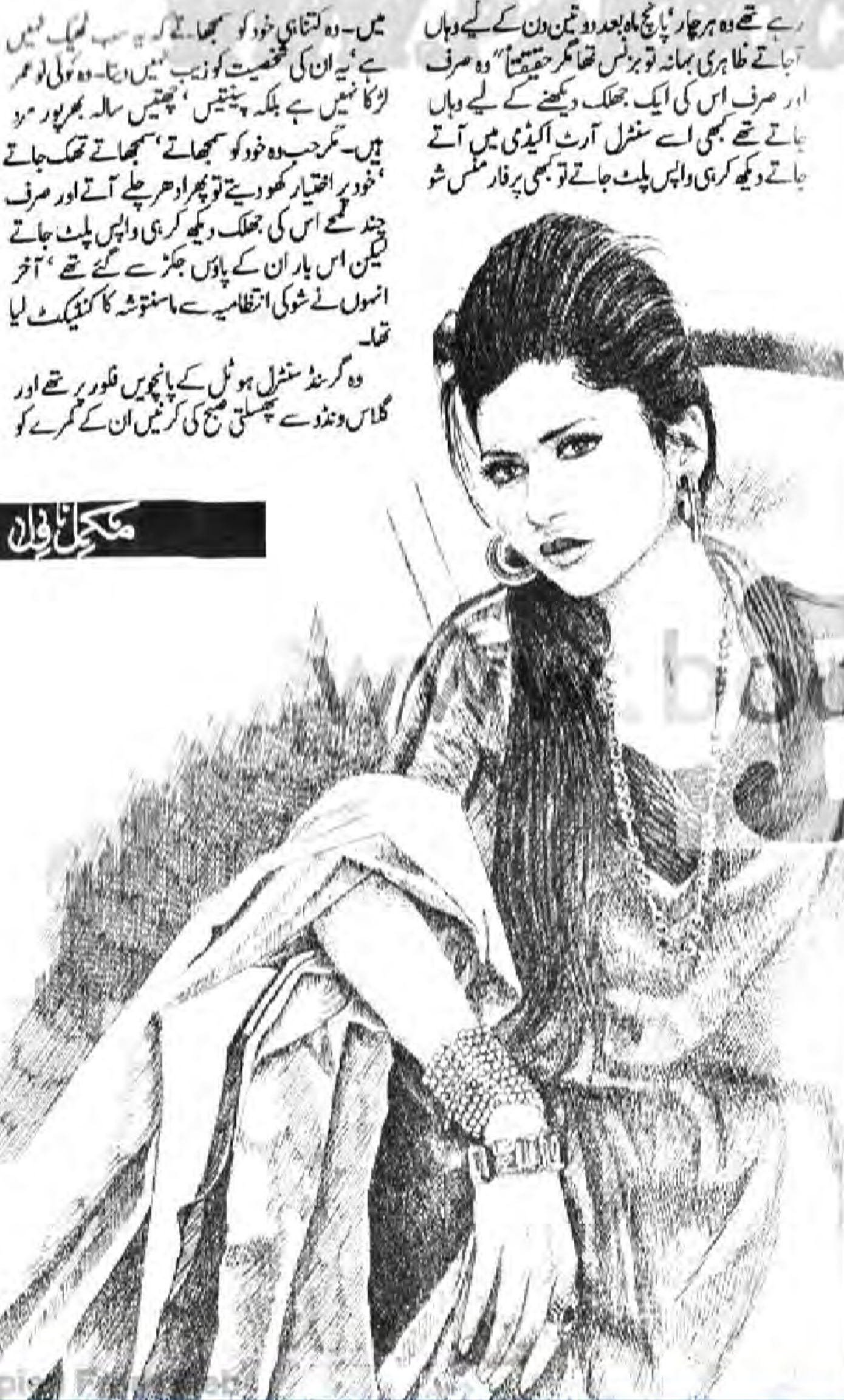
روشن کر رہی تھیں۔ انہوں نے تقریباً" ساری رات لفظوں کی ادھیڑبن میں گزاری تھی۔ کتنی بار اس کا نمبر بھی ملایا مگر لائن ملنے سے پہلے ہی ڈسکنکٹ کردیا۔ اب بھی وہ موبائل ہاتھ میں پکڑے بہت دیر سے کرسی پر جھول رہے تھے اور نگاہیں گلاس ونڈو کے پار صاف ستھری سنگاپوری سڑک پر تھیں۔ جہاں کوڑا کرکٹ تو کیا تھوکنا تک جرم تھا۔ وہاں صبح کی تازہ دم ٹریفک منظم سی رواں دواں تھی انہوں نے بے اختیاری میں ری ڈائل کا بٹن پش کیا اور چمکتی اسکرین پر سگنل کا دائرہ گھومنے لگا۔

"ہیلو... سلامت پاگی۔"

اس کے رقص سے زیادہ اس کا لہجہ طلسم میں بھیگا تھا۔ لگتا تھا وہ نیند کے اترتے خمار میں ہے' جب اس نے اپنی لوکل زبان میں انہیں ہیلو کے ساتھ صبح بخیر کہا تھا۔ ایسا ہرگز نہیں تھا کہ تطہیر شاہ کو اس کے الفاظ سمجھ نہ آئے تھے۔ غالباً" اکثر سنگاپور آنے کی بنا پر انہیں چند مقامی الفاظ سمجھ آجاتے تھے۔ مگر وہ اس وقت کال ملنے سے انتہائی کنفیوژ ہو گئے تھے۔ نہ صرف ان کی کرسی جھٹکے سی رکی تھی بلکہ لہجہ بھی بے ترتیب ہو گیا تھا۔

"ہا... ہا... ہیلو... آر یو... ما... استوشہ۔"

"یس... اینڈ یو۔" اس نے کسلمندی سے کروٹ بدلتے ہوئے جمائی روکی اور ٹائم پیس پر وقت دیکھا صبح کے نو بجے تھے اس نے بے زاری سے کمبل ہٹایا اور کشن سیدھا کیا اور بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ جمائی پر جمائی انگلیوں کی پشت سے روکتے ہوئے اس کی آنکھوں میں ہلکا سا پانی بھر گیا تھا اور اکتاہٹ دوسری طرف مکمل خاموشی سے ہونے لگی۔

"اینڈ یو مسٹر' ہو آر یو۔"

"آئی ایم... ایکچولی..." تطہیر شاہ کی اتنی ہکلاہٹ پر اس کی پیشانی مزید اکتاہٹ سے بھر گئی۔ گویا صبح ہی صبح اتنی کنفیوژن۔

"پلیز سپیک' ایم لیسننگ۔"

"یس۔" انہوں نے سر ہلاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ شاید وہ اپنا مکمل تعارف کروانا چاہتے تھے' اپنے بارے میں بہت کچھ جتانا چاہتے تھے۔ اتنے بااعتماد شخص کا حوصلہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ وہ "آئی۔ ایم" کے بعد کہہ سکے تو صرف اتنا۔

"آئی ایم سوری' دس از اونلی رانگ کال' ایم ایکسٹریملی سوری اگین۔" انہوں نے کہہ کر فون کھٹاک سے بند کردیا۔

وہ حیرت زدہ فون کو تک رہی تھی کہ یہ کون رانگ کال ہے جو نام' نمبر بھی جانتی ہے' کنفیوژسی ہکلاہٹ بھی اور اتنی بار سوری' وہ سوچتے ہو استہزائیہ سے کندھے اچکا کر رہ گئی تھی۔ مگر دوسری طرف ان کے دل کی دھڑکن اتنی تیز تھی کہ وہ کچھ بھی نہ کہہ پائے تھے۔ بلکہ سیل آف کرکے بیڈ پر اچھال دیا۔ انہیں اپنی اس مضحکہ خیز حرکت پر ندامت ہو رہی تھی اور غصہ بھی کہ اگر کال کر ہی لی تھی تو بات بھی کرلیتا۔ زیادہ سے زیادہ کیا کہتی' غصہ ہوتی اور کیا کرتی۔ مگر اب جو حالت ہے وہ تو شاید نہ ہوتی۔ وہ کمرے میں ٹہلتے ہوئے اپنی ہتھیلی پر گھونسے مار کر اپنا غصہ نکالتے رہے' وہ اب دوبارہ کال کرکے اپنی مزید بے وقوفی کا ثبوت دینا ہرگز نہیں چاہتے تھے۔ بلکہ ایک لمبی آہ بھر کے بیڈ پر آڑھے ترچھے نیم دراز ہو گئے۔ یقیناً" وہ یہی سوچ رہے تھے کہ اب انہیں یہاں سے چلے جانا چاہیے۔ بلکہ دوبارہ کبھی اس کے پیچھے نہیں آئیں گے' ایک نہ ہونی بات کے لیے کیوں خود کو' اپنے وقت کو برباد کر رہے ہیں' لیکن اب اور نہیں۔ وہ خود سے کیے عہد پر صرف دو دن ہی قائم رہ سکے تھے۔

☼ ☼ ☼

وہ ہوٹل ایگزٹ کی بیرونی سیڑھیوں پر لمحہ بھر رکے' انہوں نے ہاتھ پینٹ پاکٹس میں پھنساتے ہوئے ہونٹوں میں بھری ہوا خارج کی اور قدرے پنجوں کے بل اونچے ہو کر دوبارہ سیدھے کھڑے ہوئے گویا انہیں انتظار سے کوفت ہو رہی تھی۔ وہ دائیں جانب دیکھ رہے تھے۔ جہاں ایک ورکر گاڑی کے آگے بیٹھا کچھ

کر رہا تھا۔ گرینڈ سنٹرل ہوٹل کے سامنے کھلا سا سبز احاطہ تھا جس کے دائیں طرف چھوٹا سا اوپن شیڈ پارکنگ لاٹ تھا۔ ہوٹل کا اپنا پارکنگ لاٹ تو انڈر گراؤنڈ تھا لیکن اوپن میں ہوٹل اونر اور مینیجر کی ذاتی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ہوٹل میں سیاحوں کے لیے پک اینڈ ڈراپ اور ٹیکسی کی مکمل سہولت دستیاب تھی مگر تطہیر شاہ کے اکثر سنگاپور آنے اور اسی ہوٹل میں اسٹے کی وجہ سے مینیجر سے اچھی خاصی سلام دعا تھی۔

وہ تطہیر کو اپنی ذاتی گاڑی استعمال کے لیے دے دیتا تھا۔ انہیں یہاں آئے تقریباً" تین دن ہو چکے تھے مگر ابھی تک گاڑی کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی وہ قلیل شو میں ٹیکسی پر ہی گئے تھے۔ مگر آج انہوں نے پہلے ہی مینیجر کو بتایا تھا کہ انہیں گاڑی تیار کروا دیں' شاید انہیں ایک دو جگہ جانا تھا اور پھر گھر والوں کے لیے شاپنگ بھی کرنا تھی۔ سنگاپور میں اکثر نمبر پلیٹ کے ساتھ ڈرائیور کا نام بھی انگریزی میں درج کروانا گڈ مینرز سمجھا جاتا تھا۔ اسی لیے مینیجر نے ایک نمبر پلیٹ تطہیر شاہ کے نام سے بنوا کر رکھی ہوئی تھی۔ اب بھی مینیجر کا ملازم پلیٹ بدل رہا تھا۔ جس سے تطہیر شاہ کو کوفت ہو رہی تھی۔ کیوں کہ مینیجر نے انہیں کہا تھا۔ آپ چلیں' گاڑی تیار ہے' مگر وہاں تو ابھی پلیٹ ہی بدلی جا رہی تھی۔ ملازم پلیٹ بدل کر ہاتھ جھاڑتا ہوا کھڑا ہوا اور ہاتھ سے انہیں آنے کا اشارہ کیا تھا۔

"اوکے..." وہ اپنی سن گلاسز درست کرتے ہوئے تیز قدموں سے اس کی جانب بڑھے تھے۔

"السو ریڈی سر۔" ملازم نے بونٹ بجا کر جتلایا تھا۔

"تھینک یو۔"

انہوں نے والٹ سے چند سنگاپوری ڈالر بطور ٹپ اس کی جانب بڑھائے' جنہیں دیکھ کر اس لڑکے کی آنکھیں شکریہ سے جگمگا اٹھیں۔ وہ اس کا شانہ تھپتھپا کر' دروازہ کھول کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ انہوں نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اپنا سیل ڈیش بورڈ پر رکھا۔ اس ایک لمحے نے ہی عجیب احساس میں آلیا تھا۔ وہ گیئر پر ہاتھ رکھے چند لمحے موبائل کو تکتے رہے اور پھر بے اختیار ہی موبائل اٹھالیا ان کا خود سے کیا ہر عہد ٹوٹنے لگا تھا۔ غالباً" ان دو دنوں میں انہوں نے خود سے کتنا عہد کیا تھا کہ اب وہ اسے کبھی فون نہیں کریں گے' کبھی اس کے پیچھے نہیں جائیں گے بلکہ جلد از جلد یہاں سے واپس چلے جائیں گے پھر کبھی نہ آنے کے لیے کیوں کہ یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے' کسی طرح زیب نہیں دیتا کہ وہ اس کا ساتھ چاہیں یا اس کی خواہش کریں' لیکن اس کمزور لمحے کی گرفت نے ہر عہد توڑ دیا اور اس کی آواز کے گزشتہ لمس نے دوبارہ انہیں بہتا ہوا پانی کر دیا۔ رابطے کی دوسری گھنٹی آتے ہی فون کا ڈسکنکٹ ہونا' انہیں اپنے منہ پر ندامت کا طمانچہ محسوس ہوا تھا۔ وہ ہونٹ بھینچے تیزی سے گاڑی ہوٹل سے باہر لے گئے۔ ٹریفک کو تیزی سے کراس کرتے ہوئے وہ شرمندگی سے منہ کھولے ہولے ہولے سانس لے رہے تھے گویا ان کا ایپریشن اچانک کسی غلطی کی طرح پڑا تھا۔ وہ ابھی شرمندگی کے حصار میں تھے۔ جب سیل پر ٹیکسٹ ٹون بجی۔ روشن اسکرین پر لکھا تھا۔

" Now' I am busy
I Call you back "

بہتے ہوئے پانی میں ہلچل سی مچ گئی تھی۔ انہوں نے کوئی پانچویں بار ٹیکسٹ پڑھا تھا۔ ہر بار وہ پہلے سے زیادہ حیرت میں آجاتے' ہلکی ہلکی موسیقی میں ان کی انگلیاں اسٹیئرنگ وہیل پر تھرکنے لگی تھیں اک خوش گوار حیرت تھی۔

"کیا وہ مجھے جانتی ہے... پر کیسے؟ اس نے کیا سمجھ کر مجھے ٹیکسٹ کیا' ہے ہی میرا نمبر اس کے کسی جاننے والے سے ملتا ہو یا پھر غلطی سے میرے نمبر پر سینڈ ہو گیا ہو۔" سوچوں کے بھنور نے تھرکتی انگلیوں کی گرفت اسٹیئرنگ پر جما دی۔ "اگر غلطی ہے' تو بہت خوب صورت غلطی ہے۔" ان کی مسکان گہری ہونے لگی تھی۔

وہ غلط فہمی و خوش فہمی کی ڈور ہاتھ پر لپیٹتے ہوئے ہوٹل سے

بہت دور ایک پارک کے قریب رک گئے۔ گیٹ کے قریب ہی خوب صورت ریسپشن پر ایک انڈونیشن میوزیکل بینڈ کھڑا پرفام کر رہا تھا اس کے گرد سیاحوں کا ہجوم تھا۔ بینڈ کے کچھ پیچھے پارک کے اندر بل کھاتی سڑک کے ایک جانب اونچا سا فوارہ نصب تھا جس کے اوپر بڑے بڑے سرخ شیروں کا جوڑا تعمیر تھا۔ وہ دونوں شیر ایک دوجے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے آمنے سامنے کھڑے تھے۔ ان کے منہ سے پانی کی دودھیا دھار بہت اونچی جا کر ان کی پشت سے ہوتی ہوئی کرسٹل کی سلیب پر گر رہی تھی۔ سلیب کے نیچے رنگ برنگی لائٹس لگی تھیں، جن کی روشنی سلیب سے منعکس ہو کر پانی بھرے تالاب میں دھنک بکھیر رہی تھیں۔ میوزیکل ڈرم کی مدہم آواز اور پانی میں اتری دھنک، یقیناً" یہاں سیاحوں کے لیے فسوں خیز ماحول تھا۔ تطہیر شاہ جیبوں میں ہاتھ ڈالے دھیرے دھیرے چلتے اس ماحول کا حصہ بن گئے۔ ویسے تو سنگاپور کے تقریباً" ہر چوراہے یا پارک میں پتھر کے شیر نصب تھے یا تو یہاں کے لوگ بہت خونخوار تھے یا پھر طاقت ور، مگر کسی شیر کے مجسمے نے اس طرح سے انہیں اپیل نہیں کیا تھا جس طرح اس جوڑی نے اردگرد کی ہر چیز بھلا دی تھی۔ اگر وہ چونکے تھے تو اپنے موبائل کی تھرتھراہٹ پر۔ وہ چند لمحے اسکرین کو دیکھتے رہے پھر بٹن پُش کر کے بے اختیار ہی منہ سے نکلا تھا۔

" I can't believe this "

ان کی اتنی بے یقینی پر ماسنتوشہ کا بھرپور قہقہہ چھوٹ گیا۔

" WhyMr....can't I call you back "

" NoNoNo only I am surprised' just surprised "

بے شک کہ وہ اسی کے خیال میں کھوئے ہوئے تھے، اور "نو نو" کی تکرار کرتے ہوئے یقین چاہ رہے تھے جس پر وہ مزید ہنس پڑی تھی۔

"حالانکہ مسٹر! آپ کو بالکل حیران نہیں ہونا چاہیے تھا، میں نے خود آپ کو کال بیک ٹائپ کیا تھا۔

غالباً" وہ ایک آرٹ کالج کی سیکنڈ شفٹ میں رقص کی کلاس لیتی تھی اور جب تطہیر شاہ نے اسے کال کی وہ وہاں ہی تھی۔ اس نے بات کرنے کے بجائے کال بیک ٹائپ کیا تھا اس کی اتنی خالص اردو میں یاددہانی کروانے پر ان کی حیرانگی سوا ہو گئی۔

"آپ اردو بول سکتی ہیں...؟"

"جی۔ سمجھ اور لکھ بھی سکتی ہوں۔" وہ پھر مسکرائی تھی۔ "ایکچوئلی مجھے آپ کے لہجے سے اندازہ ہوا تھا آپ کسی انڈین علاقے سے ہیں۔"

اس کے میٹھے سے انداز پر تطہیر شاہ کو کچھ حوصلہ ہوا تھا اور وہ چلتے ہوئے چند اسٹیپ چڑھ کر تالاب کے گرد بنی ماربل کی نیلی دیوار پر بیٹھ گئے۔ اب شیروں کا جوڑا ان کی پیٹھ پر تھا نہ تو ان کے پانی پھینکنے کے انداز میں فرق آیا تھا اور نہ ہی اک دوجے کو دیکھنے میں، مگر تطہیر شاہ کے خفیف سی گردن موڑ کر دیکھنے پر انہیں ایسے لگا جیسے وہ اک دوجے کو دیکھ کر مسکرا بھی رہے ہوں۔ یقیناً" وہ خود بھی ان کے کھلنڈرے انداز سے مسکرائے تھے دھنک رنگ مزید بکھرے۔

"بالکل مس! میرا تعلق پاکستان راولپنڈی سے ہے۔"

"او تو مسٹر پاکستانی! آپ نے کیوں کال کی تھی، آئی تھنک آپ نے دو دن پہلے بھی کال کی تھی، جسے شاید آپ رانگ کال کا نام دے رہے تھے۔ کیوں میں نے صحیح پہچانا نا۔"

غالباً" وہ کال اسے اچھی طرح یاد تھی کہ رانگ کالز تو بار بار ڈسٹرب کرتی ہیں مگر وہ تو "سوری" کے بعد دوبارہ آج آئی تھی۔

"بس ایسے ہی میم... ایم سوری اگر آپ کو برا لگا۔" وہ اس کے لہجے پر صرف بھنوئیں سکیڑتے رہ گئے۔

"بس ایسے ہی تو کوئی کسی کو رانگ کال نہیں کرتا اور رہی برا لگنے کی بات تو مجھے صرف اتنا سا برا لگا تھا کہ آپ نے اگر کال کی ہے تو بات کیوں نہیں کی۔ صرف سوری کی تکرار کیوں، جس کام کے لیے آپ نے فون کیا ہے، بات کرنا چاہیے تھی۔" وہ بہت پراعتماد لہجے میں بول رہی تھی ایسے لگتا تھا ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے راکنگ چیئر پر ہل رہی ہو۔

"ایکچوئلی مس کچھ الفاظ ہوتے ہیں جنہیں آپ کوئی آواز نہیں پہنا سکتے، جن کے لیے شاید گویائی کا کوئی لبادہ نہیں ہوتا بس وہ آپ کے اندر بنتے ہیں اور ہونٹوں پر آنے سے پہلے ہی معدوم ہو جاتے ہیں۔"

"مطلب۔" شاید اس کی چیئر آگے ہو کر پنجوں کے وزن پر رکی تھی۔

"مطلب آپ کچھ بھی نکال لیں، مگر میں آپ سے یہ نہیں کہوں گا کہ میں آپ کا کوئی بہت بڑا فین ہوں یا پچھلے دو سال سے کسی دھواں دھار عشق میں مبتلا ہوں۔" وہ بات کرتے ہوئے لمحہ بھر رکے اور اسٹیپ اتر کر نیچے روش پر آ گئے۔ روش پر کئی درخت جھول رہے تھے۔ انہوں نے ایک پتوں والی چھوٹی سی شہنی توڑی اور پوروں میں گھما کر پانی میں اچھال دی۔

"ماسنتوشہ جی! کچھ فیصلے ہوتے ہیں جو آپ کو خود بھی بہت مزاحیہ لگتے ہیں جو آپ سوچتے، سمجھتے کبھی نہیں کرتے مگر دل بے قرار آپ سے کرواتا ہے۔"

"اور دماغ" سوالوں سے وہ خاصی حاضر دماغ لگی تھی۔ ایسے لگا تھا جیسے وہ چیئر سے اٹھ گئی ہو اور دھیرے دھیرے کمرے میں ٹہل رہی ہو جیسے اس کے جواب کی منتظر ہو۔

"دماغ تو دل کی ضد ہوتا ہے نا، ہر بات میں لاجیک ڈھونڈتا ہے، مگر دل دل تو نازک سا ہوتا ہے، بہت خوب صورتی سے بنا، بہت خوب صورت رنگ سے بھرا، بے اختیار دھڑکتا..." وہ درختوں کے ٹھنڈے سائے تلے چلتے خاصی آگے نکل گئے تھے۔ ان کا لہجہ بہت ڈوبا ہوا تھا۔

"خوب صورت تو دماغ بھی ہوتا ہے مسٹر۔" اس نے ابھی تک ان کا نام نہیں پوچھا تھا بس گفتگو کا سلسلہ ایسے ہی چل پڑا تھا۔ "اور یقیناً" اس کا رنگ بھی بہت خوب صورت ہوتا ہے۔"

"یقیناً" میم! دماغ کا رنگ بھی خوب صورت ہوتا ہے مگر مقابلے پر اگر دل آ کر ٹھہر جائے تو دماغ بھلے کتنا ہی زور لگا لے، مگر کچھ بھلا ضرور لگنے لگے گا۔"

"آپ باتیں بہت خوب صورت کرتے ہیں۔" وہ اس کی فلاسفی سے محظوظ ہوتی ہوئی کمرے سے نکل کر ٹیرس پر آ گئی جہاں سے اردگرد کے صاف ستھرے فلیٹس اور پر رونق سڑک واضح نظر آ رہی تھی۔ وہ ٹیرس پر رکھے جھولے میں بیٹھ گئی اور باتیں کرتے ہوئے دھیرے، دھیرے جھولتی رہی۔ وہ بہت دیر ذو معنی یا پھر شاید بے معنی باتیں کرتے رہے تھے۔ جو بھی تھا، مگر ان کے لہجے میں اتنی طاقت ضرور تھی کہ وہ بھی فون بند کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس ایک ہی طویل کال میں ان دونوں کے درمیان اچھی خاصی آشنائی ہو گئی تھی۔ یہاں تک کہ تطہیر شاہ نے اسے ڈنر پر انوائٹ کیا تھا اور اس نے بھی انکار نہیں کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اذکا بیگم اپنے خاندانی رعب و طنطنہ کے ساتھ ابھی حویلی پہنچی تھیں۔ ان کی پیشانی پر تھکن اور ناگواری کے کچھ ملے جلے تاثرات سے تھے۔ وہ ایک ہفتے کے طویل عرس کی وجہ سے خاصی تھک گئی تھیں۔ صفر کے مہینے میں ان کے آباؤ اجداد کے مزاروں پر بہت بڑے پیمانے پر سالانہ عرس ہوتا تھا۔ جن میں خواتین کی حاضری ضروری ہوتی۔ بہت سے مریدنیاں ان سیدانیوں کے آگے پیچھے پھرتیں، دم کرواتیں، دعائیں منگواتیں، نذر نیاز لیتیں۔ وہ عرس میں شرکت کے پورے ایک ہفتے بعد اپنے میکے ڈھوک نگر سے آج واپس آئی تھیں۔ انہوں نے تمبو نما بڑی سی سرخ چادر ذرا سی سر سے سرکائی چادر بالوں سے پھسل کر ابھی شانوں تک آئی ہی تھی جب پیچھے کھڑی فردوس نے فوراً" پکڑی اور بہت احترام سے اتاری اور تہہ لگائی۔

"لگتا ہے بی بی جی آپ بہت تھک گئیں۔"

"ظاہر ہے تھکاوٹ تو ہونی ہی تھی۔" وہ اس کا

جواب دے کر آگے بڑھیں اور کاؤچ پر بیٹھ گئیں۔
"تم بتاؤ یہاں سب خیریت ہے۔" ان کی بازپرس پر وہ نہایت مستعد ہو گئی۔
"جی جی بی بی جی! ہم تو آپ کی غیر حاضری میں بھی آپ کو حاضر ہی جان کر کام کرتے ہیں۔" وہ سر جھکائے کھڑی تھی۔
"کوئی آیا گیا۔۔۔؟ کوئی فون وغیرہ؟" انہوں نے تھکن سے سر بیک پر ٹکالیا۔
"جی! وہ چھوٹے شاہ کا فون آیا تھا' آپ کا پوچھ رہے تھے میں نے عرس کا بتا۔۔۔" اس کی مزید تفصیل سے پہلے انہوں نے سر اٹھایا اور اس کی بات کاٹ دی۔
"اور بڑے شاہ کا۔" وہ چند لمحے فردوس کی خاموش جھکی نظروں کو دیکھے گئیں پھر استہزائیہ سا "ہونہہ" کہا جسے اسی خاموشی کی امید تھی۔ "اچھا' چھوٹے شاہ کو فون ملاؤ۔۔۔" انہوں نے اپنے سیل کی طرف دیکھتے ہوئے آرڈر دیا تھا جو بجلی کی تیزی میں اس نے پورا کر دیا۔ دوسری ٹون پر مشیب شاہ نے فون ریسیو کیا۔ فردوس نے فون اذکا بیگم کو تھما دیا۔ "ہیلو۔۔۔"
"جی ہیلو' السلام علیکم مما! کیسی ہیں آپ اور کب واپس آئیں۔"
مشیب شاہ نے ایک ہی سانس میں ان سے دو سوال کیے تھے۔ غالباً" جب اسے پتا چلا کہ وہ ماموں کے ہاں عرس میں گئیں ہوئی ہیں تو اس نے انہیں فون کرنا مناسب نہ سمجھا۔ ایک تو وہ مصروفیت کی بنا پر ہوں' ہاں میں بات کرتیں اور دوسرے وہ ایسی بات ضرور کر دیتی تھیں جس کی کڑواہٹ وہ کئی دن محسوس کرتا تھا' مگر اب انہوں نے خود بیٹے کو فون کیا تھا تو اسے خوشی فطری تھی۔
"وعلیکم السلام! بہت بے تاب لگ رہے ہو۔۔۔" انہوں نے مسکرا کر کہا اور قریب کھڑی فردوس کو اشارے سے ڈرائی فروٹ ٹرے اپنے نزدیک رکھنے کا کہا اور پھر اسے باہر جانے کا اشارہ کر دیا۔
"کیوں مما! میں آپ کی آواز سن کر بے تاب نہیں ہو سکتا۔"
"اچھا۔۔۔" اس کے معصومانہ انداز پر بھی اذکا بیگم نے "اچھا" خاصا چبا کر کہا جیسے اس کا مذاق اڑایا ہو۔ مشیب کو ان کا انداز اندر تک محسوس ہوا تھا۔ غالباً" وہ اپنے دوستوں کے ساتھ کامن روم میں بیٹھا تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ اس کے چہرے کی کوئی بدلتی لکیر کسی دوست پر عیاں ہو۔ وہ ان سے اشارتاً" ایکسکیوز کرتا باہر نکل کر گراؤنڈ میں آگیا۔ "اور سنائیں عرس کیسا رہا' سب ٹھیک ہو گیا۔"
"ظاہر ہے ٹھیک ہی ہونا تھا' بلکہ فرسٹ کلاس ہوا' عام سے لوگوں کی شرکت نہ شرکت سے وہاں کوئی فرق نہیں پڑتا' آخر اتنے بڑے بزرگوں کی نظر عنایت ہے۔" وہ منقہ اور کاجو چن چن کر منہ میں اچھالتے ہوئے خوب جتلا کر بولی تھیں۔ ان کے جتانے کی اہم وجہ ان باپ بیٹے کا وہاں نہ جانا تھا۔ ان دونوں کو ہی اس قسم کی تقریبات پسند نہیں تھیں جہاں لوگ انہیں معتبر بنا کر ان کے گھٹنے چومتے ہوں۔ بہانے کے طور پر عین ان دنوں بیٹے کے پیپرز شروع ہو جاتے اور باپ کی اہم بزنس میٹنگ' جس پر اذکا بیگم اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا کر رہ جاتیں۔ اب بھی ان کی غیر حاضری محسوس ضرور ہوئی تھی' مگر اپنے لفظوں سے حسب معمول ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔ مشیب شاہ گراؤنڈ کی ڈھلوان اتر کر کالج سے باہر جانے والی سڑک پر آگیا تھا' سڑک کے گرد لگے جنگلے کے ساتھ اونچی اونچی کیاریاں بنی تھیں وہ ان ہی کیاریوں کی ایک دیوار پر ٹک گیا۔
"مما! بابا جان کیسے ہیں اور کیا آگئے ادھر سے۔" باپ کے استفسار پر انہوں نے عجیب سا منہ بنایا تھا یا شاید منقہ کا سخت بیج دانتوں کے درمیان آکر انہیں بدمزا کر گیا تھا۔
"میں کیا بتاؤں کہ کیسا ہے وہ' میرے سے زیادہ تو تمہارے پاس معلومات ہوتی ہیں' تم ہی سے رابطے میں رہتا ہے۔" ان کے لہجے کی کڑواہٹ وہ آہستہ آہستہ حلق میں اتارنے لگا۔
"نہیں مما' میں کچھ دنوں سے ایگزیمز میں بزی تھا اور وہ بھی یقیناً" اپنی میٹنگ میں الجھے ہوں گے' مجھ

سے بھی رابطہ نہیں ہوا ان کا۔" اس کے منمناتے انداز پر وہ طنزاً" ہنسی تھیں جیسے اس نے ناممکن بات کی ہو۔
"اچھا تم سے رابطہ نہیں ہوا' تم کہتے ہو تو مان لیتی ہوں' ویسے یقین آنے والی بات ہے نہیں۔"
"میں سچ کہہ رہا ہوں مما' میں جھوٹ کیوں بولوں گا۔" بولتے ہوئے مشیب شاہ کی نظر دور اڑتے پنچھی پر تھی' جو تنہا بہت دیر سے اڑتا ہوا' قلابازیاں لگاتے ہوئے خلا میں گم ہو گیا تھا۔
"تم جھوٹ نہیں بولتے' وہ بلواتا ہے تم سے۔" اذکا بیگم نے اسے ڈپٹا تھا۔
"آپ کیوں اتنا نیگیٹو سوچتی ہیں' بابا نے کبھی آپ کے خلاف کوئی بات نہیں کی' نہ کبھی کوئی بات آپ سے چھپانے کو کہا ہے' پھر بھی آپ ہمیشہ انہیں غلط ہی سمجھتی ہیں۔"
"اور یہ سب تمہارے باپ نے تم سے کہا ہو گا کہ میں ہی غلط ہوں' اس کے بارے میں غلط سوچتی ہوں۔" انہوں نے ڈرائی فروٹ ٹرے غصے میں پرے ہٹائی۔ ان سے برداشت نہیں ہو رہا تھا کہ ان کا بیٹا ہر بات میں باپ کو ووٹ کرے وہ خاصے غصے میں آگئی تھیں۔
"میرے خلاف تمہارے اندر زہر بھرنے کے علاوہ اس شخص کو آتا ہی کیا ہے' صرف اس نے وہ جان کر تم سے ایسی باتیں کرتا ہے' بڑا مظلوم ہے نا۔۔۔ ہونہہ۔" وہ دانت جما کر بولیں۔ "صرف اس نے مجھے زک پہنچانے کے لیے تمہیں اتنی دور داخل کروایا' صرف میری ممتا کو آزمانے کے لیے تمہیں مجھ سے دور کیا ہے' لیکن مجھے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔۔۔" وہ جانے ابھی اور کیا کیا بولتیں' کیوں کہ وہ اکثر باتیں کرتے ہوئے خوامخواہ ہی غصے میں آجاتی تھیں ان کے تنفر بھرے لہجے کو مزید برداشت کرنے کی مشیب شاہ میں تاب نہیں رہی تھی۔ غالباً" تیز دھار اسے چیرتی ہوئی دل تک جا پہنچی تھی۔ اس نے سگنل کا بہانہ بنا کر فون ڈسکنکٹ کر دیا تھا۔ اک پنچھی تھا جو غوطہ لگا کر خلا سے باہر آگیا تھا وہ اڑتے بادلوں کی لپیٹ میں تھا' مگر اس کے چاروں اطراف گرد کی فضا تھی۔ گھٹن بڑھنے سے پہلے ہی اس کے پر تیز بارش نے دھو دیے تھے۔

☼ ☼ ☼

چودہ سالہ مشیب شاہ' اذکا بیگم اور تطہیر شاہ کی اکلوتی اولاد تھا۔ جہاں وہ تطہیر شاہ کے دل کی دھڑکن تھا۔ ان کی سب سے بڑی کمزوری وہاں اذکا بیگم اپنی سگی اور اکلوتی اولاد سے صرف اس لیے خار کھا جاتی تھیں کہ وہ تطہیر شاہ کا منظور نظر تھا' شاید انہیں تطہیر شاہ سے جڑی کوئی چیز بھی خاص پسند نہیں تھی حالانکہ تطہیر شاہ اور اذکا بیگم دونوں تایا' چچا زاد تھے' مگر پندرہ برسوں میں ان دونوں کے درمیان ذرا بھی ہم آہنگی نہ ہوئی تھی۔
اب سے تقریباً" پندرہ' سولہ سال پہلے تطہیر شاہ کی دو بہنوں کی شادی اذکا بیگم کے دو بھائیوں سے ہوئی تھی۔ ان کے خاندان میں وٹے سٹے کی شادی کا عام رواج تھا جسے وہ "آمن' سامن" کا رشتہ کہتے تھے۔ جب ان کی دو بہنوں کی شادی طے ہوئی تو بہنوں کے سسرال والوں نے رواج کے مطابق "سامن" میں اپنی بیٹی دینا چاہی۔ غالباً" تطہیر شاہ اس وقت یونیورسٹی میں تھے جب انہیں اچانک کال کر کے گھر بلایا گیا۔ نہ صرف فوراً" نکاح پڑھوایا گیا تھا بلکہ بہنوں کی رخصتی کے ساتھ اذکا بیگم کو بھی بیاہ کر حویلی لایا گیا تھا۔ ان کے خاندان میں اکثر شادیوں کے فیصلے اسی طرح اچانک ہوتے تھے۔ یہ تطہیر شاہ کے لیے کوئی انہونی بات نہیں تھی' شادی کے وقت ان کی عمر تقریباً" بیس برس تھی' اتنی کم عمر میں شادی کے تقاضے' ذمہ داریاں اور جذبات سب کچھ ان کے ذہن میں اتھل پتھل ہو گیا تھا۔
دلکش رنگ و نقوش اور نیم فربہی جسم کی مالک اذکا بیگم ان سے عمر میں صرف چار سال ہی بڑی تھیں' لیکن جوانی کی مضبوط شاخ کو چھوتے لمبے چوڑے اسمارٹ سے تطہیر شاہ کے ساتھ ظاہری طور پر اتنی بڑی

نہیں لگتی تھیں جتنا وہ اپنی فطرت سے ظاہر کرتی تھیں۔ تطہیر شاہ اس وقت چڑھتے شباب کے اس زینے پر تھے جس وقت انسان میں فطری تبدیلیاں آچکی ہوتی ہیں اور خود اعتمادی بحال ہونا شروع ہوتی ہے مگر ازکا بیگم اپنے حسن و رعب داب کے آگے کسی کو ٹھہرنے دیتیں تب نہ۔ انہیں اپنے آگے پیچھے پھرتیں، ہاتھ جوڑتیں گردن جھکائے گھٹنے سہلاتی مریدنیوں کی عادت تھی۔ وہ یہی چاہتی تھیں کہ ان کی اکڑی گردن کے آگے تطہیر شاہ بھی سر نہ اٹھا سکے بلکہ ان کے آگے پیچھے پھرتا ان کی جی حضوری میں لگا رہے۔ آخر ان کے "آستن سامن" میں اس کی دو بہنیں تھیں غالباً" اس لیے بھی ازکا کا پلڑا بھاری تھا۔ پھر خاندانی پیری پر ان کے والد وارث تھے شاید اسی لیے ان کا لب و لہجہ اطوار و انداز تطہیر شاہ کے سامنے زیادہ ہی زعم میں آجاتے، مگر تطہیر شاہ کی رگوں میں بھی اسی خاندان کا خون تھا، وہ بلاجواز کسی برتری کو ماننے والے نہیں تھے اور اک ان دیکھی ضد کی خلیج ان دونوں کے بیچ پنپنے لگی تھی۔ غالباً" اسی لیے ان کا رشتہ ازدواجی بندھن سے آگے ہو کر کبھی دوستی یا ذہنی ہم آہنگی تک نہ پہنچ سکا تھا اور ازدواجی بندھن بھی وہ جس میں حق و فرض صرف سر سے اتارے جارہے ہوں۔ اکثر ہی ان میں سرد سی جنگ چھڑی رہتی تھی۔

یہ شادی کے شروع دنوں کی بات ہے۔ وہ چمکتے لیپ ٹاپ کے آگے کتابیں اور فائلز بکھیرے بیڈ پر بیٹھے اپنی اسائنمنٹ تیار کررہے تھے، ان کا آخری سمسٹر چل رہا تھا ان کے برابر ہی زمانے بھر کی ناگواریت چہرے پر سجائے ازکا بیگم نیم دراز تھیں۔

"مجھے کل ڈاکٹر کے پاس جانا ہے۔" ان کی نگاہیں ٹی وی اسکرین پر تیزی سے بدلتے اشتہار پر تھیں۔

"ٹھیک ہے۔" انہوں نے لیپ پیڈ سے انگلی ہٹا کر کاغذ پر کچھ تیزی سے اتارتے ہوئے کہا۔ "میں ڈرائیور سے کہہ دوں گا۔ وہ گاڑی تیار رکھے گا۔ آپ فردوس کو ساتھ لے جائیے گا کل مجھے اسائنمنٹ جمع کروانی ہے۔"

"ڈرائیور اور فردوس کو میں خود بھی کہہ سکتی ہوں، تمہیں یہ جتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ میں تمہاری دست نگر ہوں۔" انہوں نے ایک ترچھی غصیلی نگاہ سے تطہیر شاہ کو دیکھا اور پھر چھوٹی ٹی وی اسکرین پر موڑ لیا۔

"پھر پریشانی کیا ہے۔" وہ اس کے لہجے کو خاطر میں لائے بغیر کتاب کے صفحے پلٹتے رہے۔

"مجھے تم لے کر جاؤ گے۔" ان کے اتنے حکمیہ انداز پر صفحہ پکڑے انگلیاں رک گئی تھیں۔ انہوں نے بھنویں اچکا کر انہیں دیکھا۔ وہ تنی گردن کے ساتھ فل والیم پر مووی دیکھنے میں منہمک تھیں۔ ان کے مغرورانہ انداز پر تاسف سے سوچا۔

"یقیناً" میں ہی بے وقوف ہوں، جو بے دھیانی میں اپنی مصروفیت جتا گیا، اب تو یقیناً" میرے ساتھ ہی جانا ہوگا، اگر میں خود سے کہہ دیتا تو یہ عورت کبھی میرے ساتھ نہ جاتی۔"

ازکا بیگم کی ضد کچھ ایسی ہی تھی۔ جب بھی تطہیر شاہ اپنی پڑھائی وغیرہ میں مصروف ہوتے یا بہت تھکے پریشان ہوتے تو ازکا کو اسی دن اپنا حق یاد آجاتا تھا اور اگر کبھی وہ مسرور ہوتے یا اسے دیکھ کر دل بہک جاتا تو ہمیشہ ہی ازکا بیگم کی یا تو طبیعت خراب ہوتی یا پھر شدید نیند کا غلبہ ہوتا تھا۔ جانے انہیں اتنی اذیت دے کر کیا ملتا تھا۔ تطہیر نے کئی بار احساس دلانے کی کوشش بھی کی تھی کہ وہ ایسا کیوں کرتی ہیں یا یہ کہ "مجھے تنگ کرکے آپ کو کیا ملتا ہے، یہ شادی کا فیصلہ میرا نہیں بلکہ بابا اور تایا جان کا تھا، اذیت دینی ہے تو انہیں دیں۔"

"تو تمہارا کیا خیال ہے میں جھوٹ بول رہی ہوں کہ مجھے نیند آرہی ہے اور پلیز اب تم بھی سو جاؤ۔" وہ خمار آلود نگاہوں سے انہیں دیکھ کر کروٹ بدل کر لیٹ جاتیں، جس پر وہ اندر تک سلگ جاتے اور اکثر تو نیند کی ٹیبلیٹ لے کر سو جاتے تھے، مگر چاہتے ہوئے بھی اپنی اس اذیت کا ذکر کبھی ماں باپ سے نہیں کیا تھا بلکہ خاموشی سے برداشت کرتے آرہے تھے۔ اب بھی

انہوں نے اس کی نفسیاتی برتری پر تاسف بھرا سانس کھینچا اور انگلیاں کی پیڈ پر چلاتے ہوئے دھیمے سے لہجے میں پوچھا تھا۔

"آپ ٹائم لے چکی ہیں؟" لہجے میں صرف استفسار ہی تھا، مگر وہ بدک گئیں۔

"کیوں؟ تمہارا کیا مطلب ہے میں اتنی بے وقوف ہوں، بغیر ٹائم لیے ہی چل پڑوں گی، اپنی چار جماعتوں کا مجھ پر رعب مت جمایا کرو، کہ تمہیں ہی سب عقل ہے ہونہہ۔"

ان کے تحقیر بھرے لہجے پر تطہیر شاہ کو غصہ تو بہت آیا تھا بلکہ اکثر ہی آتا تھا، مگر آج کل وہ تخلیق کے آخری مرحلوں سے گزر رہی تھیں تو وہ صرف ہونٹ چبا کر رہ گئے۔ انہوں نے شروع، شروع میں ایک دو بار اپنے محبت بھرے رویے سے اس ان دیکھی خلیج کو پاٹنے کی کوشش ضرور کی تھی، مگر ازکا بیگم جانے زعم کی کس مٹی سے بنی تھیں کہ ذرا جو ان کے لہجے و انداز میں تبدیلی آئی ہو۔ وہ ایسے ہی بات کرتی تھیں جیسے وہ ان کا شوہر نہیں بلکہ وہ بہنوں کے عوض قرض دار ہو۔ ان میں ایک بڑا کمپلیکس تعلیمی فرق بھی تھا۔ غالباً" تطہیر شاہ نے شادی کے بعد بھی تعلیم جاری رکھی تھی۔ وہ ماس کمیونی کیشن میں بی ایس آنرز کررہے تھے۔ ان کے خاندان میں خواتین کو میٹرک، ایف اے تک کی تعلیم گھر میں ہی دلوائی جاتی تھی اور مردوں میں بھی کوئی ایف اے، بی اے سے آگے نہیں پڑھا تھا، مگر تطہیر شاہ کا مزید پڑھنے کا شوق انہیں ڈراتا تھا۔ شاید خاندان میں زیادہ تعلیم یافتہ ہو کر مجھے نیچا دکھانے کی کوشش کرے گا۔

"گدی نشین سید مہتاب شاہ کی بیٹی کو اپنے آگے حقیر بنالے گا، باندی کی طرح انگلیوں پر نچالے گا، ہرگز نہیں میں عمر اور رتبے میں اس سے بڑی ہوں، اسے میرا احترام کرنا چاہیے۔" شاید اسی لیے بھی انہیں خاطر میں نہ لاتی تھیں بلکہ اپنا رعب منوانے کے لیے انہیں "تم" کہہ کر مخاطب کرتی تھیں حالانکہ وہ شروع سے ہی اسے بہت عزت سے مخاطب کرتے تھے۔

جس پر ازکا بیگم کی جانے کس حس کی تسکین ہوتی تھی۔ نہ صرف اپنی عزت کرنے پر بلکہ انہیں مختلف حیلے بہانوں سے تنگ کرکے کچھ اطمینان محسوس ہوتا تھا۔ اب بھی طبیعت بوجھل ہونے کے باوجود فل والیم پر مووی دیکھ رہی تھیں۔ وہ اتنے شور میں ڈسٹرب ضرور ہورہے تھے، مگر ایک بار بھی زبان سے نہیں کہا کیوں کہ جانتے تھے کہ پھر وہ ضد میں آجائیں گی۔

ضدی تو وہ بچپن سے تھیں، مگر مکمل فطرت اس وقت بنی جب تطہیر شاہ کی بہنوں کا رشتہ ان کے بھائیوں سے طے ہوا۔ ازکا کو جب ہی خدشہ ہوا تھا کہ "سامن" کے لیے انہیں ہی پیش کیا جائے گا۔ جب "سامن" میں ہی جانا ہے تو کیا ضروری تھا کہ بھائیوں کا رشتہ تطہیر کی بہنوں سے طے ہوتا، ماموں زاد بھی تو تھیں، مگر شادی کی وقت ان سے پسند تو کیا، مرضی تک نہیں پوچھی گئی اور ماں باپ کا زبردستی باندھا بندھن مزاج میں ضد کی کڑواہٹ گھول گیا۔ جانے تطہیر شاہ سے کون کون سی من گھڑت ضد تھی کہ معصوم سا پھول گود میں آنے پر ممتا کو جوش آیا ضرور تھا، مگر "تطہیر شاہ کی اولاد کو وہ گود میں کھلائیں، ہرگز نہیں۔" انہوں نے بچہ مکمل آیا کے سپرد کردیا تھا۔

تطہیر شاہ نے جب پہلی بار ننھے شاہ کو دیکھا۔ وہ حیرت سے گول مٹول کمبل میں لپٹے بچے کو گود میں لیے کھڑے تھے۔ کم سنی کی وجہ سے کسی خاص جذبے یا خوشی کا اظہار نہیں کرپائے تھے۔ البتہ ماں، باپ کو خوش دیکھ کر انہیں بھی شاید خوشی محسوس ہوئی تھی، لیکن چند ہی مہینوں میں بچے کے اچھلتے ہاتھ پاؤں، گونجتی قلقاریاں، چمکتی آنکھیں اور معصومانہ نرم مسکراہٹ پر جذبہ پدر جگمگا کر اظہار کرنے لگا۔ وہ اسے آیا سے لے کر اپنے کمرے میں آجاتے، گود میں اچھالتے ہوئے مختلف آوازیں نکالتے، اس کے سرخ ناک گال کو چھوتے اور ازکا بیگم کے قریب بیڈ پر لیٹا دیتے۔

"میرا خیال ہے اسے یہاں رہنا چاہیے۔"

"شہزادیوں اور کنیزوں میں فرق ہوتا ہے، اب میں

اس کے کام کرتی اچھی لگوں گی کیا؟" ازکا بیگم نے انگلی کی پور نرمی سے اس کے گال کو چھوتی' ماتھے پر پیار کیا اور پھر سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں۔ بے شک وہ منہ میں آیا بے تکا جملہ بول ضرور دیتی تھیں، مگر اپنے بچے کو خوش ہو کر ہی دیکھتی تھیں۔

"یہ آپ کی اولاد ہے۔ اس کے کاموں میں تو آپ کو عار محسوس نہیں کرنا چاہیے۔" وہ بھی کھیلتے مشیب کو دیکھتے ہوئے ان کے قریب ہی بیڈ پر بیٹھ گئے۔

"صرف میری؟ تمہاری بھی تو ہے۔" ازکا کی آواز میں یک لخت ہی درشتگی بھر گئی۔

"میں سمجھتا بھی ہوں۔" اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ جتا کر گول مٹول بچے کو اٹھا لیتے اور اپنے سینے سے لپٹا کر سیدھے لیٹ جاتے۔ ازکا نے چھ ماہ کے مشیب شاہ کو گود میں پیار سے اٹھایا اور جتاتی ہوئی باہر نکل گئیں۔

"میں بہت اچھی طرح اپنی ذمہ داریوں کو جانتی ہوں، مگر مجھے اچھا نہیں لگتا کیوں کی طرح بچے کی ناک پونچھنا' بے وقوفوں کی طرح گود میں اچھالتے پھرنا۔" وہ مشیب شاہ کو آیا کی گود میں ڈھیروں نصیحتیں کر کے دے آئیں کہ اسے کھلا پلا کر' صاف ستھرا کر کے سلا دے۔

اب ایسا بھی نہیں تھا کہ ان کی ممتا مشیب کی معصومانہ حرکتوں پر جاگی نہ تھی۔ وہ اسے ہمیشہ نرم ہاتھ لگاتی تھیں۔ جب پیار آتا تو والہانہ بوسے لیتیں۔ محبت بھری نظروں سے دیکھتی تھیں، مگر اک شاہانہ انداز میں' اک زعم بھرے احساس میں اور تطہیر شاہ کے سامنے زعم کے اندر بے نیازی بھی در آتی اور ان کے اسی زعم اور بے نیازی کا خطرہ تطہیر شاہ کو ہوا تھا کہ کہیں وہ ان کی اولاد میں منتقل نہ ہو جائے۔ غالباً" وہ خود بہت بارعب مگر منکسر شخصیت کے مالک تھے اور اپنے بیٹے کو بھی اپنے جیسا دیکھنا چاہتے تھے۔ ہر قسم کے احساس برتری سے بالاتر۔ اسی لیے انہوں نے اسے تقریباً" پانچ سال کی عمر میں ہی ایبٹ آباد کے بہترین اسکول میں داخل کروا دیا تھا۔ اس کے داخلے پر ازکا بیگم نے بہت رکاوٹیں ڈالیں مگر تطہیر شاہ کو بھی اپنی بات منوانا آتی تھی۔ وہ اسے ہر ویک اینڈ پر گھر لے آتے اور بہترین سا وقت اس کے ساتھ گزارتے۔ انہوں نے خود تو وقت اور قسمت کے ساتھ مصلحتاً" سمجھوتہ کر لیا تھا۔ تعلیم مکمل ہونے پر باپ کا کاروبار سنبھال لیا۔ ان کے والد اور تایا میں جب وراثتی تقسیم کا وقت آیا تو بڑے ہونے کی بنا پر گدی اور زمینداری تایا نے سنبھال لیا جو بعد میں ان کے بیٹوں میں مورث ہو گیا اور بڑے پیمانے پر اسکریپ' بحری جہازوں کا بزنس جو دوسرے ملکوں تک پھیلا ہوا تھا' وہ ان کے والد کے حصے میں آیا جواب تطہیر شاہ سنبھال رہے تھے۔

انہوں نے اپنی زندگی کو کنوئیں کے مینڈک کی طرح ڈھال لیا تھا۔ گھر' کاروبار اور ازکا بیگم کی مغرورانہ باتیں' ہاں البتہ کچھ اچھا وقت گزرتا تو وہ ان دنوں جب مشیب شاہ گھر آتا تھا۔ اس کا نام مشیب تطہیر شاہ نے رکھا تھا جس کا مطلب "اچھائیوں کا بدلہ دینے والا تھا" اور واقعی وہ "مشیب" ہی تھا۔ اپنے باپ کا بہترین اچھا دوست۔ وہ گھنٹوں کے حساب سے باتیں کرتے تھے اور ہر طرح کا مسئلہ شیئر کر لیتے تھے۔ وہ ماں کے عجیب سے رویے کو شدت سے محسوس کرتا تھا اور کئی بار باپ سے ذکر بھی کیا تھا' مگر وہ ہر بار پیار سے ٹال دیتے تھے۔

"تم اپنی اسٹڈیز پر دھیان دیا کرو یار! یہ سب تو ایسے ہی چلتا رہے گا۔" وہ شاید اپنے اور اس کے دھیان کو یونہی بٹاتے رہتے اگر سنگاپور میں ان کی نگاہ ستور شہ پر نہ جاتی۔

☼ ☼ ☼

وہ کاروباری سلسلے میں سنگاپور گئے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ یونیورسٹی کے زمانے کا بہترین دوست داؤد بھی تھا۔ داؤد آرٹ کے فن پاروں کا بہت دلدادہ تھا۔ وہاں کے ایک آرٹ سینٹر میں نمائش لگی ہوئی تھی۔ سینٹر کے سیکنڈ اور تھرڈ فلور کو آرٹ گیلری کی شکل دی گئی تھی۔ جبکہ فرسٹ فلور پر کوئی کلچرل شو لگا تھا۔ داؤد

تطہیر شاہ کو بھی اپنے ساتھ پینٹنگز دکھانے لے گئے۔

ان کی گاڑی آرٹ سینٹر کے سامنے رکی تھی کہ تطہیر شاہ کی نظر سینٹر سے نکلتی ایک دبلی پتلی سی لڑکی پر گئی جو بہت عام سے حلیے میں تھی۔ وہ بہت تیزی سے چلتی ہوئی باہر آ رہی تھی۔ اس لڑکی سے نسبتاً" کچھ کم عمر لڑکا' لڑکی نے اسے راستے میں احتراماً" روکا تھا اور وہ رک بھی گئی تھی۔ ان دونوں کے ہاتھ میں کوئی ڈائری وغیرہ تھی شاید اس پر وہ آٹو گراف لینا چاہتے تھے۔ اس نے مسکرا کر ان سے ڈائری لی اور کچھ لکھ کر لڑکی کے گال تھپتھپاتے ہوئے مسکرا کر اسے ڈائری لوٹا دی۔ وہ دونوں بھی شکریے کے ساتھ مسکرائے تھے۔ وہ بھی نگاہوں سے "کوئی بات نہیں" کا اشارہ کرتی تیزی سے باہر نکل آئی۔ اس کے لمبے سیاہ بال کھلے تھے جو ہوا چلنے سے قدرے آگے کو آ گئے۔ اس نے تیز تیز چلتے ہوئے کھلے بالوں کو ڈھیلے سے جوڑے کی شکل دی اور اپنی گاڑی میں آ کر بیٹھ گئی۔ وہ ان کے قریب سے ہی گاڑی نکال کر لے گئی یہ دیکھے بنا کہ کوئی اسے دیکھ کر حیرت میں ڈوبا کھڑا ہے۔

وہ عام سے حلیے کی لڑکی کہیں سے بھی رقاصہ نہ لگتی تھی اور نہ یہ گمان گزرتا تھا کہ وہ پرفام کر کے واپس جا رہی ہے' لیکن وہ عام سی لڑکی لمحے میں ہی تطہیر شاہ کے لیے خاص بن گئی تھی۔ کسی کے روکنے پر رک جانا یا مسکرا کر آٹو گراف دینا ذرا بھی بڑا احسان نہ تھا اور نہ ہی وہ دنیا کی پہلی یا آخری حسین لڑکی تھی مگر تطہیر شاہ کو جانے ایسا کیا لگا تھا کہ وہ گاڑی کا دروازہ پکڑے یہ تک بھول گئے کہ "وہ اندر بیٹھ رہے تھے یا باہر نکل رہے تھے۔" گاڑی کے پیچھے سے گھوم کر آتے داؤد مخل ہوئے تھے۔

"کیا ہوا' رک کیوں گئے۔"

"ہوں کچھ نہیں۔" وہ اس کی آواز پر چونک ہی گئے۔

"پھر چلو اندر۔" وہ تطہیر شاہ سے چند قدم آگے بڑھے تو وہ بھی گاڑی کا دروازہ بند کرتے ہوئے ان کے پیچھے چل دیے۔ گیلری بہت خوب صورتی سے سجائی گئی تھی۔ آرٹ کے بہترین فن پارے وہاں رکھے گئے تھے۔ داؤد تقریباً" ہر پینٹنگ کے پاس رک کر کچھ نہ کچھ تبصرہ ضرور کر رہا تھا۔ اور وہ "ہوں' ہاں" سے اس میں شامل تھے۔ ان کی نگاہوں کے سامنے صرف مسکراتا نرم سا چہرہ' اڑتے سیاہ ریشمی سے بال گھوم رہے تھے۔ ان کا نہ صرف وہ سارا دن گم صم گزرا تھا بلکہ رات بھی ہزار ذہن جھٹکنے کے باوجود شاداب کنول سا چہرہ' اڑتے سیاہ عنبریں گیسو اور رسیلی مسکان کے جھماکے ہوتے رہے تھے۔ دو دن بعد ان کی پاکستان واپسی تھی اور وہ جانے سے پہلے شام میں مشیب اور ازکا بیگم کے لیے شاپنگ کرنا چاہتے تھے۔ بے شک ازکا بیگم کو ان کی لائی چیزیں کبھی پسند نہیں آتی تھیں مگر وہ صرف اپنا فرض ادا کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور لے آتے تھے۔

☼ ☼ ☼

وہ ہوٹل کے ہال میں بیٹھے تیزی سے لنچ کر رہے تھے۔ تاکہ ذرا جلدی شاپنگ پر نکلیں اور جلدی فارغ ہوں۔ ان کی پشت کی جانب موجود ٹیبل پر تین خواتین بیٹھی تھیں۔ یقیناً" وہ بھی لنچ ہی کر رہی تھیں۔ ان کی نسوانی سرگوشیوں اور چمچے کانٹے کی آواز بہت مدھم تھی۔ اچانک ہی وہاں کچھ چیزیں گرنے کی آواز آئی۔ اس آواز میں کچھ نمایاں تھا تو وہ ایک نسوانی لبی سسکاری۔ جس پر تطہیر شاہ نے ذرا سی گردن پھیر کر پیچھے دیکھا تھا۔ ایک دبلی سی لڑکی کرسی پر بیٹھی' بیٹھی اپنے پاؤں کی طرف جھکی ہوئی تھی۔ اس کی گردن کی پشت پر بڑا بڑا سا ڈھیلا جوڑا لڑھک کر اس کے شانے پر ٹکا تھا۔ آگے کے بال قدرے چھوٹے تھے اور شاید جوڑے میں نہیں گوندھے گئے تھے۔ بلکہ کھلے چھوڑے گئے تھے۔ جو پھسل کر لٹوں کی صورت چہرے کے دونوں اطراف آئے ہوئے تھے۔ وہ جھکی ہوئی لڑکی اپنے پاؤں سہلا رہی تھی۔ اس کے قریب ہی شرمندہ سا کھڑا ویٹر نیپکن اٹھا کر اس کے پاؤں کی طرف بڑھا۔ غالباً" وہ کسی کا آرڈر کیا کھانا لے جا رہا تھا۔ جانے راستے میں کیا

رکاوٹ آگئی تھی یا کسی سے ٹکراؤ کا خطرہ ہوا تھا کہ اس کے ہاتھ کا بیلنس بگڑا اور سارا گرم کھانا اس لڑکی کے پاؤں پر گر گیا تھا۔ وہ مارے خوف کے آنکھیں پھاڑے اس لڑکی طرف سے شدید رد عمل کا منتظر تھا۔ اس نے ڈرتے' ڈرتے پلیٹ سے نیپکن اٹھایا یقیناً" اس کا پاؤں صاف کرنے کے لیے۔ مگر اس لڑکی نے وہ اس کے ہاتھ سے پکڑا اور خود اپنا پاؤں صاف کرنے لگی۔
تمام لوگوں کی گردنیں انہی کی ٹیبل پر مڑی تھیں۔ ایک دو اور ویٹرز بھی قریب کھڑے "سوری' سوری" کر رہے تھے۔ اس کی ساتھی خواتین غصے میں دانت پیسنے لگیں۔ شاید مینیجر تک بھی خبر ہو گئی تھی۔ تب ہی وہ تیزی سے آیا تھا۔ وہ اس سے معافی مانگنے کے ساتھ' ساتھ نہ صرف ویٹر کو غصے سے گھور رہا تھا بلکہ اچھا خاصا ڈانٹ رہا تھا۔ مگر وہ لڑکی جسے کہنا چاہیے تھا۔ "اندھے ہو' آنکھیں بند کر کے چلتے ہو' دماغ کام نہیں کرتا تمہارا' یا پھر ایک زوردار تھپڑ رسید کرتی۔ وہ اپنی میٹھی آواز میں۔
"اٹس اوکے۔ اٹس اوکے۔" کہتی اپنا پاؤں نیپکن سے صاف کر رہی تھی۔ ایک ویٹر بھاگ کر برن آئنٹمنٹ اٹھا لایا۔ اور اس کے سامنے پنجوں کے بل بیٹھتے ہوئے لگانے لگا۔ مگر وہ بھی اس نے اپنی پور پر لے لیا اور جلے حصے پر اچھی طرح لگایا تھا۔ اس کے نازک سے صاف ستھرے پاؤں پر جلنے کے سرخ نشان واضح نظر آ رہے تھے۔ پھر بھی اس کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ تھی۔ اور شرمندگی بھی محسوس کر رہی تھی کہ اس کی وجہ سے بے چارے غریب کو نہ صرف سب گھور رہے ہیں بلکہ ڈانٹ رہے ہیں اور ہو سکتا ہے سزا' تنخواہ کی کٹوتی میں ملے۔ اس نے خجالت دور کرنے کے لیے اپنا سر اوپر اٹھایا اور سیدھی ہو بیٹھی۔ غالباً" وہ مینیجر کے سامنے الزام اپنے سر لے رہی تھی کہ "غلطی اس کی ہے' اسی کا پاؤں قدرے آگے تھا' جس میں ویٹر الجھ گیا تھا۔ وہ معذرت خواہانہ انداز میں کہتی ہوئی کھڑی ہوئی۔ حالانکہ اس کی آنکھوں سے تکلیف کا اندازہ ہو رہا تھا۔ مگر وہ مسکرا کر باہر نکل گئی اس کی ساتھی خواتین بھی ساتھ تھیں۔ تطہیر شاہ کو صرف اس کے ملائم سے ہونٹ ملتے نظر آئے تھے یا پھر چہرے کے گرد بال۔ وہ تو وہی لڑکی تھی جو سینٹر کے باہر نظر آئی تھی۔ وہی ریشم سیاہ بال' چمکتی آنکھیں' مسکراتے ہونٹ وہ اپنے اگلے بال سمیٹتے ہوئے کب کی وہاں سے جا چکی تھی مگر آج پھر تطہیر شاہ کی دھڑکن رک گئی تھی۔
اسے لوگوں کی چہ میگوئیوں سے پتا چلا تھا کہ وہ سنگاپور کی مشہور کلاسیکل رقاصہ ماستوشہ ہے اور بعد میں مینیجر سے سرسری بازپرس پر تصدیق بھی ہو گئی کہ "رقاصہ ماستوشہ' یعنی کہ ایک ہندو لڑکی۔" انہوں نے کوئی ہزار بار خود کو سرزنش کی تھی۔ بار' بار ذہن کو جھٹکا تھا مگر وہ پھر بھی پوری جزئیات کے ساتھ آنکھ کے پردوں پر چپک گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

انہیں پاکستان آئے کئی ہفتے گزر گئے تھے۔ اپنے کاموں میں الجھ کر وہ اپنا دھیان بٹا لینا چاہتے تھے۔ مگر جانے کیا سحر تھا اس کی کالی سیاہ بڑی بڑی آنکھوں میں جو ایسے جگمگاتی تھیں جیسے شفاف دودھیا جھیل میں سیاہ بادل کے ٹکڑے کا عکس ٹھہر گیا ہو اور تطہیر شاہ جیسے مضبوط مرد کا دل اس جھیل میں اترتے' اترتے کہیں ڈوب جائے' جس سے نکلنے کا کوئی سہارا ہی نہ ہو' جیسے جھیل کا کوئی کنارہ ہی نہ ہو' بس گہرائی ہی گہرائی۔ ایسی حالت تو ان کی جوانی میں نہ ہوئی تھی جیسی اب تھی۔ وہ مخلوط اداروں میں پڑھے تھے۔ اور پھر یونیورسٹی میں ان کے ارد گرد بہت سی خوب صورت لڑکیاں تھیں۔ کتنی تو صرف ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے' صرف اک نگاہ خاص کی منتظر تھیں اور کتنی نے ان کی جانب قدم بھی بڑھائے تھے مگر انہیں کسی میں کشش محسوس نہ ہوئی تھی ان کے آفس میں خاصی پیاری بنی سنوری لڑکیاں آتی جاتی رہتی تھیں مگر کبھی کسی پر نگاہ غلط نہیں ڈالی تھی۔ ظاہر ہے ایک شادی شدہ شخص ایک بچے کے باپ تھے۔ مگر اب کیا ہو گیا تھا۔ ان کا بیگم مزاجاً" جیسی بھی تھیں لیکن ماستوشہ کے مقابلے میں خاصی خوب

صورت تھیں۔ تطہیر شاہ نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ کوئی عام سی لڑکی انہیں اتنا ڈسٹرب کر دے گی کہ وہ اپنی بیوی اور ان کی ہر بات کا اس سے لاشعوری موازنہ شروع کر دیں گے' اور لڑکی بھی وہ جو رقاصہ ہو' ایک مذہب غیر سے تعلق رکھنے والی ہو' ان کے دل و دماغ میں عجیب جنگ جاری تھی۔
"میں کون سا اسے اپنانے جا رہا ہوں' صرف اچھی لگی تھی۔" دل نے کسی بات کی تردید کی تھی۔
"پھر فضول میں اپنا وقت کیوں برباد کر رہے ہو۔" دماغ بار بار جھنجوڑ رہا تھا۔
"شاید اسے سوچنا اچھا لگتا ہے' کوئی سکون ملتا ہے۔"
"کیوں۔" دماغ دل کی باتوں میں آنے والا نہیں تھا لیکن دل کے پاس بڑی حجتیں تھیں۔
"کیوں' شاید کیوں کا تو میرے پاس جواب نہیں یا پھر شاید میں اس سے دوستی کرنا چاہتا ہوں' ملنا چاہتا ہوں اس سے' مجھے لگتا ہے اس کی آواز بہت خوب صورت ہو گی نرم ملائم' سکون آور بس وہی سننا چاہتا ہوں۔"
"ایک غیر عورت سے دوستی کرنا چاہتے ہو' اس کی آواز سے سکون لینا چاہتے ہو' تم جانتے بھی ہو اپنی خواہش کا مطلب' ایک غیر مذہب کی لڑکی' غیر کلچر سے آخر تک ہی کیا ہے۔"
"دوستی میں کلچر کب دیکھا جاتا ہے' سرحدیں کب نظر آتی ہیں' اور میں اپنی اخلاقی' مذہبی ویلیوز جانتا ہوں۔"
"پھر بھی؟" دماغ نے سرزنش کی تھی۔
"میں اتنا جانتا ہوں کہ مجھ میں اور اس میں کوئی مماثلت نہیں' لیکن میں تو صرف اور صرف۔۔۔" ان کے پاس اس "صرف" کی کوئی تاویل نہیں تھی۔ دماغ چاہے کتنا ہی بڑا سوچ سامنے کھڑا کر دیتا مگر دل ہر بار اس پہ نرم سی باڑ گرا کر سلا دیتا۔ تطہیر شاہ بھلے کتنے ہی مضبوط تھے مگر دل تو دل ہی تھا۔ ہر مذہب' رسم و رواج' فاصلوں کی قید و بند سے آزاد ہو کر صرف دھڑکتا رہتا تھا۔ کبھی بے ہنگم تو کبھی اتنا آہستہ کہ ان کی نسیں تک ڈوب جاتیں۔ وہ اپنی فیلنگز کسی سے شیئر کرنا چاہتے تھے مگر کس سے؟ اپنے بیٹے مشہب شاہ سے؟ لیکن وہ تو عمر کے ایسے حصے میں تھا کہ نہ تو اتنا چھوٹا کہ جو مرضی اس کے سامنے کہہ دو' وہ کچھ دیر سنتا اور پھر اپنے کھیل کود میں مشغول ہو جاتا اور نہ ہی اتنا بڑا تھا کہ باپ کی رہنمائی کرتا' اس کی فیلنگز کو سمجھتے ہوئے کوئی راستہ نکالتا۔ ہاں ایک داؤد تھا۔ مگر وہ اس سے بھی کہہ نہیں پا رہے تھے۔

☼ ☼ ☼
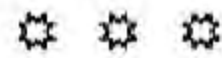
انہیں سنگاپور سے آئے پانچ' چھ ماہ ہو گئے تھے۔ وہ اپنے ایمپلائز سے میٹنگ کرنے کے بعد' میٹنگ روم میں اکیلے ہی بیٹھے تھے۔ وہ اپنے دونوں ہاتھوں میں سر تھامے ہوئے تھے۔ غالباً" انہیں بزنس کے سلسلے میں سنگاپور جانا تھا۔ بلکہ وہ کام تو ان کا کوئی بھی قابل ایمپلائز کر سکتا تھا مگر لاشعوری طور پر وہ خود جانا چاہ رہے تھے۔ مگر تنہائی میں دل و دماغ کی مسلسل جنگ میں آخر ہمت کر کے دماغ جیت ہی گیا تھا۔ اور وہ یہ فیصلہ کر ہی چکے تھے کہ اپنی جگہ کسے بھیجنا ہے۔ میٹنگ ختم ہوئے تقریباً" دو گھنٹے ہونے کو تھے۔ مگر وہ ایک ہی زاویے میں بیٹھے تھے۔
لکڑی کا میرون پالشڈ دروازہ ہلکی سی ناک کے بعد کھل گیا۔ ان سے ملنے داؤد آیا تھا۔ جو سیکریٹری سے پوچھ کر سیدھا ادھر ہی آ گیا۔ تطہیر شاہ نے دروازے کی آہٹ پر سر اٹھا کر دیکھا تو سیدھے ہو بیٹھے۔
"ہم۔ آؤ یار آؤ۔" وہ تپاک سے ملے تھے۔
"خیریت ہے تم یہاں اکیلے کیوں بیٹھے ہو۔" وہ سامنے لگے سفید لیدر کے صوفے پر بیٹھتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔
"ہاں یار! بس ایسے ہی' کچھ طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔" وہ گلاس میں پانی ڈال کر' اس کے برابر ہی بیٹھ گئے اور دھیرے' دھیرے پینے لگے۔
"تو گھر چلے جانا تھا' آرام کرتے جا کر۔" داؤد نے

ٹانگ پر ٹانگ چڑھائی۔

"ہاں بس ابھی کچھ ہی دیر میں جاتا ہوں" اور تم سناؤ یار کیسے آنا ہوا؟" انہوں نے خالی گلاس ٹیبل پر رکھ دیا۔

"یہاں سے گزر رہا تھا' سوچا تمہارے آفس کی چائے ہی پیتا چلوں۔" اس کی بے تکلف ڈیمانڈ پر انہوں نے سہلاتے ہوئے قہقہہ لگایا تھا اور اپنے پی۔ اے کو چائے کا آرڈر دے دیا۔ چائے کے دوران وہ اپنے بزنس پر باتیں کر رہے تھے جب داؤد نے بتایا کہ وہ اگلے ہفتے ملائیشیا جا رہے ہیں۔

"تم ملائیشیا جا رہے ہو۔" تطہیر شاہ کی آنکھیں پھیل گئیں۔

"ہاں۔ اس میں حیرت کی کیا بات ہے' تم بھی بنا لو پروگرام' یار کتنا عرصہ ہو گیا کہیں نہیں نکلے' انسان زندگی کی یکسانیت سے اکتا جاتا ہے' کچھ چینج ہو جائے گا۔"

وہ جو اتنی دیر تنہا بیٹھ کر مکمل فیصلہ کر چکے تھے کہ وہ اب کبھی سنگاپور' سائیڈ پر بھی نہیں جائیں گے۔ بلکہ بے قابو دل کو سمجھانے کی کوشش کریں گے مگر ایک ہی لمحے میں سب پر پانی پھر گیا اور دل کی تاویل دماغ کے عہد پر بھاری تھی۔ کہ وہ کون سا سنگاپور جا رہے ہیں وہ تو ملائیشیا جا رہے ہیں وہ بھی چند دن کے لیے۔ اب بے جا خواہش پر بزنس تو نہیں چھوڑ سکتا۔

وہ اگلے ہفتے داؤد کے ساتھ ملائیشیا چلے گئے تھے۔ ملائیشیا سے سنگاپور دور ہی کتنا تھا۔ اور ان کا تو وہاں کاروباری کام بھی تھا۔ ویسے بھی وہ کون سا کسی کو اغوا کرنے جا رہے تھے یا شادی کرنے جا رہے تھے۔ صرف ایک نظر' صرف ایک نظر دیکھ لینے میں حرج کیا ہے' ایک نظر تو شاید معاف ہی ہو۔ وہ دماغ کو کمزور دلیلوں سے راضی کر ہی چکے تھے۔ اور اگلے دن سنگاپور چلے گئے تھے۔ ماسنتوشہ کی آرٹ اکیڈمی کے بارے میں معلومات "غیر ارادتاً" وہ جمع کرتے رہتے تھے۔ انہوں نے اکیڈمی کا ایک دو وزٹ ہی کیا تھا جب وہ ماہ پارہ سراپا یقین یا گمان انہیں نظر آتی گئی۔ وہ "حقیقتاً" اسے چند لمحے دیکھ کر ہی واپس ہوٹل آ گئے تھے" اور خود کو خوب ڈپٹا" انہیں اپنا آپ انتہائی فضول لگا تھا اور پھر یہ ان کا معمول بن گیا تھا۔ جب وہ خود کو سمجھاتے سمجھاتے تین چار ماہ بمشکل گزار لیتے اور پھر اپنے اندر کی جنگ سے ہار جاتے تو وہاں چلے آتے صرف چند دن کے لیے ہی سہی۔ یہ خاموش آنکھ مچولی کا سلسلہ چلا تو تقریباً" دو سال کا عرصہ بیت گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

ان دنوں بھی وہ ظاہری طور پر بزنس کے سلسلے میں سنگاپور آئے ہوئے تھے۔ جب اس کے کلچر شو میں شرکت کی تھی۔ لوگ اس کے رقص کو داد دیتے رہے مگر تطہیر شاہ فوکس لائٹس ہٹ جانے کے بعد بھی اس کی آنکھوں' ہونٹوں اور بالوں میں کھوئے ہوئے تھے۔ اس بار انہوں نے ہمت کر کے اسے فون کیا تھا اور اس کی آواز کی چاشنی ان کی نیندوں میں گھل گئی تھی۔ بات کا سلسلہ چلا تو نوبت ڈنر تک آ گئی تھی۔ وہ یہ سوچ' سوچ کر ہی بہت خوش تھے کہ اس نے ڈنر کی دعوت قبول کی۔ آج وہ بہت تک سک سے تیار ہوئے تھے۔ ایش کلر کے ڈنر سوٹ میں ملبوس وہ بہت پروقار لگ رہے تھے۔ انہوں نے تیاری میں ڈیزائنڈ ٹائی سے لے کر کف لنکس' ٹائی پین' کلون یہاں تک کہ سن گلاسز تک کا خیال رکھا تھا۔ انہوں نے راستے سے سرخ پھولوں کی بوکے باسکٹ لی تھی۔ وہ "سہولی ڈے" فائیو اسٹار ہوٹل کا لاؤنج تھا۔ جہاں ان کا ٹیبل پہلے سے بک تھا۔

ماسنتوشہ کوئی خاص تیار نہیں تھی۔ بلکہ سادہ سی تھی۔ اس نے پنڈلی سے نیچے تک آتی عام سی نیلی لونگ اسکرٹ پر گلابی نیلی چیک دار گرم ٹاپ پہن رکھی تھی سر پر تنکوں سے بنا گلابی رنگ کا گول ہیٹ لے رکھا تھا۔ اس کا ڈھیلا سا جوڑا گردن کی پشت پر ہیٹ سے نیچے تھا کٹے ہوئے بال چہرے کے اطراف تھے۔ ہر طرح کی جیولری سے آزاد وجود لیے اس کے روبرو بیٹھی تھی۔ وہ کلچرل شو والی ماسنتوشہ سے یکسر مختلف لگ رہی تھی۔ دبلی' پتلی' بغیر میک اپ کے قدرے صاف رنگ پر اس کے تیکھے نقوش اور خاص کر اس کی سیاہ بڑی بڑی آنکھوں پر چلمن کی خم دار باڑ' کچھ تھا ان آنکھوں میں کچھ جادو تھا جو اسے سب سے مختلف بنا دیتا تھا۔ تطہیر شاہ نے ایک نگاہ حیرت اسے دیکھا اور سوچا۔

"بے شک وہ ازکا بیگم سے رنگ و روپ میں زیادہ حسین نہیں ہے' مگر پھر بھی دل کی دھڑکن کیوں ڈوب رہی ہے۔"

انہوں نے کھانے میں وہ سنگاپوری ڈیشز آرڈر کی تھیں جن میں گوشت کا استعمال نہیں تھا کم از کم گائے کے گوشت کا۔ یہ بات ماسنتوشہ نے محسوس بھی کی مگر کچھ بولی نہیں تھی۔ اور خاص کر یہ محسوس کیا تھا کہ وہ اپنی باتوں سے نہ تو اس کے فن کا دلدادہ لگ رہا تھا' نہ رقص کا قدردان' نہ حسن کی بے وجہ تعریف' اور نہ ہی مختلف ڈیشز اٹھا اٹھا کر تکلف نہ کرنے کی معذرت بلکہ بات کرتے ہوئے صرف ایک نگاہ اس کے چہرے پر ڈالتا اور اپنی پلیٹ پر متوجہ ہو جاتا۔ دیکھنے میں تو وہ خاصا اسمارٹ' وجیہہ تھا ہی مگر اس کی یہ ادا اسے باقی مردوں سے کم از کم مختلف لگی تھی۔ اور جب اس نے بتایا کہ وہ اسے گزشتہ دو سالوں سے جانتے ہیں مگر کبھی ہمت نہیں ہوئی بات کرنے کی تو ماسنتوشہ کا بے ساختہ قہقہہ چھوٹ گیا۔

"کیوں مسٹر! میں کیا اتنی خوفناک ہوں۔"

"نہیں' نہیں۔ ایکچولی کچھ اچھا سا نہیں لگا۔" وہ کہنیاں ٹیبل پر رکھے پیچھے کو خاصے ایزی بیٹھے تھے۔ اب بھی صرف انہوں نے بھنویں اچکا کر اک نگاہ ہی دیکھا تھا۔

"اچھا! تو پھر اچھا سا کب لگا' جو آپ نے صبح ہی صبح فون کھڑکا دیا تھا۔" اس کی بے ساختہ یاددہانی پر انہوں نے چونک کر اسے دیکھا' وہ خاصی محظوظ لگ رہی تھی۔ انہوں نے اس کے انداز پر مسکراتے ہوئے قدرے کہنیوں پر وزن بڑھایا اور آگے ہوئے تھے۔ ان کی مسکراہٹ خاصی خوب صورت تھی۔

"میں نے اس روز بھی آپ سے کہا تھا نا کچھ چیزیں بالکل آپ کے اختیار میں نہیں ہوتیں' بس اسی بے اختیاری میں آپ سے رابطہ ہو گیا تھا۔ بہرحال سوری" وہ ٹیبل پر رکھے دونوں ہاتھ معافی کے انداز میں جوڑتے ہوئے اس کی آنکھوں میں دیکھ رہے تھے۔

"سوری اگر آپ کو برا لگا۔"

"مجھے بالکل برا نہیں لگا' خاصے دلچسپ انسان معلوم ہوتے ہیں آپ! تطہیر شاہ۔"

وہ کھانا کھا چکی تھی' اپنا منہ نیپکن سے صاف کر کے' نیپکن پلیٹ میں رکھ دیا' غالباً" اچھے انسان تو وہ ظاہری طور پر لگ ہی رہے تھے مگر وہ اندر سے تب لگے جب انہوں نے اپنا مکمل تعارف کروایا' نا صرف اپنے بزنس' تعلیم' فیملی بلکہ یہ کہ نہ صرف وہ شادی شدہ اور ایک چودہ سالہ بچے کے باپ بھی ہیں۔ وہ انہیں دیکھتے ہوئے حیرت سے تکتی ہی رہ گئی۔ کہ یہ پہلا مرد ہی ہو گا جو بے اختیاری میں کسی لڑکی سے رابطہ کرتا ہے' ڈنر پر بلاتا ہے' اس کے حسن' فن سے کوئی سروکار نہیں' نظروں میں نہیں تولتا اور پھر پہلی ملاقات میں ہی اپنے بیوی بچے کا فخریہ اعتراف امیزنگ!۔

"آپ کو دیکھ کر لگتا نہیں کہ آپ اتنے بڑے بچے کے باپ ہیں۔"

"اچھا۔" وہ پھر خوب صورت سا مسکرائے تھے۔

"ویسے میرا خوب صورت سا بیٹا بہت ذہین اور میرا بہترین دوست بھی ہے۔"

انہیں اچھی طرح یاد تھا جب سنگاپور سے واپسی پر ان کی کیفیت عجیب سی رہتی' ازکا بیگم کو محسوس ہوتی یا نہیں مگر مشیب شاہ ان سے ضرور پوچھتا تھا۔ "بابا آپ کی طبیعت ٹھیک ہے نا' آپ چپ چپ کیوں ہیں۔"

"کچھ بھی نہیں میری جان!۔ میں تو بالکل فٹ ہوں۔" وہ اسے اپنے ساتھ زور سے بھینچتے ہوئے اس کا دھیان بٹا دیتے تھے۔ وہ "بابا۔ بابا۔" چلاتا رہ جاتا اور وہ والہانہ اس کے گالوں پر پیار کرتے۔ اب بھی اس کا ذکر ہونے پر چہرہ کھل گیا تھا۔ انہوں نے سوائے ازکا بیگم کے مزاج کے' اپنی فیملی اپنے بیٹے کے بارے میں

بہت سی باتیں کی تھیں۔ یہ ان کی خاصی اچھی ملاقات رہی تھی۔ یقیناً" تطہیر شاہ کی شخصیت ایسی نہیں تھی جسے ماسنتوشہ آسانی سے بھلا سکتی۔ ان کے نشست و برخاست کے مینرز' باڈی لینگویج ان کا وجہ سراپا بہت کچھ تھا۔ جس نے کہیں اسے بھی دستک دی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ تقریباً" ہفتے کے لیے وہاں گئے تھے۔ مگر کچھ کاروباری کام اٹکا تھا اور کچھ ان کا دل بھی اٹک ہی گیا تھا۔ انہیں وہاں گئے ہوئے بیس دن ہوگئے تھے۔ ان بیس دنوں میں ان کے گھر سے یا ہر دو تین ملاقاتیں ہوئی تھیں اور کئی ٹیلی فونک گفتگو۔ بہرحال ایک مسافر کو اپنا سفر مکمل کرنا ہی تھا اور پلٹ کر اپنے دیس ہی آنا تھا۔ وہ اپنی واپسی کی تیاری میں مگن تھے۔ جب منیب شاہ کا فون آگیا۔ وہ سلام دعا کے بعد گلوں پر اتر آیا۔

"آخر ایسا کون سا جہاز پھنس گیا ہے' جو کلیئر نہیں ہو رہا' آپ کو ایک مہینہ ہونے کو ہے۔"

"بس یار! میری پرسوں سیٹ کنفرم ہے۔" وہ پیار سے بولے تھے۔

"آپ کو پتا ہے؟ میں کتنا بور ہو رہا ہوں' ایک مہینہ ہوگیا ہے مجھے گھر گھرے ہوئے۔"

"میری جان! آپ گھر چلے جاتے' قدیر کو فون کرنا تھا وہ آپ کو گاڑی میں لے جاتا۔" اس کے شکوے پر وہ مزید لاڈ سے بولے تھے۔

"آپ کے بغیر میں وہاں کیا کرتا' مزید بور ہی ہوتا۔" وہ منہ پھلا کر رہ گیا۔

"کیا مطلب؟ وہاں آپ کی مما ہیں' وہ کتنا مس کر رہی ہوں گی آپ کو۔" باپ کی دلیل پر وہ استہزائیہ سا بولا۔ "وہ اور مس۔"

"ایسے نہیں کہتے منیب بیٹا' وہ آپ سے بہت پیار کرتی ہیں' ماں ہیں وہ آپ کی' ان سے زیادہ آپ کو کون چاہے گا۔"

"آپ" وہ فوراً" بولا۔

"یار تم بھی نا۔" ان کی آواز میں پیار بھری گھرکی تھی۔

"تو پھر وہ ایسی باتیں کیوں کرتی ہیں' جن سے میرا دل دکھے' ہمیشہ آپ کو انڈر اسٹیمیٹ کرتی ہیں' وہ جانتی بھی ہیں میں آپ کے خلاف نہیں سن سکتا' آئیڈیل ہیں آپ میرے' پھر بھی۔"

وہ اس کے احتجاج پر بس سانس بھر کر رہ گئے۔ غالباً" اس نے اپنی اور ماں کی پرانی ٹیلی فونک گفتگو باپ کو بتائی تھی جب بھی تطہیر شاہ نے اسے درگزر کرنے کا کہا تھا اور اب بھی وہ پیار سے اس کا دل صاف کرتے رہے' تاکہ اس کے ننھے دل میں کبھی کسی کے لیے بھی نفرت نہ آئے۔

انہوں نے بہت دیر اس سے بات کرنے کے بعد فون بند کیا ہی تھا جب ماسنتوشہ کی کال آگئی۔ وہ انہیں اپنے گھر ڈنر پر انوائیٹ کر رہی تھی۔ غالباً" وہ جانتی تھی کہ پرسوں ان کی واپسی ہے تو کیوں نہ ایک دعوت ہی کردی جائے۔ ویسے بھی اسے اندازہ ہوا تھا کہ تطہیر شاہ کو اس کے بارے میں کوئی غلط فہمی ہے' شاید اسی لیے ہوٹل کے بجائے گھر بلایا تھا۔

اس نے کھانے میں خاصا اہتمام کر رکھا تھا۔ اس نے اوون سے گرلڈ بیف کی ڈش نکالی' اس کی سائیڈ بدلی اور دوبارہ اوون میں رکھ کر ٹائمر سیٹ کیا تھا۔ اسٹو پر رکھی دیگچی سے حلیم نکال کر ڈونگے میں ڈال کر ہرے دھنیے' ہری مرچ اور ادرک سے گارنش کیا اور وہ بھی ڈھانپ کر اوون کے قریب سلیب پر رکھ دیا۔ جہاں پہلے سے ایک دو ڈونگے ڈھکے رکھے تھے۔ اب وہ تیزی سے سلیب پر پھیلاوا سمیٹنے لگی۔ اور پھر سلیب کو گیلے کپڑے سے رگڑ کر صاف کیا تھا۔ اتنے میں اوون کی بزر بجی۔ اس نے ہاتھوں پر نائلون کے سفید گلوز پہن رکھے تھے۔ ان پر اس نے ہیٹ پروف گلوز چڑھائے اور اوون کا دروازہ کھولا تھا۔ سارے کچن میں گرم مسالے اور بھنے گوشت کی سوندھی خوشبو پھیل گئی تھی۔ اس نے گرلڈ بیف کی ڈش سائیڈ پر کی اور حلیم' نرگسی کوفتے' مغلیائی پلاؤ کی ڈشز ترتیب وار اوون کی گرل

پر رکھیں۔ اب اس نے دروازہ بند کرکے ٹائم سیٹ نہیں کیا تھا۔ غالباً" وہ مہمان کی آمد پر ہی گرم کرنے تھے۔ وہ ہاتھوں سے گلوز اتارتے ہوئے مڑی تو کچن کی دیوار کے ساتھ کھڑے تطہیر شاہ کو دیکھ کر خاصی حیران ہوئی تھی۔ کہ وہ جانے کب سے کھڑے ہیں۔

وہ آج کوئی خاص تیار نہیں تھے بلکہ سادہ سی براؤن ڈریس پینٹ پر گرے اور اسکن دھاری دار سوئیٹر پہن رکھا تھا سوئیٹر کی آستین کلائیوں سے قدرے اونچی کر رکھی تھیں۔ وہ سینے پر ہاتھ لپیٹے ایک ٹک اسے ہی دیکھ رہے تھے۔ کتنی سادہ کتنی گھریلو لگ رہی تھی وہ۔ اس نے کاسنی پرنٹڈ پلازو پر ڈھیلی ڈھالی لمبی سرخ جرسی پہن رکھی تھی۔ بالوں کا ڈھیلا سا جوڑا گردن سے خاصا نیچے جھول رہا تھا۔ اس کے پاؤں میں کاٹن فر کے نرم سے جوتے تھے۔ وہ اپنے کام میں اتنی منہمک تھی کہ کسی دوسرے کی موجودگی کو محسوس ہی نہ کرسکی۔ حالانکہ جب وہ کچن میں آئی تھی تو ڈور بیل ہونے پر اس نے خود ذکریا کو آواز دے کر کہا تھا کہ "دروازے پر دیکھو کون ہے۔" سولہ سالہ ذکریا برابر فلیٹ میں رہتا تھا اور اکثر اس سے اردو تشریحات سیکھنے آجاتا تھا۔ اس نے مہمان کو کچن میں بھیجا اور خود اپنا کام کرنے لگا تھا۔ اور اب انہیں کھڑا دیکھ کر حیرانگی سے منہ کھلا رہ گیا۔

"آپ! آپ کب آئے۔"

"ابھی آیا ہوں۔" انہوں نے کندھے اچکائے۔ اور حیرت سے کھلی آنکھیں قدرے جھپکی تھیں' "آپ کیا سارے کام کرلیتی ہیں؟" آج اس نے اس کا گھریلو روپ دیکھا تھا' کتنی اچھی لگ رہی تھی اپنے کام خود کرتی ہوئی۔

"کام ہی کتنا ہوتا ہے۔" اس نے گلوز کھونٹی پر لٹکائے۔ "چلیں! آپ اندر سٹنگ روم میں بیٹھیں۔" وہ انہیں اندر لے جانا چاہ رہی تھی غالباً" وہاں طرح طرح کے مسالوں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

"آپ اپنا کام کمپلیٹ کرلیں' میں ایزی ہوں۔" وہ بہت فری انداز میں کہہ کر کچھ آگے ہوئے اور سلیب پر رکھی سیلڈ پلیٹ میں سے گاجر کا ٹکڑا اٹھا کر منہ میں ڈال لیا' ماسنتوشہ کو اس کا فری انداز بہت بھایا تھا۔

"میرا کام کمپلیٹ ہوگیا۔" اس نے اوون کا ٹائم سیٹ کیا اور ہاتھ جھاڑتے ہوئے مسکرائی وہ انہیں اندر لے آئی تھی۔

قرینے سے آراستہ سٹنگ روم جہاں مختلف ڈیکوریشن اور پھولوں کے علاوہ سامنے دیوار پر سرخ مخملیں قالین نما بڑا سا ٹکڑا لگا تھا جس پر کالے رنگ سے کعبہ شریف کی شبیہ اور سبز رنگ سے مسجد نبوی کا گنبد تھا۔ تطہیر شاہ کی نگاہ لمحہ بھر اس پر رکی پھر صوفے پر بیٹھ گئے۔ غالباً" وہ سوچ رہے تھے کہ وہ ڈیکوریشن کے طور پر لے آئی ہوگی یقیناً" وہ ان کے بارے میں جانتی نہیں ہوگی۔ وہ اس ڈیکوریشن پر تو اتنا نہ چونکے تھے جتنا کھانے کی ورائٹی نے حیران کردیا۔ کچھ ہی دیر بعد ماسنتوشہ نے کھانا لگایا تھا اور اس نے وہ مغلیائی ڈشز بنائی تھیں جن میں خاص طور پر بیف استعمال تھا۔

"آپ گوشت کھاتی ہیں۔" انہوں نے اس کے ہاتھ سے مغلیائی پلاؤ کی ڈش پکڑتے ہوئے سرسری سا پوچھا تھا۔

"کیوں نہیں۔" وہ ہنستے ہوئے کندھے اچکائے۔

"ایم سوری" انہوں نے اپنی پلیٹ میں چاول نکال کر ڈش اس کے قریب ہی رکھ دی۔ "میں میں نے سنا تھا۔ آپ کے دھرم میں۔" وہ اپنے چمچے میں چاول سمیٹ رہے تھے جب لفظ "دھرم" پر رک کر اور نگاہ چرا کر اسے دیکھا۔ یقیناً" کسی کے مذہب کو پوائنٹ آؤٹ کرنا نہایت ہی احمقانہ بات تھی۔ مگر ان کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی وہ زور سے ہنس پڑی تھی۔ انہوں نے پہلی بار اسے اتنے غور سے دیکھا تھا کہ ہنستے ہوئے اس کے بائیں گال پر بہت گہرا ڈمپل پڑتا تھا۔ جو اس کی آنکھوں سے بھی زیادہ پرکشش تھا۔

"ایکسکیوز می۔ کیا پوچھ سکتا ہوں' آپ ہنسی کیوں ہیں۔" "یقیناً" وہ اس کے اتنا ہنسنے پر جھینپ سے گئے تھے۔ وہ ہنستے ہوئے پہلے اثبات میں سرہلاتی رہی پھر

بہت سی باتیں کی تھیں۔ یہ ان کی خاصی اچھی ملاقات رہی تھی۔ یقیناً" تطہیر شاہ کی شخصیت ایسی نہیں تھی جسے ماستوشہ آسانی سے بھلا سکتی۔ ان کے نشست و برخاست کے مینرز' باڈی لینگویج ان کا وجہ سراپا بہت کچھ تھا۔ جس نے کہیں اسے بھی دستک دی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ تقریباً" ہفتے کے لیے وہاں گئے تھے۔ مگر کچھ کاروباری کام اٹکا تھا اور کچھ ان کا دل بھی اٹک ہی گیا تھا۔ انہیں وہاں گئے ہوئے بیس دن ہو گئے تھے۔ ان بیس دنوں میں ان کے گھر سے باہر دو تین ملاقاتیں ہوئی تھیں اور کئی ٹیلی فونک گفتگو۔ بہرحال ایک مسافر کو اپنا سفر مکمل کرنا ہی تھا اور پلٹ کر اپنے دیس ہی آنا تھا۔ وہ اپنی واپسی کی تیاری میں مگن تھے۔ جب منیب شاہ کا فون آگیا۔ وہ سلام دعا کے بعد گلوں پر اتر آیا۔

"آخر ایسا کون سا جہاز پھنس گیا ہے' جو کلیئر نہیں ہو رہا' آپ کو ایک مہینہ ہونے کو ہے۔"

"بس یار! میری پرسوں سیٹ کنفرم ہے۔" وہ پیار سے بولے تھے۔

"آپ کو پتا ہے؟ میں کتنا بور ہو رہا ہوں' ایک مہینہ ہو گیا ہے مجھے گھر گئے ہوئے۔"

"میری جان! آپ گھر چلے جاتے' قدیر کو فون کرنا تھا وہ آپ کو گاڑی میں لے جاتا۔" اس کے شکوے پر وہ مزید لاڈ سے بولے تھے۔

"آپ کے بغیر میں وہاں کیا کرتا' مزید بور ہی ہوتا۔" وہ منہ پھلا کر رہ گیا۔

"کیا مطلب؟ وہاں آپ کی مما ہیں' وہ کتنا مس کر رہی ہوں گی آپ کو۔" باپ کی دلیل پر وہ استہزائیہ سا بولا۔ "وہ اور مس۔"

"ایسے نہیں کہتے منیب بیٹا' وہ آپ سے بہت پیار کرتی ہیں' ماں ہیں وہ آپ کی' ان سے زیادہ آپ کو کون چاہے گا۔"

"آپ" وہ فوراً" بولا۔

"یار تم بھی نا۔" ان کی آواز میں پیار بھری گھرکی تھی۔

"تو پھر وہ ایسی باتیں کیوں کرتی ہیں' جن سے میرا دل دکھے' ہمیشہ آپ کو انڈر اسٹیمیٹ کرتی ہیں' وہ جانتی بھی ہیں میں آپ کے خلاف نہیں سن سکتا' آئیڈیل ہیں آپ میرے' پھر بھی۔"

وہ اس کے احتجاج پر بس سانس بھر کر رہ گئے۔ غالباً" اس نے اپنی اور ماں کی پرانی ٹیلی... گفتگو باپ کو بتائی تھی جب بھی تطہیر شاہ نے اسے درگزر کرنے کا کہا تھا اور اب بھی وہ پیار سے اس کا دل صاف کرتے رہے' تاکہ اس کے ننھے دل میں کبھی کسی کے لیے بھی نفرت نہ آئے۔

انہوں نے بہت دیر اس سے بات کرنے کے بعد فون بند کیا ہی تھا جب ماستوشہ کی کال آگئی۔ وہ اسے اپنے گھر ڈنر پر انوائیٹ کر رہی تھی۔ غالباً" وہ جانتی تھی کہ پرسوں ان کی واپسی ہے تو کیوں نہ ایک دعوت ہی کر دی جائے۔ ویسے بھی اسے اندازہ ہوا تھا کہ تطہیر شاہ کو اس کے بارے میں کوئی غلط فہمی ہے' شاید اسی لیے ہوٹل کے بجائے گھر بلایا تھا۔

اس نے کھانے میں خاصا اہتمام کر رکھا تھا۔ اس نے اوون سے گرلڈ بیف کی ڈش نکالی' اس کی سائیڈ بدلی اور دوبارہ اوون میں رکھ کر ٹائمر سیٹ کیا تھا۔ اسٹوو پر رکھی دیگچی سے حلیم نکال کر ڈونگے میں ڈال کر ہرے دھنیے' ہری مرچ اور ادرک سے گارنش کیا اور وہ بھی ڈھانپ کر اوون کے قریب سلیب پر رکھ دیا۔ جہاں پہلے سے ایک دو ڈونگے ڈھکے رکھے تھے۔ اب وہ تیزی سے سلیب پر پھیلاوا سمیٹنے لگی۔ اور پھر سلیب کو گیلے کپڑے سے رگڑ کر صاف کیا تھا۔ اتنے میں اوون کا بزر بجی۔ اس نے ہاتھوں پر نائلون کے سفید گلوز پہن رکھے تھے۔ ان پر اس نے ہیٹ پروف گلوز چڑھائے اور اوون کا دروازہ کھولا تھا۔ سارے کچن میں گرم مسالے اور بھنے گوشت کی سوندھی خوشبو پھیل گئی تھی۔ اس نے گرلڈ بیف کی ڈش سائیڈ پر کی اور حلیم' نرگسی کوفتے' مغلیائی پلاؤ کی ڈشز ترتیب وار اوون کی گرل پر رکھیں۔ اب اس نے دروازہ بند کر کے ٹائم سیٹ نہیں کیا تھا۔ غالباً" وہ مہمان کی آمد پر ہی گرم کرنے تھے۔ وہ ہاتھوں سے گلوز اتارتے ہوئے مڑی تو کچن کی دیوار کے ساتھ کھڑے تطہیر شاہ کو دیکھ کر خاصی حیران ہوئی تھی۔ کہ وہ جانے کب سے کھڑے ہیں۔

وہ آج کوئی خاص تیار نہیں تھے بلکہ سادہ سی براؤن ڈریس پینٹ پر کریم اور اسکن دھاری دار سوئیٹر پہن رکھا تھا سوئیٹر کی آستین کلائیوں سے قدرے اونچی کر رکھی تھیں۔ وہ سینے پر ہاتھ لپیٹے ایک ٹک اسے ہی دیکھ رہے تھے۔ کتنی سادہ کتنی گھریلو لگ رہی تھی وہ۔ اس نے کاسنی پرنٹڈ پلازو پر ڈھیلی ڈھالی لمبی سرخ جرسی پہن رکھی تھی۔ بالوں کا ڈھیلا سا جوڑا گردن سے خاصا نیچے جھول رہا تھا۔ اس کے پاؤں میں کاٹن فر کے نرم سے جوتے تھے۔ وہ اپنے کام میں اتنی منہمک تھی کہ کسی دوسرے کی موجودگی کو محسوس ہی نہ کر سکی۔ حالانکہ جب وہ کچن میں آئی تھی تو ڈور بیل ہونے پر اس نے خود زکریا کو آواز دے کر کہا تھا کہ "دروازے پر دیکھو کون ہے۔" سولہ سالہ زکریا برابر فلیٹ میں رہتا تھا اور اکثر اس سے اردو تشریحات سیکھنے آجاتا تھا۔ اس نے مہمان کو کچن میں بھیجا اور خود اپنا کام کرنے لگا تھا۔ اور اب انہیں کھڑا دیکھ کر حیرانگی سے منہ کھلا رہ گیا۔

"آپ! آپ کب آئے۔"

"ابھی آیا ہوں۔" انہوں نے کندھے اچکائے۔ اور حیرت سے کھلی آنکھیں قدرے جھپکی تھیں' "آپ کیا سارے کام کر لیتی ہیں؟" آج اس نے اس کا گھریلو روپ دیکھا تھا' کتنی اچھی لگ رہی تھی اپنے کام خود کرتی ہوئی۔

"کام ہی کتنا ہوتا ہے۔" اس نے گلوز کھونٹی پر لٹکائے۔ "چلیں! آپ انڈر سٹنگ روم میں بیٹھیں۔" وہ انہیں اندر لے جانا چاہ رہی تھی غالباً" وہاں طرح طرح کے مسالوں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

"آپ اپنا کام کمپلیٹ کرلیں' میں ایزی ہوں۔" وہ بہت فری انداز میں کہہ کر کچھ آگے ہوئے اور سلیب پر رکھی سیلڈ پلیٹ میں سے گاجر کا ٹکڑا اٹھا کر منہ میں ڈال لیا' ماستوشہ کو اس کا فری انداز بہت بھایا تھا۔

"میرا کام کمپلیٹ ہو گیا۔" اس نے اوون کا ٹائم سیٹ کیا اور ہاتھ جھاڑتے ہوئے مسکرائی وہ انہیں اندر لے آئی تھی۔

قرینے سے آراستہ سیٹنگ روم جہاں مختلف ڈیکوریشن اور پھولوں کے علاوہ سامنے دیوار پر سرخ مخملیں قالین نما بڑا سا ٹکڑا لگا تھا جس پر کالے رنگ سے کعبہ شریف کی شبیہ اور سبز رنگ سے مسجد نبوی کا گنبد تھا۔ تطہیر شاہ کی نگاہ لمحہ بھر اس پر رکی پھر صوفے پر بیٹھ گئے۔ غالباً" وہ سوچ رہے تھے کہ وہ ڈیکوریشن کے طور پر لے آئی ہوگی یقیناً" وہ ان کے بارے میں جانتی نہیں ہوگی۔ وہ اس ڈیکوریشن پر تو اتنا نہ چونکے تھے جتنا کھانے کی ورائٹی نے حیران کر دیا۔ کچھ ہی دیر بعد ماستوشہ نے کھانا لگایا تھا اور اس نے وہ مغلیائی ڈشز بنائی تھیں جن میں خاص طور پر بیف استعمال تھا۔

"آپ گوشت کھاتی ہیں۔" انہوں نے اس کے ہاتھ سے مغلیائی پلاؤ کی ڈش پکڑتے ہوئے سرسری سا پوچھا تھا۔

"کیوں نہیں۔" وہ ہنستے ہوئے کندھے اچکائے۔

"ایم سوری۔" انہوں نے اپنی پلیٹ میں چاول نکال کر ڈش اس کے قریب ہی رکھ دی۔ "میں نے سنا تھا۔ آپ کے دھرم میں۔" وہ اپنے چمچے میں چاول سمیٹ رہے تھے جب لفظ "دھرم" پر رک کے اور نگاہ چرا کر اسے دیکھا۔ یقیناً" کسی کے مذہب کو پوائنٹ آؤٹ کرنا نہایت ہی احمقانہ بات تھی۔ مگر ان کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی وہ زور سے ہنس پڑی تھی۔ انہوں نے پہلی بار اسے اتنے غور سے دیکھا تھا کہ ہنستے ہوئے اس کے بائیں گال پر بہت گہرا ڈمپل پڑتا تھا۔ جو اس کی آنکھوں سے بھی زیادہ پرکشش تھا۔

"ایکسکیوزمی۔ کیا پوچھ سکتا ہوں' آپ ہنسی کیوں ہیں۔" یقیناً" وہ اس کے اتنا ہنسنے پر جھینپ سے گئے تھے۔ وہ ہنستے ہوئے پہلے اثبات میں سرہلاتی رہی پھر

خود ہی بول پڑی۔

"مسٹر تطہیر شاہ! آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ الحمد للہ! میرے دھرم میں گائے کا گوشت بالکل حلال ہے۔" ان کا چمچہ والا ہاتھ منہ میں ہی رہ گیا اور آنکھیں حیرت سے کھل گئیں۔

"یقیناً" آپ بھی میرے نام کی وجہ سے کسی غلط فہمی کا شکار ہوگئے ہیں۔"

"جج۔ جی۔" انہوں نے چمچہ منہ سے نکال کر ایک لفظی جملہ بولا تھا۔ جس پر وہ پھر مسکرائی۔

"کوئی بات نہیں سر' اکثر لوگ ہو جاتے ہیں' ایکچولی آپ نے کوئی مذہب پر بات کی نہیں' میں نے بھی مناسب نہیں سمجھا' میرا اصل نام عنایا ہے' اور الحمدللہ میں مسلمان ہوں۔"

"پھر آپ نے ہندوانہ نام۔۔۔" وہ ابھی بھی حیرت میں تھے کہ "مسلمان اور نام؟" کیا فیشن کی دوڑ میں۔"

"دراصل میری استاد نے مجھے یہ نام گفٹ کیا تھا۔"

عنایا کی والدہ احمد آباد انڈیا سے تھیں اور والد سنگاپوری۔ عنایا کی دو بہنیں اور ایک بڑا بھائی تھا اور وہ سب سے چھوٹی تھی۔ اس کی پیدائش پر اس کی والدہ خاصی بیمار ہوگئی تھیں۔ بڑے بچے کم از کم اتنے بڑے تھے کہ اپنے چھوٹے' چھوٹے کام خود کر سکتے تھے اور باقی کام ان کے میاں کر لیتے تھے۔ لیکن بالکل نوزائیدہ بچی کو سنبھالنا قدرے مشکل تھا۔ اتنی آمدن نہیں تھی کہ مستقل کام والی رکھ سکتے اسی لیے عنایا کو اس کی نانی احمد آباد لے گئیں۔ انہوں نے بہت لاڈ سے اس کی پرورش کی تھی جب پانچ' چھ سال بعد وہ واپس سنگاپور گئی تو اکثر بیمار رہتی۔ نانی کو یاد کرکے روتی چلاتی تو پھر نانی اسے واپس لے گئیں۔ ان کے پڑوس سے اچھے تعلقات تھے۔ بے شک اس علاقے میں بیشتر مسلمان تھے مگر ہندو اور بدھ مت کی بھی اچھی خاصی تعداد تھی۔ اس وقت اس محلے میں تمام لوگوں کے روابط اچھے تھے بلا امتیاز اک دوجے کے گھر آتے جاتے تھے۔ ان کے برابر والا گھر ایک۔۔۔ بت پرست عورت کا تھا' اس کی چھوٹی سی بیٹی ماستوشہ عنایا کی ہم عمر تھی۔

پڑوسی اور ہم جماعت ہونے کی وجہ سے ان دونوں کے درمیان خوب دوستی تھی۔ وہ اکثر ایک دوسرے کے گھر بہت بہت دیر کھیلتی رہتی تھیں۔

ماستوشہ کی والدہ کلاسیکل رقاصہ تھی اور وہ اسے چھوٹی سی عمر میں ہی رقص سکھاتی تھی۔ عنایا جب اسے رقص کرتے دیکھتی تو کھیل چھوڑ کر اسی کی طرح گھومنے لگ جاتی۔ وہ اس وقت تقریباً "گیارہ' بارہ برس کی تھی جیسے ہی یہ بات نانی کے علم میں آئی تو انہوں نے اپنی عقل پر ماتم کیا کہ انہوں نے کیوں اپنی نواسی کو رقاصہ کی بچی سے دوستی گانٹھنے دی۔ پھر انہوں نے اس پر سختی کرنا شروع کردی نہ صرف ان کے گھر جانے سے روکا بلکہ اسکول میں بھی اکٹھے کھیلنے سے منع کردیا۔ لیکن عنایا اس وقت بچی تھی اور پھر اپنی قریبی سہیلی سے کیسے دور رہ سکتی تھی اس نے راہ نکال ہی لی تھی۔ غالباً" نانی خاصی بوڑھی تھیں۔ بڑے ماموں نوکری کے سلسلے میں اپنی فیملی سمیت وہاں شفٹ ہوگئے تھے گھر میں صرف نانی اور چھوٹے ماموں رہتے تھے۔ چھوٹے ماموں رات میں خاصی دیر سے آتے تھے۔ ایسے میں سارا دن اکیلی بچی کیا دل لگاتی۔ جب نانی کمر سیدھی کرنے کے بہانے لیٹتیں تو انہیں اونگھ کے ساتھ خراٹے بھی شروع ہو جاتے۔ بس ایسے میں ہی عنایا کی عید ہو جاتی۔ وہ دبے پاؤں ماستوشہ کے گھر چلی جاتی۔ اسے اچھی طرح یاد تھا ایک دوپہر نانی سوئی ہوئی تھیں وہ خاموشی سے اس کے گھر چلی گئی۔ اور کچھ ہی دیر بعد ان کے گھر نانی بھی پہنچ گئیں۔ غالباً" اس وقت ماستوشہ اپنی ماں سے رقص سیکھ رہی تھی اور وہ تھوڑی کے نیچے اپنی نازک ہتھیلی رکھے بیٹھی اسے گھومتے حسرت سے دیکھ رہی تھی۔ اس کا بھی دل چاہا وہ بھی اس کی طرح گھومے۔ پر نانی نے ناچنے سے سختی سے منع کیا ہوا تھا اور جس چیز پر سختی سے پابندی لگائی جائے اٹریکشن بھی اسی چیز میں لگتی ہے اور اس وقت عنایا کے لیے سب سے زیادہ اٹریکشن ماستوشہ کے گھومنے پر تھی۔ آخر وہ بھی اس کی نقل میں بازو لہراتی ہوئی اٹھی ہی تھی جب اس کی پشت پر زور دار

دھموکا لگا۔ وہ کرنٹ کھا کر مڑی تو نانی سے طمانچہ منہ پر۔ اس کے چودہ طبق روشن ہوگئے تھے۔

"کم بخت! میں تجھے سارے گھر میں ڈھونڈ رہی تھی اور تو پھر ان کے گھر آگئی۔" بوڑھی نانی کی آواز میں جوانوں جیسی چنگاڑ تھی۔

"خود تو' تو بے غیرت تھی ہی' اپنی بیٹی کو بھی بنالے گی مگر میری نواسی کے پیچھے کیوں پڑی ہے' گند پھیلانے کے لیے میرا ہی گھر ملا' تجھے دوزخی عورت۔" اب ان کے عتاب کا نشانہ ماستوشہ کی ماں تھی جو نانی کا قہر زدہ سا چہرہ دیکھ کر پہلے ہی خوف زدہ ہوگئی تھی۔ اب اتنی باتیں سن کر اس کی آنکھوں میں پانی بھر آیا۔

"ماسی میں نے اسے نہیں کہا رقص سیکھنے کو' یہ تو خود کرتی ہے' ہمارے بلائے بغیر ہی آجاتی ہے۔"

"بکواس بند کر اپنی' اور میں تجھ کافرہ کی ماسی کہاں سے ہوگئی۔" نانی نے ہاتھ سے اسے دھتکارا اور اپنے سخت ہاتھ میں عنایا کی گدی دبوچ لی ان کی ہتھیلی کی انگلی جلد اس کی نرم گردن میں کھبی جارہی تھی۔

"تیرا ناس ہو جائے۔" انہوں نے اسے دو جھٹکے دیے "اب ادھر آئی تو میں تیری ٹانگیں توڑ دوں گی' تیرے بازو کاٹ کر چیلوں کو ڈال دوں گی۔" وہ اسے جھٹکے دیتیں گھر تک لے آئیں۔

"منحوس تو جن پیروں پر ناچ رہی تھی ناں اللہ میاں وہ کاٹ کر دوزخ میں ڈالے گا' آگ کے صندوق میں بند کرے گا تجھے۔" آگ کے تصور سے ہی اسے جھرجھری آگئی۔ ابھی اس بات کو دو دن ہی گزرے تھے جب شام کے وقت ماستوشہ اپنی دیوار پر چڑھی اس سے اسکول کا کام پوچھ رہی تھی۔ غالباً" دو دن سے اسے بخار تھا اور وہ اسکول نہیں گئی تھی۔ عنایا اپنے بستے سے کاپی نکال کر ابھی چھت کی طرف جانے ہی لگی تھی جب غسل خانے سے وضو کرتی نانی باہر نکل آئیں اور اس کے ہاتھ سے کاپی چھین لی۔

"چل تو نماز پڑھ وقت ختم ہو رہا ہے' جس کو پوچھنا ہے جاکر استانی سے پوچھ آئے' اور تو۔" اب ان کا رخ دیوار پر لٹکی ماستوشہ کی طرف تھا۔ "منحوس دفع ہو' مرجا کے کہیں' ہمارے پیچھے کیوں پڑی ہے' اپنی ناپاک صورت دکھا کر میرا وضو ہی تڑوا دیا۔" نانی اسے کوستی دوبارہ غسل خانے کی طرف بڑھی تھیں مگر ان کی بددعا میں جانے کیا بات تھی پھر واقعی ہی وہ ہو گیا۔ یا تو وہ نانی کے نخوت بھرے لہجے سے ڈر گئی تھی یا پھر اینٹوں کی کچی دیوار سے نکل کر کوئی کیڑا اس کے قریب آرہا تھا اس کا ہاتھ دیوار سے پھسل گیا اور وہ سیدھی اپنے صحن میں دھم سے جا گری یہاں تک کہ اس کی ماں کو بھی کچھ پتا نہ چلا کہ وہ کیسے گری ہے یا نانی نے اسے کیا کہا۔ عنایا نے کتنا ہی شور مچایا تھا کہ اسے اپنی سہیلی کی خیریت پوچھنے جانا ہے مگر نانی نے اس کی ایک نہ سنی بلکہ اسے کمرے میں بند کرکے باہر سے کنڈی لگادی۔ وہ کتنا ہی روتی بلکتی رہی مگر بے سود رہا۔ نانی محلے داری کی وجہ سے خود خاموشی سے ادھر ضرور گئی تھیں مگر اسے تقریباً" ایک ہفتے سے گھر میں قید رکھا ہوا تھا۔

کتنے دن بعد آج اسے اسکول جانے کی اجازت ملی تھی۔ اس نے اپنے بال بنائے اور کچھ ٹافیاں اپنے بستے میں ماستوشہ کے لیے رکھی تھیں۔ وہ بستہ اٹھا کر ابھی کمرے سے باہر نکلی ہی تھی جب چھوٹے ماموں اور نانی کی آوازوں نے اس کے پاؤں روک لیے۔

"خون ہی اس کا اتنا نکلا" اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی مرگئی۔"

"ہاں اماں! دکھ تو مجھے بھی بہت ہوا" بے چاری عورت کی ایک ہی بیٹی تھی وہ بھی کس طرح اچانک ہی مرگئی۔" ماموں کی غمگین آواز پر عنایا کی آنکھیں مزید پھٹ گئیں۔

"کیا۔۔۔ کیا کہا ماموں نے' کون مرگئی؟ کہیں ماستوشہ' نہیں' نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" وہ تو آج اسکول جاتے ہوئے خوش ہی اسی لیے تھی کہ واپسی پر اس کے گھر بھی جائے گی۔ اس کی خیریت پوچھے گی اسے ٹافیاں دے گی' گھر میں بند رہنے کے باوجود بھی اسے محلے میں کچھ غیر معمولی ہونے کا اندازہ تھا۔ چھوٹے چھوٹے گھروں کی دیواریں ملی ہوئی تھیں۔ بے شک آوازوں کی سمجھ نہیں آئی تھی مگر ارد گرد

چہل پہل کا پتا ضرور چلتا تھا۔ اور عنایا نے اندازہ لگایا تھا شاید اس کی ٹانگ یا بازو ٹوٹ گیا ہوگا اور لوگ خیریت پتا کرنے آتے ہوں گے گویا آج وہ بھی اس کی خیریت پوچھنے جائے گی۔ مگر ماموں تو کچھ اور ہی کہہ رہے تھے۔ جس پر نانی نے ٹھنڈی سانس لی۔

"ہاں بھیا! تھی تو اکلوتی اولاد' دکھ تو مجھے بھی ہوا اسے روتا پیٹتا دیکھ کر' مگر دیکھو اسے سیکھا کیا رہی تھی۔ ناچ گانا' نرا دوزخ کا کاروبار' خس کم جہاں پاک' اب کم از کم ہماری بچی تو ادھر نہیں جائے گی' اسی سے کھیلنے چلی جاتی تھی اور' اور وہ کم بخت اپنی بیٹی کے ساتھ ہماری عنایا کو بھی ناچ سکھا رہی تھی۔" نانی کے پوپلے منہ سے انگارے نکل رہے تھے۔

"اماں یہ تو کیا کہہ رہی ہے' پہلے تو نے کبھی نہیں جتایا کہ وہ عنایا کو بھی۔" ماموں کے لقمہ بھرے منہ سے عجیب چبھتی آوازیں نکل رہی تھیں۔

"کیا جتاتی' میں نے ڈانٹ ڈپٹ کر روکا تو ہے' اور اسی لیے تو باہر نہیں نکلنے دیا' پتا چلے گا تو جائے گی ادھر' روئے دھوئے گی۔" "نانی تم بہت بری ہو۔" اس نے دل میں سوچا۔

"اب خیال رکھنا' ادھر نہ ہی جائے" ماموں شاید پانی پی رہے تھے۔

"نہ اب کیوں جائے گی' اور ویسے بھی اب تو اس کی ماں کو خود بھی عقل آگئی ہوگی جیسے اس بچی کو زمین پر پٹخا ویسے اس کی ٹانگیں کاٹ کر دوزخ میں پھینکے گا۔" اس وقت عنایا کو اپنی نانی خون آشام چڑیل لگی تھی۔ اس کی سیاہ معصوم آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تیرنے لگے۔ اس کا جی چاہا کہ نانی بھی ویسے ہی گر کر مرجائے۔ اسے دکھ اور بے بسی سے رونا آنے لگا۔

"ماسنتوشہ مرگئی' میری پیاری سہیلی مرگئی' اسے نانی نے مارا ہے' پہلے اسے گھر جاکر ڈانٹ کر آئیں تو اسے بخار ہوگیا پھر اسے ڈانٹ کر کہا منحوس دفع ہوجا' مرجا کے کہیں' اور وہ واقعی مرگئی' نانی تم نے میری سہیلی ماردی' اس کی ماں کی اکلوتی اولاد' اس کا اکلوتا خواب ماردیا' صرف میری وجہ سے وہ مرگئی' نہیں' نہیں' ماسنتوشہ نہیں مرسکتی۔" وہ بستہ پھینک کر چارپائی پر لیٹی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اسے بخار میں پھونکتے ہوئے تقریباً" ایک ہفتہ ہوگیا تھا۔ نانی بھی پریشان ہوگئیں آخر یک دم اسے اتنا بخار کیسے ہوگیا؟ ہفتہ بھر ہوگیا بخار اترنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ وہ ڈاکٹر سے مختلف دوائیاں لالا کر اسے دیتی رہیں لیکن وقت سے بڑا کوئی ڈاکٹر نہیں تھا وہ ٹھیک ہوہی گئی تھی مگر اب اس نے ایک تہیہ کرلیا تھا۔ کہ وہ چوری چوری ماسنتوشہ کی ماں سے ملے گی۔ پھر اس نے ایسا ہی کیا اسکول سے چھٹی پر وہ جلدی نکلتی اور کچھ دیر کے لیے ان کے گھر چلی جاتی۔ پہلے دن تو ماں اپنی بیٹی کی سہیلی سے مل کر خوب روئی مگر پھر سنبھل کر بولی۔

"تو میری ماسنتوشہ جیسی ہے نا' تیری آنکھیں' تیرے بال بالکل ماسنتوشہ جیسے ہیں' میں تجھے ماسنتوشہ کہہ لوں' تجھے برا تو نہیں لگے گا۔" وہ اسے چمکارتے ہوئے بھیگی آواز میں کہہ رہی تھیں۔ جس پر وہ بھی رونے لگی۔

"آنٹی! آج سے میں آپ کی ماسنتوشہ ہوں' مجھے بالکل برا نہیں لگے گا' میں رقص سیکھ کر آپ کا خواب پورا کروں گی۔" وہ ان سے روتے ہوئے وعدے کرتی رہی نہ صرف سہیلی کی محبت میں بلکہ ایک ضد تھی جو نانی نے بھردی تھی۔ اس ضد کو پورا کرنے کے لیے اس نے معمول بنالیا خاموشی سے آدھ پون گھنٹہ ان کے گھر بتا آتی۔ نانی کو یہ اطمینان تھا کہ نہ وہ اب دیوار پر چڑھ کر برابر جھانکتی ہے' نہ گھر سے غائب ہوتی ہے۔ بلکہ اسکول میں بھی زیادہ دیر پڑھتی ہے۔ دن مہینوں میں گزرتے گئے جب ایک دن ماموں دوپہر میں گھر آرہے تھے۔ اسے بستہ لیے برابر گھر سے نکلتے دیکھ لیا۔ وہ نہ صرف غصے میں آگ بگولہ ہوئے بلکہ اس کے لمبے بال پکڑ کر مارتے گھر تک لائے اور اس کے رو' رو کر چلانے اور یہ کہنے "کہ میں جاؤں گی ان کے گھر" پر خوب پٹائی بھی کی۔ انہیں غصہ تھا کہ ماں تو چلو بوڑھی ہے گھر سے نہیں نکلتی مگر محلے کے کسی بھی شخص نے نہیں دیکھا کیسی ہوشیاری سے جاتی رہی۔ اسی دن نانی

نے سنگاپور فون بھی کروادیا۔ "کہ اپنی بیٹی عزت سے لے جاؤ' اب وہ ہمارے قابو میں نہیں رہی۔"

اسے سنگاپور آئے بھی کئی ماہ گزر گئے تھے۔ اس میں عجیب سی سرکشی سماگئی تھی کہ "میں رقاصہ ہی بنوں گی' جو کرنا ہے کرلو" اس وقت اس کی عمر بندرہ' سولہ سال تھی اس نے وہاں اسکول میں ایسی ہی لڑکیاں سہیلیاں بنائیں جو رقص سیکھتی تھیں اور جب کالج چلی گئی تو وہاں اسے آرٹ اکیڈمی کا پتا چل گیا تو رقص سیکھنا آسان تر ہوگیا۔ اس کے گھر والوں نے وہاں بھی بہت سختی کی تھی ڈرایا دھمکایا' مگر وہ ہٹ دھرم ہوگئی۔ والد صاحب کا انتقال تو بہت پہلے جب وہ احمد آباد میں تھی تب ہی ہوگیا تھا' بہنوں کی شادی ہوگئی وہ اپنے گھروں کی ہوگئیں بھائی کی نوکری ملائیشیا میں لگ گئی وہ وہاں ماں کو بھی ساتھ لے گئے۔ صرف وہ نہیں گئی تھی۔ وہ سنگاپور کے ہوسٹل میں رہنے لگی تھی۔ اس وقت اس کا گریجویشن مکمل ہورہا تھا اس نے فوراً" نوکری کرلی۔ احمد آباد سے واپسی پر' وہ پوچھنے پر اپنا نام ماسنتوشہ بتاتی تو اس کی امی ڈانٹ دیتیں مگر اب خود مختار ہونے کے بعد اپنا نام مکمل بدل لیا تھا۔ نام کی وجہ سے مذہب لوگ از خود ہی اخذ کرلیتے مگر اسے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ لیکن اس کے گھر والوں کو اس پر بہت اعتراض تھا انہوں نے خوب لعنت ملامت کی' مکمل ناطہ توڑلیا۔ لیکن وہ پھر بھی کبھی فون پر بات کرلیتی تھی۔ بلکہ پچھلے سال جب اس کی امی کو فالج کا اٹیک ہوا تو وہ بیٹی تھی کیسے ملنے نہ جاتی۔ مگر تینوں بھائی' بہنوں نے اسے حقارت سے دیکھا کہ وہ مرتد ہے۔ اس نے بارہا کہا۔

"میں مسلمان ہوں' صرف نام بدلا ہے مذہب نہیں۔"

"تو جھوٹ بولتی ہے' جہنم تیرے جیسے منافقوں کے لیے بنی ہے اور تو سر کے بل جائے گی اس میں۔" یہ اس کی بڑی بہن تھی جو اس وقت داروغہ دوزخ بنی ہوئی تھی۔

"جب تیرا حشر ہوگا نا' اس ماسنتوشہ اور اس کی ماں کے ساتھ جب تیرے ناچتے پاؤں پر آگ کے کوڑے لگیں گے تو تجھے ہم ہی یاد آئیں گے۔" یہ اس کی چھوٹی بہن تھی جو شاید اس کے دوزخ میں جانے کے بعد دوزخ کا دروازہ بند کرے گی اور بھائی نے تو اس کی صورت بھی نہ دیکھی کلام تو کیا کرتا تھا۔ بلکہ صرف صلہ رحمی کے صدقے ماں سے اسپتال میں صرف عیادت کرنے دی اس کی گندی کمائی کا چیک اس کے منہ پر دے مارا اور آئندہ معذرت خواہانہ انداز میں کبھی نہ ملنے کی تلقین اور ہمارے حوالے سے کسی کو نہ ملنے کی یاد دہانی بھی کروائی تھی۔ اتنی بے عزتی پر وہ اپنے سارے رشتے بھول گئی ہر تعلق سے نفرت ہونے لگی۔ صرف کبھی فون پر ماں کی خیریت پوچھتی وہ بھی اگر کوئی بتادیتا۔

وقت کی ندی بہتے' بہتے پھیلتی جارہی تھی۔ دن رات نے اس میں کتنے رنگ بھرے' موسموں نے کیسی کیسی خوشبوئیں دیں اور وہ تیس سال کی ہوگئی۔ نام اور مذہب میں تصادم کی وجہ سے اس کی زندگی میں کوئی مرد خاص مقام تک نہ آسکا تھا اور جو آیا تھا وہ تو یہ سن کر حیران ہی رہ گیا۔

"عنایا۔۔۔! عنایت کی ہوئی' گاڈ گفٹڈ! اتنا خوب صورت نام' آپ کو اپنی استاد سے اتنی محبت تھی کہ اپنے رشتے' اپنی ماں یہاں تک کہ اپنے رب ہر چیز سے مخالفت مول لی۔" تطمیر شاہ کی شدید حیرانی پر اس نے اپنا چمچہ پلیٹ میں رکھا اور پلیٹ کے دونوں اطراف اپنے ہاتھ جوڑ کر میز پر جمائے اور بہت جتا کر بولی تھی۔

"نام سے کیا فرق پڑتا ہے تطمیر شاہ' انسان کو کردار کا اچھا ہونا چاہیے' اگر آپ کا نام کسی کی خوشی کا باعث بنتا ہے تو کیا مضائقہ ہے' خوشی بانٹنے کا۔" اس کی بات کے جواب میں انہوں نے بھی ہاتھ اسی کے انداز میں رکھے اور اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگے۔

"بالکل پڑتا ہے عنایا جی' نام کا آپ کی زندگی' آپ کے رشتوں' آپ کی شخصیت پر بالکل اثر پڑتا ہے' یہ جو آج کل فیشن ہوگیا ہے نا' اپنا نام بگاڑ کر آگے پیچھے کسی برٹش پرسنالٹی کا نام لگا لینا یہ درست نہیں ہے

بلکہ کیا کیس ہے اور آپ یہ دیکھیں کہ صرف آپ کے نام کی تبدیلی پر آپ کی زندگی سے کتنے رشتے نکل گئے' کوئی نیا رشتہ یقیناً" غلط فہمی کی بنیاد پر نہیں بنا اور پھر شخصیت۔ اس پر تو یقیناً" خوب اثر پڑا ہو گا۔" اس کی بات پر ماسنتوشہ کی بھنوؤں میں خفیف سی سمٹن اور تغیر نے بھی ہاتھ سمیٹ کر کرسی کی بیک سے پشت ٹکائی اور ایزی ہو کر بیٹھ گئے۔

"دیکھیں عنایا بی بی! بہت سے مکمل شرعی کام صرف اور صرف کفار کی مشابہت سے بچنے کے لیے مختلف رکھے گئے مثلاً" دس محرم الحرام کا روزہ بنی اسرائیل مذہبی عقیدت کے طور پر رکھتے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نو محرم کا روزہ بھی ساتھ لگانے کا عہد کیا۔ پھر روزے کے اوقات مختلف رکھنے کے لیے سحری واجب کردی کیوں؟ ایز سمبل' کفار کی مشابہت سے بچنے کے لیے اور پھر دوسرے مذاہب میں عبادت کی پکار کے لیے آگ جلائی جاتی' نقارے بجائے جاتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک معتبر اعلان اذان ودیعت کی گئی' کیا اللہ تعالیٰ کو ان کے کرداروں پر شک تھا؟ یا یہ کہ ان کے باطن اللہ سے چھپے تھے؟ نہیں بالکل نہیں۔ صرف اور صرف مسلمان کو باقی امتوں سے مختلف رکھا گیا تھا' پھر آپ یہ کیسے کہہ سکتی ہیں کہ کردار اچھا ہونا چاہیے۔ مذہب غیر کے نام سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" اس کی نوک دار بھنوئیں مزید سمٹ گئیں اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتی انہوں نے انگشت سے اسے ایک منٹ چپ رہنے کا کہا۔

"آپ نے ایک اور بات کہی تھی' کسی کو خوشی دینے میں کیا مضائقہ ہے' یہ آپ نے بالکل ٹھیک کہا' ہمارے مذہب میں تو ہر کسی کے جذبات' ان کی خوشی کا خیال رکھنے کا حکم ہے' آدمیت کا احترام ہے' لیکن کیا صرف آپ انہیں اپنا نام بدل کر' ان کا پروفیشن اپنا کر ہی خوشی دے سکتی تھیں؟ حالانکہ آپ اچھی طرح جانتی ہوں گی کہ ہمارے مذہب میں اس چیز کی ممانعت ہے۔" اس کے ممانعت لفظ پر وہ استہزائیہ ہنسی اور کرسی کے بیک پر ٹکتے ہوئے ٹانگ پر ٹانگ چڑھالی۔

"مسٹر آپ مذہب کو کیوں درمیان میں لا رہے ہیں؟ ہمارے مذہب میں تو اور بھی بہت کچھ ہے؟ چوری' جھوٹ' دھوکا' زنا' قتل' ہر چیز کی ممانعت ہے' ہر جرم کا بدلہ دوزخ ہے' یہ جانتے بوجھتے سب مسلمان کرتے ہیں' پھر صرف رقص پر ہی کیوں اعتراض؟" وہ اسے حیرت سے سن رہا تھا' اس کی پشت کرسی کی بیک پر جمی تھی اور کہنی کرسی کے بازو پر اس کا ادھ کھلا چوڑا سا ہاتھ اس کے بھرے' بھرے ہونٹوں سے کچھ ہی نیچے تھا اور انگشت ہونٹوں کو پار کرتی ہوئی ناک کے ایک کونے کو چھو رہی تھی۔ جب کہ انگوٹھا گالوں میں کچھ دھنسا ہوا تھا۔ ایسے لگتا تھا کہ وہ تاسف سے کچھ سوچ رہے ہوں۔ انہوں نے اس کی کمزور سی حجت پر مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلا کر ہاتھ نیچے کیا۔

"عنایا جی! وہ آج اسے جتاتے ہوئے "عنایا" کہہ رہے تو غالباً" انہیں تاسف تھا کہ ایک مسلمان پڑھی لکھی لڑکی غیر نام رکھنے اور رقص کرنے کو غلط بھی نہیں سمجھتی۔

"سوسائٹی کیا ہے' میرا مطلب ہے کون ہے؟" شاید وہ اسے سمجھانا چاہتے تھے۔

"یہ کیا بات ہوئی۔" وہ اپنے سوال سے یکسر مختلف جواب پر گردن مار کر رہ گئی۔ "ظاہر ہے' میں' آپ' ہم سب سوسائٹی ہیں۔"

"پھر ہر اکائی مل کر سوسائٹی بناتی ہے تو مضبوط تو اکائی کو ہونا چاہیے نا۔" اس کی لاجک عنایا کی بالکل سمجھ نہیں آئی اس نے خاصی کوفت زدہ شکل بنا رکھی تھی۔ "بی بی' ہم ہمیشہ پہلے دور کیوں دیکھتے ہیں اور دور کی چیز کو دیکھنا ہی پسند کرتے ہیں' کیا ہماری نزدیک کی نظر خراب ہے' اپنا آپ تو انسان کے قریب تر ہوتا ہے' اتنا کہ آئینے کی ضرورت بھی نہیں پڑتی' ہم کیوں یہ دیکھتے ہیں کہ کوئی کیا کر رہا ہے' کیوں کر رہا ہے' یہ کیوں نہیں دیکھتے ہم کہاں کھڑے ہیں' ہم کتنا جانتے ہیں دین کو' خود کو' بے شک جھوٹ' چوری' قتل' زنا ہر چیز کی ممانعت ہے اور ہر جرم کا بدلہ دوزخ ہے' لیکن کیوں؟ اللہ تعالیٰ کی اتنی بڑی ذات مبارک کو ہمارے جھوٹ' چوری' زنا'

قتل سے کیا فرق پڑتا ہے' وہ کیوں ہمیں آگ میں ڈال دے گا' اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ اللہ ہمارا یہ کام نہیں کر سکتا تو ہم چوری کر لیتے ہیں یا یہ کہ اللہ اس بندے کو نہیں مارتا تو ہم مار دیتے ہیں' کیا ہمارے اس طرح کرنے سے "نعوذ باللہ" اللہ کی ذات مبارک چھوٹی ہو سکتی ہے' اسے فرق پڑ سکتا ہے یا پھر کاموں پر سے اس کی قدرت کم ہو جائے گی' نہیں' بالکل نہیں۔ اسے ہمارے مشرق و مغرب چہرے پھیرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا اس کے پاس تو عبادت و شکر گزاری کے لیے بہتر فوج ہے۔ وہ پھر ہمیں کیوں سزا دے گا' ہمیں' اتنے خوب صورت انسانوں کو' تکلیف ایذا دے کر' ہماری سزا و جزا اس کی مبارک ذات پر کوئی فرق نہیں ذاتی' فرق پڑتا ہے تو عنایا بی بی' ہمیں' ہم انسانوں کو۔" جتاتے ہوئے انہوں نے کہنی کرسی کے بازو سے ہٹائیں اور ٹیبل پر موڑ کر رکھتے ہوئے قدرے آگے ہو کر بیٹھ گئے۔ وہ اب بھی مسلسل اس کے چہرے کے تاثرات جانچ رہے تھے۔ ان کا افسوس ختم نہ ہو رہا تھا کہ مسلمان لڑکی' ہندوانہ نام' رقص۔۔۔

"مطلب۔۔۔" وہ ان کے لہجے اور گفتگو کا رخ بدلتا دیکھ کر حیرت زدہ تھی۔

"مطلب یہ کہ" انہوں نے ہونٹ بھینچ کر کھولے "رقص کے بارے میں آپ کیا سمجھتی ہیں' کیا ہے رقص؟"

"میں صرف رقص کی نہیں کلاسیکل رقص کی بات کر رہی ہوں۔" وہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی تھی۔

"کائنات کی ہر چیز ہی رقص میں ہے' ہم تو صرف اپنے انداز سے فطری خوب صورتی کی تشریح کرتے ہیں' قدرت بیان کرتے ہیں۔" "یقیناً" اسے وہ بدذوق لگے تھے اس کے مطمئن انداز میں اپنی صفائی پیش کرنے کو' وہ چند لمحے خاموشی سے دیکھتے رہے۔

"زبردست! کہ کائنات کی ہر چیز رقص میں ہے' اور اس رقص میں کوئی برائی نہیں' کالی رات کا لبادہ اتارتے سنہرے دن کے رقص میں' ٹنڈ منڈ خزاں رسیدہ شاخوں کو چومتی بہار کی کونپلوں کے رقص میں لہراتے سنگ گھومتے بادل اور برف زاروں سے پھسلتے جھرنوں کے رقص میں' ایک ننھی سی کونپل سے پھوٹتے خمار رتوں کا رقص' جب اللہ نے اپنی قدرت کی تشریح کے لیے اتنی منفرد چیزوں کو رقص میں رکھا ہے تو کیا ضروری ہے اس کی فطرت کی ترجمانی ایک عورت کے پاؤں کی جھنکار' اس کے تراشیدہ نقوش یا خدوخال سے سمجھایا جائے' کیا عورت اتنی ہی کم مائیگی چیز ہے کہ اسے سجا سنوار کر کسی لذیذ ڈش کی طرح پیش کیا جائے کہ جس پر ہزار نظریں ہزار زاویے سے اٹھیں "عورت" کے لفظ میں کتنا بھرم' کتنا مان بھرا ہے' ڈھانپی ہوئی چیز' چھپی ہوئی' پردے میں رکھی ہوئی بالکل کلی کی طرح پاکیزہ' عنایا بی بی کلی کو توڑنے سے پہلے ہر ہاتھ چند لمحے کے لیے رکتا ضرور ہے اور اکثر رک ہی جاتا ہے' مگر کھلے پھولوں کا رنگ' پھیلتی خوشبو اتنے اٹریکٹیو ہوتے ہیں کہ لمحہ تاخیر سے اسے توڑ لیا جاتا ہے' اسی طرح جب عورت کے خدوخال' انداز نمایاں کیے جائیں وہ بھی اس محفل میں جہاں خوشبو اور آواز کا سرور ہو تو نفاق تو پھیلے گا نا اور یہی نفاق رقاصہ پر براہ راست اثر انداز ہو گا یا نہیں مگر پیسے یا طاقت کے بل بوتے پر کسی معصوم لڑکی یا معصوم بچے کو اپنے عتاب کا نشانہ ضرور بنائے گا' کسی کی زندگی ضرور تباہ کرے گا۔" وہ کسی غیر مرئی نکتے پر دیکھتے ہوئے دھیمے دھیمے بول رہے تھے۔

"عنایا جی' معصوم سی چھ سالہ بچی یا سات سالہ بچہ جب کسی کے ظلم کا شکار ہوتا ہے نا تو اس ظلم میں کہیں نہ کہیں شیطانی سرور ضرور شامل ہوتا ہے' ہم لوگ پریشان ہیں کہ بچوں پر تشدد بڑھ گیا ہے' پتا ہے کیوں۔" انہوں نے ایک نگاہ گردن جھکائے بیٹھی ماسنتوشہ پر ڈالی۔

"ہم لوگوں نے گناہ کو گناہ سمجھنا چھوڑ دیا ہے' نفس کی غذا کو روح کی غذا کہنا شروع کر دیا ہے اور جب کوئی کسی کے نفس کی غذا بنتا ہے' اس کی زندگی برباد ہو جاتی ہے' وہ روتا ہے' بلکتا ہے' اس ایک کی زندگی کئی

زندگیوں کو متاثر کرتی ہے' سوسائٹی کو متاثر کرتی ہے' اگر اس کا سدباب نہ کیا جائے تو پورا انسانی تمدن خراب ہو جاتا ہے' اور اللہ کو اپنے بنائے تمدن سے بڑا پیار ہے' وہ نہیں چاہتا اس کا بندہ' اس کا بنایا تمدن بگاڑے۔ صرف اور صرف اللہ کے بنائے تمدن کو بگاڑنے کی سزا کے طور پر بندہ آگ میں جائے گا۔ ایک رقاصہ کے ناچنے سے رب کو کوئی فرق نہیں پڑتا' اس کے پاؤں کی دھمک اس کی بنائی زمین نہیں توڑ سکتی' اس کی اونچی چھلانگ پہاڑ کو چھو نا نہیں کر سکتی مگر جو تمدن میں اس کی وجہ سے نفاق پھیلا وہ۔۔۔ وہ کبھی معاف نہیں کرے گا' جیسے آپ کہہ رہی تھیں جھوٹ' چوری' قتل' زنا' یہ سب کر لینے سے اللہ کی ذات متاثر نہیں ہوتی' بلکہ اس کا بنایا تمدن متاثر ہوتا ہے اور وہ اپنے تمدن کا بگاڑ برداشت کیسے کرے' میں نے تو جہاں کہیں نماز' روزہ عبادت کا ذکر پڑھا ہے' تو ان کی جزا کا ذکر پڑھا ہے' نہ کرنے پر کوئی خاص وعید نہیں پڑھی' ہاں البتہ معاشرے کو' تمدن کو بگاڑنے پر زبردست وعید ہے' خواہ وہ بگاڑ رقاصہ پیدا کرے یا چور' قاتل یا جھوٹا' مسلمان یا نان مسلم' ایک چھوٹی سی مثال ہے' اگر برا نہ لگے۔" اس نے پھر اس کی طرف دیکھا وہ آنکھیں سختی سے بند کیے بیٹھی تھی۔

"ماں کو دیکھا ہے نا آپ نے' بچہ اس کے ساتھ بھلے جتنی بدتمیزی کرے' اس کی بات نہ مانے' وہ کچھ خاص نہیں کہتی ہلکا' ہلکا ڈپٹتی رہتی ہے' زیادہ سے زیادہ اتنا کہتی ہے میں تم سے نہیں بولتی' مجھ سے بات نہ کرو یا پھر میں تمہیں فلاں چیزوں کی' مگر جب بچہ بدتمیزی میں اپنے دوسرے بہن' بھائی کے ساتھ مار پیٹ کرتا ہے۔ خواہ مارنے والا ہی لاڈلا بچہ ہو' مگر وہ فوراً" تھپڑ رسید کرتی ہے' اس سے برداشت نہیں ہوتا نا' اگر مارتی نہیں تو کم از کم بہن' بھائی سے اسے معافی مانگنے کا ضرور کہتی ہے' آخر دوسرا بچہ بھی تو اسی کا ہے نا' پھر اللہ کا دل تو ستر ماؤں سے زیادہ نرم ہے' پھر وہ کیسے برداشت کرتے کہ اس کے ایک بندے کا پھیلایا نفاق دوسرے کی زندگی تباہ کردے' اتنی پیاری مخلوق جن کے لیے اس نے مکمل آرام دہ جنت بنائی' وہ کیوں انہیں آگ میں ڈالے گا' بصورت دیگر اس کی وجہ سے کسی کی زندگی آگ نہ بن جائے۔" وہ لمبی آہ بھر کر چپ ہو گئے تھے۔ غالباً" ماسنتوشہ کے چہرے پر ایک رنگ ندامت کا آرہا تھا۔ ایک جا رہا تھا۔

"کاش۔۔۔! کاش۔۔۔! میری ماں' نانی نے کبھی گناہ سے بچنے کے لیے ایسے سمجھایا ہوتا' وہ تو ہر بار یہی کہتی رہی' تیرے ہاتھ کاٹ کر دوزخ میں جلائے گا' تو ٹانگیں اچھالتی ہے' تو وہ جہنمیوں کو کھلائے گا۔ جھوٹ بولا تو اللہ آگ کا انگارہ منہ میں رکھے گا۔ پھر اگر ہر کام کے بعد آگ ہی مقدر ہے تو دنیا میں تو کسی کو خوشی پہنچا دوں' میں تو صرف ماسنتوشہ کی ماں کا خواب پورا کرنے' ان کو خوش کرنے کے لیے رقاصہ بنی تھی۔" وہ اس کی نمی کھلی آواز کی پروا کیے بغیر خاصے مضبوط لہجے میں بولے۔

"غلط۔۔۔ بالکل غلط' آپ اب بھی غلط بیانی کر رہی ہیں۔" اس نے چونک کر تطہیر شاہ کو دیکھا' اس کی آنکھوں میں نمی کی وجہ سے گلابیاں کھل رہی تھیں۔ مگر جو غلط ہے۔ وہ غلط ہے۔ اس نے گلابی نازک رنگ کی پروانہ کی۔

"آپ نے رقص صرف اپنی نانی' ماموں' یا والدہ کی ضد میں سیکھا ہے۔ صرف ان کی سختی کی ضد میں یا پھر ماسنتوشہ کی ناگہانی موت کو گلٹ سمجھ کر۔"

"نہیں ایسا نہیں ہے۔" اس نے ناک سے سوں کر کے نمی کھینچی۔

"عنایا جی ایسا ہی ہے' اگر ماسنتوشہ کی والدہ کو خوش کرنے یا بیٹی بننے کا خیال تھا تو نام اور پیشہ اپنانا ضروری نہیں تھا۔ ان کی مالی مدد کر کے' ان کی خدمت کر کے بھی آپ بیٹی کے کچھ حقوق ادا کر سکتی تھیں۔ آخر وہ آپ کی سہیلی کی والدہ تھیں۔ تنہا بیوہ عورت' لیکن شاید آپ نے بعد میں تو ان کا حال تک نہیں پوچھا ہوگا۔" وہ آج شرمندہ پر شرمندہ کر رہے تھے۔ واقعی ایسا تھا وہ جب احمد آباد سے یہاں آئی تو اس نے کبھی وہاں فون تک نہیں کیا تھا۔ بلکہ اپنی ہی ضد پر اڑی رہی۔ جب احمد آباد میں مسلم' ہندو فساد پھیلے اور بیشتر مسلمان شہید ہوئے تو نانی اور چھوٹے ماموں بھی دہلی شفٹ ہو گئے تھے۔ پھر بھی اس نے ماسنتوشہ کی والدہ کا کچھ نہیں پوچھا تھا۔ ہو سکتا تھا کہ کسی مسلم نے انتقامی کارروائی کا نشانہ اس تنہا عورت کو بھی بنایا ہو' مگر آج سے پہلے تو کبھی یہ خیال تک نہ آیا تھا۔ پھر وہ کیسے خوش کرنے کے لیے اپنے خاندان' اپنے مذہب سے ٹکرا رہی تھی؟ وہ بہت دیر "سوں سوں" کرتی روتی رہی' مگر اس نے بھی چپ نہیں کروایا تھا۔

کھانا بے شک بہت لذیذ تھا' جو ماہرانہ ہاتھوں کو داد دے رہا تھا' مگر گنتی کے چند ٹھنڈے نوالے کھا لینے کے بعد تطہیر شاہ معذرت کرتے چلے گئے تھے۔ شاید ان سے اس کے گرتے آنسو قابل برداشت نہیں تھے یا پھر چاہتے تھے کہ وہ جتنا رونا چاہتی ہے' تنہائی میں رو لے' ہو سکتا ہے رو لینے سے اس کے دل کا غبار' اس پر جمے چند بدنما دھبے مٹ کر صاف ہو جائیں۔

☼ ☼ ☼

نیلے صاف آسمان پر سفیدی تو بالکل مٹ چکی تھی۔ مگر کناروں پر نارنجی اور سرمئی دھاریوں کے امتزاج میں منعکس ہوتا سورج خوب صورت سی شام بکھیر رہا تھا۔ البتہ آسمان درمیان سے بالکل کھلا روشن سا تھا۔ ابھی کچھ دیر بعد ستاروں کے جھرمٹ نے اسے سجا دینا تھا۔ وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑا اپنی تیاری کا جائزہ لے رہے تھے۔ انہوں نے کف لنکس بند کیے' ٹائی ناٹ درست کی تھی۔ اب انہوں نے کلون اٹھا کر اپنی کالر کے گرد اسپرے کیا اور کلون واپس ڈریسنگ پر رکھ دیا۔ اس کے قریب ہی رکھی سنہری واچ اٹھا کر ٹائم چیک کیا اور بائیں کلائی پر باندھنے لگے۔ واچ کے قریب ہی ان کا والٹ اور موبائل بھی رکھا تھا۔ واچ باندھتے ہوئے موبائل کی چمکتی اسکرین پر کوئی تیسری بار نگاہ گئی تھی اور وہ ہونٹ بھینچ کر رہ گئے تھے۔ وہ اس کی کال ریسیو کرنا نہیں چاہتے تھے۔ غالباً" رات جب ڈنر سے واپس آئے تو خاصے الجھ گئے تھے۔ وہ رات کو بھی صحیح طرح سے سو نہیں پائے تھے اور دن میں بھی خاصی یاسیت سوار رہی تھی۔ آج رات ان کی فلائٹ تھی' مگر کسی فنی خرابی کے باعث فلائٹ لیٹ ہو کر اگلے دن صبح دس بجے تک شیڈول کی گئی تھی۔ وہ ایئرپورٹ سے ساری تفصیلات لے چکے تھے۔ اب جب فلائٹ تھی نہیں تو سوچا کیوں نہ ازکا بیگم اور مشعب شاہ کے لیے شاپنگ ہی کرلی جائے۔ وہ اتنے دن سے وہاں تھے۔ مگر شاپنگ کا پروگرام ڈیلے ہوتا جا رہا تھا۔ کل رات ڈنر سے واپسی پر بھی ان کا پروگرام شاپنگ کا تھا' مگر وہ ایک عام سی دعوت یکسر بدل گئی تھی۔ کچھ حقیقتیں آشکار ہونے پر وہ کیا سے کیا بولتے چلے گئے اور پھر آخر الجھے بکھرے سے اٹھ کر واپس آ گئے۔

وہ بہت دیر تک سڑکیں ناپتے رہے تھے کہ وہ کیوں ایک اجنبی عورت کے پیچھے سائے کی طرح بھاگ رہے ہیں؟ وہ اس کی دعوت پر منہ اٹھا کر اس کے گھر چلے گئے؟ اور پھر اپنی ہر دلیل سے یہ ثابت کرتے رہے کہ وہ غلط راستے پر ہے' وہ لاشعوری طور پر یہ کیوں چاہتے ہیں کہ وہ ویسی بن جائے کہ جس کے ساتھ پر وہ فخر کر سکیں۔ کیوں وہ نشے کی طرح ان کی رگوں میں آہستہ آہستہ' اتر رہی ہے؟ کیوں خوابوں میں نیندوں کی طرح گھل رہی ہے؟ کیا انہیں اس سے محبت ہو گئی ہے؟ وہ اسے ہمیشہ کے لیے اپنانا چاہتے ہیں؟ اب جب یہ بھی ثابت ہو گیا کہ وہ مسلمان ہے' تو کیا اسے اپنا لینا چاہیے؟ کیا ایک بیوی' بچے کے ہوتے ہوئے ایک کنواری لڑکی سے عشق بگھارنا' اسے اپنی فیلنگز جتانا زیب دیتا ہے؟ ان کے اندر سے جواب صرف گہری خاموشی کی صورت ہی آتا رہا۔ وہ سڑک پر ٹھوکریں مارتے آخر تھک کر ہوٹل آ گئے تھے۔ رات کروٹیں بدل کر گزری تو دن کی سستی بہت دیر شاور لے کر اتاری تھی۔ اب سب بھلا کر گرما گرم کافی پی کر تازہ دم ہوئے اور شاپنگ کے لیے تیار ہو رہے تھے تو اس کا فون آ گیا۔ وہ فون اٹھانے سے گریز کر رہے تھے' مگر پھر وہی بے اختیاری کا عالم؟ انہوں نے والٹ جیب میں

ڈالتے ہوئے فون بھی آن کر کے کان سے لگا لیا۔
"ہیلو... السلام علیکم! کہاں تھے۔ میں اتنی دیر سے ٹرائی کر رہی ہوں۔" وہ بہت تیزی میں بولی تھی۔
"وعلیکم السلام!" انہوں نے صرف سلام کا جواب دیا' دوسرے سوال کا جواب شاید مناسب نہ لگا تھا۔
"ہیلو! تطہیر آپ سن رہے ہیں نا۔"
"جی... جی..." وہ ایسے بولے جیسے کسی نے نیند سے جگا دیا ہو۔
"آپ سنائیں... آپ کیسی ہیں ماسنتوشہ جی۔"
"ماسنتوشہ! اسے اچھا ہوا تھا" ماسنتوشہ نہیں عنایا۔" وہ دھیمی آواز میں جھلا کر بولی تھی۔ "آپ نے جان کر مجھے اس نام سے پکارا ہے۔ صرف مجھے چیک کرنے کے لیے کہ میرے دل پر کسی کی دلیلوں نے دستک دی بھی یا نہیں۔" وہ اس کی ذہانت پر حیران ہوئے تھے۔ "بہت جان گئی ہیں آپ مجھے' کمال ہے' اتنی جلدی۔"
"بالکل... کچھ لوگ ہوتے ہیں جنہیں جاننے کے لیے آپ کو صرف چند لمحے ہی درکار ہوتے ہیں یا پھر ایک ملاقات اور کچھ کو جاننے کے لیے ساری عمر بھی ناکافی پڑ جاتی ہے۔" ایسے لگتا تھا جیسے وہ دل کی گہرائیوں سے بول رہی ہو۔
"اور تطہیر شاہ کس کیٹیگری میں آتا ہے میم۔" انہوں نے فون کندھے میں دبوچ کر باہر سے کمرے کو لاک کیا۔
"کیا واقعی تطہیر آپ کو میری باتوں سے اندازہ نہیں ہوتا۔" اس کے انداز پر وہ چند لمحے خاموش رہے' پھر خود ہی بات بدل گئے تھے۔
"آپ کو کیسے پتا چلا "میں یہاں ہوں' حالانکہ میری تو گھنٹہ پہلے کی فلائٹ تھی۔"
"اور وہ لیٹ ہو کر کل صبح روانہ ہوگی' ہیں نا۔" وہ کہنے کے ساتھ ہی زور سے ہنسی تھی۔ یقیناً" اس کا ڈمپل بھی بنا ہو گا۔ "میں نے صبح نیوز سنی تھیں' اب بتائیں کہاں ہیں آپ؟"
"بس ایسے ہی شاپنگ کے لیے نکل رہا ہوں۔" وہ اب ہوٹل کی لابی کراس کرتے ہوئے ریسپشن تک آ گئے تھے۔ انہوں نے اپنا اطلاعی پیپر سائن کیا اور ایگزٹ کی طرف بڑھ گئے۔
"اچھا... پھر چند منٹ انتظار کریں' میں بھی باہر شاپنگ کے لیے ہی نکلی ہوئی ہوں' اکٹھے چلتے ہیں۔" وہ جانتے تھے کہ یقیناً" وہ جھوٹ بول رہی ہے اور اب صرف ملنے کے لیے اسپیشل آئے گی۔ شاید وہ اس کی فیلنگز جاننے لگے تھے اور واقعی ہی وہ کچھ دیر بعد وہاں آ گئی' اس کی تیاری سے لگتا تھا کہ وہ کسی شاپنگ کے لیے باہر نہیں نکلی ہوئی' بلکہ ابھی جلدی میں نکلی ہے۔ ہاں ایک تبدیلی تھی کہ اس کے گلے میں مفلر لٹک رہا تھا۔
"آئیے..." اس نے اپنی گاڑی گیٹ کے باہر روکی اور باہر نکلی تھی۔ وہ پنجوں کے بل قدرے اونچی ہو کر انہیں بلانے کا اشارہ کر رہی تھی۔
گرینڈ سینٹرل ہوٹل کے قریب ہی ایک بہت بڑا مال تھا۔ "المصطفیٰ اسٹور" جہاں پر بیشتر ورائٹی برصغیر کی تھی۔ وہ انہیں وہاں لے آئی تھی۔ وہاں پر اکثر شاپنگ پر آنے والے برصغیر کے لگتے تھے۔ اس سے قبل کہ وہ گاڑی بڑی سی کرنسی ایکسچینج کے پاس روکتی' تطہیر نے ہاتھ اٹھا کر منع کر دیا۔
"رہنے دیں... میرے پاس آل ریڈی ہے' گاڑی پارکنگ میں لے چلیں۔" وہ گاڑی پارکنگ میں کر کے اسٹور میں آ گئے تھے۔ کئی منزلہ بنا یہ اسٹور ہر طرح کی ورائٹی سے بھرا پڑا تھا۔ ان کی شاپنگ سے لگتا تھا کہ وہ اکثر شاپنگ کرتے رہتے ہیں' وہ ان کی شاپنگ کو سراہ رہی تھی۔
"بڑی خوش نصیب ہیں آپ کی مسز' جنہیں اتنا کیئرنگ شوہر ملا۔" اس کے سراہتے لہجے میں کہیں کہیں حسرت بھی تھی جو تطہیر کو واضح محسوس ہوئی تھی۔ وہ اوکا بیگم کے لیے ایک شال پسند کر رہے تھے۔ وہ لمحہ بھر تو اس کے لفظوں پر غور کرتے رہے اور پھر ترچھی نگاہ سے اسے دیکھا۔ "کاش! مسز کو بھی اندازہ ہوتا۔" وہ صرف دل میں سوچ کر رہ گئے تھے۔

انہوں نے عنایا کے لیے بھی ایک ہلکے انگوری رنگ کی میکسی نما فراک پسند کی' لچکیلے سے اس فراک کے گھیر اور گلے پر سرخ اور گہرے سبز موتیوں اور نگوں کا کام تھا۔ اس کے ساتھ ایک سرخ اسکارف بھی لے کر پیک کروایا تھا۔
"تھینک یو..." ایک طمانیت بھرا احساس تھا جو اس پیکٹ کو تھام کر عنایا کو محسوس ہوا تھا۔
انہوں نے اسٹور میں بنے کیفے پوائنٹ پر آئس کریم کھائی اور بہت اچھے طریقے سے ایک دوسرے کو "خدا حافظ" کہا تھا۔ تطہیر شاہ یقیناً" خود کو یہ باور کروا چکے تھے کہ یہ ان کی آخری ملاقات ہے۔ مگر ایسا نہیں تھا۔ وہ اگلے دن ان سے پہلے ایئرپورٹ پہنچ چکی تھی۔ اس نے وہاں آنے سے پہلے بہت سوچا تھا۔ اسے بہت گلٹ بھی تھا کہ وہ کیوں ایک شادی شدہ مرد کے پیچھے بھاگ رہی ہے۔ کیوں کسی عورت کے حق پر ڈاکہ ڈال رہی ہے۔ مگر وہی بے اختیاری کا عالم تھا۔ یقیناً" تطہیر شاہ کی شخصیت ایسی تھی کہ جسے وہ چاہتے ہوئے بھی بھلا نہ پا رہی تھی۔ ان کا لہجہ تو ایک رانگ کال پر ہی کہیں دستک دے گیا تھا اور پھر جیسے ان سے باتیں ہوئیں اور پھر اس رات ان کا دلیل' سمجھانے کا انداز دل میں کہیں اترتا چلا گیا تھا۔ اس رات اس نے تطہیر شاہ کے بارے میں کتنا سوچا تھا کہ انہیں تو مجھ سے نفرت نہیں ہوئی۔ گھن نہیں آئی۔ سخت لہجے میں سرزنش نہیں کی۔ میرے اپنوں نے تو مجھ سے ہمیشہ فاصلہ رکھا۔ غصے سے بات کی' انہیں گھن آئی میرے پروفیشن سے' بے عزتی محسوس ہوئی میرے وجود سے' ہمیشہ موت سے ڈرایا' دھمکایا' پھر وہ کیوں محبت سے قائل کرتے چلے گئے؟ ان کا نرم لہجہ جادو بھرتا چلا گیا۔ اس کے دل میں بے چینی تھی' بے قراری تھی' بے اختیاری تھی' وہ چاہنے کے باوجود خود کو روک نہیں پائی' کسی مقناطیسیت کے تحت بے بسی سے کھنچی جا رہی تھی۔ وہ دماغ کو دوستی کے رہنما کے نام کی جھوٹی سچی تسلیاں دیتی ان سے پہلے ایئرپورٹ پہنچ گئی تھی۔
وہ اسی انگوری فراک میں ملبوس تھی' بلکہ سرخ اسکارف بہت اچھے طریقے سے سر پر لپیٹ رکھا تھا۔ وہ کہیں سے بھی پہلے والی ماسنتوشہ نہیں لگ رہی تھی' بلکہ وہ اب عام سی ڈھیلے سے جوڑے والی ماسنتوشہ بھی نہیں لگ رہی تھی' کیونکہ اب عنایا تھا بہت پر وقار پیاری سی عنایا ہی تھی۔ وہ ہاتھوں میں سرخ گلاب کا بوکے لیے ان کی منتظر کھڑی تھی۔ سنگاپور کے منظم لوگوں کی طرح یہ پانچ منزلہ صاف ستھرا ایئرپورٹ بھی خاصا منظم نظر آ رہا تھا۔ فلائٹ کی گزشتہ معذرت کے ساتھ اب روانگی کی اناؤنسمنٹ گونجنے لگی۔
"اللہ حافظ۔" تطہیر شاہ نے بہت آہستگی سے کہا۔
وہ پھول پہلے ہی تھینک یو کے ساتھ لے چکے تھے اور اپنے سامان پر رکھ چکے تھے۔
"پھر کبھی آئیے۔" خدشے کی نمی اس کے گلے میں اٹکی ہوئی تھی۔ دل میں اس کے لیے جو بھی تھا' مگر اپنی جیبوں میں ہاتھ پھنسائے اس کے روبرو کھڑے تھے' مگر نظریں زمین پر جمی تھیں۔ "پلیز..." نمی سانسوں میں اٹکنے لگی تھی۔ "پلیز چند لمحوں کے لیے ہی سہی' پہچان ہی سہی' مگر اس تعلق کو برقرار رکھنا۔"
"آپ چاہتی ہیں یہ تعلق برقرار رہے۔" انہوں نے زمین سے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں چند لمحے یوں ہی دیکھتے رہے۔ دونوں کی نظریں سپاٹ تھیں۔ ایک دوسرے کے جواب کی منتظر سی' مگر پھر بھی تطہیر شاہ کو جانے کہاں سے تقویت ملی تھی۔ وہ بہت اٹل لہجے میں بولے تھے۔ "میں ضرور آؤں گا۔"
ان کی انگلی میں ایک چاندی کی انگوٹھی تھی جس میں خاصا قیمتی پتھر لگا ہوا تھا۔ انہوں نے وہ اتاری اور خاموشی سے عنایا کی انگلی میں ڈال دی۔ پہلے وہ انگوٹھی اس کی نازک انگلی میں بہت ڈھیلی تھی' مگر اس میں ایسا لمس تھا جو اس کی ہر رگ میں اتر کر دل سے گزر رہا تھا۔ اس نے مٹھی زور سے بند کر لی' مبادا ہاتھ کھلنے سے یہ لمس رگ سے جدا نہ ہو جائے' گر نہ جائے' ٹوٹ نہ جائے' بکھر نہ جائے۔

☼ ☼ ☼

وہ بہت دیر سے مالی کا سر کھا رہے تھے۔ آج ان کا آف تھا اور اکیلے بیٹھ بیٹھ کر تنگ آگئے تھے تو سرِ شام ہی لان میں نکل آئے اور اپنی مرضی کے مطابق پودوں کی کانٹ چھانٹ کروا رہے تھے۔ انہوں نے کتنی بار بلاوجہ ہی اسے ڈانٹا' پھر جھنجلا گئے۔ گویا اپنا غصہ خوامخواہ غریب مالی پر اتار رہے تھے۔ ازکا بیگم انہیں بتائے بغیر کل سے میکے گئی ہوئی تھیں۔ شروع شروع میں جب وہ بغیر اطلاع دیے کہیں جاتیں تو وہ انہیں فون کرکے خیریت پوچھا کرتے' واپسی کا ارادہ معلوم کرتے' مگر وہ جس انداز میں جواب دیتیں تو آہستہ آہستہ انہوں نے پوچھنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ گویا یوں گھر سے جانا ان کا معمول بن گیا تھا۔ کچھ دیر پہلے انہوں نے منیب شاہ کو فون کیا تھا۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ کمبائن اسٹڈی میں کسی ٹیسٹ کی تیاری کر رہا تھا۔ گویا اس سے بھی چند منٹ ہی بات ہو سکی تھی۔ وہ اس وقت بہت اکیلا محسوس کر رہے تھے۔

انہیں سنگاپور سے آئے تقریباً" ایک ماہ سے زیادہ ہو چکا تھا۔ یوں تو جب بھی وہ وہاں سے آتے تھے۔ تو کتنے ہی دن جھنجلاہٹ' الجھن کا شکار رہتے تھے' مگر اس بار بات ہی کچھ مختلف ہو گئی تھی۔ انہوں نے ہر پہلو پر بہت سوچا تھا۔ مگر جواب وہی مہیب گہرا سناٹا۔ انہوں نے زیادہ سے زیادہ خود کو نارمل رکھنا چاہا تھا۔ یہاں آنے کے فوراً" بعد منیب کو تین' چار دن کے لیے گھر لے آئے۔ پھر اس کے واپس جانے کے چند دن بعد ہی اس سے ملنے گئے تھے۔ کاروباری میٹنگز' گھریلو حق و فرائض اتنا مصروف رہنے کے باوجود وہ کون سی جگہ تھی جو مسلسل خالی تھی؟ وہ خالی پن دور کرنے کے لیے ہی اسے فون کرتے رہتے تھے اور اگر خود نہ کرتے تو اس کا ضرور آجاتا تھا۔ اب بھی خالی پن ان کے اندر اتر رہا تھا جب موبائل ٹون بجی۔ اسکرین کو دیکھتے ہی روح تک سرشار ہو گئی تھی۔ وہ لان میں رکھی بید کی کرسی پر ٹک گئے تھے۔ مالی نے بھی قدرے سکون کا سانس لیا اور درخت چھانٹتا خاصا آگے چلا گیا۔

"اور سنائیں کیا کر رہے تھے۔" عنایا نے رسمی سلام دعا کے بعد سرسری پوچھا تھا۔

"آپ کو بھولنے کی کوشش۔" تطہیر شاہ کے جواب پر اس کی آواز میں خفگی ابھری تھی۔

"کیوں ہر بار ایسے ہی جواب دیتے ہیں۔ کیا واقعی مجھے بھول جانا اتنا آسان ہے۔" اس کے استحقاق بھرے لہجے پر ان کا فلک شگاف قہقہہ لگا جو یقیناً" دور کھڑے مالی کو بھی محسوس ہوا تھا۔ تب ہی اس نے گردن موڑ کر انہیں دیکھا۔ ان کا تمتماتا چہرہ دیکھ کر وہ بھی مسکرایا اور پھر اپنے کام میں مصروف ہوتا مزید آگے نکل گیا۔ مگر تطہیر شاہ کی گہری مسکان اس بات کی غماز تھی کہ وہ عنایا کے انداز پر خوب محظوظ ہوئے ہیں۔ کوئی تو ہے جو ان پر حق جتائے۔

"کم از کم اس ایک زندگی میں تو نہیں مادام۔" انہوں نے مسکراہٹ روکی اور ٹانگ پر ٹانگ چڑھاتے ہوئے بولے۔ "آپ سنائیں' آپ کیا کر رہی تھیں۔"

"آپ کو یاد۔"

"رئیلی۔" اس کے سہ لفظی جملے پر وہ قدرے حیران ہوئے۔ "کیا میں بھول گیا تھا' جو یاد کر رہی تھیں۔"

"مطلب۔" وہ حقیقتاً" اس کی باتوں سے الجھ ہی جاتی تھی۔

"مطلب یہ مادام۔" انہوں نے ٹانگ سے ٹانگ اتاری اور ٹہلتے ہوئے اندر لاؤنج کی طرف بڑھ گئے۔ "یاد انہیں کیا جاتا ہے جو بھولنے لگیں' جو چیز آپ کے دل و دماغ کے پردوں پر چپک جائے اسے تو بھولنے کی کوشش کی جاسکتی ہے' تاکہ نارمل لوگوں کی طرح زندگی گزاری جائے۔"

وہ اس کی گاڑھی باتوں سے جہاں متاثر ہوئی تھی وہاں بہت' بہت دیر الجھی رہتی۔ وہ کتنی ہی دیر اسے الجھاتے رہے۔ فردوس نے میز پر چائے لاکر رکھی تھی جو وہ باتوں کے دوران پی بھی گئے تھے۔ فون بند ہونے کے خاصی دیر بعد بھی ان کے چہرے پر تازگی تھی۔ جانے وہ گرم چائے سے تھی یا خوب صورت لہجے سے' مگر ان کی نگاہوں کے سامنے بڑا سا ایل سی ڈی آن تھا۔ جس پر کوئی ڈراما یا کمرشل چل رہے تھے' لیکن تطہیر شاہ وہاں سے کہیں دور کھوئے ہوئے تھے۔ وہ چونکے تو ازکا بیگم کی آمد پر۔

ان کے چہرے پر ناگوار سی تھکاوٹ تھی۔ وہ سیدھی اپنے کمرے کی جانب بڑھنے لگی تھیں۔

"بتانے کی زحمت تو آپ نے کبھی محسوس نہیں کی' اب کیا آمد پر چند لمحے رکنے کی زحمت بھی نہیں گوارہ۔" تطہیر شاہ کے ٹوکنے پر لحہ بھر وہ رکیں اور گردن موڑ کر دیکھا۔

"ایم سوری۔ میں نے دیکھا نہیں۔" وہ بے نیازی سے جھوٹ بول کر دوبارہ چل دیں' جس پر وہ اندر تک سلگ گئے اور یک لخت اٹھے اور ان کے پیچھے ہی چل دیے۔

"دیکھا نہیں یا دیکھنا نہیں چاہتیں۔" وہ چبا کر بولے تھے۔

"کہنا کیا چاہتے ہو تم۔" ازکا بیگم کے پلٹنے سے زیادہ آواز تیز تھی۔

"یہ ہی کہ میں آپ کا شوہر ہوں' آپ کے آنے' جانے کا مجھے علم ہونا چاہیے' میں بھی کہیں آتے جاتے آپ کو ضرور بتاتا ہوں' یہ ہی آپ کا بھی فرض بنتا ہے۔" ان کی جتاتی تیز آواز پر وہ قدرے ڈھیلی پڑیں اور بیڈ پر بیٹھتے ہوئے کندھے اچکائے۔

"تو مت بتایا کرو' میں نے کبھی عدالت نہیں لگائی تمہارے لیے۔"

"تو لگائیں عدالت۔" وہ بے بسی سے دونوں ہاتھ اٹھا کر قدرے زور سے بولے۔ "حق ہوں میں آپ کا' جتائیں اس حق کو۔" جانے آج انہیں اتنا غصہ کیوں آگیا تھا۔ ایسا کیا ان کے اندر ہو رہا تھا۔ وہ کون سی ٹوٹ پھوٹ تھی جس سے وہ تھک گئے تھے۔ حالانکہ یہ بے نیازی تو ازکا بیگم کی ذات کا حصہ پہلے دن سے تھی۔ مگر آج ان کی بے نیازی تطہیر شاہ کے لیے قابل برداشت نہیں تھی۔ وہ غصے سے سرخ ہو رہے تھے جس پر وہ اور زیادہ چڑ گئیں۔

"پلیز۔ میرا سر مت کھاؤ' میں اتنی سلی نہیں ہوں کہ تمہارا کہیں آنا' جانا مجھے متاثر کرے' مجھے ان چیزوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" وہ اپنی بھاری جیولری اتار کر سائیڈ ٹیبل پر پٹخنے والے انداز میں رکھ رہی تھی' یہ دیکھے بنا کہ ان کے جملے کی دھار تطہیر شاہ کے چہرے کو کیسے چیر رہی ہے۔

"تمہیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔" انہوں نے پہلی بار اسے آپ کی جگہ تمہیں وہ بھی خاصا چبا کر کہا تھا۔ جس پر انہوں نے کرنٹ کھا کر انہیں گھورا' گویا عزت گھٹتی محسوس ہوئی تھی۔ مگر وہ دانت جمائے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے جملے کی تکرار کر رہے تھے۔

"تمہیں کوئی فرق نہیں پڑتا' میرا کہیں آنا جانا تمہیں متاثر نہیں کرتا' تمہیں کوئی فرق نہیں پڑتا' کوئی فرق بھی نہیں' تو ٹھیک ہے ازکا بیگم۔" انہوں نے جبڑے جماتے ہوئے ناک پھیلائی اور گہری سانس کھینچی۔ وہ کچھ سوچتے ہوئے اثبات میں دھیرے دھیرے سر ہلا رہے تھے۔ "ٹھیک ہے' اب متاثر بھی کرے گا اور فرق بھی پڑے گا۔ میں ہی بے وقوف تھا۔ جو اتنے برس ایک بے حس دیوار سے سر پھوڑتا رہا' اپنی زندگی کے خوب صورت لمحے اندھے کنویں میں گزار دیے' مگر اب اور نہیں' تم نے تو فیصلہ کرنے میں میرے لیے آسانی کر دی ازکا بیگم' میں تطہیر شاہ۔" انہوں نے پوری آنکھیں کھولیں۔ "دوسری شادی کر رہا ہوں۔"

"کیا۔ کیا کہا تم نے۔ تم اور شادی۔" وہ تمسخرانہ ایسے ہنستے ہوئے کھڑی ہوئیں جیسے اپنی زندگی کا سب سے بڑا مذاق سن لیا ہو۔

"جو تم نے سنا ہے وہی۔" تطہیر شاہ کے آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے پر وہ بھی مقابل تن کر کھڑی ہو گئیں اور سر سے پاؤں تک انہیں جانچا۔

"اچھا۔ اتنی ہمت بھی ہے تم میں' ہونہہ۔" انہوں نے تنی گردن جھٹکی۔ "یہ جانتے بوجھتے کہ میرے "سامنے" تمہاری بڑھاپے کے زینے پر قدم رکھتیں' بچوں والی دو بہن کھڑی ہیں' پھر بھی' واہ کیا

ہمت ہے۔" ان کے چبا چبا کر جتانے اور کندھے اچکانے پر تطہیر شاہ کا دل چاہا کہ ان کے منہ پر اک کھینچ کر طمانچہ دے ماریں، مگر وہ کمزور مرد نہیں تھے جو ایک عورت وہ بھی بیوی پر ہاتھ اٹھاتے وہ صرف ایک غصے بھرا ہنکارا بھر کر رہ گئے۔

"تو تمہارے خیال میں تمہارے بھائیوں نے میری بہنوں کو بہت خوش رکھا ہوا ہے' ہونہہ۔۔۔ عرس اور دوسری تقریبات کی آڑ میں وہ جو کچھ کرتے ہیں نا' وہ میں بھی بہت اچھی طرح جانتا ہوں اور تم بھی' اس لیے میرا منہ مت کھلواؤ۔"

"میرے بھائی جو کچھ بھی کرتے ہیں' مگر کبھی تمہاری بہنوں کے مقابل کسی کو لا کر کھڑا نہیں کیا' بیوی کی عزت کسی کو نہیں دی' سمجھے تم۔" وہ غصے میں تنی ہوئی دو قدم آگے بڑھ گئیں۔ اب وہ ان کی پشت پر کھڑی تھیں' مگر منہ دوسری جانب تھا۔

"اچھا۔۔۔" وہ رخ پھیر کر ان کی پشت کو گھورنے لگے۔ "وہ جو کچھ کرتے ہیں' حرام ہے یا حلال ہے' وہ سب درست ہے تمہارے نزدیک۔" حرام' حلال کی بات پر وہ کرنٹ کی تیزی میں پلٹی تھیں۔

"حرام ہے۔۔۔ حلال ہے' درست ہے یا غلط' تمہیں کس نے روکا ہے' جو وہ کرتے ہیں تم بھی کر لو وہ سب کچھ' مگر میرے مقابل لا کر کسی کو کھڑا کرنے کی جرات مت کرنا۔" وہ ایک دوسرے کے نزدیک شکاریوں کی طرح کھڑے تھے۔ وہ اتنے نزدیک تھے کہ ایک دوسرے کے سانس کی چبھن اپنے اندر محسوس کر سکتے تھے۔

"کیوں۔۔۔ کیا کر لوگی تم۔" انہوں نے ان کے دونوں بازو جکڑے "زعم کس چیز پر ہے تمہیں" انہوں نے انہیں جھنجھوڑا تو پوری کی پوری ہلنے لگیں۔

"اگر تمہارے گدی نشین پیر' صوفی بھائی اپنے بیوی' بچوں کو' اپنے گھر کو صرف اس لیے تباہ کرتے ہیں کہ ان کی عقل کا تقاضا حلال کے بجائے حرام پر اترتا ہے اور ان کا بہنوئی حرام پر تھوکتا بھی نہیں' تو آئیم سوری۔۔۔ ہونہہ۔۔۔" انہوں نے انہیں جھٹکے سے ایسے چھوڑا کہ سنبھلنا ان کے لیے مشکل ہو گیا اور وہ صوفے پر دھم سے بیٹھ گئیں۔

"ان سے کہو' وہ جو کر سکتے ہیں کر لیں اور جو تم کر سکتی ہو وہ بھی شوق سے کر لو' اگر روک سکتی ہو تو روک کر دکھاؤ۔" وہ صوفے پر بازو جمائے خاصے ان پر جھکے ہوئے تھے۔ ان کی آواز میں تلواروں کی درشتگی تھی۔ "میں اسی ہفتے سنگاپور جا رہا ہوں' شادی کرنے' سمجھی تم۔" وہ گردن جھٹک کر سیدھے کھڑے ہوئے اور تیزی سے باہر نکل گئے۔

ازکا بیگم حیرت و خوف سے ایسے تھیں جیسے کسی کرنٹ نے جسم میں سے ساری توانائی جذب کر لی ہو۔ جیسے خون کا آخری قطرہ بھی منجمد ہو گیا ہو۔ وہ بس پتھر کی رہ گئیں ہوں۔ ان کی آنکھیں ابل کر باہر آ رہی تھیں کہ یہ آج اسے ہو کیا گیا۔ وہ تو اکثر ایسے ہی بولتی تھیں۔ شروع سے ان کا یہی انداز رہا تھا یات کرنے کا' پھر آج کیا چبھ گیا' اتنا لال بھبھوکا چہرہ' یہ الفاظ' یہ انداز تو انہوں نے پندرہ سال میں پہلی بار دیکھے تھے۔ وہ تو خام خیالی میں تھیں کہ تطہیر شاہ ان کے گدی نشین میکے سے ڈرتے ہیں۔ وہ بہنیں کمزوری ہیں اور ساری زندگی اس ڈر اور کمزوری کے ہاتھوں منمناتے رہیں گے۔ آگے پیچھے پھریں گے۔ مگر آج کا رویہ ان کی سانسیں روک دینے کے لیے کافی تھا۔ اتنی ذلت' ڈراوا' بے بسی' آخر وہ شادی کر کیوں رہا ہے؟ وہ ابھی بھی جان نہ پائیں۔ کیا وہ اسے روک سکتی تھیں؟ کیا ان کے وہ بھائی جو اپنے حجروں میں آئے دن کوئی رنگین چھپائے رکھتے تھے' روک سکیں گے؟ انہیں تطہیر شاہ کی جرات اور اپنی بے چارگی پر رونا آیا تھا۔ خواہ ان میں کتنی ہی اکڑ تھی' زعم تھا' مگر تھیں تو عورت اور اب اپنی بے بسی پر رونے کے سوا اور کیا کرتیں تو وہ بہت دیر صوفے پر سر ٹکائے روئی تھیں۔

☼ ☼ ☼
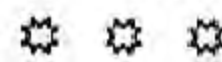
تطہیر شاہ کی زندگی دوران تعلیم ہی باپ نے جکڑ دی تھی اور ان کے طبعی جذبات بھی ازکا بیگم کے مزاج کے

مرہون منت تھے۔ چل سو چل زندگی گزر رہی تھی' مگر جب نرم گرم لمس نے آنکھوں کو لو دی' دل کی دھرتی کسی کے لہجے سے بھیگنے لگی اور پھر وہ سیراب اک اک لمس میں سما کر لاشعور پر قابض ہو گیا۔ وہ ایسے میں کیا کرتے۔ انہیں سنبھلنے کے لیے ازکا بیگم کا ہاتھ چاہیے تھا۔ پر وہ تو بہت اونچا تھا اور جو چیز پہنچ میں تھی۔ وہ اسے پانے کے لیے اتنے بے خود ہو رہے تھے کہ کسی ان دیکھی کشش سے کھینچے چلے جاتے تھے۔ غالباً" اگر وہ مضبوط اعصاب کے نہ ہوتے تو شیطان ان سے جیت گیا ہوتا۔ وہ کوئی پارسا' کوئی ماورائی مخلوق نہیں تھے اور نہ نور سے بنے فرشتے' وہ ہوش و حواس رکھتے' گوشت پوست سے بنے آخر انسان ہی تھے' گناہ ان سے بھی ہوتے تھے۔ رقص و سرور کی محفل میں چلے وہ بھی جاتے تھے۔ ہاں البتہ گناہ کو گناہ سمجھتے ضرور تھے۔ حرام حلال کی تمیز ضرور تھی۔ اڑتے بالوں' مسکراتے بھیگے' ہونٹوں سے جو نفاق ان کے اندر پھیلا تھا۔ تو کیا ضروری تھا' اپنی اس کمزوری کو شیطان کا ہتھیار بنا دیتے' انسانی تمدن کو خراب کرتے' جبکہ رب نے ان کے لیے پاکیزہ راہ نکالی تھی۔

پہاڑ کی چوٹی سے سرمئی مخملیں چادر پھسلتی نیچے آ رہی تھی۔ جھلملاتے پورے چاند پر سنہری چاندنی محو رقص تھی۔ چاند کے گرد بنے سنہرے مضبوط ہالے نے جہاں تاروں کو گہنا دیا تھا۔ وہاں سرمئی رات کا لبادہ دھیرے' دھیرے چاک کیا تو ہر چیز مست ہوا اور نقرئی کرنوں کی میت میں جگمگا کر بقعہ نور بن گئی۔ وہ ان کی سنگت میں نکھری ہوئی لگ رہی تھی۔ تطہیر شاہ کی پندرہ سالہ ازدواجی زندگی میں شاید ہی کوئی ایسا پر سکون لمحہ آیا ہو' جتنا وہ اب محسوس کر رہے تھے۔ ان کی شادی ملائیشیا میں عنایا کی والدہ کے گھر پر ہوئی تھی۔ اس کی والدہ اپنی بیٹی کی واپسی اور پھر شادی پر بہت خوش تھیں۔ وہ تطہیر شاہ کی بھی بہت مشکور تھیں' جنہوں نے نہ صرف اسے واپسی کا رستہ دکھایا بلکہ پورا بدل دیا تھا۔

وہ تقریباً" پندرہ دن ملائیشیا کے ٹور پر رہے تھے۔ اس دوران ازکا بیگم نے تو ان کی ایک بھی کال ریسیو نہیں کی' مگر مشعب شاہ سے وہ رابطے میں تھے۔ بے شک ابھی انہوں نے مشعب کو اپنی شادی کے بارے میں نہیں بتایا تھا' بلکہ اندازہ تھا کہ ازکا بیگم نے بھی خلاف توقع اسے کچھ نہیں بتایا تھا۔ جہاں یہ حیرت تھی' وہاں اطمینان بھی تھا کہ چلو میں خود ہی جا کر اسے طریقے سے بتاؤں گا اور اس نے تو یقیناً" باپ کو خوش دیکھ کر خوش ہی ہونا تھا۔ غالباً" وہ تو خود ماں کے رویے سے عاجز تھا۔

ان کی کل پاکستان واپسی تھی اور واپسی سے پہلے ہی وہ عنایا کا ذہن آہستہ آہستہ ازکا بیگم کے مزاج سے آشنا کر چکے تھے۔ ان کی فلائٹ تقریباً" رات کے وقت اسلام آباد پہنچی تھی۔ انہوں نے چھپ کے شادی نہیں کی تھی اور خوشی ہوتی' اگر ازکا بیگم بخوشی اجازت دے دیتیں' مگر اجازت تو کیا انہیں تو سرے سے فرق ہی نہیں پڑتا۔ تطہیر شاہ کے کہیں بھی ہونے نہ ہونے سے۔ اسی لیے وہ عنایا کو سیدھے اپنے گھر لے آئے تھے۔ اس نے ان کے خاندان کی عورتوں کی طرح نہ صرف بڑی سی شال لپیٹ رکھی تھی۔ بلکہ چہرہ بھی ڈھانپ رکھا تھا اور یہ سب یقیناً" اس نے تطہیر شاہ کے کہنے پر کیا تھا۔ محبت' دیوانگی کے کہنے پر کیا تھا۔ محبت کی راہ شاید اپنا رستہ خود بنواتی ہے اور وہ اس راہ گزر کی راہی تھی سو اپنی آنکھیں بند کیے اس کی آنکھوں سے دیکھتی' اس کا ہاتھ تھامتی۔ سنگاپور کی مشہور رقاصہ سے تطہیر شاہ کی بیوی بن گئی۔ شاید تطہیر شاہ کی آنکھیں زیادہ خوب صورت دیکھتی تھیں۔ اسی لیے یہ راہ خاصی دلنشین خاصی پر حسین تھی۔

وہ جب گھر کے اندر پہنچے تو غیر معمولی سناٹے کا احساس ہوا تھا۔ ازکا بیگم سے تو یہ ہی توقع تھی' بلکہ اچھا ہی تھا کہ وہ خود ہی سائیڈ پر تھیں' ورنہ جانے کیا ری ایکٹ کرتیں' لیکن جب فردوس نے مشعب شاہ کے گھر آنے کا بتایا تو انہیں بہت حیرانی ہوئی۔ غالباً" پرسوں تو بات ہوئی تھی۔ اس نے اپنے آنے کا کوئی ارادہ نہیں بتایا تھا۔ ویک اینڈ میں بھی ابھی دن تھے۔

انہوں نے عنایا کو فردوس کے ساتھ دوسرے کمرے میں بھجوا دیا اور اسے کھانے پینے کے بندوبست کا کہا تھا۔ فردوس کی نظروں سے اندازہ ہوتا تھا کہ اسے ان کی دوسری شادی کا علم ہے یا پھر اس کی اتنی عمر تو تھی ہی کہ دیکھ کر سمجھ گئی ہو۔ وہ عنایا کو ایک بہترین کمرے میں لے گئی تھیں۔ وہ پہلے مشیب کے کمرے کی طرف بڑھے' دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ وہ ایک کھلی ہوئی البم پر چہرہ رکھے الٹا لیٹا سو رہا تھا۔ وہ اندر آئے اسے سیدھا کیا البم بند کر کے سائیڈ پر رکھی۔ اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کے سرخ گالوں پر شفقت بھرا بوسہ دیا اور کمبل اوڑھا دیا۔ اس کے برابر دوسرے بیڈ پر اس کا دوست کعب سو رہا تھا۔ کعب داؤد کا بیٹا تھا۔ ان دونوں کی بچپن سے ہی بہت دوستی تھی۔ بلکہ جب تطہیر شاہ نے مشیب کو ایبٹ آباد داخل کروایا تو داؤد نے کعب کو بھی ساتھ ہی داخل کروایا تھا۔ وہ دونوں ویک اینڈ پر اکثر اکٹھے ہی راولپنڈی آتے تھے۔ مگر کعب اپنے گھر چلا جاتا تھا۔ آج کل داؤد اپنی بیوی کے ساتھ بیرون ملک گیا ہوا تھا۔ شاید اسی لیے کعب مشیب شاہ کے ساتھ آگیا۔ انہوں نے اسے بھی پیار کرتے ہوئے کمبل درست کیا اور دروازہ بند کر کے باہر آگئے۔ ان کا رخ اب اپنے کمرے کی طرف تھا۔ وہ سنہری ناب گھما کر اندر داخل ہوئے تھے۔ جس چیز نے ان کا سب سے پہلے استقبال کیا وہ مہیب اندھیرا تھا۔ اذکا بیگم کبھی کمرے میں اندھیرا نہیں کرتی تھیں۔ انہیں اندھیرے سے نفرت تھی۔ وہ تو سوتے ہوئے بھی تیز نائٹ بلب جلاتی تھیں۔ گویا آج اندھیرا کر کے اپنی نفرت کا اظہار کر رہی تھیں۔ ان کا ہاتھ پہلے سوئچ پر پڑا اور کمرہ مدھم سا روشن ہو گیا۔ چھت پر لگا ایک چھوٹا سا گلوب آن ہوا تھا۔ جس کا گول ہالہ چھت سے منعکس ہو کر بیڈ پر روشنی بکھیر رہا تھا۔ وہ کچھ دیر کمرے کے بیچ کھڑے اذکا بیگم کی پشت کو دیکھتے رہے۔ وہ بیڈ کی ایک طرف کروٹ لیے لیٹی تھیں۔ آنکھوں پر بازو رکھا ہوا تھا۔ دروازہ کھولنے' لائٹ آن ہونے اور پھر تطہیر شاہ کے قدموں کی بھاری آواز پر بھی ان میں ذرا برابر جنبش نہ ہوئی۔ یقیناً" وہ سونے کی اداکاری کر رہی تھیں۔

"طبیعت ٹھیک ہے آپ کی۔" آج ان کا وہی شستہ پرانا لہجہ تھا۔ حالانکہ سنگاپور جانے سے چند دن پہلے ان دونوں کے بیچ تلخ کلامی کے بعد جامد خاموشی ہونے سے تو یہ ہی خیال تھا کہ شاید اب خاموشی کی چادر کبھی اٹھے گی نہیں' مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔ وہ اس کا جواب نہ پا کر چند قدم آگے بڑھے اور بالکل سرہانے کھڑے ہو گئے۔

"مشیب کب آیا تھا' وہ ٹھیک تو ہے۔" "نہیں کم از کم اتنا تو اندازہ تھا کہ وہ جاگ رہی ہیں۔ "میں کچھ پوچھ رہا ہوں آپ سے۔" انہوں نے نرمی سے ان کی کلائی پکڑ کر چہرے سے ہٹائی۔ گلابی سی آنکھیں خاصی بوجھل لگ رہی تھیں۔ جن میں نمی واضح تھی۔ وہ چند لمحے انہیں دیکھتے رہے۔ اذکا بیگم بھلے کتنی ہی خود پسند گھمنڈی تھیں' مگر تھیں تو ایک عورت ہی۔ ان کی راج دھانی پر ایک سوتن نے قدم رکھا تھا۔ یہ کوئی کم سانحہ نہیں تھا۔ تطہیر شاہ نے تاسف سے سوچا۔

"آخر وہ متاثر ہوئی ہیں۔ فرق تو پڑا ہے "کاش! ابھی پہلے اس درد کو محسوس کر لیتیں۔" وہ لمبا سانس بھر کر ان کے سامنے ہی کرسی پر بیٹھ گئے۔ وہ جان کر بات کر رہے تھے۔

"طبیعت ٹھیک ہے؟ کھانا کھایا آپ نے؟"

"یہ ناز نخرے اپنی اس نئی نویلی محبوبہ کے اٹھاؤ۔" اذکا بیگم کے اس قدر چبا کر محبوبہ کہنے پر انہوں نے خوب حظ اٹھایا اور ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر کرسی سے ٹیک لگالی۔

"چلیں شکر ہے' آپ نے کسی کے ناز اٹھانے کی اجازت تو دی۔"

"ہونہہ۔" انہوں نے دوسری جانب چہرہ پھیر لیا تھا۔

"اذکا بیگم جو ہونا تھا وہ اب ہو چکا ہے' بہتر ہے آپ اسے قبول کر لیں اور میرا آپ سے وعدہ ہے۔" وہ چوڑا ہاتھ سینے پر رکھتے ہوئے بولے تھے۔ "آپ کے

کسی حق میں کوئی کمی نہیں آئے گی' جب تک کہ آپ خود اپنے عمل سے نہ چاہیں۔"

"مجھے نیند آرہی ہے' چلے جاؤ یہاں سے۔" وہ اپنی نم آواز کو خاصا قابو میں رکھ کر دوسری جانب کروٹ بدل گئیں۔

"یہ تو میں جان گیا ہوں کہ اس وقت آپ کو کتنی نیند آرہی ہے۔" قدرے آگے ہو کر بیٹھ گئے۔ "آپ میرے اکلوتے بیٹے کی ماں ہیں' اس اعتبار سے بھی میرے لیے زیادہ معتبر ہیں۔ پلیز۔ پلیز میں نہیں چاہتا ہمارے رشتے میں مزید بگاڑ پیدا ہو۔" تطہیر شاہ کی اتنی محبتوں پر وہ اپنی سابقہ جون میں لوٹ آئیں اور کمبل پھینک کر اٹھیں اور چلا کر انگشت دروازے کی طرف اٹھائی۔ "میں نے کہا' یہاں سے چلے جاؤ' تم نے سنا نہیں۔"

وہ بہت حد تک ان کی کیفیت سمجھ رہے تھے' مگر انہیں خود پر بھی اتنا یقین تھا کہ زیادہ نہ سہی' مگر جتنا ان کے درمیان سابقہ نپا تلا تعلق ہے۔ وہ اپنے رویے سے بحال کر لیں گے۔ وہ کچھ دیر وہاں خاموشی سے بیٹھے رہے۔ پھر عنایا کے پاس آگئے۔

☼ ☼ ☼

وہ صبح ذرا دیر سے اٹھے تھے کچھ سفر کی تھکان تھی۔ کچھ اذکا بیگم کا رویہ اور پھر یک لخت ہی مشیب شاہ کو بھی فیس کرنا تھا۔ بھلے عنایا کی سنگت سب کچھ بھلا دینے کے لیے کافی تھی۔ مگر پھر بھی رات خاصی الجھن میں گزری تھی۔ شاید اسی لیے آنکھ کھلنے میں ذرا دیر ہو گئی تھی۔ وہ تیار ہو کر ڈائننگ ٹیبل کی طرف آرہے تھے۔ جہاں اذکا بیگم پہلے سے ہی ناشتے میں مصروف تھیں۔ ان کے سامنے کعب اور برابر میں مشیب شاہ بیٹھا تھا۔ وہ پلیٹ میں رکھے کباب اور آملیٹ کو چھری سے بس کاٹے جا رہا تھا۔ جیسے ہی اس کی نظر باپ پر گئی وہ کرسی دھکیل کر اٹھا اور ان کے قریب آگیا۔ وہ ہی معصوم کول گلابی سا چہرہ جسے دیکھ کر ہی تطہیر شاہ کی ساری تھکاوٹ اتر جاتی تھی۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے اپنی بانہیں کھول دیں۔ "آؤ میری جان" مگر وہ چند قدم دور رک کر' سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

"بابا آپ کہاں تھے؟"

"ملائیشیا مائی ڈیر! میں نے آپ کو بتایا تو تھا۔" وہ دو قدم آگے بڑھے تھے۔ یقیناً" اسے لپٹانے کے لیے' مگر وہ "لیکن کیوں" کہتا ہوا ایک قدم اور پیچھے ہو گیا۔ اس کے کیوں پر تو وہ لمحہ بھر کرنٹ کھا گئے اور اچٹتی نظر اذکا بیگم پر ڈالی۔ وہ گردن اکڑائے مزے سے سلائس پر جام لگا رہی تھیں۔ تطہیر شاہ نے ناک سے بھی سانس کھینچی اور مشیب کو کلائی سے پکڑ کر اپنے قریب کر لیا۔

"بتاؤں گا' پہلے ناشتا تو کر و یار!"

"بابا پہلے آپ بتائیں۔" اس نے قدرے خفگی سے اپنی کلائی چھڑوائی۔ اذکا بیگم نے دوسرے سلائس پر مارجرین لگا کر دونوں سلائس کو اوپر تلے رکھا اور کھانے لگیں۔ ایسے لگتا تھا وہ انہیں بیٹے کے کٹہرے میں دیکھ کر بہت خوش ہو رہی تھیں۔

"بتاؤ تطہیر شاہ' تمہارا بیٹا کچھ پوچھ رہا ہے تم سے۔" ان کی اتنی شان بے نیازی پر وہ اندر تک سلگ گئے تھے۔ گویا وہ ان کے بیٹے کو خوب مس گائیڈ کر چکی تھیں۔ ان سے یہ ہی توقع تھی' مگر اب سنبھالنا تو مشیب شاہ کو تھا۔ اسی لیے انہوں نے اسے کندھوں سے پکڑ کر اپنے بالکل قریب کر لیا۔ لیکن ان کے بولنے سے پہلے ہی اذکا بیگم سابقہ انداز میں بول پڑیں۔

"مشیب بیٹا! کیوں باپ سے جھوٹ بلوانے کی ضد کر رہے ہو' وہ بے چارہ اب کیا بتائے کہ اپنی منہ زور خواہشات سے مجبور ہو کر کسی کنواری لڑکی سے گل چھرے اڑا کر آرہا ہے' چھوڑو تم اسے اور میرے پاس آکر ناشتا کرو۔"

"او یو شٹ اپ۔" انہوں نے مشیب کے کندھے چھوڑ کر اذکا کی طرف متوجہ ہوئے۔ اتنے شدید غصے کو وہ صرف جبڑوں میں دبا کر رہ گئے تھے اور گہری سانس لے کر' خود پر ذرا قابو پایا۔ یقیناً" وہ اپنے بیٹے اور کعب کے سامنے کوئی تماشا نہیں چاہتے تھے۔ کعب تو گردن

جھکائے ایسے بیٹھا تھا۔ جیسے یہاں موجود نہیں' مگر مشیب نے باپ کی اتنی سخت آواز میں ماں کو سرزنش پہلی بار دیکھی تھی۔ وہ حیرت سے انہیں دیکھے گیا۔

"مشیب میری جان!" وہ لہجے کو خاصا کنٹرول کرچکے تھے اور پیار سے اس کے چہرے کو ہاتھوں میں بھرلیا۔

"بابا۔۔۔ آپ مجھ سے جھوٹ نہیں بولیں گے نا۔" بے ساختہ تطہیر شاہ کا سر نفی میں ہل گیا۔ انہیں سمجھ نہیں آرہا تھا کہ اب اسے کیسے اعتماد میں لیں۔

"بابا آپ میرے آئیڈیل ہیں۔ آپ کچھ غلط کرکے میرا آئیڈیل نہیں توڑ سکتے۔" اس کی روندھی آواز میں مزید نمی آگئی تھی اور بھوری آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تیرنے لگے تھے۔ "بابا پلیز بتائیں نا میرے بابا ایک ہندو ڈانسر سے شادی کیسے کرسکتے ہیں؟"

"ہندو ڈانسر۔" لفظ تطہیر شاہ کے ہوش اڑا گیا۔ انہوں نے شدید غصے اور بے بسی سے ازکا بیگم کے مغرور انداز کو دیکھا۔ غالباً" ازکا بیگم کے ذرائع اتنے بھی کم نہ تھے کہ ان کا میاں شادی کا کہہ کر چندرہ دن سنگاپور' ملائیشیا گزار آئے اور وہ پتا بھی نہ کرسکیں کہ شادی کس سے کی۔ سوتن کا دکھ اپنی جگہ تھا۔ مگر جب مقابلے پر رقاصہ آئی تو وہ کیسے برداشت کرتیں۔ وہ انہیں بھائیوں کے ذریعے تو روک نہیں سکی تھیں۔ مگر ان کی واحد کمزوری ان کا بیٹا تھا۔ وہ بے شک دیر سے سہی مگر یاد ضرور آیا تھا اور اسے سب سے بھاری ہتھیار کے طور پر استعمال کیا تھا۔ انہیں جیسے ہی پتا چلا کہ کل تطہیر شاہ اس لڑکی کے ساتھ پاکستان پہنچ رہے ہیں تو فون پر مشیب شاہ کی منتیں کرنے لگیں۔ "پلیز میری جان! صرف دو دن کے لیے' پلیز آجاؤ۔"

"مما! آپ کو پتا بھی ہے' بابا جان کے بغیر میرا دل نہیں لگتا" وہ کل آجائیں گے نا پھر مجھے ویک اینڈ پر لے آئیں گے۔ صرف تین' چار دن تو ہیں ویک اینڈ میں۔۔۔ ویسے بھی میرا کل ٹیسٹ ہے۔ مجھے وہ بھی دینا ہے۔" وہ بہت دیر ماں کو ٹالتا رہا تھا۔

"مشیب بیٹا! تمہاری زندگی میں میری اتنی بھی ویلیو نہیں کہ صرف دو دن پہلے ملنے آجاؤ" تمہارا باپ' تمہارا ٹیسٹ اتنے اہم ہیں۔"

"مما یہ بات نہیں ہے۔" وہ ان کی چوٹ پر تھوڑا بدبدایا۔

"تو اور کیا بات ہے مشیب' تمہیں پتا ہے؟ میں کتنا مس کررہی ہوں تمہیں' میری کتنی طبیعت خراب ہے' ماں ہوں تمہاری' اب کیا تمہیں بلانے کا حق بھی نہیں رہا میرا۔" وہ کہتے کہتے سچ مچ رونے لگیں اوران کا طاقت ور ہتھیار کام آگیا تھا۔

"مما پلیز آپ روئیں تو نہیں' میں آجاؤں گا' مگر کعب بھی میرے ساتھ رہے گا' کیونکہ انکل آنٹی جاپان گئے ہوئے ہیں۔"

"اوکے۔۔۔ اوکے۔۔۔ میری جان تم جسے مرضی لے آؤ' میں صبح ہی گاڑی بھجوا دوں گی' تم پیکنگ کرلو اور ہاں تمہارے پرنسپل سے میں نے اجازت لے لی ہے۔"

وہ اس کے گھر آنے پر بہت خوش ہوئیں۔ اس کے دوست کی خوب خاطر مدارت کی اور شام کی چائے کے بعد مشیب کو اپنے کمرے میں لے گئیں۔ وہ اسے اپنے پاس لیٹائے بہت دیر ادھر' ادھر کی باتیں کرتی رہیں۔ وہ بھی حیرانی سے ماں کی محبت سے محظوظ ہوتا رہا تھا اور جب انہوں نے بہت کھلے لفظوں میں باپ کا کارنامہ سنایا اور اپنی مظلومیت کا رونا رویا تو مشیب شاہ آنکھیں پھاڑے نفی میں سر ہلاتا رہ گیا تھا۔ جب اس کا من خوب بھر گیا تو خاموشی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ جانے وہ رویا تھا یا گھٹ گھٹ کر سسکتا باپ کا پرانا البم دیکھتا رہا۔ مگر دعا ایک ہی تھی کہ۔۔۔

"مما کی ساری غلط فہمیوں کی طرح یہ بھی صرف غلط فہمی ہو۔" جانے کب نیند آئی' کب باپ کمرے میں آیا' اسے کچھ نہیں پتا تھا۔ ہاں البتہ صبح اسے جلدی ازکا بیگم نے دلار سے اٹھایا تھا اور یہ بھی بتایا کہ اس کا باپ' اس دوشیزہ کے ساتھ آچکا ہے اور اب وہ باپ سے ہی ماں کی کہی باتوں کی تصدیق چاہ رہا تھا۔ یہ دیکھے بنا کہ اس کے لفظ ڈانسر پر باپ کا چہرہ سُن ہوگیا تھا۔

"بابا۔۔۔" اس کے آنسو آنکھوں سے پھسلنے لگے۔

"بابا۔۔۔ پلیز بتائیں نا آپ تو کہتے تھے کہ میں آپ کا سب کچھ ہوں' آپ کا فخر' آپ کا مان' پھر آپ اپنے مان کو کیسے توڑ سکتے ہیں۔ آپ تو مجھے ہمیشہ سر اٹھا کر چلنے کا کہتے تھے' پھر آپ میرے دوستوں کے سامنے کیسے میرا سر جھکا سکتے ہیں؟" وہ باپ کے ساتھ لپٹ کر زور زور سے سسکنے لگا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن اتنی تیز تھی کہ اس کی دھک دھک تطہیر شاہ کے دل پر ہتھوڑوں کی طرح برس رہی تھی۔ وہ خاموشی سے اسے اپنے ساتھ بھینچے کھڑے تھے۔ مگر قہر آلود نگاہیں ازکا بیگم پر تھیں۔ جن کی زندگی کا مقصد آج صرف تماشے سے محظوظ ہوتا ہی تھا۔

اس نے ان کے سینے سے سر اٹھایا اور ان کے خاموش چہرے کو دیکھا۔ وہ بھی گردن جھکا کر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بہت آہستگی سے نفی میں سر ہلا رہے تھے۔ وہ باپ کے ہلتے سر کو شادی کی تردید سمجھ کر خوش ہوا تھا۔ اپنا مان بچنے پر خوش ہوا تھا۔ شاید اسی لیے اس نے ایک سسکاری سے آنسو روکے اور ہلکے سے ہونٹ مسکرائے۔

"بابا میں نے مما سے کہا تھا' میرے بابا ایسا کچھ نہیں کرسکتے۔" ان کا ہلتا سر رکا اور آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "مما کو یقیناً" کوئی غلط۔۔۔" لفظ تو ابھی پورا ادا بھی نہ ہوا تھا' جب اس کی نظر باپ کے پہلو سے سرک کر کچھ فاصلے پر گئی۔ ان کے پیچھے لمبی سی ایک اجنبی لڑکی کھڑی تھی۔ وہ تو وہی چہرہ تھا جو کل ماں نے لیپ ٹاپ پر اسے دکھایا تھا۔ بہت سے میک اپ سے بھرا چمکتے اسٹیج پر ناچتا ہوا۔ مشیب شاہ کو ایسے لگا جیسے کسی نے اسے گھٹا ٹوپ جنگل میں پھینک دیا ہو یا پھر اندھے کنوئیں میں پھینک دیا ہو۔ اس نے نظریں باپ کی طرف پھیریں' وہ خاموشی کا بت بنے کھڑے تھے۔

"آپ۔۔۔ آپ نے۔۔۔" اسے شدت سے رونا آرہا تھا۔ آنسو گلے میں اٹکنے سے سانس تک رک رہا تھا۔

"بابا آپ نے مجھ سے جھوٹ بولا" آپ مجھ سے جھوٹ کیسے بول سکتے ہیں۔" وہ کہہ کر پلٹنے لگا' مگر تطہیر شاہ نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ "مشیب' میری جان! میری بات تو سنو بیٹا۔"

"پلیز مجھے چھوڑ دیں' بابا میں کسی کا بیٹا نہیں ہوں' آپ نے بھی مجھے میرے دوستوں کے سامنے شرمندہ کردیا' میرا آئیڈیل توڑا ہے آپ نے' مجھے تنہا کردیا ہے۔" اس نے اپنا بازو زبردستی چھڑایا اور سسکتے ہوئے بمشکل کہہ پایا وہ اپنی آستین سے آنسو رگڑتا تیزی سے اپنے کمرے کی جانب بڑھا تھا۔ کعب بھی اٹھ کر اس کے پیچھے چل دیا۔ "یہ تم نے اچھا نہیں کیا ازکا بیگم۔۔۔"

ان کے دانت جما کر غرانے پر وہ لہک کر بولیں۔

"اچھا۔۔۔ تم نے ہی چیلنج کیا تھا' جو کرسکتی ہو کرلو' روک سکتی ہو تو روک لو' روک تو میں تمہیں نہ سکی۔" وہ بیک سے پشت لگا کر مسکرائیں "ہاں البتہ تمہارے بیٹے کو تمہارے مقابل کھڑا کرسکتی تھی سو کرلیا' اب کیوں تڑپ رہے ہو۔" آخری جملے پر انہوں نے شانے اچکائے اور مزے سے چائے کی چسکیاں بھرنے لگیں۔

"تم سے تو مجھے اس سے بھی زیادہ گری حرکت کی امید تھی۔" وہ زخمی شیر کی طرح غراتے ہوئے ایک قدم ان کی جانب بڑھے۔ ان کا چہرہ غصے سے تپ کر دہکتے تانبے کی طرح لگ رہا تھا اور لہجہ بھڑکتے شعلے کی طرح۔ "مگر یہ ذہن میں رکھنا ازکا بی بی' مشیب میرا اکلوتا بیٹا ہے' میرا سب کچھ' اس کے لیے میں کسی بھی حد تک جاسکتا ہوں۔ تمہیں تمہارے زعم سمیت زمین میں گاڑھ بھی سکتا ہوں۔" وہ پوری آنکھیں کھولے نتھنے پھلائے' انہیں کھا جانے والی نظروں سے گھور رہے تھے۔ وہ مزید آگے بڑھے۔ "ایک بات میری کان کھول کر سن لو' اگر اسے مزید ٹارچر کیا تو میں۔۔۔"

"انکل۔۔۔ انکل۔۔۔" تطہیر شاہ کے بھڑکتے لفظ منہ میں تھے۔ جب کعب کے چلانے کی آوازیں آئیں۔ اس کی خطرناک پکار پر وہ کرنٹ کھا کر لپکے تھے۔ کان کے پردے پھاڑتی' ہوش اڑا دینے والی آواز نے بھاگتے تطہیر شاہ کی ٹانگوں سے جان کھینچ لی تھی۔ فائر کی آواز پر

یقیناً" جان ازکا بیگم کی بھی نکلی تھی۔ تب ہی وہ ہونقوں کی طرح گرتی پڑتی منیب شاہ کے کمرے کی طرف لپکیں۔

☼ ☼ ☼

بچے کے جانے کہاں سے خون ابل رہا تھا۔ اس کا سرباپ کے کندھے پر تھا اور بازو کو انہوں نے ہاتھ سے بھینچ رکھا تھا۔ تطہیر شاہ کی انگلیوں سے تیزی سے خون پھسل کر ان کے کپڑے اور کارپٹ پر گر رہا تھا۔ وہ قدریں کو غالباً" گاڑی کا پکارتے بیرونی دروازے کی طرف لپک رہے تھے۔ ازکا بیگم نے بھاگ کر انہیں پیچھے سے پکڑا شاید وہ ساتھ چلنے کی فریاد کر رہی تھیں مگر وہ یک لخت مڑے اور صرف کندھے سے ہی انہیں اتنی زور کا جھٹکا کہ وہ کاؤچ پر جا گری تھیں۔

"اگر میرے بیٹے کو کچھ ہو گیا' تو تم اپنا حشر سوچ لینا۔" وہ انگارے برساتے رکے نہیں تھے۔

☼ ☼ ☼

عنایا گم صم تب ہی ہو گئی تھی جب منیب شاہ نے اس کے لیے لفظ "ہنڈو وانسر" استعمال کیا تھا۔ اسے اپنے لیے یہ لفظ کبھی برا نہیں لگا تھا' اکثر لوگ نام کی وجہ سے یہی سمجھتے تھے اور اگر کوئی پوچھ لیتا تھا تو وہ ہنس کر تردید کر دیتی تھی' مگر برا کبھی نہیں لگا تھا' مگر اس بچے کے منہ سے سنتے ہی اس کی آنکھیں پھیل گئیں' کتنی حقارت تھی اس کے لہجے میں' اس کی نگاہ کے نشتر اس کے اندر تک گھاؤ کر گئے تھے اور پھر جیسے جیسے صورت سنگین ہوتی گئی وہ غائب دماغی سے سب کو باری باری تک رہی تھی۔ خاص کر تطہیر شاہ کا وہ روپ سرخ انگارہ سا چہرہ ایک طرف بیٹے کی محبت میں اسے پچکارتے ہوئے اور دوسری طرف غصے اور نفرت کا قہر ازکا بیگم پر نکالتے ہوئے اور پھر خوف ناک آواز نے تو زمین میں گڑھا سا کر دیا تھا۔ ایسے لگا تھا کہ چھت اس پر آگری۔ اس سے کھڑے ہونا دشوار ہوا تو پشت کو ہلو کا سہارا دیا تھا۔ گرے کارپٹ پر سرخ تازہ خون کی لکیر۔ اس کا بدن ہولے ہولے لرزنے لگا تھا۔

ازکا بیگم اوندھے منہ کاؤچ پر پڑی تھیں۔ بلکتے ہوئے جانے دعا مانگ رہی تھیں یا بڑبڑا رہی تھیں۔ وہ یک لخت اٹھیں اور عنایا کے مقابل جا کھڑی ہوئیں۔ ان کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا اور بہت سے بال بھی آنسوؤں کے ساتھ چپکے ہوئے تھے۔

"تمہاری وجہ سے ہوا ہے یہ سب' صرف تمہاری وجہ سے۔" انہوں نے اس کے بازوؤں کو دونوں ہاتھوں میں جکڑ لیے۔

"تم نے میرا شوہر چھینا' میرا بچہ چھین لیا' مجھے برباد کر دیا' تطہیر کو برباد کر دیا' میرا سب کچھ برباد کر دیا' فتنہ عورت' تم نے' تم نے سب کچھ اجاڑ کر رکھ دیا۔" وہ ہذیانی کیفیت میں چلاتے ہوئے اسے جھنجوڑ رہی تھیں۔ "مجھے برباد کر کے' میرا بچہ چھین کے' تم بھی آباد نہیں رہو گی' برباد ہو جاؤ گی تم بھی۔" چیختے چیختے ان کی آواز بیٹھ گئی اور وہ خود ہچکولے لیتی ہوئیں بے دم ہو کر اس کے قدموں میں گرتیں چلی گئیں۔ انہوں نے منیب شاہ کو باپ کے خلاف اس لیے اکسایا تھا کہ وہ باپ کی خوب بے عزتی کرے' خوب لڑے' جس کا وہ ہر وقت دم بھرتا ہے' ماں پر اسے فوقیت دیتا ہے' اسے اس کی اوقات یاد دلائے اور الٹے پاؤں اس عورت کو دھتکار کر نکال دے' مگر اس سے اتنے انتہائی قدم کی امید نہیں تھی۔ یہ تو سوچا ہی نہیں تھا کہ وہ باپ کی بے عزتی کو اپنی بے عزتی سمجھتا ہے اور جذبات میں خود کو نقصان پہنچا لے گا۔ جب سب الٹ گیا۔ تو ان کے اندر ممتا تڑپنے لگی۔ یہ دیکھے بغیر کہ آج وہ کسی کے قدموں میں گری ہوئی رو رہی ہیں۔ انہوں نے تو کسی کو اپنے روبرو ٹکنے نہ دیا تھا۔ شوہر کو کچھ نہیں سمجھتی تھیں' لیکن آج اپنی بربادی کے خوف سے زمین پر پڑیں تڑپ رہی تھیں۔

"کیا واقعی میں نے برباد کیا ہے سب کچھ' تطہیر شاہ میری وجہ سے تڑپا ہے' اپنے بیٹے کی نظروں میں میری وجہ سے گرا ہے' وہ میری وجہ سے اجڑ جائے گا' تباہ ہو جائے گا' نہیں' نہیں۔" عنایا مزید پتھر کی مورتی بنتی چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

اسپتال کا ویٹنگ لاؤنج تھا۔ جہاں تطہیر شاہ صوفے پر سر پکڑے بیٹھے تھے۔

"منیب تمہارا نام تو اتنا خوب صورت رکھا تھا' وہ واحد چیز جس پر ازکا بیگم نے مجھ سے اکتفا کیا تھا' پھر یہ اذیت کس چیز کا بدلہ ہے یار! غالباً" انہوں نے یہ تو سوچا ہی نہیں کہ وہ ایسے بھی ری ایکٹ کر سکتا ہے' یا یہ کہ ازکا بیگم کے مس گائڈ کرنے پر وہ اتنا ہاتھ بھی ہو سکتا ہے۔ انہوں نے شادی سے پہلے ہر پہلو پر سوچا تھا' مگر ان ہر پہلوؤں میں منیب اتنا بڑا نہیں تھا کہ وہ باپ کی شادی کو اپنی ذلت کا مسئلہ بنا لے گا۔ وہ تو یہاں تک ہی پلان کر سکے کہ اسے پیار سے بتائیں گے' عنایا سے ملوائیں گے اور یقیناً" وہ اس سے مل کر بہت خوش ہو گا۔ باپ کو خوش دیکھ کر خوش ہو گا' لیکن یہ تو سوچا ہی نہیں اگر کسی نے منفی رخ دکھا دیا تو کیا ہو گا؟ کیا وہ اتنا بڑا ہو گیا تھا؟ کب ہوا وہ اتنا بڑا؟ وہ اتنا بڑا قدم اٹھا سکتا ہے' اور' اور اس نے ان کی گن کب اور کیسے نکالی تھی؟ بس انہیں تو اتنا یاد تھا کہ جب وہ پچھلی بار چھٹیوں پر گھر آیا تھا تو ان سے گن چلانی سیکھنے کی ضد کی تھی۔

"کب سے تھی اس کے پاس گن؟ اس نے کس سے سیکھی؟ کب' کب کوشش کی؟ اوہ میرے خدایا!" انہوں نے اپنے بال مٹھیوں میں جکڑ لیے۔ ازکا بیگم کے بھائی بھی ادھر پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے میڈیا اور پولیس میں خبر جانے سے روک لی تھی۔ ڈاکٹر اپنی پوری کی کوشش کر رہے تھے بے شک خون بہت بہہ چکا تھا' مگر کعب نے چیختے ہوئے جب اس سے گن چھیننا چاہی تو فائر سر کے بجائے بازو کے گوشت پر ہوا تھا اور صحت مند ہونے کی بنا پر ہڈی مکمل طور پر بچ گئی تھی۔ ایک آپریشن کے بعد ڈاکٹرز کامیاب ہو گئے۔ تطہیر شاہ کو لگا تھا جیسے ان میں نئی روح پھونک دی گئی ہو۔

☼ ☼ ☼

وقت کب کیسے سرکا' سے بدلے' کتنے پہر بیت گئے تھے' وہ گم صم سی زینے کے دوسرے اسٹیپ پر کب سے بیٹھی تھی۔ لاؤنج کی چھت پر لگے چھوٹے چھوٹے سے بلب کی روشنی میں ہر چیز کسی خوف ناک ہیولوں کی صورت سراپا سوال تھی۔ اس کے پاس جواب میں صرف خاموشی تھی' آنسو تھے' جو بند ٹوٹے دریا کی طرح امڈتے آ رہے تھے۔ "تطہیر میری وجہ سے برباد ہو جائیں گے' میں نے انہیں ان کے گھر' ان کے سکون کو تباہ کر دیا' ان کی مکمل زندگی میں دراڑ میں نے ڈالی' کیوں؟ کیا مجھے ان سے محبت ہو گئی تھی؟ کیا محبت ایسی بے خودی کا نام ہے کہ وہ یہ تک بھلا دیتی ہے کہ اس کا محبوب پہلے ہی مکمل زندگی گزار رہا ہے اور اس کا ایک بے اختیار سا جھٹکنے سے محبوب کی بساط کے تمام مہرے ہل جائیں گے' محبت ہلچل کیوں سکھاتی ہے؟ شور کیوں مچاتی ہے؟ یہ دلوں پہ اختیار رکھنا کیوں نہیں سکھاتی؟ سانسوں میں ٹھہراؤ کیوں نہیں سکھاتی؟ کیا چاہ صرف مٹھی میں دبوچ لینے سے بچ سکتی ہے؟ بہت دور سے صرف دعاؤں میں بھی تو زندہ رہ سکتی ہے' اگر میں تطہیر کی محبت کو مٹھی میں دبوچ لوں گی تو کیا اس کی زندگی میں ہمیشہ ہلچل مچی رہے گی' ازکا بیگم تو مجھے کبھی قبول نہیں کریں گی' تو کیا منیب۔۔۔؟ جس پر میرا فرسٹ امپریشن ہی غلط پڑا' وہ کیسے قبول کرے گا' آج جس اذیت سے تطہیر شاہ گزر رہے ہیں۔ اس کو گود میں لے کر بھاگتے تطہیر کے چہرے پر جو اذیت تھی' کیا اسے ماں کی ہمدردی دوبارہ کسی گھناؤنی حرکت پر نہیں اکسائے گی' کیا وہ تطہیر کو بار' بار اس اذیت سے گزارے گا؟ اور اگر کوئی غلط حرکت نہ بھی کی تو بھی ماں کے نشتر اس میں اک ان دیکھی ضد تو بھر ہی دیں گے' یہ لاابالی عمر ایسے ہی ہوتی ہے' خوامخواہ اپنوں سے ضد لگا کر' خود کو تباہ کرنے کی' میں بھی تو ذرا سی ضد میں عنایا سے مستنوشہ بن گئی تھی۔ کیا تطہیر شاہ کا اکلوتا بیٹا' ان کا سب کچھ' میری وجہ سے تباہ ہو گا' میری وجہ سے۔"

اس نے اپنا سر تھکے ماندے شخص کی طرح کچھ اوپر والے اسٹیپ پر گرا لیا تھا۔ وہ مسلسل چھت کو

گھورنے لگی۔ آنسوؤں کا سیلاب اس کی کن پٹی سے ہو کر بالوں کو بھگو رہا تھا۔

"تطہیر آپ کی زندگی تو مکمل تھی' آپ' ازکا بیگم اور منیب شاہ آپ کی تکون میں میری جگہ کہاں تھی؟ کیا واقعی آپ مکمل تھے؟ صرف میرے آنے سے آپ کے سارے اینگلز ہل گئے' شاید ہاں آپ سمجھتے ہو نا۔ ازکا بیگم آپ سے لاتعلق رہتی ہیں' اپنے زعم' اپنے گھمنڈ میں' حالانکہ ایسا شاید نہیں ہے' میں نے ان میں ایک بیوی' ایک ماں کو تڑپتے دیکھا ہے' تطہیر میں نہیں چاہتی کوئی عورت میری وجہ سے ہر روز تڑپے یا پھر ضد میں آکر آپ کو تڑپائے' اذیت دے یا ہمارے بیچ بدگمانی پیدا کرے' اگر میں آپ کی زندگی سے نکل بھی گئی تو کیا ہوگا؟ بے شک بھولنا آسان نہیں ہوگا' مگر آپ کی فیملی بے بکھر ہے' آپ کا اکلوتا بیٹا' آپ کا منیب' آپ سب کچھ' آپ اس کی خاطر بھول ہی جاؤ گے اور میرا کیا ہے۔" اس نے ناک کی نمی "منسوں" سے چڑھائی اور اپنا سر سیڑھی کے اسٹیپ سے اٹھالیا۔ اس نے آنسو ہتھیلیوں سے رگڑے۔

"میں تو شیروں کی سرزمین کی بیٹی ہوں' طاقت ور' اپنے ارمانوں کا خون کر کے بھی جی لوں گی اور عورت تو ویسے بھی بہت مضبوط ہوتی ہے' کسی بھی بڑے سے بڑے جان لیوا درد سہنے کا اگر ارادہ کرلے تو کسی کے سامنے سسکاری بھی لینا اپنی توہین سمجھتی ہے' خواہ وہ ریت کی ذرے کی طرح اڑ رہی ہو' خواہ سوکھے پتے کی طرح اندر سے لرز رہی ہو' مگر سب کے سامنے چٹانوں کو چھوٹا کر دیتی ہے۔۔۔ اور ویسے بھی تطہیر ضروری تو نہیں کہ ہر کسی کی نیا پار لگے' انسان کی ہر خواہش پوری ہو' ہر سفر کی کوئی منزل' ہر خواب کی کوئی تعبیر بھی ہو' کچھ خواب آنکھوں کو بے خواب ہی رکھتے ہیں' شاید ہماری آنکھیں بھی وہی بے خواب آنکھیں ہوں' میں آپ سے ساتھ نبھانے کا وعدہ توڑ رہی ہوں تطہیر' بہت خاموشی سے جا رہی ہوں' ایسی جگہ جہاں اب کی بار آپ نہ ڈھونڈ سکو' کہیں بھی' کسی بھی گم نام گوشے میں' پلیز مجھے معاف کر دینا' مجھ سے نہیں ہوگا یہ سب کچھ' میں آپ کو روز تڑپتا' اذیت سے گزرتا یا پھر اپنی بیوی بچے کے کٹہرے میں کھڑا شرمسار نہیں دیکھ سکتی' پلیز خود کو سمجھانے کی کوشش کرنا' مجھے ڈھونڈنے کی کوشش مت کرنا' میں نہیں چاہتی کہ اب دوبارہ ہمارا سامنا ہو اور اگر آپ کو دیکھ لیا تو شاید میرا ارادہ ڈگمگا جائے' اک دل ہی تو ہے' بے قابو ہو جائے' مچل جائے' تمہیں تمہارے سامنے چھوڑ کر نہیں جاسکتی' خدا حافظ نہیں کہہ سکتی۔" وہ یہ سب تطہیر شاہ کو سامنے بٹھا کر کہنا چاہتی تھی' اسے حقیقتیں سمجھانا چاہتی تھی کہ وہ اپنے بیٹے کی خاطر اس بات کو سمجھنے کی کوشش کرے' مگر اس میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ وہ یہ سب کچھ اس کے سامنے کہہ پائے۔ اسے سلگتے بلکتے خود کلامی کرتے بہت وقت بیت گیا تھا۔ بہت سے ملازمین اس کے سامنے چل پھر رہی تھیں' مگر کسی نے اس پر دھیان نہیں دیا۔ یعنی وہاں وہ اتنی ہی اجنبی' غیر اہم تھی یا پھر وہ کسی کے ڈر سے اس کے قریب نہیں آئی تھی۔ ازکا بیگم تو جب ہی اس کے قدموں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی تھیں۔ کب دن ختم ہوا' کب لاؤنج میں روشنی ہوئی اور پھر تمام روشنیاں مدھم کر دیں گئیں۔ کب سلگتی رات بیت کر آخری تارہ بھی ڈوب گیا۔ سورج کی پہلی شعاع کب درختوں پر اتری اور زمین پر پھیلنے لگی۔ اسے اردگرد کا ہوش کب رہا تھا۔ وہ تو صرف ازکا بیگم کے لگائے الزامات کہ "صرف تمہاری وجہ' صرف تم صرف تم" میں ہی چکرا گئی تھی۔

خود کو اتنا باور کروا لینے کے بعد وہ کچھ سنبھلی اور آنسو پونچھتی ہوئی وہاں سے اٹھی۔ وہ اس کمرے کی طرف چل دی جہاں چوبیس گھنٹے پہلے وہ اور تطہیر شاہ اکٹھے تھے۔ وہاں سے اس نے اپنا انتہائی ضروری سامان اور ایک آدھ وہ یادگار جس میں تطہیر شاہ کی خوشبو' اس کا لمس تھا وہ ایک چھوٹے سے ہینڈ کیری میں رکھی اور خاموشی سے باہر نکل آئی۔ وہ لاؤنج کراس کر کے باہر نکلنے کو تھی جب اس کے قدم ازکا بیگم کی کرخت آواز پر تھم گئے۔

"تم۔۔۔ تم کہاں چل دیں۔۔۔؟"

اس نے آنسوؤں سے بھیگا چہرہ ذرا سا پیچھے موڑا سامنے ازکا بیگم کھڑی تھیں۔ وہ کل والی آن بان' نفیس سے میک اپ سے مزین' گھمنڈی سی گردن اکڑائے ناشتا سے محظوظ ہوتی ازکا بیگم سے یکسر مختلف لگی تھیں۔ ان کا دھلا' دھلایا شفاف چہرہ' جس کے گرد دوپٹے کا ہالہ تھا۔ اس نورانی چہرے سے لگتا تھا کہ رب کی بہت حمد و ثناء کی گئی ہو' اسے دل سے پکارا گیا ہو۔ یقیناً" ایسا تھا۔ کل وہ بہت روئی تھیں۔ اپنی گزشتہ زندگی پر' اپنے ماں' باپ کے زبردستی فیصلے پر' خوامخواہ اپنے شوہر سے زعم کی ضد لگانے پر' پہلے اپنی زندگی برباد اور پھر بیٹے کو موت کی طرف دھکیلنے پر۔ ان کے آنسو تھمتے نہ تھے۔ انہوں نے سارا دن' ساری رات سجدے میں رو' رو کر گزاری تھی' ان کی صرف ایک ہی فریاد' التجا' گزارش تھی منیب شاہ کی زندگی۔ وہ اپنے رب کو اس کے ناموں سے پکار کر معافی مانگتی رہیں' "کہ رب تو منیب کی زندگی کے بیچ موت نہ آنے دے' میں تطہیر شاہ کی خوشی کے بیچ کبھی نفرت نہیں آنے دوں گی' "بھلا ماں کے تڑپتے دل سے نکلی دعا کیسے رد ہوتی۔ دعا بھی وہ جو پورے صدق دل سے مانگی گئی ہو۔

کچھ دیر پہلے ہی ان کے بھائی کا فون آیا تھا کہ وہ منیب کو لے کر گھر کی طرف نکل گئے ہیں۔ غالباً" گولی اس کے بازو پر لگی تھی جو آپریشن کے ذریعے فوراً" نکل بھی گئی۔ ڈاکٹرز نے چوبیس گھنٹے آبزرویشن میں رکھ کر' خون لگا کر اسے ڈسچارج کر دیا تھا۔ بھائی نے جہاں منیب کا بہت خیال رکھنے کی نصیحت کی تھی وہاں خاصے سخت لفظوں میں بہن کو سرزنش بھی کی تھی کہ "تطہیر شاہ نے جو کچھ کیا وہ تمہاری عادتوں اور حماقتوں کی وجہ سے کیا ہے' تم اس کے دل کو تو کھو ہی چکی ہو' اب کیوں اکلوتے بیٹے کو کھونا چاہتی ہو۔"

غالباً" اسپتال میں منیب کے حادثے کی وجہ تطہیر شاہ نے واضح انہیں بتا دی تھی' جہاں وہ بھانجے کے انتہائی قدم پر حیران تھے۔ وہاں بہن پر شدید غصہ بھی آیا تھا۔ شاید ان کی سرزنش کا ازکا بیگم پر اثر نہ ہی ہوتا کیوں کہ وہ فطرتاً" خود پسند' من مرضی والی تھیں' مگر اپنے رب سے کیا وعدہ بہت اچھی طرح یاد تھا۔ تطہیر شاہ کی زندگی میں تو پہلے ہی وہ ایک حد تک تھیں' مگر اب وہ بیٹے سے دور نہیں ہوں گی۔ انہیں اس کی زندگی بچنے کی خوشی تھی۔ بھائی کا فون سنتے ہی انہوں نے نوافل شکرانے کے ادا کیے اور صدقہ خیرات کرنے کمرے سے باہر نکلی تھیں۔ جیسے ہی ان کی نظر گھر سے نکلتی عنایا پر گئی۔ تو ان کی فطرت کی ساری رعونت ان کے سوال میں سما گئی۔ عنایا چند لمحے انہیں دیکھتی رہی پھر پوری کی پوری ان کی طرف مڑ گئی۔

"آپ کو اپنا گھر' اپنا شوہر اور اپنا بیٹا مبارک ہو' میری وجہ سے آپ کی زندگی برباد ہو رہی ہے نا' اسی لیے میں خاموشی سے خود کو ہی برباد کر کے جا رہی ہوں' کہاں یہ تو ابھی مجھے بھی نہیں پتا' مگر میں تطہیر کو اذیت میں نہیں دیکھ سکتی' جو انہیں میرے یہاں رہنے کی وجہ سے بار' بار پہنچائی جائے گی۔"

"اوہ" انہوں نے خاصا لمبا "اوہ" کہہ کر کچھ گردن ٹیڑھی کی۔ "بہت محبت ہے تمہیں اس سے" وہ اس کے روبرو کھڑی تھیں۔

"ہاں۔" بھلے وہ رات کتنی ہی عاجز ہو گئی تھیں' مگر مزاج کی فطری درشتگی اتنی جلدی جانے والی نہ تھی۔ عنایا کی نرم سرگوشی سے بھرے اقرار پر بھی ان کا لہجہ دھیمانہ پڑا۔ "اچھا۔۔۔"

اس کے دل میں اتنی آگ لگا کر' میرا شوہر' میرا حق لے کر اب خاموشی سے جا رہی ہو' تاکہ وہ مجنوؤں کی طرح تمہیں ڈھونڈتا پھرے' پاگل ہو جائے تمہاری محبت میں' مجھے ہمیشہ سوالوں کے کٹہرے میں رکھے بہت چالاک ہو تم۔" وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے چبا چبا کر بول رہی تھیں۔ اور عنایا خاموشی سے ان کی دونوں آنکھوں کو تکے جا رہی تھی۔

"دراصل تم نے دیکھ لیا ہے نا کہ وہ اپنے رشتوں' اپنی چیزوں کے لیے خاصا پوزیسو ہے' اس کی شعلہ بار نگاہیں' اس کا غصہ' دیکھ چکی ہو نا تم اور اب چاہتی ہو کہ

وہ ساری زندگی مجھے انہی نظروں، اسی غصے سے نوازے، سزا دے مجھے کہ میری وجہ سے تم نے اسے چھوڑا، اس کی نظروں میں مظلوم بن کر ساری زندگی اس کے دل پر قابض رہنا چاہتی ہو اور میں، میں۔۔۔" وہ روندھی آواز اور نمی کو بہت مشکل سے قابو کرتی ہوئی ایک سانس بول میں رہی تھیں۔

"میں ساری زندگی اس کی نظروں میں کبھی اٹھ ہی نہ سکوں، سہاگن ہوتے ہوئے بھی اک اجڑے دل کے مرد کے ساتھ اجڑی زندگی گزاروں، ہونہہ میں اتنی بے وقوف نہیں ہوں بی بی! جتنا تم نے سمجھا ہے، اس گھر میں کوئی میری اجازت کے بغیر آیا، گیا نہیں ہے، اگر تم نے آنے کی جرات کر ہی لی ہے تو تمہارا کیا خیال ہے چلی بھی اپنی مرضی سے جاؤ گی، میں تمہیں یہاں سے قدم بھی باہر رکھنے نہیں دوں گی۔۔۔" وہ ایک قدم اور آگے بڑھ کر بالکل اس کے برابر کھڑی تھیں اور وہ چپ بس انہیں سنے جا رہی تھی۔

"اپنے حق پر ڈاکے کا لمحہ تو میں پندرہ دن پہلے سہہ چکی ہوں، وہ جو درد تھا نا، اپنے شوہر کی تقسیم کا، وہ لمحہ اب بیت گیا ہے، میرا حق اب بٹ چکا ہے، تمہارے جانے یا نہ جانے سے اب وہ سب پہلا سا نہیں ہو سکتا، اک دھتکاری اور ادھوری زندگی سے تو بہت بہتر ہے میں باخوشی اس کی تقسیم برداشت کر لوں اور رہی مشیب شاہ کی بات، تو میں ماں ہوں اس کی، جب اسے اپنے شوہر اور تمہارے خلاف بھڑکا سکتی ہوں تو اپنی ممتا سے اسے سمجھا بھی سکتی ہوں اور میں بہت اچھی طرح جانتی ہوں کہ اپنے بیٹے کو کیسے سمجھانا ہے۔"

وہ اپنی بات مکمل کر کے چند لمحے اسے خاموشی سے تکتی رہیں۔ غالباً" ان میں اتنی بڑی تبدیلی بیٹے کے انتہائی قدم پر آئی تھی۔ اس لمحے نے انہیں ان کے زعم کو توڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ فطرتاً" جیسی بھی تھیں مگر مشیب شاہ ان کی اکلوتی اولاد تھا اور وہ اسے کسی قیمت پر کھونا نہیں چاہتی تھیں۔ پھر انہیں تطہیر شاہ کے لفظ "آپ کے حق میں کمی نہیں آئے گی، جب تک کہ اپنے عمل سے آپ خود نہ چاہیں" اچھی طرح یاد تھے۔

پھر کیوں وہ اپنے لیے اذیت بھری راہ چنتیں جب کہ بھائیوں کے تیور بھی واضح ہو گئے تھے۔ انہوں نے ساری رات گڑگڑا کر دعائیں مانگیں، اس گڑگڑاہٹ میں اپنی کوتاہیاں بھی واضح ہو گئیں اور آگے کا لائحہ عمل بھی کہ وہ شوہر کا بٹوارہ صرف بیٹے کے لیے برداشت کر سکتی ہیں۔ وہ چند لمحے اسے دیکھتی رہیں پھر فردوس کو آواز دی اور وہ بھی بوتل کے جن کی طرح فوراً "جی، جی" کرتی حاضر ہو گئی۔

"یہ چھوٹی بی بی کا سامان ان کے کمرے میں رکھ آؤ۔" وہ حکمیہ انداز میں کہہ کر مڑ گئیں مگر عنایا کو خاصا حیران کر گئی تھیں۔

جہاں عنایا کی آنکھیں بے یقینی سے پھیل گئی تھیں وہاں لاؤنج کے دروازے کی اوٹ میں کھڑے تطہیر شاہ سکتے میں تھے۔ انہوں نے ایک نظر گود میں سوتے مشیب شاہ کو دیکھا اور پھر سکتہ مسکراہٹ سے ٹوٹ گیا۔ غالباً" وہ "مشیب" ہی تھا، نام اثر ضرور رکھتا ہے۔ جو کام وہ ساری زندگی نہ کر سکے اور نہ کر سکتے تھے یعنی ازکا بیگم کی مرضی کے خلاف کوئی اقدام اور وہ راضی بھی ہو جائیں۔ وہ مشیب شاہ کی ایک جذباتی حرکت نے صرف رات میں کر دیا۔ گزری رات ان کے لیے کتنی تکلیف، کتنی پریشانی، کتنی بے بسی، اذیت لے کر آئی تھی مگر آج کی صبح کتنی روشن تھی، کتنا سکون، اطمینان اور مان لے کر آئی تھی۔ صبح کی نرم گرم شعاعیں بلاشبہ ایک ہی سورج سے پھوٹ رہی تھیں مگر ہر شعاع کا مسحور کن لمس، ہر ٹہنی، ہر شاخ پر الگ بہار دکھا رہا تھا۔

☼ ☼

محبت کے کتنے رنگ

سلمیٰ فقیر حسین

"فردوس' اے فردوس! کہاں مری پڑی ہے؟ باہر آکر میری گل سن۔" وہ موڑھے پر کھڑی دیوار پر دونوں کہنیاں ٹکائے۔ متلاشی نظروں سے کب سے اپنی تایازاد فردوس کو آوازیں دے رہی تھی۔

"ہائے' یہ گرمی!" اس نے انگارے جیسے سورج کی جھلسا دینے والی تپتی دھوپ سے اپنے پسینہ پسینہ ہوتے وجود کو' ہاتھ کو ہلاتے ہوئے ہوا دینے کی ناکام سی کوشش کی۔

"دیکھ فردوس! اگر تو نے باہر آکر میری گل نہیں سنی تو تجھ سے میرا من چین سب ختم۔" باہر سے آتے شجاع چوہدری نے اس کی دھمکی پر ذرا سا مسکراتے ہوئے اپنے سر کو خفیف سا جھٹکا دیا اور بیرونی پھاٹک نما گیٹ کے ساتھ بنی بیٹھک میں گھس گیا۔

"کیا ہے' کیوں میرے کان پھاڑ رہی ہے۔ اب بندہ کچھ دیر سو بھی نہیں سکتا۔" فردوس اپنی موندی موندی آنکھوں کو مسلتے ہوئے باہر آتے ہی بڑی سی جمائی لیتی ہوئی۔ اسے پھاڑ کھانے کو دوڑی تھی۔ اسے اپنی نیند بہت پیاری تھی اور فریحہ صاحبہ کی آوازوں نے اسے کچی نیند سے جگا دیا تھا۔ غصہ کرنا تو لازمی بنتا تھا۔

"نہ میں کون سا مسجد کے اسپیکر میں بول رہی ہوں۔ جو تیرے کان پھٹ رہے ہیں۔" وہ بھی فریحہ تھی اپنے نام کی ایک' ادھار رکھنا اسے کہاں آتا تھا۔

"اچھا' چل چھوڑ بتا! کیوں اتنی دھوپ میں دیوار پر چڑھی ہے۔" فردوس نے آنکھوں پر دھوپ سے بچنے کے لیے' ہاتھ کا چھجا بنا کر ایک آنکھ بند اور ایک آنکھ کھول کر اسے دیکھا کہ سورج ذرا سا بھی اپنی طرف نظر اٹھانے کی اجازت نہیں دے رہا تھا۔ اور وہ جلد از جلد اس کے آنے کا مدعا جان کر اندر بھاگ جانا چاہتی تھی۔

"تجھ سے پرانا ڈائجسٹ لانے کو کہا تھا۔ لے آئی ہے تو دے' مجھے شام تک آخری قسط پڑھ کر تمہیں واپس کر دوں گی۔" اس نے اسے یوں کچی نیند اٹھانے کا مقصد بتایا اور ساتھ ہی ساتھ شام تک واپس کر دینے کی تسلی بھی دی کہ کہیں وہ دینے سے انکار ہی نہ کر دے۔

"میں نے پتا کروایا تھا۔ مگر ابھی پرانے ڈائجسٹ نہیں آئے۔ جب آئیں گے تو لے آؤں گی۔" وہ منہ بناتے ہوئے جانے کو مڑی۔

"اے! رک تو فردوس نیا تو لائی ہو گی۔ وہی دے دے۔ قسم سے آج تو بالکل نیند نہیں آ رہی۔" اس نے جیسے التجا کی۔ اسے کبھی بھی دوسروں کی طرح گرمیوں میں نیند نہیں آتی تھی۔

"کہا نا ابھی نہیں خریدا اگر ہوتا بھی ڈائجسٹ میرے پاس تو تمہیں کبھی نہیں دیتی۔ یاد ہے پچھلی بار جب تم نے رسالہ خریدا تھا۔ تب میں نے تمہاری کتنی منتیں کی تھیں کہ ایک بار مجھے بس شعر پڑھنے کے لیے دے دے۔ مگر تم نے نہیں دیا تھا۔" فردوس نے اسے یوں اپنی نیند برباد کرنے کے غصے میں کافی کچھ سنا ڈالا تھا۔

"کتنی بے مروت ہے تو فردوس۔ بھول گئی وہ وقت جب میں نے ایک ساتھ دو ڈائجسٹ خریدے تھے' ایک بغیر پڑھے تمہیں دے دیا تھا اور پیسے لینا تو دور تمہیں ایک بات نہیں سنائی تھی اور تم نے کیسے میری بے عزتی کر کے رکھ دی۔"

فریحہ نے اس کے یوں باتیں سنانے پر حیرت سے منہ پر ہاتھ رکھے دیکھا اور پھر اس پر کیا گیا اپنا احسان یاد کروانا فرض سمجھا اور یہ کوئی پہلی بار نہیں ہوا تھا ہر ماہ ڈائجسٹ کے گھر آتے ہی پہلے پڑھنے کے چکر میں ایک دوسرے کو گنوائے جاتے تھے۔

"اور جو ایک بار میں نے تمہیں ٹیچر کی ڈانٹ سے بچانے کے لیے تمہارے بیگ سے ڈائجسٹ نکال کر اپنے بیگ میں ڈال لیا تھا اور ڈانٹ بھی ٹیچر سے خود کھائی تھی۔" فردوس اپنا احسان جتانے میں کیسے پیچھے رہتی۔

"وہ تم نے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ٹیچر کی مار سے بچایا تھا اور تمہیں ڈائجسٹ چوری کرنے کی سزا دی تھی۔" وہ جانتی تھی کہ اس نے رسالہ پہلے پڑھنے کے چکر میں اس کے بیگ سے نکال کر اپنے بیگ میں ڈال لیا تھا اور اسی لیے جب کسی اسٹوڈینٹ کی شکایت پر ٹیچر نے ان دونوں کی تلاشی لی تھی تو رسالہ فردوس کے بیگ سے برآمد ہوا تھا اور وہ جو ٹیچر کے ممکن ردعمل کے خیال سے آنکھیں میچ کر کھڑی تھی۔ خود کے بچ نکلنے اور فردوس کی شامت آتے دیکھ کر دل ہی دل میں خوب محظوظ ہوتی رہی تھی۔

"اچھا چل میرے منہ نہ لگ میں پہلے ہی کچی نیند اٹھائے جانے پر بڑی تپی ہوئی ہوں۔" فردوس نے اس کے یوں حقیقت دکھانے پہ نظریں چراتے ہوئے غصہ دکھایا تھا۔ "ایک دو دن میں خرید لوں گی۔"

"ضرورت نہیں ہے ڈائجسٹ منگوانے کی۔ میں خود اپنے لیے خرید لوں گی اور خبردار جو مانگنے آئی ہو تو۔ کنجوس مکھی چوس۔"

"کس بات پر اتنی دیر سے گرمی اور دھوپ کی پروا کیے بغیر بحث ہو رہی ہے۔"

وہ اس کو غصے سے دو ٹوک انداز میں کہتے ہوئے جانے لگی تھی۔ جب شجاع ماتھے پر بل ڈالے بیٹھک سے باہر آیا تھا۔

"کتنی بار کہا ہے کہ اپنی آوازوں کے والیوم ذرا کم رکھا کرو۔ کب سے تمہاری ڈھول جیسی آوازیں بیٹھک میں جا رہی ہیں۔ اگر کوئی بیٹھک میں مہمان بیٹھا ہو تو کیا سوچے گا تم لوگوں کے بارے میں۔"

وہ جو کب سے بیٹھک میں سونے کی کوشش کر رہا تھا کہ رات کو پانی کی باری کے لیے اسے رات بھر جاگنا تھا مگر ان کی آوازیں کیا اسے سونے دے رہی تھیں۔ پانچ منٹ' دس منٹ وہ پورے بیس منٹ بعد' ان کی لڑائی ختم نہ ہوتے دیکھ کر غصے سے بھرا ہوا آیا تھا۔

"بھائی! یہ مجھے سونے نہیں دے رہی تھی۔ ڈائجسٹ مانگ رہی ہے۔ وہ بھی نیا۔" فردوس بھائی کو غصے میں دیکھتے ہوئے سارا الزام اس پر رکھ کر دبے قدموں سے اندر کی سمت بھاگ گئی تھی کہ شجاع کی ڈانٹ کھانے کی ہمت اس میں نہیں تھی۔

"بدتمیز کہیں کی۔ آئندہ کبھی اس سے بات نہیں کروں گی اور یہ کڑوا بادام جہاں میں کچھ اپنی مرضی کا کرنے لگتی ہوں وہاں بوتل کے جن کی طرح نمودار ہو جاتا ہے۔ پتا نہیں کس جنم کی دشمنی مجھ سے نکالنا چاہتا ہے۔"

"اب تم بھی اندر جاؤ گی کہ یہیں دھوپ میں جل مرنے کا ارادہ ہے۔" وہ اسے یوں منہ بسورتے وہیں کھڑی سوچتے پا کر بولا تھا۔

"جا رہی ہوں۔" وہ منمنا کر کہتے ہوئے نیچے اتر آئی تھی۔ شجاع بس اسے دیکھ کر رہ گیا تھا۔ کیا کیا باتیں آج مجھے فردوس نے نہیں سنا ڈالی۔

دونوں بہن بھائی ایک جیسے ہیں کڑوے بے مہر بے وفا۔ آئندہ میں فردوس سے دوستی نہیں رکھوں گی کبھی بات نہیں کروں گی۔" وہ جلتی کڑھتی سونے کے لیے دادی کے ساتھ والی چارپائی پر لیٹ گئی تھی۔

وہ ہمیشہ فردوس سے لڑنے کے بعد اس سے کبھی بات نہ کرنے کا عہد کرتی تھی۔ مگر پھر دو چار دن کے بعد سب بھول بھال کر اس کے پاس چلی جاتی اور اگر وہ نہ جاتی تو فردوس خود اسے منانے چلی آتی تھی کہ ایک دوسرے سے بات کیے بغیر انہیں کھانا ہضم نہیں ہوتا تھا اور لڑائی بھی اکثر ڈائجسٹ نہ آنے پر ہی ہوتی تھی کہ شرط کے مطابق ایک ماہ ڈائجسٹ فریحہ منگواتی تھی اور ایک ماہ فردوس۔ مگر فردوس اپنی کنجوسی کی وجہ سے ہمیشہ ڈائجسٹ لیٹ منگواتی تھی فردوس کے اس اگلے ماہ پرانا رسالہ لینے کے چکر میں وہ ناول کی آخری قسط پڑھنے سے رہ گئی تھی اور پھر ایسا ہوا کہ وہ اس کی آخری قسط ڈھونڈنے کے باوجود نہیں پڑھ سکی تھی اور اسے ہمیشہ آدھی ادھوری کہانی پڑھ کر پریشانی اور بے چینی لگی رہتی تھی کہ پتا نہیں آگے کیا ہوا ہو گا۔ وہ ہر کہانی کو مکمل پڑھنا چاہتی تھی کہ اسے ہمیشہ ادھوری کہانیاں بے چین رکھتی تھیں۔

"باہر میرے بھائی! میرا ایک کام کر دے۔" اس نے اسکول سے آکر کھانا کھاتے اپنے چھوٹے بھائی کو منت بھرے انداز میں کہا۔

"باجی! کام کرنے کی مزدوری ہوتی ہے اور مزدور کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے دی جاتی

ہے۔" بابر نے مصروف سے انداز میں مکھن سے چپڑی روٹی' اچار اور پیاز کے ساتھ کھاتے ہوئے اسے جتایا کہ وہ پیسے لیے بغیر ہرگز کام نہیں کرے گا۔

"ہاں! تو میں بھی مزدوری دوں گی نا۔" وہ تیزی سے بولی جس میں خوشی کا عنصر زیادہ تھا کہ موڈی سا بابر مان گیا ہے۔

"کام کیا ہے۔" اس نے ایک نظر فریحہ کو دیکھ کر لسی کا گلاس منہ سے لگا لیا۔

"مجھے ڈائجسٹ لا دے۔ مگر دیکھ دادی کو پتا نہ چلے۔" اس کو کہنے کے ساتھ اسے دادی سے محتاط رہنے کی تاکید کی۔ وہ حساب لگا کر اس سے کہتی ہوئی اٹھ کر اندر رکھے بیگ کی سمت بھاگی تھی۔ کہ ڈائجسٹ پڑھنے کی اتنی لت لگی ہوئی تھی کہ اسے پڑھے بغیر اسے سکون نہیں ملتا تھا اور وہ ڈائجسٹ خریدنے میں کنجوسی نہیں کرتی تھی۔ دادی اکثر کہتی تھی کہ جس دن یہ لڑکی ڈائجسٹ نہ پڑھے۔ اس کی حالت نشیوں جیسی ہو جاتی ہے اور وہ دادی کے کہنے پر ہنستی رہتی۔

"میرا ڈائجسٹ نہیں لایا بابر۔" وہ جو کب سے کمرے میں ادھر سے ادھر چکر کاٹتے ہوئے۔ بے تابی سے بابر کا کم اور ڈائجسٹ کا زیادہ انتظار کر رہی تھی۔ اسے خالی ہاتھ دیکھ کر اس کا حلق سوکھ سا گیا تھا۔

"تم نے پیسے کم دیے تھے۔ اتنے کا ڈائجسٹ نہیں آتا۔" وہ لاپروائی سے کہتا ہوا پنکھے کے نیچے کھڑا ہو کر ہوا لینے لگا تھا۔

"مگر میں نے تو پورے پیسے دیے تھے پھر کیا ہوا۔" وہ حیران ہوئی۔

"دیکھ میری بھولی باجی۔ جو بیس روپے تم نے مجھے دیے تھے۔ ان کا تو گھر سے نکلتے ہی میں نے برف والا گولا کھا لیا اور چوک میں جاتے ہی گرمی اتنی شدید لگی کہ دل گھبرانے لگا۔ تبھی میں نے پندرہ روپے والی موٹی تازی دودھ والی قلفی لے لی کہ کھاتے ہوئے جاؤں گا تو گرمی اتنی شدید محسوس نہیں ہوگی۔ دکان پر جا کر پتا چلا کہ میرے پاس پینتس روپے بچے ہیں۔ اتنے کا رسالہ نہیں آتا۔ پھر یہ سوچتا تھا کہ گرمی پہلے سے بھی زیادہ لگنے لگی۔ ایک پھر خریدلی کہ گھر واپس پہنچنے کے لیے بھی تو کچھ ٹھنڈا میٹھا چاہیے تھا۔ باقی بچے بیس روپے۔ وہ میرے پاس ہیں اور ستر روپے دو۔ تمہیں ڈائجسٹ لا دوں۔ جلدی کر پھر مجھے نہر پر نہانے بھی جانا ہے۔"

وہ مکاری اور بھولے پن سے آنکھیں مٹکاتے ہوئے تفصیل بتا رہا تھا اور فریحہ کی آنکھیں حیرت اور صدمے سے کھلی جا رہی ہیں۔

"ٹھہر ذرا مر جانے! میں تیری گرمی اتارتی ہوں۔" وہ صدمے سے گنگ غصے سے کھولتے ہوئے جوتے کی سمت بڑھی تھی اور بابر صاحب ہنستے ہوئے باہر کی طرف۔

"نہیں ڈائجسٹ منگوانا تھا تو پہلے بتا دیتیں۔ ایویں میرا ٹیم (وقت) برباد کیا۔" وہ شریر سی مسکراہٹ آنکھوں میں لیے۔ کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔

"لوگوں کے اتنے اچھے بھائی اور کزن ہیں۔ مگر میرے نصیب میں تو نہ بھائی اچھا ہے اور نہ کزن۔ میری تو قسمت ہی ماری گئی۔" وہ کہتے ہوئے دادی کی پائنتی پر دونوں ہاتھوں میں سر گرا کر بیٹھ گئی تھی کہ پیسوں سے زیادہ اسے ڈائجسٹ نہ ملنے کا افسوس تھا۔

"اے فری کیا ہوا۔ ایسے کیوں بیٹھی ہے۔" دادی اس کے یوں اپنی چارپائی پر بیٹھنے پر ہڑبڑا کر اٹھی تھیں اور اسے یوں بیٹھا دیکھ کر پوچھنے لگیں۔

"کیا بتاؤں دادی! میری تو قسمت ہی ماڑی ہے۔" وہ دادی کے پوچھنے پہ ملول سی بولی۔

"نہ پتر اب تو جوان جہان ہے۔ نیانی (بچی) نہیں ہے۔ خیر سے بارویں کے پیپر دیے ہیں۔"

"دادی کہو کچھ سمجھتی آپ کچھ ہیں؟" وہ غصے سے کہتی ہوئی اٹھ گئی تھی کہ دادی کے اونچا سننے پر وہ ہمیشہ چڑ جاتی تھی۔ ابھی بھی دادی اس کے قسمت ماڑی کو نیانی سمجھ بیٹھی تھیں۔

☼ ☼ ☼

یہ شجاع دے کر گیا ہے کہہ رہا تھا۔ تمہیں دے دوں۔ وہ صحن میں پانی کا چھڑکاؤ کر کے اب چارپائیاں ترتیب سے رکھ رہی تھی۔ جب دادی جو دروازے پہ ہونے والی دستک پر اٹھ کر گئی تھیں۔ واپسی پہ آکر بولیں۔

ڈائجسٹ پر نظر پڑتے۔ خوشی سے اس کی چیخ نکلتے بچی تھی۔ مگر اگلے ہی لمحے ڈائجسٹ دادی کے دینے پر وہ جی بھر کر حیران ہوئی تھی کہ دادی اس کے ڈائجسٹ پڑھنے کے خلاف تھیں اور اکثر اس کے جمع کیے ہوئے ڈائجسٹ اٹھا کر ردی والے کو دے دیتی تھیں۔

"دادی! یہ ڈائجسٹ ہے۔ پڑھ لوں نا؟" وہ جان بوجھ کر ڈائجسٹ ان کی آنکھوں کے قریب کرتے ہوئے بولی۔

"جانتی ہوں بی بی کہ یہ ڈائجسٹ ہے۔ مگر شجاع کا کہنا ہے کہ یہ رسالے لڑکیوں کو شعور و عقل سمجھ دیتے ہیں۔ فریحہ کو بھی پڑھنے دیں شاید اسے بھی سمجھ بوجھ آجائے۔" دادی نے شجاع کی کہی ہوئی بات حرف بہ حرف اس تک پہنچائی تھی اور اس کا منہ بن گیا تھا۔

"تو دادی! پہلے مجھے کون سی عقل نہیں ہے۔ شجاع نے تو مجھے ڈنگر ہی سمجھ رکھا ہے۔ جسے خود کو تو بہت عقل ہے۔ غصہ کرنے کے سوا اسے آتا کیا ہے۔"

"شرم تو نہیں آتی۔ اپنے تائے کے اکلوتے پتر کے بارے میں ایسا کہتے ہوئے۔ ایک تو اس نے تمہیں رسالہ لا کر دیا اور دوسرا تو اسے باتیں سنا رہی ہے۔ اگر تیرے دادا مرحوم زندہ ہوتے تو وہ اپنے لاڈلے پوترے کے بارے میں تمہاری زبان درازی سن کر تمہاری ٹانگیں توڑ دیتے۔" دادی کو بھی اس کی اس بدزبانی پر غصہ آگیا تھا۔

"دادی پلیز یہ دادا نامہ مت شروع کر لیجیے گا۔ ابھی میرے پاس لڑنے کے لیے ٹیم نہیں ہے۔" اس نے دادی کو شروع ہوتا دیکھ کر ان کے آگے ہاتھ جوڑے تھے اور فریحہ پنکھا چلا کر پہلی چارپائی پر بیٹھ گئی تھی۔ جانتی تھی کہ اگر دادی سے بحث کرنے بیٹھ گئی تو اس کا آدھا ایک گھنٹہ یونہی گزر جاتا ہے کہ دادی کا دادا نامہ اگر ایک بار شروع ہو جاتا تو مشکل سے ہی ختم ہوتا تھا اور ڈائجسٹ کی موجودگی میں 'اس کا غصہ کرنا یا ناراض رہنا مشکل تھا اور آج تو دادی نے شجاع کے کہنے پر ہی سہی اسے کھل کر پڑھنے کی اجازت دے دی تھی۔

"اماں! شجاع آیا تھا؟" امی کچن میں دودھ کو جوش دے کر باہر آئی تھیں۔

"دروازے پر ہی یہ رسالے دے کر چلا گیا ہے۔ میں نے کہا تھا کہ آجا۔ مگر ذرا جلدی میں تھا کہہ رہا تھا۔ پھر آئے گا۔" دادی نے اماں کو تفصیل بتائی تھی۔

"رسالہ دینے آیا تھا۔" امی نے بڑبڑاتے ہوئے ایک نظر اسے ڈائجسٹ میں محو دیکھ کر پوچھا تھا۔

"ہاں اسی نے دیا ہے۔" دادی نے کہا تھا اور دروازے کی دستک پر اس طرف متوجہ ہو گئی تھیں۔ امی بھی پر سکون ہو گئیں کہ شجاع پہ انہیں بہت بھروسہ تھا۔ وہ جانتی تھیں اگر اس نے اسے یہ پڑھنے کے لیے دیا ہے تو یہ اچھی چیز ہی ہوگی ان جیسی ان پڑھ کی عورت تو ہمیشہ فریحہ کو رسالہ پڑھنے سے روکتی رہی تھیں کہ پتا نہیں اس میں کیا لکھا ہو گا۔

"اماں جی! میں سوچ رہی تھی کہ شجاع کی ٹریننگ پر جانے سے پہلے میلاد وغیرہ کروالیں۔" تائی رقیہ دادی جان کے قریب بیٹھ کر بولی تھیں۔

"ہاں بھئی۔ میلاد تو ہونا چاہیے۔ آخر ہمارے شجاع کا فوج میں جانے کا خواب پورا ہو رہا ہے۔" دادی کی بجائے امی نے جواب دیا تھا۔

"ویسے کتنے ماہ کی ٹریننگ ہے شجاع کی۔" انہوں نے آخر میں پوچھا تھا۔

"نو ماہ کی کہہ رہا ہے پھر میرا پتر فوجی بن جائے گا۔ میرے ملک کا محافظ بن جائے گا۔" تائی کے لہجے میں بیٹے کے فوجی بن جانے کی خوشی اور امید جھلک رہی تھی۔

"ان شاء اللہ" دادی نے محبت سے چور لہجے میں کہا تھا کہ شجاع ان کا لاڈلا تھا اور اس کے فوجی بننے کے لیے انہوں نے بہت دعائیں مانگی تھیں۔

"تو پھر ٹھیک ہے۔ اماں کل میلاد رکھ لیتے ہیں۔ اور تو عابدہ میری بہن ذرا جلدی آجانا۔ مجھ سے اکیلے میں کہاں اتنا کام ہو گا۔" تائی نے کہنے کے ساتھ انہیں جلدی آنے کی تاکید بھی کی تھی۔

"کیوں نہیں بھر جائی میں صبح جلدی آجاؤں گی۔" انہوں نے محبت اور خلوص سے ان کا ہاتھ دبایا تھا۔ دونوں دیورانی جیٹھانی میں بہت اچھے تعلقات تھے۔

"نووین کو تو بلاتے ہی نا؟" دادی نے کسی امید کے تحت دھیرے سے پوچھا تھا۔

پہلی بار اتنی دیر سے فریحہ کا کھانے پر سے ارتکاز ٹوٹا تھا اور اس نے بے تابی سے تائی جان کو دیکھا۔

"اماں! فون کر دوں گی۔ آنا ہوا تو آجائے گی۔ بڑے لوگ ہیں پتا نہیں آئے یا نہیں۔" تائی نے عام سے انداز میں کہا تھا۔ اس نے دیکھا۔ دادی کی آنکھوں کی لو بجھ سی گئی تھی۔ پتا نہیں کیوں؟

☼ ☼ ☼

"اماں جی کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ بڑا بیٹا شکیل چوہدری جس کی ایک بیٹی فردوس اور ایک بیٹا شجاع تھا۔ شجاع فوج میں بھرتی ہو گیا تھا اور کچھ دنوں میں اس کی ٹریننگ شروع ہونے والی تھی اور چھوٹی فردوس ایف اے کے ایگزامز کے بعد فری تھی۔ چھوٹے بیٹے مطلوب کی بھی ایک ہی بیٹی فریحہ اور ایک بیٹا بابر تھا۔

فریحہ بھی ایف اے کے ایگزامز کے بعد فری تھی جبکہ بابر ابھی چھٹی کلاس میں تھا۔

اکلوتی بیٹی نووین جس کی خواہش اور پسند کے آگے مجبور ہو کر دادی جان نے ان کی شادی شہر میں رہنے والے دادا کے دوست شفیق ہمدانی کے بیٹے جلیل ہمدانی سے کر دی تھی۔ گو دادی اور دادا جان اکلوتی بیٹی کی شادی شہر میں ملنے والے آزاد خیال جلیل ہمدانی کرنا نہیں چاہتے تھے۔ مگر نووین اپنے گھر بعض اوقات آنے والے جلیل ہمدانی کی سحر زدہ کر دینے والی باتوں اور اس کی طرف سے شدید محبت کی یقین دہانیوں پر اس کی محبت میں اس قدر ڈوبی ہوئی تھی کہ اس نے دادی کے انکار پر ان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر رو کے التجا کر کے انہیں منا لیا تھا اور اماں بھی اکلوتی بیٹی کی ضد اور محبت کے سامنے ہار گئی تھیں۔ انہوں نے دادا جان کو بھی منا لیا تھا۔ یوں نووین کی شادی جلیل ہمدانی سے کر دی تھی اور وہ اب ڈیفنس کے خوب صورت گھر میں رہتی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"اے فردوس پھوپھو آ رہی ہیں نا۔" اس نے دیگ پکانے کے لیے چاول صاف کرتے ہوئے فردوس سے کسی امید کے تحت پوچھا۔

"پھوپھا سے پوچھ کر آنے کو کہہ رہی تھیں۔ ویسے تو ہر جگہ جانے کی اجازت ہے پھوپھو کو۔ مگر یہاں آنے کے لیے ہمیشہ پھوپھا صاحب کی اجازت لینا ضروری ہو جاتی ہے۔" فردوس نے منہ بناتے ہوئے کہا کہ اسے کلف لگے پھوپھا کبھی بھی اچھے نہیں لگتے تھے۔

فریحہ کو اس کا یوں غصہ کرنا پسند نہیں آیا تھا۔ اس نے دیکھا ان کے قریب ہی چارپائی پر بیٹھی دادی کے جھریوں زدہ چہرے پر اداسی سی ٹھہر گئی تھی۔ پتا نہیں دادی پھوپھو کے نام پر اتنا اداس کیوں ہو جاتی ہیں۔ اتنی اچھی اور خوش تو ہیں پھوپھو اور انکل (پھوپھا) ابھی اتنے نفیس سے ہیں۔ اس نے سوچا۔

تبھی اس کی آنکھوں میں خوب صورت نرم و نازک سی پھوپھو کا سراپا لہرایا تھا۔ اسے تو ہمیشہ نک سک سے تیار پھوپھو پر رشک ہی آتا تھا۔ وہ انہیں بہت پسند کرتی تھی۔ وہ جب بھی آتیں۔ فریحہ ان کے ساتھ ہی چپکی رہتی۔ ان کے وجود سے اٹھتی کلون کی خوب صورت مہک کو اپنے نتھنوں میں اتارتی۔ ان کی ایک ایک بیش قیمت چیز کو دھیرے سے چھو کر دیکھتی اور حیران ہوتی۔ انہیں دل ہی دل میں سراہتی کہ وہ چالیس پینتالیس کی ہونے کے باوجود اپنی عمر سے کم ہیں اور جب وہ چلی جاتیں تو وہ رشک و حسرت سے ان کے متعلق سوچتی رہتی۔ کتنی حسرت تھی کتنا شوق کہ وہ بھی پھوپھو کے گھر میں جا کر رہے یا پھوپھو ہی زیادہ سے زیادہ ان کی طرف آیا کریں۔ مگر نہ تو پھوپھو کبھی بلاوجہ ان کی طرف آتی تھیں اور نہ اس کو پھوپھو کے گھر جا کر رہنے کی اجازت تھی۔ حتیٰ کہ دادی بھی اپنی بیٹی کے گھر ایک رات سے زیادہ نہ رکتی تھیں۔

پھوپھو میلاد پر اپنے اکلوتے بیٹے عدن ہمدانی کے ساتھ آگئی تھیں اور وہ سب کام وام بھول بھال کر ان کے ساتھ چپٹی ہوئی تھی۔ وہ کیسے بات کرتی ہیں۔ کیسے بولتی ہیں، کیسے کھاتی ہیں وہ ان کی ہر ہر بات کو نوٹ کرتی ان سے متاثر ہو رہی تھی۔

"پھوپھو! دادی بتا رہی تھیں آپ کو میٹھا بہت پسند ہے۔ یہ دیکھیں میں نے صبح ہی آپ کے لیے کھیر بنائی تھی۔ مجھے یقین تھا۔ آپ ضرور آئیں گی۔" وہ اندر الگ سے ان کے لیے دستر خوان بچھائے۔ ان کو ایک ایک چیز پیش کر رہی تھی اور وہ اس کی محبت پر مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہی تھیں۔

"ارے۔۔۔ پھوپھو! بس اتنا سا۔۔۔ اور کھائیے نا اس سے زیادہ تو میں نمک مرچ چیک کرنے کے بہانے کھا لیتی ہوں۔" وہ انہیں دو چمچے نمکین اور ایک چمچہ زردے کا کھا کر بس کرتے دیکھ کر حیران ہوئی۔ اسے واقعی پھوپھو کے اتنا کم کھانے پر حیرت ہوئی تھی۔

"ہماری مما جینے کے لیے کھاتی ہیں۔ کھانے کے لیے نہیں جیتیں۔" باہر سے آتے عدن ہمدانی نے۔ اس کی اوپر تک بھری چاولوں کی پلیٹ کو دیکھتے ہوئے کہا اور دل ہی دل میں اس نازک اندام لڑکی کے اتنا زیادہ کھانے پر حیران ہوئے بنا نہیں رہ سکا تھا۔

"کیا فائدہ ایسی امیری کا کہ بندہ پیٹ بھر کر بھی نہ کھا سکے۔" اس نے بے ساختہ کہا تھا اور اگلے ہی لمحے اپنی زبان کی پھسلن پر زبان دانتوں تلے دبالی تھی۔

پھوپھو کے چہرے پر ایک سایہ سا گزرا تھا اور عدن نے اسے دلچسپی سے دیکھا تھا۔ یہی وہ لمحہ تھا۔ جب عدن ہمدانی کا دل اس لاپروا نادان سی لڑکی پر ٹھہر گیا تھا۔ ایسے ہمیشہ قدرتی اور دلکش منظر بھاتے تھے۔ وہ ان منظروں کو ہمیشہ اپنے پاس قید کر لینا چاہتا تھا اور آج یہ لڑکی اسے ہر بناوٹ ہر طرح کے فریب سے عاری قدرت کا حسین پیکر لگی تھی۔ اس دلکش منظر کو محفوظ کر لینے کی خواہش بے ساختہ دل میں ابھری تھی۔

"کیا کرتی ہیں آپ؟" وہ بڑی گہری اور دلکش مسکراہٹ لیے اسے دیکھ رہا تھا۔

"میں اور فردوس ایف اے کے ایگزام کے بعد فارغ ہیں اور کالج جانے کا بے تابی سے انتظار کر رہی ہیں۔" وہ خوشی خوشی تفصیل بتانے لگی تھی اور عدن ہمدانی مبہوت سا اسے دیکھے گیا تھا۔ کسی کام سے اندر آتے شجاع نے عدن ہمدانی کی نظروں کے تعاقب میں اسے دیکھا۔ جو پھوپھو سے مسکراتے ہوئے کچھ کہہ رہی تھی۔

"فریحہ۔ اماں جان تمہیں بلا رہی ہیں۔" اس نے اپنے چہرے پر پھیلتے غصے اور ناگواری کے تاثرات کو چھپاتے عام سے انداز میں اسے وہاں سے بھیجنے کے لیے بہانہ بنایا تھا کہ اسے کوئی اس کے سوا دیکھے وہ بھی اس والہانہ نظروں سے یہ برداشت کرنا اس کے لیے بہت مشکل تھا۔

پھر جب تک پھوپھو گئیں نہیں۔ تب تک عدن ہمدانی کی نظریں بار بار اس کی سمت اٹھتی رہیں اور ہر بار پہلے سے زیادہ اسے پانے کی خواہش دل میں مچلتی رہی تھی۔ اس کے چلے جانے کے بعد، فریحہ نے بار بار اس کے بارے میں سوچا تھا کہ اس کی متوجہ کرتی کچھ کہتی شریر سی نظریں اور دھیما دھیما سحر زدہ کر دینے والا لہجہ اسے شرمانے پر مجبور کرتا رہا تھا اور اس کا جاتے ہوئے اس کے قریب سے گزرتے ہوئے ایک لمحے کے لیے رک کر کہنا۔

"یاد رکھنا! فریحہ! محلوں میں رہنے والے شہزادے۔ بعض اوقات اپنے لیے شہزادی شہر سے دور کسی بستی سے ڈھونڈتے ہیں اور مجھے میری شہزادی مل گئی ہے۔"

معنی خیز جملے میں وہ اسے بہت کچھ سمجھا گیا تھا۔

"ہائے اللہ! کتنا خوب صورت اور دلکش انداز تھا۔ دھیمی دھیمی روشنی جیسا۔ ایسا کہ سامنے والا بس ہار

جائے خود کو 'جادوگر' کہیں کل۔" وہ خود ہی اپنی سوچ پر اپنے انداز پر ہنسی تھی۔ ستاروں بھرا آسمان اس کی معصومیت اس کی سادگی پر مسکرا دیا تھا۔

سو تو اس رات شجاع چوہدری بھی نہیں پایا تھا کہ عدنان ہمدانی کی پر شوخ نظریں اور فریحہ کا قوس و قزح والا چہرہ اسے بار بار ڈسٹرب کرتا رہا تھا۔ بات اگر صرف عدنان ہمدانی کی پسندیدگی تک ہوتی تو ٹھیک تھا۔ مگر اس نے عدنان ہمدانی کی سوچ کا عکس فریحہ کے چہرے پر دیکھا تھا۔ پریشان کیسے نہ ہوتا۔ اس رات پہلی بار اس نے فریحہ کے ساتھ اپنے سخت اور غصے والے رویے کے بارے میں سوچا تھا۔

"میرا غصہ صرف اس لیے ہے فریحہ کہ تم اپنی لاپرواہیاں چھوڑ کر سمجھ دار ہو جاؤ۔ یقین جانو تمہاری اصلاح کے علاوہ میرا کوئی مقصد نہیں ہے۔ تم جیسی ہو۔ مجھے تم ویسی ہی اچھی لگتی ہو۔ بس تمہاری لاپرواہی تمہاری ناسمجھی سے ڈر لگتا ہے کہ کہیں تمہاری یہ ناسمجھی تمہیں کسی بڑے نقصان سے دوچار نہ کر دے۔" بہت دیر تک وہ برگد کے درخت تلے چارپائی پر لیٹا کروٹ بدلتے ہوئے خود کلامی کرتا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"دادا جان نے اس لیے گھر میں دیوار بنائی تھی کہ کل کو اولاد جوان ہوگی تو ان کے بیچ پردہ رہے گا۔ یوں منہ اٹھائے ایک دوسرے کے سامنے نہیں آئیں گے۔ مگر اسے دیکھو جب دل چاہتا ہے منہ اٹھا کر چلا آتا ہے۔" شجاع کو آتا دیکھ کر اس کا منہ پھول گیا تھا۔

"ایک میرے باپ کا گھر ہے اور ایک چچا کا۔ اس لیے کسی کو میرے آنے جانے پر اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔" وہ اس کی بڑبڑاہٹ اور بگڑتے منہ کو دیکھ کر سمجھ گیا تھا۔ تبھی دادی کے قریب بیٹھ کر با آواز بلند بولا تھا۔

"نہ پتر کون تیرے یہاں آنے پر اعتراض کرے گا۔ تیرا ہی گھر ہے جب دل چاہے آ۔ اللہ بخشے تیرے دادا مرحوم کو وہ تجھ سے اتنی محبت کرتے تھے کہ ایک لمحے کے لیے بھی تمہیں اپنی آنکھوں سے دور نہیں کرتے تھے۔ گھر میں تو انہوں نے یہ سوچ کر دیوار بنا دی کہ اگر دونوں بھائیوں کے دلوں میں بچوں کا رشتہ کرنے کا خیال ہوا تو آسانی رہے گی۔ مگر زمین جائداد انہوں نے دو حصوں میں تقسیم نہیں کی کہ دونوں بھائی ساتھ مل کر کام کریں گے تو ایک دوسرے کے ساتھ بندھے رہیں گے۔ اور دیکھو میرے بچے آج تک ایک دوسرے کے ساتھ ہیں۔" دادی بیٹے کے لاڈلے کو دیکھ کر شروع ہو گئی تھیں اور وہ دادی کا دادا نامہ شروع ہوتا دیکھ کر اٹھ کر چھت پر کپڑے اتارنے چلی آئی۔

"تو دادی پھر بھائیوں میں رشتے داری کریں نا۔ دادا کی خواہش بھی پوری ہو جائے گی اور میری بھی۔"

آخری بات اس نے منہ ہی منہ میں بڑبڑائی تھی۔ اسے یقین تھا دادی نے نہیں سنی ہوگی۔

"میری تو یہی خواہش ہے کہ تیری اور فری کی بات پکی ہو جائے پر فیصلہ تو تیرے ماں باپ نے ہی کرنا ہے۔ میں کسی پر زور زبردستی تو نہیں کر سکتی۔" دادی نے دھیرے سے کہا تھا کہ بے شک ان کے بہو بیٹے ان کو عزت دیتے تھے۔ ان کی بات مانتے تھے۔ مگر اس کے باوجود انہوں نے کبھی کسی پر اپنی مرضی مسلط نہیں کی تھی۔ وہ انہیں سمجھاتی ضرور تھیں۔ مگر فیصلے کا اختیار ہمیشہ اپنے بچوں کو دیتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی دونوں بہوویں ان کی بہت عزت کرتی تھیں۔

"ہاں! تو "خبط عشق" ناول پڑھ لیا۔ کیا سبق ملا پڑھ کر۔" وہ اس کے پیچھے آکر منڈیر سے ٹیک لگا کر کالی بدلیوں میں ڈھلتے سورج کو دیکھتے ہوئے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے اپنی عادت کے خلاف مسکرا رہا تھا۔

"اسے کیا ہو گیا یہ تو کبھی عید شب برات پر نہیں مسکرایا کجا کہ آج اس عام سے دن میں۔" وہ جی بھر کر حیران ہوئی تھی اس کے مسکرانے پہ۔

"آپ بھی خواتین کے ڈائجسٹ پڑھتے ہیں۔" وہ اس کے سوال پہ پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

"کیوں میں نہیں پڑھ سکتا۔" اس نے الٹا اسی سے پوچھا تھا۔

"آپ کو دیکھ کر تو یہی لگتا ہے آپ سلطان راہی کے بہت بڑے فین ہیں اور پنجابی اور ہارر موویز کے سوا کچھ نہیں دیکھتے ہیں اور نہ پڑھتے ہیں۔" اس کے جیسے مزاج سے شہ پا کر وہ صاف گوئی سے بولی تھی [illegible] "شجاع کا قہقہہ بڑا بے ساختہ تھا۔

"پتا نہیں بخار وغیرہ ہو گیا ہے یا یونہی باؤلا ہو گیا ہے۔ ورنہ قہقہہ لگا کر ہنستے ہوئے تو میں نے اپنی پوری زندگی میں اسے نہیں دیکھا۔"

"بتاؤ نا کیا سبق ملا پڑھ کر؟" وہ چند ثانیے بعد بے تابی سے بولا کہ اس کا خیال تھا کہ کتابیں ہر قسم کے انسانوں کی تربیت و اصلاح کرتی ہیں۔ اسے یقین تھا وہ بھی کچھ نہ کچھ سمجھی ہوگی۔

"اس سے یہی سبق ملتا ہے کہ لڑکیاں جہاں چاہیں ان کی شادی کر دینی چاہیے ورنہ وہ بھاگ جاتی ہیں۔ دیکھو نا شجاع پہلے لڑکی کی شادی اس کی مرضی سے نہیں کر رہے تھے۔ جب گھر سے بھاگ کر خود اس نے اپنی پسند سے شادی کر لی تو پھر اس سے ہر تعلق ختم کر لیا۔ بے چاری اینڈ پہ معافی مانگنے آئی تو معاف بھی نہیں کیا۔"

"بکواس بند کرو۔" وہ جو کپڑوں کا ڈھیر اٹھائے اپنے ہوا سے بکھرتے بالوں کو سنبھالتے ہوئے۔ اسے کہانی اور اس کے متعلق اپنے نادر خیالات سے آگاہ کر رہی تھی۔ یہ دیکھے بغیر کہ اس کی ہر ہر بات پر شجاع کا چہرہ غصے سے لال بھبھوکا ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اس کے یوں غصے سے چیخنے پر حیران سی خاموش ہو کر اسے دیکھنے لگی تھی۔

"تم اس حد تک بے وقوف ہوگی میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔" وہ مٹھیاں بھینچے۔ خود کو پر سکون کرنے کے چکر میں لمبے لمبے سانس لینے لگا تھا۔ اسے اس کی سمجھ پر حیرت سے زیادہ دکھ ہوا تھا۔

"کیا میں نے کچھ غلط کہا۔" وہ معصومیت سے اس کو غصہ کرتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

"فریحہ کیا تم واقعی اتنی بے وقوف ہو یا میرے سامنے بن جاتی ہو۔" وہ حیرت و غصہ کی تصویر بنا بہت پیار کی پوچھی گئی بات دہرا رہا تھا۔ وہ منہ بنا کر رہ گئی تھی۔ اس سوال پہ۔

"اس میں بتانے کا، سمجھانے کا مقصد یہ تھا کہ جو لڑکیاں اپنے والدین کی عزت کو روند کر گھر سے بھاگ جاتی ہیں وہ تمام عمر ناخوش رہتی ہیں اور جو والدین کے فیصلے پہ سر جھکا دیتی ہیں وہ خوش اور آباد رہتی ہیں۔" اس نے اپنے غصے کو دباتے ہوئے نہایت تحمل سے اسے سمجھایا تھا۔ ورنہ تو اس کی اس کوڑھ مغزی پر اسے ایک چھانپڑ لگانے کو دل چاہ رہا تھا۔

"مگر پوری کہانی میں 'میں نے تو یہ جملے پڑھے ہی نہیں۔" وہ اس کے سمجھانے پر اچنبھے سے بولی۔

"تمہارا کچھ نہیں ہو سکتا فریحہ۔ میں تو کیا تمہیں کوئی بھی نہیں سمجھا سکتا۔ جو خود سمجھنا نہ چاہے۔ اسے کتابیں بھی شعور نہیں دے سکتیں۔ میں ہی بے وقوف تھا جو سمجھا شاید تم بھی زیادہ تر لوگوں کی طرح کہانیوں سے سبق لے کر سمجھ دار ہو جاؤ گی۔ مگر نہیں تم سمجھنے کے لیے پڑھتی کہاں ہو۔ تمہیں تو وہ وقت گزارنا ہوتا ہے۔" وہ اس کی اس درجہ کم عقلی پر شدید غصہ ہوا تھا اور وہ جو منہ بسور رہی تھی۔ اس پر ایک تیز نظر ڈال کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا سیڑھیاں اتر گیا تھا۔

"فریحہ یہ شجاع کیوں اتنے غصے میں گیا ہے۔" وہ کپڑوں کا ڈھیر لیے نیچے آئی تھی۔ جب امی نے اسے گھیر لیا تھا۔

"اب! مجھے کیا پتا اماں! آپ کا یہ کڑوا بادام۔ کب، کیسے اور کیوں غصے میں آجاتا ہے۔" اماں کے پوچھنے پر اسے غصہ ہی تو آگیا تھا۔ "ویسے سچ سچ بتا اماں جب شجاع پیدا ہوا تھا تو کیا تائی ہری مرچیں چباتی تھیں۔" اب وہ شرارت سے پوچھ رہی تھی۔

"شرم تو نہیں آتی تمہیں ماں سے ایسی بے شرمی کی باتیں کرتے ہوئے۔ ٹھیک کہتا ہے۔ شجاع پتر کہ ہماری محبتوں نے تمہیں ناسمجھ اور لاپروا بنا دیا ہے۔" اماں نے اس کے سوال پر بے ساختہ امڈنے والی مسکراہٹ چھپاتے ہوئے اسے گھرکا تھا۔

"لو اب اس کڑوے بادام سے آپ لوگوں کی مجھ

سے محبت بھی برداشت نہیں ہوتی۔" شجاع کے ماتھے پر اس کے ماتھے پر سینکڑوں بل پڑ گئے تھے۔

"فریحہ بڑا ہے تم سے۔" اماں نے اسے گھر کا تھا اور وہ اماں کے اس کی اتنی سائیڈ لینے پر کپڑوں کا ڈھیر ٹھکانے لگانے کے لیے پیر پٹختے ہوئے کمرے میں گھس گئی۔ موسم کی خوب صورتی یک لخت ماند پڑ گئی تھی۔

"اللہ کرے اس شجاع کی شادی جلدی ہو جائے۔ بیوی کے ناز نخرے اٹھانے میں ابھار ہے گا تو مجھے بھی ڈانٹنے کا ٹیم نہیں ملے گا۔ اس کا بھی ٹیم اچھا گزرے گا اور میرا بھی۔" اس نے صدق دل سے دعا کی تھی۔ تبھی بادل زور سے گرجا تھا اور وہ کچھ دیر پہلے والا غصہ بھول بھال کر صحن میں بھاگ گئی تھی۔

"فردوس اے فردوس جلدی آ بچ بڑا مزا آ رہا ہے۔" وہ دونوں ہاتھ پھیلائے منہ آسمان کی طرف اٹھائے تیز برستی بارش میں گول گول گھومتے ہوئے شور مچا رہی تھی کہ فردوس کے بغیر اسے کہیں بھی مزا نہیں آتا تھا۔ فردوس صاحبہ بھی اگلے ہی لمحے دیوار پھلانگ کر اس کے ساتھ ککلی ڈال رہی تھیں۔

"یہ لڑکی اتنی سیدھی اتنے صاف دل کی ہے میرے مالک اس کے ساتھ ہمیشہ اچھا ہی کرنا۔ کبھی اس کی کسی نا سمجھی کو اس کے لیے عمر بھر کا روگ نہ بنانا۔" شجاع نے اپنے گھر کے صحن سے اس برستی بارش میں اس کے ہنستے مسکراتے چہرے کو دیکھ کر دعا کی تھی۔

اس نے سوچا تھا وہ اب کبھی فریحہ پر غصہ نہیں کرے گا۔ بس اسے پیار اور آرام سے سمجھایا کرے گا۔ اسی لیے آج وہ اس سے دوستوں کی طرح بات کرنے کے لیے آیا تھا۔ اپنی دوستی کی بنیاد رکھنے کے لیے کہ وہ سمجھ رہا تھا کہ وہ اس کے غصے کی وجہ اس سے بد ظن ہے اور وہ اس کی بدگمانی اپنی دوستی سے ختم کرنا چاہتا تھا اور اسے یقین تھا جو لوگ کتابوں سے محبت کرتے ہیں۔ دنیا کو سمجھنے اور اچھے برے کی تمیز کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں اور یہی امید ہے وہ فریحہ کے پاس آیا تھا۔ مگر فریحہ کی نا سمجھی اور کند ذہنی پر ایسا غصے کا ابال اٹھا تھا کہ وہ جو اس کی بدگمانی ختم کرنے آیا تھا۔ اسے مزید خود سے بدگمان کر گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"فریحہ پتر! یہ خط ڈاکیا دے کر گیا ہے۔ پڑھ کر سنا کیا لکھا ہے۔ ویسے تیرے دادا جی کہتے تھے کہ خط کا آنا کوئی اچھا شگون نہیں ہوتا۔" دادی نے اسے اپنے لمبے سیاہ بالوں کی چوٹیاں کرتے دیکھ کر خط اس کے پاس رکھا تھا اور ساتھ دادا کو یاد کرنا نہ بھولی تھیں۔

"دادی کبھی تو دادا بے چارے کو یاد کرنا چھوڑ دیا کریں۔" وہ اپنی لمبی بالوں کی چوٹی کے آخر میں پونی ڈال کر اسے پیچھے کی طرف اچھال کر ہاتھ قمیص کے دامن سے صاف کرتے ہوئے۔ خط اٹھا کر بیٹھ گئی تھی۔

دادی کو خط سننے کی جلدی تھی۔ ورنہ اس کی ضرور کلاس لیتیں۔ ابھی صرف ایک گھوری ڈال کر رہ گئی تھیں۔

"دادی۔ دادی" ہائے دادی ہائے "میری امی" پڑھتے پڑھتے جہاں اس کی رنگت زرد ہوتی جا رہی تھی وہیں اس کی آواز میں درد مزید سمٹتا جا رہا تھا۔

"کیا ہوا فری سب ٹھیک تو ہے۔ بول فری میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔" دادی اس کی گھبراہٹ پر بدحواس باختہ سی سینے پر ہاتھ رکھے وہیں چارپائی پر بیٹھ گئی تھیں۔

"دادی لکھا ہے امی کی بہن کا دوسرے نمبر والا پتر مر گیا۔" اس نے رقت بھرے انداز میں کہتے ہوئے آخر میں رونا شروع کر دیا تھا۔

"ہائے میری عابدہ کی بہن تو جیتے جی مر گئی۔ ارے کوئی عابدہ کو بلائے اسے بتائے کہ اس کی بہن کا پتر مر گیا۔" دادی نے سنتے ہی سر کو دائیں بائیں ہلاتے ہوئے بین کرنا شروع کر دیا تھا۔

"جا پتر اپنے پیو اور تائے کو ڈیرے فون کر دے جانے کی تیاری کریں۔ ہائے ربا یہ کیا ہو گیا۔ کیڈا سوہنا جوان تھا۔ سرو کے درخت جتنا لمبا۔ سچ پوچھے

مجھے اس میں تیرا دادا نظر آتا تھا۔" دادی نے اس روتی دھوتی فریحہ کو فون کرنے کا کہتے ہوئے اس مرنے والے کا نقشہ کھینچا تھا اور ساتھ ہی دادا سے مشابہت کا حوالہ دینا ضروری سمجھا تھا۔ فریحہ نے جلدی سے اٹھ کر موبائل اٹھا لیا تھا۔

"ابا وہ مر گیا ہائے ابا۔" اس نے روتے ہوئے بین کیا تھا اور ابے کے تو جیسے ہاتھ پیر پھول گئے تھے۔

"کون مر گیا پتر۔" ابے کی بے حد گھبرائی ہوئی آواز ابھری تھی۔

"بس ابو جی! آپ بس آ جائیں۔" اس نے روتے ہوئے فون بند کر دیا تھا۔ اسی لمحے عابدہ بیگم جو کسی کے گھر دودھ دے کر آئی تھیں۔ دہلیز کے اندر قدم رکھتے ہی انہیں دادی اور فریحہ کے بین سنائی دیے تھے۔ ان کے قدم لڑکھڑا سے گئے تھے۔

"کیا ہوا فریحہ۔ سب ٹھیک ہے نا اماں۔" انہوں نے پہلے بھوں بھوں کرتی فریحہ اور پھر اماں کو دیکھا تھا۔ دل سوکھے پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔

"میں اب تمہیں کیا بتاؤں عابدہ۔ وہ مر گیا۔ دوسرے نمبر والا بھری جوانی میں مر گیا۔ تیری بہن کا سہارا نہیں رہا۔" دادی نے دونوں ہاتھ ہلاتے ہوئے بھرائے ہوئے انداز میں کہا تھا۔

"میں جانتی ہوں۔ میری بہن بیوہ ہونے کے بعد بے سہارا ہے۔ پر مرا کون ہے۔" امی نے روتے ہوئے کہا تھا۔

ابھی تک انہیں یہ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ مرا کون ہے۔ فریحہ اور دادی کو یوں زور و شور سے روتا دیکھ کر انہیں یقین تھا کہ کوئی بے حد عزیز رشتے دار گزر گیا ہے تبھی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے تھے۔

"فریحہ پتر لگتا ہے صدمے سے تیری ماں کا ذہن ہل گیا ہے۔ اٹھ اسے پانی پلا۔ حوصلہ دے۔" دادی نے عابدہ کے پوچھنے پر پہلے حیرت سے منہ اور آنکھیں کھول کر دیکھا تھا اور پھر منہ پر کپڑا رکھ کر روتے ہوئے۔ اپنے قریب رکھی چھڑی زور سے فریحہ کے پیٹ میں گھسا کر بولیں۔

"ہائے امی۔" فریحہ دادی کے یوں چھڑی گھونپنے پر چیخ کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"نہ پتر ابھی تیری ماں پاگل نہیں ہوئی صرف صدمہ ہے۔" دادی اس کی چیخ کا یہی مطلب سمجھی تھیں۔ تبھی اپنی لاڈلی پوتی کو دلاسا دینے لگیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کے بین کو سن کر فردوس اور تائی بھی پھولے ہوئے سانسوں کے ساتھ ان کے گھر آ گئیں ایک دو بار تائی نے بین کرنے کی وجہ پوچھی تھی۔ مگر جواب نہ پا کر وہ بھی وہیں زمین پر بیٹھ کر بین کرنے لگی تھیں اتنا اندازہ ہو گیا تھا کہ کوئی مر گیا ہے۔

"ہاں یار دو دن بعد میں ٹریننگ کے لیے چلا جاؤں گا۔" شجاع نے فون کان سے لگائے اپنے دوست سے باتیں کرتے ہوئے گھر کے سامنے سے گزرتے ہوئے۔ غیر ارادی طور پر ایک نظر آدھ کھلے دروازے کی سمت دیکھا اور اندر بیٹھی اپنے گھر کی تمام خواتین کو بین کرتے دیکھ کر اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔ اس کو فون بند کرنے کا ہوش بھی نہیں رہا تھا۔ وہ بس بھاگتے دوڑتے ہوئے گھر کے اندر داخل ہوا تھا اور اس کے پیچھے پیچھے بے حد گھبرائے اور پریشان سے تایا اور ابو۔

"کیا ہوا۔" اس نے ایک ہی نظر میں گھر کے تمام افراد کی خیر و عافیت موجودگی کا یقین کر کے دل ہی دل میں سکون کا سانس لیتے ہوئے پوچھا۔ فکر مندی ابھی بھی اس کے چہرے پر صاف نظر آ رہی تھی۔

"شجاع بھائی! فریحہ کی خالہ کا دوسرے نمبر والا پتر فوت ہو گیا ہے۔" فردوس نے اپنی بھیگی نظریں اور سرخ ناک دوپٹے سے رگڑتے ہوئے بتایا۔

"کیا؟" اس کے بتانے پر شجاع کی آنکھیں حیرت و بے یقینی سے اپنے پیچھے کھڑے خلیل اور مطلوب چوہدری کی طرف اٹھی تھیں۔ وہ دونوں بھی کچھ نا سمجھتے ہوئے ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے۔

"عابدہ تیری تو ایک ہی بہن ہے نا اور وہ بھی بے اولاد ہے۔ پھر یہ دوسرے نمبر والا پتر کہاں سے آ گیا۔" کتنی دیر یونہی ایک دوسرے کا منہ دیکھنے کے بعد

حیرانی سے پوچھا تھا۔ عابدہ بیگم تو خود فردوس کی بات سن کر ہکا بکا سب کو دیکھ رہی تھیں کہ مکمل بات تو انھیں بھی ابھی ابھی پتا چلی تھی۔

"ہاں! اماں جی' میری بہن تو بے اولاد ہے۔ آپ کو پتا تو ہے۔"

"ہیں۔" اب حیران ہونے کی باری نڈھال سی دادی کی تھی۔

"پر فریحہ نے جو خط پڑھ کر مجھے سنایا۔ اس میں تو یہی لکھا تھا اور سنتے ہی میں اتنا گھبرا گئی کہ کچھ سوچنے سمجھنے کا وقت ہی نہیں ملا۔"

"سچ خط میں یہی لکھا ہے۔" دادی کے کہنے پر اس نے سب کو اپنی طرف دیکھتا پا کر فوراً" کہا تھا۔

شجاع کو کچھ کچھ بات سمجھ میں آگئی تھی کہ فریحہ کی نا سمجھی سے وہ خوب واقف تھا۔ تبھی اسے تیکھے چتونوں سے دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

"ذرا خط دکھاؤ۔ دیکھوں کیا لکھا ہے۔" اور فریحہ نے فوراً" اپنے ہاتھ میں مڑا سا خط اسے تھما دیا تھا۔

"ابو' چچا جی! یہ خط ہمارے گھر نہیں بلکہ کسی عابدہ محبوب کے گھر آیا ہے۔" اس نے پورا خط پڑھ کر سنایا تھا اور ایک نظر اسے دیکھا تھا۔

"اوپر تو ابو کا نام لکھا ہے۔ سچ میں نے خود پڑھا تھا۔ عابدہ مطلوب" اسے شجاع کی بات کا یقین نہیں آیا تھا۔ تبھی ایک نظر شجاع پر ڈال کر خط لے کر دوبارہ دیکھنے لگی تھی۔

"یہ دیکھو لکھا ہے۔ عابدہ محبوب جب کہ چچی کا نام عابدہ مطلوب چوہدری ہے۔" اس نے باقاعدہ نام پر انگلی رکھ کر ناموں پر زور دیتے ہوئے اسے بتایا تھا اور وہ شرمندہ سی ہو گئی تھی۔

"فوتگی کا پڑھ کر ہی میری آنکھیں بھیگ گئی تھیں کہ مجھے محبوب بھی مطلوب نظر آ رہا تھا۔"

"اسی لیے تو تمہیں کہتے ہیں کہ اپنی آنکھیں اور ذہن کھول کر رکھا کرو۔ کیونکہ اکثر جو ہم دیکھ اور سمجھ رہے ہوتے ہیں۔ وہ سچ نہیں ہوتا۔" شجاع نے پوری سنجیدگی سے اسے سمجھایا تھا اور وہ خفت سے سر ہلاتے ہوئے پیچھے ہٹ گئی تھی۔ شجاع کو یقین تھا وہ آج بھی اس کی بات نہیں سمجھی ہوگی۔ تبھی ایک گہری نظر اس پر ڈال کر چچا اور ابو کے پاس بیٹھ گیا تھا۔ جو ان کی بے وقوفی بلکہ کم عقلی پر خوب ہنس رہے تھے۔

"دادی جان آپ تو کہہ رہی تھیں کہ مرنے والا سہو جتنا لمبا اور جوان ہے اور تو اور اسے دیکھ کر آپ کو دادا جی یاد آتے تھے۔" سب کے واپس چلے جانے کے بعد اس نے دادی کو گھیر لیا تھا۔

"بیٹے تو سب کو سوہنے اور جوان ہی لگتے ہیں اور مجھے تو ہر مرنے والے میں تیرے دادا کی جھلک ہی دکھائی دیتی ہے۔" دادی نے نظریں چراتے ہوئے وضاحت دی تھی کہ اس سارے ڈرامے میں 'تھوڑا بہت قصور' تو ان کا بھی تھا اور اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتی دادی وضو کرنے اٹھ گئیں اور وہ بس انہیں دیکھ کر رہ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"عدن ہمدانی! اب اکثر فون کرنے لگا تھا۔ دادی سے بات کر کے وہ اس سے ضرور بات کرتا اور اس کا خوشبوؤں میں ڈوبا ہوا دھیما سا لہجہ اسے پہروں مسکرانے پر مجبور رکھتا۔ دادی حیران ہو کر کہتیں "پتا نہیں اس عدن کو کیا ہو گیا ہے۔ بیس سال تو اسے نانی کی یاد تک نہیں آئی اور اب دیکھو کیسے روز نانی کی خیریت پوچھی جاتی ہے۔" وہ دادی کی ایسی باتوں پر دل ہی دل میں مسکرائی رہتی اب انہیں کیا بتاتی کہ وہ ان کی نہیں میری خیریت پوچھنے مجھ سے بات کرنے کے لیے فون کرتا ہے اور اگر عدن ہمدانی کی کال آنے پر شجاع وہاں موجود ہوتا تو اس کے ماتھے کے بل گننا مشکل ہو جاتے اور بعض اوقات وہ اسے عدن سے بات کرتے دیکھ کر بے چین سا اٹھ کر چلا جاتا۔ تب دادی اسے روکتی رہ جاتیں۔ مگر وہ پلٹ کر نہ دیکھتا کہ جس کی محبت جس کی خوشی کے لیے وہ فوج میں چلا گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اپنے سوا کسی غیر کے سپنے دیکھنا۔ اس کی برداشت سے باہر تھا۔ اسے یاد تھا ایک بار فریحہ نے کہا

تھا کہ۔

"کاش ہمارے رشتے داروں میں بھی کبھی کوئی فوج میں جائے۔ سچ وردی میں ملبوس عام سا بندہ بھی بڑا خاص لگتا ہے۔ دل خود بہ خود اس کی عزت کرنے اس سے محبت کرنے کو چاہنے لگتا ہے۔" اسے فوجی بے حد اچھے لگتے تھے اور وہ جو ہمیشہ اپنے گھر والوں کے قریب رہ کر کام کرنا چاہتا تھا۔ بے شک ملک کی خدمت کرنے کا شوق اسے بچپن سے ہی تھا اور یہ تو طے تھا کہ اسے اپنے ملک اور اپنوں کی خدمت ہی کرنی ہے کہ وہ اپنے سے منسلک رشتوں سے بہت محبت کرتا تھا اس لیے وہ ان سے دور نہیں جانا چاہتا تھا۔ تبھی اس نے پولیس لائن میں جانے کا سوچا تھا۔ مگر فریحہ کی خواہش پر کب پولیس کی وردی کی جگہ فوج کی وردی نے لے لی۔ اسے خود بھی پتا نہیں چلا تھا اور اب وہ ان قریب فوج میں ٹریننگ پر جانے والا تھا۔

وہ جانتا تھا۔ فریحہ بہت معصوم اور سیدھی سادھی ہے۔ جسے نہ صرف ہر چیز جتانی پڑتی تھی۔ بلکہ اسے سمجھانی بھی پڑتی تھی۔ اسے ہر چیز ہمیشہ دیر سے سمجھ آتی تھی۔ مگر یہ سب جاننے کے باوجود وہ کبھی بھی اپنے دل کی بات فریحہ سے نہیں کر پایا تھا۔ پتا نہیں اس نہ بتانے کے پیچھے اس کی کوئی مصلحت چھپی تھی یا فریحہ کی بے وقوفیوں نے اس کے ہونٹ بند کر رکھے تھے۔ وہ جب بھی کبھی خوشگوار موڈ لیے اس سے کچھ کہنے اسے کچھ بتانے کے لیے آتا۔ وہ کوئی نہ کوئی ایسی بات کر دیتی جو اس جیسے سمجھ دار اصول پسند سوچ رکھنے والے شخص کو غصے سے باہر کر دیتی اور وہ ہمیشہ اس پر غصہ کر کے واپس آ جاتا۔

امی اور تائی خاندان میں ہونے والی کسی فوتگی پر گئی تھیں اور فردوس کسی سہیلی کے ہاں سیپارہ پڑھنے کے لیے۔ دادی حسب عادت دوپہر میں سو رہی تھیں اور وہ حسب عادت سونے کی کوشش کر رہی تھی۔ تبھی شجاع کے چند دوست بن بتائے اس سے ملنے آ گئے تھے کہ پرسوں صبح اسے ٹریننگ پر جانا تھا۔

"اچھا ہوا فریحہ تم جاگ رہی ہو۔ یہ پکڑو گوشت اور جلدی سے بھون لو۔ ساتھ میں زردہ بھی بنا لینا۔ روٹی میں تندور سے لے آتا ہوں۔" وہ اس کے قریب گوشت کا شاپر رکھ کر ہدایت دیتا پلٹ گیا تھا اور اس کے تو جیسے ہاتھ پیر ہی پھول گئے تھے۔ اسے اپنی اچھی کوکنگ پر تو کوئی شک نہیں تھا۔ مگر شجاع کے کام کہنے پر وہ یونہی بدحواس ہو جاتی تھی۔ ابھی بھی وہ دل ہی دل میں فردوس کو کوستے ہوئے اٹھ کر کچن میں آ گئی تھی (اگر فردوس گھر ہوتی تو اسے شجاع کا کام نہ کرنا پڑتا) ایک طرف گوشت رکھ کر دوسری طرف چاول ابال کر وہ شیرہ تیار کرنے لگی تھی۔ جب شجاع کی دوبارہ آمد ہوئی تھی۔ ہاتھ میں دہی بھلے کا شاپر پکڑے وہ ایک طرف رکھے برتنوں میں سے پلیٹیں نکال کر اس میں ڈالنے لگا تھا۔ اس کو ایک نظر ایسے سلیقے سے لڑکیوں کی طرح کام کرتے دیکھ کر وہ شیرہ چاولوں میں مکس کرنے لگی تھی۔ جب اچانک ہانڈی جلنے کی بو پر شجاع پلٹا تھا۔

"فریحہ پانی ڈالو" اس نے چیختے ہوئے دہائی دی تھی۔ اور شجاع کے ایک دم سے بولنے پر۔ اپنے دھیان میں شیرہ مکس کرتی فریحہ نے سٹپٹاتے ہوئے فوراً" ہاتھ میں پکڑی شیرے والی دیگچی گوشت میں انڈیل دی تھی۔

"فریحہ تم! تم کبھی کچھ ڈھنگ سے نہیں کر سکتی۔" وہ تاسف سے سر تھام کر رہ گیا تھا۔ اگلے دس منٹ اسے اس کی بے وقوفی پر وہ لیکچر سننے کو ملے تھے کہ وہ دل تھام کر رہ گئی تھی۔ مگر کھانا تو پکانا تھا تبھی شجاع ساتھ والی خالہ مجیداں کو بلا لایا تھا۔

وہ شجاع کے دوستوں کے جانے کے بعد گندے برتن دھو رہی تھی۔ جب فردوس بھی اپنے گھر میں کسی کونہ پا کر اس کی طرف آگئی تھی۔

"کوئی آیا تھا کیا؟" وہ برتنوں کا ڈھیر دیکھ رہی تھی۔

"تیرے بھائی کے دوستوں کی بارات آئی تھی۔ پتا نہیں کہاں کہاں سے ویلے نکمے منہ اٹھا کر بتائے بغیر دعوت کھانے آ جاتے ہیں۔" وہ جو پہلے سے شجاع کی ڈانٹ پر بھری بیٹھی تھی شروع ہو گئی۔

"نہ فردوس تم اپنے بھائی کا علاج کیوں نہیں

کراتیں۔ دیکھو فردوس میں سچ کہہ رہی ہوں تمہارے بھائی کے ساتھ کوئی نفسیاتی مسئلہ ہے۔ ورنہ کوئی نارمل بندہ اتنا غصہ کرتا ہے۔" وہ غصے سے بولتے ہوئے اچانک سب چھوڑ کر اس کی طرف گھوم کر فکر مندی سے بولی۔ جبکہ فردوس جان گئی تھی کہ آج پھر کسی کوتاہی پہ بھائی سے ڈانٹ پڑی ہے۔ تبھی مسکراہٹ اس کے چہرے پہ پھیل گئی تھی۔

"تم اپنی بے وقوفیاں چھوڑ دو فریحہ میں غصہ کرنا تو کیا ماتھے پہ بل ڈالنا ہی چھوڑ دوں گا۔" وہ جو اپنے دوستوں کو چھوڑ کر واپس آیا تھا۔ اس کی بات سن کر کچن میں آگیا تھا۔ اس کے سن لینے پر فریحہ کا جیسے سانس رک گیا تھا۔ وہ اس کے غصے سے ایسے ہی گھبرا اٹھی تھی۔ جبکہ فردوس مسکراتے ہوئے برتن دھونے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

"شجاع پتر' تیری دادی کی خواہش ہے کہ تیرا اور فریحہ کا رشتہ طے کردیں۔ ہماری بھی یہی خواہش ہے کہ تیری ٹریننگ پر جانے سے پہلے فریحہ سے رشتہ کر دیں۔ مجھے تو فریحہ بہت پسند ہے۔" شکیل چوہدری اور رقیہ بیگم نے اس سے پوچھا تھا اور اس سوال نے اس کے اندر تک سکون کی لہر دوڑ گئی تھی۔

"جیسا آپ چاہیں مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" اس کے سعادت مندی سے کہنے پر شکیل احمد نے اسے گلے لگا لیا تھا۔

"بس! میں نے کہہ دیا دادی میں اس کڑوے اور سخت بادام سے شادی نہیں کروں گی۔ زہر کھالوں گی۔ مگر اپنی زندگی اس کڑھتے بادل سے شادی کر کے تباہ نہیں کروں گی۔" رات تایا اور تائی کی آمد کے بعد اسے کسی غیر معمولی تبدیلی کا احساس ضرور ہوا تھا۔ امی اور ابو کا شکر ادا کرنا کہ انہیں شجاع بچوں کی طرح عزیز تھا اور دادی تو پھولے نہیں سما رہی تھیں کہ ان کی خواہش ان کے بہو بچوں نے پوری کردی ہے۔ بے شک شجاع انہیں بہت عزیز تھا۔ مگر فریحہ بھی انہیں کچھ کم عزیز نہیں تھی۔ وہ دل سے چاہتی تھیں کہ ان کی نا سمجھ اور بھولی سی فریحہ کی شادی سمجھ دار سے شجاع سے ہو جائے اور پھر شجاع کی پسندیدگی بھی ان سے ڈھکی چھپی نہیں تھی اور اب جب فریحہ کے ان کی خوشی کی وجہ پوچھنے پر انہوں نے بتایا تھا کہ تایا اس کے اور شجاع کے رشتے کی بات کرنے آئے تھے اور تمہارے ابو نے ہاں بھی کردی ہے تو وہ حیرت اور بے یقینی کے شدید جھٹکے سے اچھل ہی تو پڑی تھی اور اب جو منہ میں آرہا تھا بول رہی تھی۔

"مان لیں باجی! شجاع بھائی سے زیادہ اچھا اور کھرا انسان تمہیں کہیں نہیں ملے گا۔" پتنگ کی ڈور ہاتھ پر لپیٹتے بابر نے کسی بزرگ کی طرح اسے سمجھایا تھا۔ ویسے بھی وہ اس سے کئی سال چھوٹا ہونے کے باوجود سمجھ دار تھا۔

"آج میرے متھے نہ لگ بابر بچ بڑے غصے میں ہوں۔ میرا ابا بننے کی ضرورت نہیں ہے تمہیں۔" بے ترتیب جملے بولتے ہوئے اس نے غصے سے ذرا سا سر جھٹکا تھا۔

"نہ چوہدریوں کا خون ہے لمبا نہیں ہو گا تو اور کیا ہو گا۔ تیرے دادا جی! سرو کے درخت جتنے لمبے تھے۔ تم سب کو بھی ان پر ہی جانا ہے۔" دادی جو کب سے کان لگائے اس کی بک بک سننے کی کوشش کررہی تھیں۔ اس کے آخری جملے ہی سن پائی تھیں۔ وہ بھی غلط بھی بولی تھیں۔

"ایک تو دادی آپ سنتی کچھ اور سمجھتی کچھ ہیں۔" وہ ان کے ابا کو لمبا سمجھ لینے پر تلملا کر رہ گئی تھی۔

"بس دادی میں نے کہہ دیا ہے۔ میں شجاع سے شادی نہیں کروں گی۔"

"نہ بی بی کیا کمی ہے شجاع میں۔۔۔ تجھے تو شکر ادا کرنا چاہیے کہ تجھ جیسی نکمی کو شجاع چوہدری مل رہا ہے۔" دادی اس کی بات پر بلکہ لاڈلے شجاع کو رد کر دینے پر غصہ ہوئی تھیں۔

"توبہ مرم کا کھاتا! کیسے بول رہی ہے۔ ایک ہمارا زمانہ تھا۔ ادھر لڑکی کے رشتے کی گل ہوتی اور لڑکی شرما کر کونوں کھدروں میں چھپ جاتی اور جب تیری پردادی مرحومہ مجھے دیکھنے آئی تھیں تو میں خود شرم کے مارے منجھی (چارپائی) نیچے چھپ گئی تھی۔ میری نندوں نے کھینچ کر مجھے باہر نکالا تھا۔ میں نے ماں پیو کی لاج رکھ کر ان کی مرضی سے شادی کی تھی۔ تبھی تو تیرے دادا نے اتنی عزت اتنی محبت دی کہ وہ مجھے آج تک نہیں بھولتے۔ ہائے' چوہدری جی۔ آکر دیکھیں کیسا زمانہ آ گیا ہے۔ آپ کی پوتری آپ کے لاڈلے شجاع سے شادی سے انکار کررہی ہے۔" دادی بولتے بولتے ایک دم رونے لگی تھیں اور وہ جو کب سے منہ بنائے دادی کی تقریر سن رہی تھی ان کے رونے پر ایک دم ان کے قدموں میں بیٹھ گئی تھی۔ کہ اب لڑنے کا نہیں منت کرنے کا وقت تھا۔ (اس کے خیال سے)۔

"دادی! وہ بڑا ظالم ہے۔ سچ اسے میرا کوئی کام کوئی بھی بات اچھی نہیں لگتی۔ اونچا ہنسنے پر' اونچا بولنے پر دھوپ میں پھرنے پر' سردی میں آئس کریم کھانے پر ہر چیز پہ اسے اعتراض ہے۔ وہ مجھے بدلنا چاہتا ہے بھلا خود کو بدلنا آسان ہوتا ہے۔ اگر میری شادی شجاع سے ہوگی تو آپ کی فریحہ محبت کی بوند بوند کو ترس جائے گی۔" اس نے فلمی انداز میں ہاتھ ماتھے پر رکھ کر آنکھوں میں آنسو لیے خوب جذباتی سی تقریر کی تھی۔

"بس اتنی سی گل تھی۔ میں تبھی پتا نہیں کیوں تو شجاع سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔" دادی پتا نہیں کیا سمجھی تھیں۔ تبھی خوش ہوتے ہوئے اسے گلے لگا لیا تھا لگتا ہے بات دادی کی سمجھ میں آگئی ہے۔ وہ دادی کے یوں محبت جتانے پر اپنی جذباتی تقریر کے کار آمد ہونے پر خوش ہوئی تھی۔

"اگر تجھے ہنی مون پر جانا ہے تو کوئی بات نہیں۔ تیری اور شجاع کی شادی کے تیسرے دن میں خود تمہیں ہنی مون پر بھیج دوں گی۔" وہ دادی کی بات پر کتنے ہی پل حیرانی سے دادی کو دیکھتی رہی تھی۔ جو بوند بوند کو ہنی مون سمجھ کر اسے تسلی دے رہی تھی۔ جب بات اس کی سمجھ میں آئی تھی تو وہ جھٹکے سے ان سے الگ ہوئی تھی۔

"حد ہوتی ہے دادی نہ سننے کی بھی۔" وہ غیر محسوس طریقے سے شجاع کے انداز میں تاسف سے کہتی پیر پٹختے ہوئے چلی گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"دادی پلیز کچھ کریں نا۔ میں شجاع کو پسند نہیں کرتی۔" وہ ایک بار پھر دادی کے سامنے بیٹھی التجا کر رہی تھی کہ کل شجاع کے جانے سے پہلے اس کی منگنی شجاع کے ساتھ کی جانے کی بات ابھی ابھی اسے فردوس سے پتا چلی تھی۔ جو اس کو بھابھی بنانے کے خیال سے کافی پرجوش سی اس کے پاس آئی تھی۔ مگر وہ منہ بنائے بیٹھی رہی تھی۔ تب وہ مایوس سی واپس چلی گئی تھی اور وہ اٹھ کر دادی کے پاس آگئی۔ جو ابھی ابھی ڈاکٹر سے شجاع کے ساتھ جاکر کان صاف کروا کر آئی تھیں۔ انہوں نے اس کے کہنے پر بغور اس کا چہرہ دیکھا تھا۔

"پھر کیسے کرتی ہے پسند۔" دادی نے دل میں اٹھتے کسی خدشے کی تصدیق کے لیے برملا پوچھا تھا۔ وہ ان کے یوں صاف پوچھنے پر نظریں چرا گئی تھی۔

"میں نے کچھ پوچھا ہے فریحہ۔" دادی نے اسے خاموش دیکھ کر پوچھا تھا۔

"دادی میں۔۔۔ مجھے عدین ہمدانی پسند ہے۔" وہ اٹک کر کہتے ہوئے رکی نہیں تھی۔ اس نے پیچھے مڑ کر دادی کے چہرے کی متغیر رنگت اور بے یقین نظروں میں پھیلتے کرب و دکھ کو دیکھنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی اور دادی کے اندیشوں کی تصدیق ہوگئی تھی۔ اس نے دادی کی طرف سے مایوس ہو کر خود ہی ابو اور امی کے سامنے انکار کردیا تھا۔ امی غصہ اور ابو حیران ہوئے۔ مگر پوچھا تھا تو صرف اتنا کہ "شجاع پتر میں کوئی کمی ہے۔"

"ہاں! محبت کی مروت کی اور نرمی کی۔" دل نے جیسے دہائی دی تھی۔ مگر کہا تھا تو صرف اتنا کہ "ابو جی میں ابھی صرف پڑھنا چاہتی ہوں۔ یہ رشتے اور شادی کے متعلق میری پڑھائی مکمل ہونے کے بعد سوچیے گا۔" وہ ہر ایک کے سامنے منہ پھاڑ کر انکار کرسکتی تھی۔ مگر

ابو کے سامنے انکار کرنا وجہ بتا کر کسی قدر مشکل تھا۔ یہ اسے ابھی ابھی پتا چلا تھا۔ تبھی وہ بہانہ بنا گئی تھی۔

"جیسے تیری مرضی۔" ابو جی اس کے کہنے پر مطمئن سے ہوتے ہوئے۔ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر چلے گئے تھے۔ کہ وہ بچوں پر کسی قسم کی زبردستی کے قائل نہیں تھے۔ دادی اور امی نے بھی اس سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ مطمئن بھی تھی اور خوش بھی۔ کہ رشتہ فی الحال اس کی پڑھائی مکمل ہونے کے بعد کرنے تک ملتوی کر دیا گیا تھا۔ کسی کو اگر اس فیصلے پر اعتراض تھا بھی تو کسی نے اس سے کچھ نہیں کہا تھا اور وہ یہ سوچ کر محظوظ ہوتی رہی تھی کہ اس کی پڑھائی ختم ہونے تک عدن اپنا رشتہ بھیج دے گا اور وہ سب کو اس رشتے پر رودھو کر منا ہی لے گی۔

"تم نے واقعی ابھی پڑھنے کی وجہ سے انکار کیا ہے یا کوئی اور وجہ ہے۔" وہ اس کے سامنے کھڑا پوچھ رہا تھا۔

"مجھے آپ سے شادی نہیں کرنی تھی نہ آج نہ کل۔" اس نے بے وقوفی سے کہہ دیا تھا کہ بات اس کی پوری زندگی کی تھی۔ وہ ڈر کر یا کسی کے رعب میں آکر ہاتھ میں آیا موقع گنوانا نہیں چاہتی تھی۔ تبھی شجاع کے پوچھنے پر اس نے جھٹ بتا دیا تھا۔ کہ وہ اسے پسند نہیں کرتی۔

"شجاع نے چند ثانیے کے لیے اس کے کہنے پر اس کے معصوم اور بے ریا چہرے کو دیکھا۔ وہی معصومیت جو اس کی نادانیوں پر بھی اسے اس کے متعلق کچھ برا سوچنے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔

"پھر کس سے شادی کرنا چاہتی ہو۔" وہ اس کے منہ سے وہ نام سننا چاہتا تھا۔ بے شک وہ نام شجاع کو پتا تھا۔ وہ اس کے یوں اچانک پوچھ لینے پر سٹپٹائی تھی۔ کسی کا دھیما محبت کی آنچ لیے پر شوخ سا لہجہ اس کی آنکھوں میں لہرایا تھا اور وہ اس سے نظریں چراتے ہوئے بولی۔

"ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔" اس کا لہجہ کتنا کچا تھا شجاع جانتا تھا۔ تبھی ہولے سے مسکرایا۔

"ٹھیک ہے جاؤ۔" اس نے اسے جانے کی اجازت دے دی تھی۔

"مگر پریشان مت ہونا۔ وہی ہو گا۔ جیسا تم چاہو گی۔ یہ وعدہ ہے میرا تم سے لیکن اگر موقع ملے تو سوچنے اور سمجھنے کی کوشش کرنا کہ تم کیا چاہتی ہو۔ کیا خوش رہ سکوں گی۔ اس کے بعد تم جو فیصلہ کرو گی مجھے منظور ہو گا۔" اس نے اپنی عادت کے خلاف دھیمے لہجے میں کہا تھا کہ اس کو اس سے زیادہ جانتا تھا۔ جانتا تھا کہ جو لڑکی وہ دن اس گھر سے دور نہیں رہ سکتی۔ جو ہیل والا جوتا پہن کر بار بار ٹھوکر کھاتی ہے۔ جو اس کے گھر آنے کے لیے دروازے کی بجائے دیوار پھلانگتی ہے۔ وہ کسی طور اس ظاہری چمک دمک والے ماحول میں رہ نہیں سکتی تھی اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ پابندی انسان کو چور راستے اختیار کرنے کی طرف دھکیلتی ہے اور وہ اس پر کوئی پابندی یا زور زبردستی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنی طرف سے اسے مطمئن اور پرسکون کر دیا تھا۔

وہ جو سوچ رہی تھی کہ وہ اس کے انکار کرنے پر خوب اس کی کلاس لے گا۔ اس کے یوں تحمل سے بات سن لینے بلکہ اس کا ساتھ دینے کا وعدہ کرنے پر مسرور سی چلی آئی تھی۔ اسے یقین تھا اگر شجاع اس کے ساتھ ہے تو اسے واقعی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ شجاع دونوں گھروں کا لاڈلا اور چہیتا تھا۔ اس کی ہر بات مانی جاتی تھی۔ وہ اس سے کہہ کر اپنی بات بھی منوا لے گی۔

☼ ☼ ☼

"شجاع ٹریننگ پر چلا گیا تھا۔ دونوں گھروں میں جیسے ہر سو خاموشی چھا گئی تھی۔ دادی کتنے دن اسے یاد کر کے آنسو بہاتی رہی تھیں۔ مگر وہ خود کو بے حد آزاد اور خوش محسوس کر رہی تھی کہ اب اس کی اوٹ پٹانگ حرکتوں پر اسے ڈانٹنے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ بے حد مسرور تھی۔ ایسے میں عدن ہمدانی کا فون پر کہنا "فریحہ ہمیشہ ایسی ہی رہنا ہنستی اور قہقہے لگانے والی۔ کیونکہ عدن ہمدانی کو ایسی ہی اچھی لگتی ہو نٹ کھٹ۔"

وہ ان باتوں پر کتنے ہی دن ہواؤں میں اڑتی رہی تھی کہ جس شخص سے وہ محبت کرتی ہے۔ وہ اسے ایسا ہی دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کے اصل اور حقیقی رنگ میں۔ اسے اس کے لیے خود کو بدلنا نہیں پڑے گا۔

"شجاع جن نادانیوں پر تم غصے میں آتے ہو۔ مجھے ڈانٹتے ہو۔ کوئی میری ان نادانیوں سے محبت کرتا ہے۔ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ مجھے احساس دلاتا ہے کہ میں کس قدر خاص ہوں۔" اس نے تصور میں شجاع کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا اور چاند اس کی اس نا سمجھی پر مسکرا دیا تھا۔

دادی بس اسے دیکھ کر رہ جاتیں کہ فریحہ کا یہ روپ ان کے دل پر لگے ماضی کے زخم ادھیڑ کر رکھ دیتا اور وہ بس لب سیئے رہتیں کہ شجاع نے کہا تھا۔

"دادی جان! آپ میرے جانے کے بعد فریحہ سے کچھ مت کہیے گا۔ رشتے کے متعلق کچھ مت پوچھیے گا۔ اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں۔ یقین رکھیں ہماری محبت کے رنگ اتنے کچے نہیں ہیں کہ فریحہ ان سے بھاگ سکے۔"

آج جب شجاع کا فون آیا تھا تو دادی جیسے رو دی تھیں۔

"وہ بہت معصوم بہت ناسمجھ ہے شجاع۔ عدن کی لمبی لمبی فون کالز اور اس کی سحر زدہ کر دینے والی باتیں وہی سحر زدہ باتیں جس نے کبھی نورین جیسی سمجھ دار کو پاگل بنا دیا تھا۔ اگر فریحہ نے بھی مجھے نورین کی طرح عدن ہمدانی کے ساتھ شادی پر مجبور کیا تو... سچ میں جی نہیں پاؤں گی کہ ان بوڑھی ہڈیوں میں بیٹی کے بعد پوتی کا دکھ اٹھانے کی ہمت نہیں ہے۔"

"دادی جان آپ جانتی تو ہیں۔ وہ ہر چمکتی چیز کو سونا سمجھ لیتی ہے۔ یاد نہیں کیسے جگنو کو چمکتے دیکھ کر وہ حسرت سے کہتی تھی۔ کاش یہ میرے پاس ہوتا تو میں اس کے ساتھ اڑتی پھرتی اور ایک بار چچا نے اسے جگنو پکڑ دیا تھا اور وہ اسے قریب سے دیکھتے ہوئے منہ بنا کر پیچھے ہٹ گئی تھی کہ یہ تو کیڑا ہے۔ میں سمجھی کوئی چھوٹا سا ستارہ ہے اور پھر اس نے کبھی جگنو کی طرف دیکھا تک نہیں تھا بلکہ اپنی بلی اور کبوتروں کے ساتھ ہی کھیلتی تھی۔" شجاع نے ماضی کا قصہ دہراتے ہوئے دادی کے ساتھ خود کو بھی تسلی دی تھی کہ اسے جلد ہی پتا چل جائے گا کہ عدن ہمدانی وہ نہیں ہے جو وہ سمجھ رہی ہے اسے۔

"یہ سب تو ٹھیک ہے۔ مگر جو رنگ ان دنوں فریحہ کے چہرے پر اترے ہوئے ہیں کبھی یہی رنگ تیری پھوپھی کی آنکھوں میں بھی اترے تھے پھر اس کے بعد میں نے اس کی آنکھوں کو ہر رنگ ہر خوشی سے عاری ہی دیکھا ہے۔" دادی مطمئن ہو کر بھی مطمئن نہیں ہو پا رہی تھیں کہ پہلی ٹھوکر اتنی شدید ان کے دل پر لگی تھی کہ دوسری کا وہم بھی انہیں بھیانک حقیقت کی طرح ہراساں رکھتا تھا۔

فردوس اور فریحہ کا ایف اے کا رزلٹ آگیا تھا۔ دونوں کالج جانے لگی تھیں۔ کالج کا جو نقشہ فلموں کو دیکھ کر اس نے کھینچا ہوا تھا۔ کالج آکر اس کے سخت ماحول میں ہوا ہو گیا تھا۔ وہ چند دنوں میں ہی بور ہو گئی تھی۔ کالج سے بہتر اسے اپنا پنڈ والا سکول لگتا۔ جہاں جب دل چاہتا تھا۔ وہ کسی نہ کسی بہانے سے گھر آجاتی تھی جہاں وہ اپنی دوستوں کے ساتھ مل کر خوب ہلا گلا خوب اونچے قہقہے لگاتی۔ مگر یہاں تو ایک دن بھولے سے کسی بات پر اونچا قہقہہ لگا دیا تھا اور پریڈ کی ٹیچر نے اسے پورا پریڈ کھڑے رکھا تھا۔

بور اور اکتائے ہوئے دنوں میں اچانک پھوپھو اور انکل ہمدانی کی آمد اسے بے پناہ خوش کر گئی تھی۔ جو عدن ہمدانی کے ایم ایس سی کے شاندار رزلٹ پر رکھی جانے والی پارٹی میں ان سب کو انوائیٹ کرنے آئے تھے۔ وہ ہمیشہ کی طرح ان کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ امی اور تائی دونوں طرح طرح کے کھانے بنانے کے لیے کچن میں گھسی ہوئی تھیں کہ ہمدانی بہت کم ان کے گھر آتے تھے ان کی آؤ بھگت تو ضروری تھی نا ابو اور تایا بھی ڈیرے سے آ گئے تھے اور وہ دادی کے پاس بیٹھی ابو اور تایا کی باتوں کے جواب میں ہوں ہاں کرتے نفیس

اور دھیما دھیما بولنے والے شاندار پرسنالٹی والے انکل (پھوپھا) کو دیکھ کر پھوپھو کی قسمت پر رشک کر رہی تھی کہ ایسا شاندار اور رکھ رکھاؤ والا بندہ انہیں ملا ہے۔ بے شک وہ بہت کھاتے پیتے اور جدی پشتی چوہدری تھے۔ مگر اس کے باوجود اس نے اپنے پورے چوہدری خاندان میں ایسی آن بان رکھنے والا شخص نہیں دیکھا تھا۔

"یہ دادی بہت خاموش سی کیوں ہیں۔ پتا نہیں کیوں یہ انکل سے بات کرنا پسند نہیں کرتیں۔" ابو اور تایا آگے پیچھے اٹھ کر کسی کام سے باہر چلے گئے تھے اور وہاں کمرے میں ان کے جانے کے بعد خاموشی بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ تبھی اس نے گھبرا کر تسبیح پڑھتی اداس سی دادی کو دیکھا کہ شاید وہ کوئی بات مہمانوں سے کریں۔ مگر انہیں خاموش بیٹھے دیکھ کر وہ جی بھر کر حیران ہوئی تھی کہ بہت باتونی سی دادی جو کسی اجنبی سے مل کر بھی اس کے آگے پیچھے والوں کا حال احوال پوچھے بغیر نہیں جانے دیتی تھیں۔ وہ انکل کی موجودگی میں اتنا خاموش کیوں ہو جاتی ہیں۔

"اور پھوپھو۔" اس نے ایک نظر پھوپھو کو دیکھا۔ جو اپنے مختصر سے بلاؤز کو چھپائے ہوئے ساڑھی کے پلو کو چادر کی طرح خود سے لپیٹے شرمندہ اور خاموش سی بیٹھی تھیں۔ پھوپھو تو جب اکیلی آتی ہیں۔ زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں بولتیں۔ مگر انکل کی موجودگی میں صرف مسکرانے پر ہی اکتفا کرتی ہیں وہ سوچتے ہوئے اس لمحہ بہ لمحہ بڑھتی خاموشی سے بے زار سی اٹھ کر باہر چلی آئی تھی۔

"پھوپھو! دادی کہتی ہیں کہ آپ کو میٹھا بہت پسند ہے۔ یہ کدوؤں کی کھیر دادی نے خاص طور پر آپ کے لیے بنائی ہے کھائیں نا۔" وہ اور فردوس دسترخوان پر پھوپھو اور انکل کے ساتھ بیٹھی انہیں ایک ایک چیز پیش کر رہی تھیں اور ابھی بھی وہ پھوپھو کو ہمیشہ کی طرح ایک دو چیزیں چکھتے دیکھ کر ان کی پلیٹ میں کھیر ڈالنے لگی تھی۔

"عرصہ ہوا تمہاری پھوپھو میٹھا چھوڑ چکی ہیں کھانے تو ان کی طبیعت خراب ہونے لگتی ہے۔" انکل نے پھوپھو کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اسے روکتے ہوئے کچھ جتاتی کچھ سمجھاتی نظروں سے پھوپھو کو دیکھا اس نے انکل کی بات پر عجیب سی نظروں سے پھوپھو کو دیکھا جو ہمدانی کو شکوہ کناں نظروں سے دیکھ رہی تھیں ان کی نظروں میں کچھ تو ایسا تھا۔ جس نے فریحہ جیسی لاپروا لڑکی کو بے چین سا کر دیا تھا۔ مگر ہمدانی صاحب مزے سے دیسی گھی میں بھنی مرغی کھا رہے تھے۔

"دادی پھوپھو! اتنا کم کیوں کھاتی ہیں۔ آپ تو بتاتی ہیں کہ وہ میٹھا بہت شوق سے کھاتی تھیں۔ مگر انہوں نے تو کسی میٹھی چیز کو چکھا تک نہیں۔" مہمانوں کے جانے کے بعد وہ چاولوں کی پلیٹ پر بوٹیوں کا پہاڑ بنائے وہیں زمین پر بیٹھ کر کھانے لگی تھی۔

"مجھے نہیں پتا وہ کیوں کم کھاتی ہے۔" دادی بے زاری سے کہتے ہوئے رخ موڑ گئی تھیں۔ جس کا مطلب تھا وہ اب اس موضوع پر کوئی بات نہیں کرنا چاہتیں۔

"ایک تو دادی آپ پتا نہیں کیوں ہر بار پھوپھو کے جانے کے بعد اداس اور چڑچڑی ہو جاتی ہیں۔" اس نے ہڈی چوس کر دور پھینکی تھی۔ مگر دادی اس کی بات پر عادت کے خلاف خاموش رہی تھیں۔

"اچھا دادی یہ تو بتا دیں ہم کب جائیں گے نا پھوپھو کے گھر۔" اسے پھوپھو کا انوائیٹ کرنا یاد آیا تھا۔ تبھی وہ اشتیاق سے پوچھ رہی تھی۔

"اس بار دادی نے اپنی آنکھوں کے نم کونے صاف کر کے اس کو دیکھا تھا جو پلیٹ ختم کر کے اب اپنی انگلیاں چوس رہی تھی۔ فریحہ کبھی اس ماحول میں ایڈجسٹ نہیں ہو پائے گی۔ انہوں نے سوچا۔

"دادی آپ رو رہی ہیں۔" وہ دادی کی نم پلکیں دیکھ کر اٹھ کر ان کے قریب بیٹھ گئی تھی۔ دادی کو پریشان یا دکھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔ وہ ان سے خود سے بھی زیادہ محبت کرتی تھی۔

"لگتا ہے آنکھوں میں کچھ چلا گیا ہے۔" دادی نے نظریں چراتے ہوئے بہانہ بنایا تھا یہ بہانہ پھوپھو کے جانے کے بعد ایک بار ضرور بنتا تھا۔

"میں تم اور فردوس جائیں گے اسے بھی بتا دے۔" دادی نے اس کی توقع کے خلاف فوراً" ہامی بھری تھی اور وہ اپنی عادت کے مطابق خوشی سے اچھل پڑی تھی۔ اگلے ہی لمحے وہ دوپٹا سر پر رکھنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے۔ دیوار پھلانگ رہی تھی۔ فردوس کے گھر جانے کے لیے وہ دروازے کا بہت کم استعمال کرتی تھی۔

☼ ☼ ☼
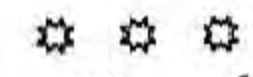
"ہائے اللہ! یہ گھر ہے یا محل میرے تو پیر اس چکنے فرش پر نہیں جم رہے۔" وہ آج ہی دونوں، دادی کے ساتھ پھوپھو کے ہاں آئی تھی۔ اور اب وہ فردوس کے ساتھ پھوپھو کے اسٹائلش سے گھر یعنی کوٹھی میں گھوم پھر کر دیکھ رہی تھی۔ چکنے صاف شفاف فرش پر پاؤں جما جما کر رکھتے ہوئے بھی بار بار پھسل رہی تھی اور قہقہے تھے کہ رکنے میں ہی نہیں آ رہے تھے۔

"ہمارے تو پورے پنڈ میں اس جیسا خوب صورت گھر نہیں ہے۔" فردوس نے لان میں لگے فوارے کے ٹھنڈے پانی میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔

"مگر دیکھ پھوپھو کی قسمت اتنا پیارا گھر اور محبت کرنے والا شوہر ملا ہے۔ سچ پھوپھو بہت خوش قسمت ہیں۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری تھی۔

اس لمحے کھلے گیٹ سے عدن ہمدانی اپنی بڑی ساری گاڑی میں وارد ہوا تھا اور اس کو لان میں دیکھ کر بڑی دلآویز مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

"پتا نہیں میرا گھر اتنا خوب صورت ہے یا پھر آج مہمان بہت خوب صورت آئے ہوئے ہیں۔" وہ اس کو دیکھ کر مسکرایا تھا۔ جواباً" وہ اس کے سحر زدہ کر دینے والے انداز پر اپنے دل کی اتھل پتھل دھڑکنوں کو سنبھالتی دھیرے سے مسکرائی تھی۔

"آپ کا گھر بھی خوب صورت ہے اور مہمان بھی۔" فردوس نے سادگی سے کہا تھا اور وہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا تھا اور وہ اس کی ہنسی کے طلسم میں جیسے کھو سی گئی۔

"میرے پاس ہونے پر مام اور ڈیڈ ہمیشہ میری کامیابی کو سیلیبریٹ کرتے ہیں۔ مگر اس بار کی سیلیبریشن پارٹی مجھے ہمیشہ یاد رہے گی کہ کوئی بہت دور سے صرف میرے لیے میری خوشی کے لیے آیا ہے۔" اس نے کہتے ہوئے آخر میں بڑے شوخ انداز میں اسے دیکھا تھا۔ وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

"کیا اس انسان سے زیادہ کسی اور کی آواز اتنی دلکش اور خوب صورت ہو سکتی ہے۔" اس نے سوچا اور عدن کے دیکھنے پر سر جھکا دیا کہ اس کی آنکھوں میں ٹھاٹھیں مارتے محبت کے سمندر کو دیکھنا بہت مشکل تھا وہ اس کے سر جھکانے پر مسکرا دیا۔

"آپ اپنے امی اور ابو میں سے کسی کے زیادہ قریب ہیں؟" فردوس نے یونہی بے وجہ ہی سوال کیا تھا۔

"ہوں!" عدن ہمدانی کے ایک لمحے کے لیے اسے دیکھا اور پھر سوچ میں پڑ گیا۔ چند ثانیے کے بعد وہ بولا۔

"وہ دونوں میرے لیے بہت خاص ہیں بہت محبت کرتا ہوں۔ میں ان دونوں سے۔ مگر مما کہتی ہیں میں اپنے ڈیڈ کی کاپی ہوں۔ انہیں جیسا ہر خوب صورت منظر اور چیز کو قید کر لینے والا اور پھر تمام عمر اس منظر کو اسی رنگ اور سانچے میں قید رکھنے کے لیے ہلکان ہونے والا اور پریشان کرنے والا۔" وہ اپنے مخصوص دلکش انداز میں مسکرا رہا تھا۔

"مجھے یاد ہے۔ تب میں نو کلاس میں تھا۔ جب بابا میرے لیے آسٹریلیا سے چھوٹا سا طوطا لائے تھے۔ وہ مجھے اتنا پسند تھا کہ میں اسے ہر وقت اپنی آنکھوں کے سامنے رکھتا تھا میں اسے ویسا ہی دیکھنا چاہتا تھا چھوٹا سا بچہ۔ مگر جب وہ بڑا ہونے لگا تو میں پریشان ہو گیا۔ میں نے اسے دانا پانی دینا بند کر دیا۔ کہ وہ بڑا نہ ہو ہر ممکن طریقے سے میں نے اسے چھوٹا اور اس سائز کا رکھنے کی کوشش کی جس سائز میں وہ میرے پاس آیا تھا۔"

وہ ایک لمحے کے لیے رکا وہ دونوں دل میں ٹوٹتے سے ہمدردی لیے کھڑے ہوئے بڑے کھوئے سے انداز میں اسے سن رہی تھیں۔ اس کے خاموش ہونے پہ چونکیں۔

"پھر کیا ہوا؟ وہ بڑا ہو گیا نا" وہ بے تابی سے بولی اسے یقین تھا وہ بڑا ہو گیا ہو گا۔

"نہیں وہ مر گیا۔" اس نے دھیرے سے ہنس کر کہا اور اس کی آنکھوں میں بے یقینی ٹھہر گئی۔ چھن! اندر کچھ ٹوٹا تھا کیا وہ سمجھ نہیں پائی۔ جبکہ فردوس عدان ہمدانی کے ساتھ مل کر توتے کے بھوکے پیاسے مر جانے پر ہنس رہی تھی۔ مگر وہ مسکرا تک نہ پائی۔

"تالو کہاں ہے۔" وہ اب فردوس سے پوچھ رہا تھا۔

"سفر سے تھک گئی تھیں۔ اندر کمرے میں ہیں پھوپھو کے ساتھ" فردوس نے بتایا تھا اور وہ تالو سے ملنے کا کہتے ہوئے انہیں بھی آنے کا کہتے ہوئے آگے بڑھا تھا۔ فردوس اور اس کے پیچھے وہ بھی مرے مرے قدموں سے چل پڑی تھی۔

☼ ☼ ☼
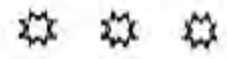
"کتنا مزا آیا تا بچ میں نے تو اپنی پوری زندگی میں اتنی بڑی پارٹی نہیں دیکھی۔ اتنے زیادہ خوب صورت لائٹوں والوں جسے صاف ستھرے لوگ اور کھانے بھی وہ جن کے ہمیں نام بھی نہیں آتے اور لڑکیوں نے ایسے کپڑے پہنے تھے کہ شجاع بھائی دیکھ لیں تو شاید انہیں گولی ہی مار دیں اور ہم تو پہننے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔" فردوس پارٹی ختم ہونے کے بعد اپنے کمرے میں آکر جوتے اتارتے ہوئے پر جوش سی بول رہی تھی۔ مگر وہ جو ان سب چیزوں کی خواہش لیے اس میں رچ بس جانے کے لیے آئی تھی بول تک نہ سکی تھی۔ عدان ہمدانی نے اسے اپنی پسند کا جوڑا خرید کر دیا تھا پارٹی میں پہننے کے لیے۔ مگر اس نے پہننے سے انکار کر دیا تھا۔ کیوں وجہ اسے معلوم نہیں تھی مگر اسے عدان ہمدانی کی کوئی بات نہیں ماننی۔ یہ اس نے ضرور سوچ لیا تھا۔ تبھی وہ ساری پارٹی میں بھی اس سے دور دور رہی تھی۔ ایسے کچھ بھی پارٹی میں اچھا نہیں لگا تھا۔

حتیٰ کہ جب عدان ہمدانی نے اسے دیکھ کر پر شوخ لہجے میں کہا تھا۔

"پتا نہیں قریحہ چوہدری تم واقعی اتنی خوب صورت ہو۔ جتنی مجھے دکھتی ہو یا میری ہی آنکھوں نے تم جیسی قدرت کا حسین پیکر پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ کچھ بھی ہے۔ تمہیں ہمیشہ کے لیے اس خوب صورت بھولے بھالے انداز میں قید کر لینے کو دل چاہتا ہے۔" وہ دل مسرور لینے والے انداز میں کہہ رہا تھا اور وہ اس کی اس وارفتگی پر خوش ہوتا تو دور کی بات مسکرا تک نہیں سکی تھی۔ اسے لگا عدان ہمدانی کی نظر میں وہ اور تو تا ایک جیسی ہی خوبیاں رکھتے ہیں۔ اس کے دل کو کچھ ہوا تھا۔

وہ جو ہمیشہ سے چاہتی تھی کوئی اسے چاہے۔ اس کی تعریف کرے کسی کی محبت اسے خود اپنی ہی نظروں میں معتبر بنا دے آج جب کوئی اس کی تعریف کر رہا تھا چاہ رہا تھا تو دل اداسی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبا جا رہا تھا۔ اسے عدان ہمدانی کے منہ سے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ تبھی وہ اس کے مزید شوخ جملوں سے بچنے کے لیے دادی کے پہلو میں آکر بیٹھ گئی تھی۔ جو ایک پرسکون کونے والی ٹیبل پر بیٹھی حیرت سے اس کھلے ڈھلے ماحول میں عورتوں اور مردوں کو ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے۔ جھومتے دیکھ رہی تھیں اور ان کی آنکھوں میں حیرت کی جگہ دکھ تب اترا جب انتہائی چھوٹے بلاوز میں شفون کی باریک ساڑھی میں انکل کے ساتھ جھومتی ہوئی پھوپھو نظر آئیں۔

"کیا ہوا اتنی خاموش کیوں ہو؟ پارٹی میں بھی چپ چپ سی تھیں۔" فردوس نے اسے یوں خاموش دیکھ کر پوچھا۔ تبھی بیڈ پر لیٹی دادی نے بھی اس کے خاموش اور گہری سوچ میں ڈوبے چہرے کو دیکھا۔

"نہیں۔۔۔ کچھ نہیں۔" اس نے سوچوں میں الجھے ذہن کو جھٹکا۔

"تم کپڑے بدلو سوتے ہیں۔" وہ کہتے ہوئے آکر دادی کے برابر لیٹ گئی۔

"پتر پہلے یہ پانی کا جگ بھر لا' جانتی ہے نا رات کو حلق سوکھنے لگتا ہے۔" دادی نے کہا تھا اور وہ جو بستر پر لیٹنے کے بعد کسی کے آواز دینے پر گھر سر پر اٹھا لیتی تھی۔ خاموشی سے اٹھ کر چلی گئی تھی۔

"دادی یہ تھوڑی بدلی بدلی نہیں لگ رہی۔"

فردوس نے دادی کے برابر لیٹتے ہوئے پوچھا کہ اسے قریحہ کی خاموشی بڑی کھٹک رہی تھی۔ دادی دھیرے سے مسکرا دیں۔

"لگتا ہے اللہ نے میری دعائیں سن لیں۔" انہوں نے سوچا۔

"میں نے تمہیں کہا بھی تھا کہ گوشت کی بنی ہوئی چیزوں کے قریب بھی نہیں جانا اور مٹھائی یا دوسری میٹھی ڈشز کو تو ہاتھ بھی نہیں لگانا۔ پھر بھی تم نے مٹھائی کھائی۔" وہ پانی لینے کچن کی طرف جا رہی تھی۔ جب پھوپھو کے کمرے سے باہر آتی پھوپھا کی گونج دار آواز پر اس کے بڑھتے قدم ٹھٹک کر رک گئے تھے۔

"میں نے صرف مٹھائی چیک کی تھی ہمدانی۔" پھوپھو منمنائی تھیں۔

"اس گھر میں چیزوں کی اتنی زیادہ ورائٹی ہے کہ ایک ایک چیز بھی چکھنے لگو تو کتنی کیلوریز بڑھیں گی۔ جانتی ہو نا۔ میں تمہیں آج آخری بار بتا رہا ہوں تو ین۔ اگر تم اپنے اس لکو سے ایک انچ بھی آگے بڑھیں تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔ سمجھیں تم۔" نفیس سے دھیما مزاج رکھنے والے انکل اس وقت کسی کرخت اور بے ڈھنگے پن سے چلاتے ہوئے اس کی سماعتوں کے ساتھ اس کے دل پر بھی کوڑے برسا رہے تھے۔

"آپ سے برا کوئی ہو بھی نہیں سکتا ہمدانی۔ تھک گئی ہوں۔ میں آپ کے معیار پر پورا اترنے کی کوشش کرتے کرتے۔ بہت بڑی غلطی کی تھی میں نے آپ کی محبت پر بھروسہ کر کے اور اس سے بھی بڑی غلطی آپ سے شادی کر کے کی ہے میں نے کتنا سمجھایا تھا اماں جی نے مجھے کہ انسان اور پودے اپنے اصل اور اپنی جڑوں کے ساتھ ہی اچھے لگتے ہیں۔ صرف میں آپ کی محبت میں میں اپنے اصل اپنی جڑوں سے کٹ گئی۔ آپ کی پسند ناپسند میں ڈھل گئی۔ وہ بھائی جن کے سامنے میں نے کبھی سر سے دوپٹا تک نہیں اتارا تھا۔ ان کے سامنے آدھے ادھورے کپڑوں میں جاتے ہوئے اپنے نیم برہنہ جسم کو چھپاتے ہوئے کتنی بار شرم سے مرتی ہوں۔ یہ آپ نہیں جانتے آپ جاننا ہی نہیں چاہتے میں آپ کی محبت میں کیا سے کیا ہو گئی اور آپ نے مجھے کیا دیا۔ نہ پوری محبت اور نہ پوری خوراک۔ گھر میں اتنا پیسہ اور بینک بیلنس ہونے کے باوجود میں اپنی مرضی کی کوئی چیز کھانے کے لیے ترستی ہوں۔ مگر آپ کو مجھ پر ترس نہیں آتا۔ آپ مجھے پچپن سال کی عمر میں بھی بیس سال کی الہڑ دوشیزہ دیکھنا چاہتے ہیں کبھی سوچا اپنی عمر سے آدھی دکھنے کے لیے میں اپنی کون کون سی خواہشات کو مارتی ہوں۔ سچ ہمدانی آپ کی محبت نے میرے عورت ہونے کا وقار میری زندگی کی ہر خوشی چھین لی۔"

پھوپھو نہ جانے کب کا دبایا ہوا غبار غصے اور آنسوؤں کی صورت نکال رہی تھیں اور اس سے وہاں کھڑا ہونا مشکل ہو گیا تھا۔ چھن' چھن' چھن' بہت کچھ تھا جو اس کے اندر ٹوٹ بکھر رہا تھا۔ اس نے بے ساختہ دیوار کا سہارا لیا۔

"تو نہیں کرنی تھی مجھ سے شادی۔ وہیں اپنی اماں محترمہ کے کہنے پر کسی بارعب انا پرست چوہدری سے شادی کر لیتیں۔ ناشکری عورت کبھی شکر نہ کرنا۔" نفیس سے انکل زہر اگل رہے تھے اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی سننے پر مجبور تھی کہ قدم اس کا بوجھ اٹھانے سے انکاری ہو رہے تھے۔

"اندھی ہو گئی تھی۔ آپ کی محبت میں جو کچھ نظر نہیں آیا۔ چوہدری مجھے کچھ اور دیتا نہ دیتا۔ دو وقت پیٹ بھرنے کے لیے روٹی ضرور دیتا۔ مجھے بیس سال کی دکھنے پر مجبور نہ کرتا اور نہ کوئی میرے پیچھے مجھے "بھینسی منی" جیسے الفاظ سے نواز کر میرا مذاق اڑاتا۔ آپ خود تو تھے ہی آپ نے اپنے بیٹے کو بھی اپنے جیسا نفسیاتی مریض بنا لیا ہے۔ اب وہ پتا نہیں کس کی زندگی خراب کرے گا۔" پھوپھو ابھی بھی روتے ہوئے اونچی آواز میں بول رہی تھیں اور وہ اپنے بے جان وجود کو گھسیٹتے ہوئے واپسی کے لیے مڑ گئی۔ اب اسے واپس ہی جانا تھا کہ سامنے نظر آنے والی روشنی ایک غار سے آ رہی تھی۔ ایک ایسے غار سے جس میں جا کر تمام خوشیاں تمام خواہشات ختم ہو جاتی تھیں اور واپسی کا کوئی راستہ

نہیں تھا۔ وہ خوش قسمت تھی جو روشنی کے تعاقب میں بھاگتے ہوئے ابھی ٹھوکر کھا کر غار میں نہیں گری تھی۔ بلکہ ٹھوکر کھانے سے پہلے ہی سنبھل گئی تھی۔ سمجھ گئی تھی کہ دادی اسے کیا سمجھانا چاہتی تھیں اور شجاع کیوں اس کی نا سمجھی پہ غصہ کرتا تھا۔ آج اسے اپنے ہر سوال کا جواب مل گیا تھا۔ دادی کا پھوپھو کے نام پر اداس ہونا ان کے جانے کے بعد چپکے سے آنسو بہانا اور پھوپھو کا کم کھانا۔ ہر سوال کا جواب مل گیا تھا اور وہ ششدر و حیران تھی دکھ سے چور ہو رہی تھی کہ وہ پھوپھو کے نقش قدم پہ چلتے ہوئے ایک ایسے انسان کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ جو انسانوں کو بھی خوب صورت چیزوں کی طرح اپنے سائز اور ایک رنگ میں قید کرلینا چاہتا تھا۔

"عورت خودرو پودے کی طرح ہوتی ہے۔ جسے اس کے اصل اس کی مٹی سے جدا کر کے کسی دوسری جگہ لگایا جائے تو وہ جگہ وہ مرد راس آجائے تو ٹھیک اور اگر نہ راس آئے تو وہ مرجھانے لگتی ہے اور بعض اوقات تو وہ جل کر ختم ہو جاتی ہے۔"

اس نے کبھی کسی رسالے میں یہ چند سطریں پڑھی تھیں مگر وہ انہیں سمجھ نہیں پائی تھی۔ مگر آج یہ چند جملے اسے اپنا پورا مفہوم سمجھا گئے تھے۔ وہ نا سمجھ ضرور تھی۔ اسے ہر بات دیر سے سمجھ آتی تھی۔ مگر وہ بے وقوف نہیں تھی کہ جانتے بوجھتے اپنے لیے خاردار راستہ چنتی۔ فیصلے کا اختیار اس کے پاس تھا اور اس نے فیصلہ کرلیا تھا۔

"تمہاری محبت اور تمہاری نیت سچی ہو سکتی ہے۔ عدن ہمدانی مگر تمہاری محبت کی شدت کو برداشت کرنا میرے بس میں نہیں ہے۔ پھوپھو جیسا حوصلہ کہاں ہے مجھ میں۔" اس نے افسردگی سے سوچا تھا۔ صبح وہ عدن اور پھوپھو کے رو کنے۔ فردوس کے مزید ایک دن رکنے کہ عدن کے ساتھ گھومنے جانے کی فرمائش کے باوجود آگئی تھی۔ فردوس اس کی ضد پہ ناراض اور دادی مطمئن تھیں۔

☼ ☼ ☼

شجاع کی ٹریننگ مکمل ہو گئی تھی۔ ڈیوٹی جوائن کرنے سے پہلے وہ ان سے ملنے آیا تھا۔ فل یونیفارم میں ملبوس وہ کس قدر خوب صورت اور دلکش لگ رہا تھا۔ وہ اسے دیکھے گئی۔

"پتا نہیں یہ شخص ہمیشہ سے اتنا خوب صورت اور پیارا سا ہے یا آج میری نظر بدل گئی ہے۔" اس نے اس کے بالوں کی فوجی کٹنگ کو دیکھتے ہوئے سوچا اور دھیرے دھیرے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے چھت پر آگئی۔

شام نیلگوں ہو رہی تھی۔ دوپہر کی گرمی شام کی نرم سی ہوا میں سکون دے رہی تھی۔ وہ منڈیر پر دونوں کہنیاں ٹکائے دور آسمان پہ بے فکری سے اڑتے پرندوں کو دیکھے گئی۔

"کیوں میرا آنا پسند نہیں آیا؟" وہ اس کے پیچھے کھڑا پوچھ رہا تھا۔ اس نے ذرا سی گردن موڑ کر اسے دیکھا اور نظر جھکالی۔

"نہیں! مجھے بھلا کیوں برا لگے گا۔ آپ کے چچا کا گھر ہے جب دل چاہے آئیں۔" اس نے دھیرے سے کہا۔ وہ اس کی سعادت مندی پہ دل ہی دل میں خوب محظوظ ہوا۔

"اگر چچا کا گھر سسرال بن جائے تو تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہو گا۔" وہ محظوظ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا کہ دادی نے اس کے جانے اور آنے کے بعد ہونے والی تبدیلی کی تمام تفصیل اسے آتے ہی خوشی خوشی بتا دی تھی۔ وہ دادی پوتا دونوں کب کوئی بات ایک دوسرے سے راز رکھتے تھے۔

"اگر غصہ نہیں کریں گے 'ڈانٹیں گے نہیں تو بتالیں۔ ورنہ رہنے دیں۔"

"تم مجھے ناراض کرنا چھوڑ دو۔ یعنی تھوڑی سی مزید سمجھ دار ہو جاؤ۔ میں تم پر ناراض ہونا چھوڑ دوں گا۔" شجاع کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ بہت گہری تھی اور اس نے بہت پیار کا کہا ہوا جملہ پھر دہرایا تھا۔

"سمجھ دار ہو گئی ہوں تو ٹھوکر کھانے سے پہلے سنبھل گئی ہوں۔ جانتے ہیں شجاع صحیح فیصلہ کرنے

میں کس نے میری مدد کی ہے۔ وہ آخر میں معصومیت سے اسے دیکھنے لگی۔

"کس نے؟"

"رسالوں نے آپ ٹھیک کہتے تھے کہ کتابیں انسان کو جلد یا بدیر زندگی جینے کا گر ضرور سکھاتی ہیں۔ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ کتابیں انسان کو شعور بخشتی ہے۔ جو بات ہم ایک دوسرے کو نہیں سمجھا سکتے۔ وہ کتابیں بڑی خاموشی سے ہمارے اندر ڈال دیتی ہیں۔" وہ دھیرے دھیرے بول رہی تھی۔ شجاع کو واقعی وہ اس لمحے بڑے سمجھ دار لگی تھی۔

"تو ٹھیک ہے پھر منہ دکھائی میں بھی تمہیں رسالے ہی دوں گا۔" وہ کھل کر ہنسا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے رخ موڑ گئی تھی۔ پھر کچھ یاد آنے پر پلٹیں۔

"شجاع کیا آپ واقعی میری خوشی کے لیے فوج میں گئے ہیں۔"

"تمہیں کس نے بتایا؟" وہ حیران ہوا۔

"بس مجھے خود ہی محسوس ہوا۔" اس نے کندھے اچکائے۔

"اس کا مطلب ہے۔ تم واقعی سمجھ دار ہو گئی ہو۔ تمہیں کچھ بھی بتانا یا سمجھانا نہیں پڑے گا۔ یہ بھی نہیں کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔" وہ کہتے ہوئے اس کی سمت جھکا تھا جذبات سے بوجھل محبت پاش نظریں اس پر جمی تھیں۔

"شجاع۔" وہ چند ثانیے اس کو دیکھتے رہنے کے بعد دھیرے سے بولی۔

"ہوں۔" وہ اس لمحے کی فسوں خیزی میں ڈوبا ہوا اسے دیکھ رہا تھا۔ بہت محبت بہت پیار سے۔

"تم نے بوتل پی ہے نا؟" وہ رومانس سی پوچھ رہی تھی اور اس کی بات پہ چوہدری شجاع کو اس کی بات پر سو والٹ کا جھٹکا لگا تھا۔

"پاگل ہو گئی ہو؟"

"پھر ابھی مجھے یوں کیوں عجیب سی نظروں سے گھور رہے تھے۔" اس کے کہنے پہ چوہدری شجاع کو اپنا سر پیٹ لینے کو دل چاہا تھا۔

"اسے عجیب نہیں بلکہ محبت بھری نظریں کہتے ہیں پاگل! جیسے تمہارے رسالے کا ہیرو رومانٹک انداز میں ہیروئن کو دیکھتا ہے۔ لگتا ہے تمہیں ہر بات کھول کر بتانی اور سمجھانی پڑے گی۔" وہ بڑبڑایا تھا۔

"ویسے سچ سچ بتاؤ۔ فریحہ تم واقعی اتنی بیوقوف ہو یا مجھے ہی لگتی ہو۔" آخر میں بھنویں اچکاتے ہوئے وہ خفا سا پوچھ رہا تھا اور وہ اس کے یوں غصہ ہونے پر پہلے حیران ہوئی تھی اور پھر اس کے غصہ کرنے کی وجہ سمجھ کر ہنسی تھی تو ہنستی ہی چلی گئی تھی۔

شجاع نے چند ثانیے اسے گھورا تھا اور پھر دھیرے سے اس کی پاگلوں کے جیسی ہنسی پر مسکرا دیا۔

"فریحہ یار! ابھی تو کچھ بن کہے 'بن بتائے سمجھ جایا کرو۔" اس نے جیسے التجا کی تھی۔

"سمجھ تو گئی ہوں۔"

"کیا؟"

"یہی کہ کڑوا اور سخت نظر آنے والا بادام۔ اتنا بھی کڑوا اور سخت نہیں ہے جتنا میں سمجھی تھی۔" وہ اسے شرارت سے دیکھتے ہوئے مسکرائی تھی اور شجاع کا قہقہہ بڑا بے ساختہ تھا۔

☼ ☼

فرحین اظفر

سوہا اور مایا دونوں بہنیں اپنی ماں کے ساتھ گھر کی اوپری منزل میں رہائش پذیر ہیں۔ ان کے والد کی وفات ان کے بچپن میں ہی ہو گئی تھی۔

گھر کی نچلی منزل میں ان کے تایا اور تائی اپنی دو بیٹیوں عفت اور نائلہ کے ساتھ رہتے ہیں۔ تایا اکثر بیمار رہتے ہیں۔

حدید، انس، عفت اور نائلہ کے خالہ زاد ہیں۔ نائلہ انس میں دلچسپی رکھتی ہے۔ مگر انس، سوہا سے شادی کرنا چاہتا ہے اور اپنی پسندیدگی کا اظہار اپنی خالہ اور سوہا کی تائی کے سامنے کر دیتا ہے۔ خالہ کو بے پناہ دکھ کا احساس ہوتا ہے مگر بظاہر راضی خوشی اس کا رشتہ لے کر اپنی دیورانی کے پاس جاتی ہیں۔ سوہا کی والدہ یہ رشتہ خوشی خوشی قبول کر لیتی ہیں۔

نائلہ باقاعدگی سے اپنے والد کو اسپتال لے کر جاتی ہے۔ وہاں اسپتال کے کلرک شبیر حسین عرف شبو سے روابط بڑھ جاتے ہیں کہ اچھے برے کی تمیز کو بھول جاتی ہے۔

سوہا اور انس کی شادی کی تقریبات بہت اچھے طریقے سے انجام پاتی ہیں اور سوہا رخصت ہو کر انس کے گھر آ جاتی ہے۔

حدید کسی کو ڈراپ کرنے جاتا ہے اور اس کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے۔

(اب آگے پڑھیے)

دوسری قسط

جانے کتنی دیر گزر گئی تھی۔ ٹھنڈے برآمدے کے طول و عرض ناپتے۔ صارم پہنچ چکا تھا۔ انس اسے دیکھ کر بے اختیار سا ہو گیا۔
"صبر کرو خدا سے دعا کرو۔ اللہ سب بہتر کرے گا۔" صارم اسے کندھے سے لگائے تھپک رہا تھا۔ اس کے روم روم سے حدید کی سلامتی اور زندگی کے لیے دعا نکل رہی تھی۔ کسی نے وسوسوں کی انتہا پر جا کے بھی اس حادثے کے بارے میں نہیں سوچا ہو گا۔
زندگی اپنی بانہوں میں انسان کے لیے کتنے رنگ سمیٹے کھڑی ہوتی ہے اور انسان اتنا بے بس ہے کہ وہ ہر موقع کی مناسبت سے ایک رنگ نکال کر اسے اوڑھا دیتی ہے اور انسان اسے اوڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ جیسے اس وقت وہ اپنی زندگی کے سب سے خوب صورت اور خوشیوں بھرے موقع پر حزن کا رنگ اوڑھے بیٹھا تھا۔
صارم بہت دیر تک افسوس سے اسے تکتا رہا۔ پھر دھیرے دھیرے چلتا ہوا نزدیک آ گیا۔
"انس!" اس نے اس کے دونوں کندھوں پر ہاتھ دھر دیے۔ وہ یوں چونکا جیسے گہری نیند سے جاگا ہو۔
"میری بات مانو! تم گھر چلے جاؤ۔" انس جو غائب دماغی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ایک دم اس کے ہاتھ اپنے شانوں سے ہٹا کر رخ موڑ لیا۔
"نہیں نہیں جا سکتا۔"
"پاگل ہو گیا تم۔ بھول رہے ہو۔ گھر پر بھی کوئی تمہارا منتظر ہے۔" صارم کی بات پر کسی کی شبیہ نے اسے ایک لمحے کے لیے ماحول سے بے گانہ کر دیا۔ لیکن اگلے ہی لمحے معاملے کی سنگینی نے اپنے پر پھیلا دیے۔
"میرا دل نہیں مانتا کہ کسی اور کو، کچھ اور حالت میں۔۔۔" اس نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔
"پلیز صارم۔۔۔ میں نہیں جانتا۔ اللہ نہ کرے۔ میرا دل پھٹنے لگتا ہے یہ سوچ کر کہ آج اگر میں چلا گیا اور پیچھے سے اسے کچھ ہو گیا تو۔۔۔" اس نے بے چارگی سے نفی میں سر ہلایا۔
"میں زندگی بھر خود کو معاف نہیں کر پاؤں گا۔ کبھی خود سے نگاہیں نہیں ملا سکوں گا۔" صارم نے بے اختیار اسے گلے سے لگا لیا۔
"اسے کچھ نہیں ہو گا۔ وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ ان شاء اللہ۔" انس کے دل کو ڈھارس سی ہوئی۔
سر جھکا کے بیٹھے ہوئے گزرے۔

✡ ✡ ✡

چند لمحے یوں ہی عفت بے بسی سے سامنے کھڑی سوچ رہی تھی کہ اب کیسے کیا کہے۔
"پتا نہیں مجھے تم سے کہنا چاہیے یا نہیں، مگر میرا خیال ہے تم اب کپڑے بدل لو۔" سوہا ابھی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔
"حدید کی حالت خراب ہے۔ میرا نہیں خیال کہ انس بھائی اب آئیں گے آج رات واپس۔۔۔ ایسے میں تم کب تک یوں بیٹھی رہو گی ان کے انتظار میں۔" اس نے رک رک کر بے ربط انداز میں بات مکمل کی۔
حقیقت تو یہ تھی کہ اسے بے حد رونا آ رہا تھا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ سوہا کی زندگی کی سب سے قیمتی رات ایسے غارت ہو گی اور اس مشکل وقت میں وہ خود اس کا سامنا کرے گی۔
سوہا ایک گہری سانس لے کر شرارہ سمیٹتی ہوئی اٹھی۔ کانوں میں آویزے، ہاتھوں میں بھری چوڑیاں، پیروں میں بندھی پائل سب بجھے بجھے پھول سب جیسے احتجاجاً بول اٹھے۔
"وہ جس کے لیے زیب تن کیا تھا۔ اس نے تو ابھی دیکھا تک نہ تھا۔ ہمیں دیکھا جائے، ہمیں سراہا جائے، ہماری نرمی اور کوملتا کو محسوس کیا جائے۔ یہ ہمارا حق ہے۔"
دھیرے دھیرے چلتی ہوئی وہ واش روم میں بند ہو گئی۔ عفت گرنے کے سے انداز میں بیڈ پر بیٹھ گئی۔ خوشبو میں لٹاتی بیلے اور گلاب کی کلیاں اسے ڈسنے لگی تھیں۔
یہ کمرہ جہاں اس وقت انس اور سوہا کو ہونا چاہیے تھا۔ اس کی محبتیں، اس کی چاہتوں کی شدتیں، شرماہٹیں، سرگوشیاں، لیکن۔۔۔ اس وقت وہاں صرف خاموشی اور اداسی کا راج تھا اور میں خود کیا کر رہی ہوں اس وقت یہاں۔ اسے اپنی موجودگی سے الجھن ہونے لگی، وحشت ہونے لگی۔ "حدید کا کیا حال ہے۔ مجھے فون کر کے پتا کرنا چاہیے۔" خیال آتے ہی وہ اٹھ کر باہر نکل گئی۔

✡ ✡ ✡

ایمرجنسی روم کے باہر جلتی سرخ لائٹ اس کا دل دہلا رہی تھی۔ جتنی بھی خیر و سلامتی کی دعائیں، آیتیں اور سورتیں اسے یاد تھیں۔۔۔ بے آواز لبوں سے نکل رہی تھیں۔
چار گھنٹے گزر جانے کے باوجود حدید کی حالت میں کہیں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ معاً دروازہ کھلا اور ایک ڈاکٹر جھکے قدموں سے باہر نکلا۔ انس بے تابی سے اٹھ کر اس کی طرف لپکا۔
"یا اللہ۔۔۔ کوئی خیر کی خبر، کوئی سلامتی کی نوید، کوئی مژدہ جانفزا۔" چند قدم تیر کی سی تیزی سے اٹھاتے ہوئے بھی اس نے کتنی دعائیں مانگ ڈالیں۔
"کوئی ہڈی ٹوٹی نہیں ہے۔ صرف لیفٹ تھائی میں فریکچر ہے۔ مگر دماغ میں کوئی ایسی ضرب لگی ہے جو۔۔۔" ڈاکٹر نے جملہ ادھورا چھوڑ کر انس کا چہرہ دیکھا۔
"اگلے اڑتالیس گھنٹے میں ان کا ہوش میں آنا بہت ضروری ہے۔ ورنہ وہ کومے میں چلے جائیں گے۔ ہم کوشش کر رہے ہیں، آپ دعا کریں۔"
وہ ترحم آمیز انداز میں اس کا دولہاؤں والا لباس اور تیاری دیکھ کر کندھا تھپکتا ہوا آگے بڑھ گیا۔
انس نے نم آنکھوں کو بند کر کے آخری بار دیکھا۔ حدید کا چہرہ یاد کرنے کی کوشش کی۔ ہنستا، مسکراتا، شرارتی، بے فکرا، خوش باش چہرہ۔ وہ کتنا ہشاش بشاش تھا ابھی چند گھنٹے پہلے تک۔ دو آنسو پلکوں سے ٹوٹ کر اس کے گالوں پر لڑھک گئے۔ اس نے ہارے ہوئے انداز میں بینچ پر بیٹھ کر ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا لیں۔
"مجھ سے میرا آخری خونی رشتہ مت چھیننا میرے مالک۔۔۔ یا اللہ۔۔۔ میں اسے بنا جی نہیں پاؤں گا۔" دل کے بہت اندر کہیں کسی کونے میں کوئی ڈرا سہما بیٹھا چپکے چپکے رو رہا تھا۔

✡ ✡ ✡

وہ واش روم سے نکلی تو کمرہ خالی تھا۔ اس کے احساسات عجیب سے ہو رہے تھے اور دل بھی کمرے کی طرح خالی خالی لگ رہا تھا۔ کتنی دیر وہ یوں ہی بے مقصد بیڈ پر بیٹھی ناخنوں سے نیل پالش کھرچتی رہی۔ گلے اور کانوں کا زیور بہت چبھنے لگا تھا تو اتار کے رکھ دیا۔
مہندی کے دلفریب ڈیزائن سے سجے انگوٹھیوں اور چوڑیوں بھرے ہاتھوں کو وہ خود ہی دیکھتی، دل ہی دل میں انہیں سراہتی رہی تھی۔ پھر دل بھر گیا تو ایک ایک کر کے وہ بھی ڈریسنگ ٹیبل کی زینت بن گئیں۔ کلائیاں سونی ہو گئیں۔ بنا کسی کی محبت پاش نظریں محسوس کیے اور کسی کی نرم گرم گرفت میں پگھلے بغیر ہی۔
کاٹن کے آرام دہ سوٹ میں بھی سخت بے آرامی سی تھی۔ گہنوں سے الگ ہو کے بھی اس کے وجود سے دلہناپا اترا نہیں تھا۔ اسے رہ رہ کر حدید کا خیال بھی آ رہا تھا اور انس کی غیر حاضری بھی حصار باندھ رہی تھی۔

بال بنیں نکال کر چوٹی کے بل کھولتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ گھر میں عفت اور نائلہ کی موجودگی کے باوجود عجیب سی تنہائی اور وحشت ناک سناٹا سا ہے۔ اس نے اٹھ کر دوپٹا شانوں پر ڈالا اور باہر نکلی۔ کمرہ اوپری منزل پر تھا۔ وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آئی۔

"عفت۔۔۔ نائلہ۔" سامنے ہی وہ دونوں موجود تھیں۔ نائلہ جائے نماز پر بیٹھی تھی۔ عفت کے ایک ہاتھ میں تسبیح اور دوسرے میں موبائل تھا۔ "اب کیسی طبیعت ہے حدید کی؟"

"طبیعت کیسی ہوئی ہے۔ بس اللہ اپنا کرم کرے۔ جانے کس کی نحوست کی نظر ہو گیا ہے۔" نائلہ بڑبڑا کر نیت باندھنے لگی۔ عفت نے قریب آکر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "تم نیچے کیوں آگئیں۔ تھوڑی دیر آرام کرلو۔ میں نے گھر پر کہلوا دیا تھا کہ ہم دونوں آج یہیں رک جائیں گی۔" اس نے پلٹ کر ایک نظر نائلہ کو دیکھا۔

"حدید کی حالت ابھی خطرے سے باہر نہیں ہے۔ گھر پر کسی کو کچھ پتا نہیں ہے۔ انس بھائی نے منع کیا تھا بتانے سے۔ صبح انہیں بھی بتادیں گے۔" سوہا کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اب کیا کہے۔

"تمہیں بھوک تو نہیں لگ رہی۔" "نہیں۔" یک لفظی جواب دے کر وہ مڑنے لگی۔ پھر۔۔۔ کچھ خیال آنے پر رک گئی۔

"وہ۔۔۔ انس سے بات ہوئی ہے تمہاری۔" وہ پوچھتے ہوئے جھجک سی گئی۔ چند گھنٹے پہلے کی نویاہتا دلہن۔۔۔ کیسے پوچھے۔ کیا آج شادی کی پہلی رات وہ اپنے دولہا کے بغیر سو جائے۔ اپنے محرم کا انتظار کیے بغیر۔ یا پھر وفاشعار بیوی ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے جاگ کر انتظار کرے۔

"وہ کسی سے بات نہیں کر رہے۔ مجھے ان کے دوست نے بتایا تھا حدید کے بارے میں بھی اور یہ بھی کہ انس بھائی گھر آنے کے لیے تیار نہیں۔" عفت اپنی جگہ یہ کہتے ہوئے شرمندہ سی تھی۔

"تم چلو کمرے میں جاکے آرام کرو۔ صبح تک ان شاء اللہ آجائیں گے۔" اس نے اپنی بات کا تاثر ختم کرنے کے لیے جانے کس کو تسلی دی تھی۔ سوہا کو یا خود کو۔

وہ اپنے خالی پن کو سنبھال کر ایک ایک سیڑھی گنتی ہوئی واپس اسی سجے سجائے کمرے میں آگئی۔ کمرے کی سجاوٹ بھی وہی تھی اور مہک بھی۔ ہاں مگر وہاں کی بولتی معنی خیز خاموشی اور ریشمی سرسراہٹیں اب سو چکی تھیں۔ ہاتھ پیروں کی نیل پالش اتار کر اس نے بھی وضو کرکے وہیں نیت باندھ لی۔ دعا کے لیے پھیلے ہاتھوں پر کتنے ہی آنسو قطار در قطار گر کر اس کے ہاتھوں اور چہرے کو گیلا کرتے رہے۔ وہ رو رہی تھی اور دعا کر رہی تھی۔ حدید کی زندگی کے لیے اور شاید اس ہی سے جڑی اپنی آئندہ زندگی کی خوشیوں کے لیے۔

☼ ☼ ☼

فجر کا وقت ہوا چاہتا تھا۔ نہ حدید کی حالت میں کوئی تبدیلی آئی تھی۔ نہ انس کے انداز نشست میں۔ صارم نے ایک، دوبار اسے گھر جانے کے لیے راضی کرنے کی کوشش کی۔ مگر۔۔۔ اس کی حالت دیکھ کر چپ ہو گیا۔ لمحہ لمحہ جیسے موت و زیست کی کسوٹی کھیل کر گزر رہا تھا۔ شدید اعصابی جنگ نے خود صارم کی حالت بھی شکستہ کروالی تھی۔ ابھی تو سوہا کے گھر والوں اور خالہ جان کو بتانے کا مرحلہ باقی تھا۔ کیا قیامت گزرے گی ان پر جب حدید کے ایکسیڈنٹ کا پتا چلے گا اور کیا سوچیں گے سب لوگ یہ سن کر کہ انس پوری رات گھر واپس نہیں پلٹا۔

صبح آٹھ بجے کے قریب ڈاکٹر نے حدید کے ہوش میں آنے کی خوش خبری سنائی۔ بے ساختہ کلمہ شکر دونوں کے منہ سے نکلا۔ ڈاکٹر نے انس کو اس سے ملنے کی اجازت دے دی تھی۔

صارم نے گھر فون کرکے اطلاع دی۔ پھر خود بھی حدید کے پاس چلا آیا ہوش میں آجانے کے باوجود حدید کی

حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ کوئی بات کرپاتا۔ پھر بھی غنیمت تھا کہ کم از کم خطرے سے باہر تو تھا۔

انس اس کے ہاتھ کو دونوں ہاتھوں میں دبا کر دیر تک بیٹھا رہا۔ یہاں تک کہ صارم نے بڑھ کر اس کے شانے پر دباؤ ڈالا۔ اس نے سر اٹھایا تو صارم نے دیکھا۔ اس کی آنکھیں نم تھیں۔

"وہ اب پہلے سے بہتر ہے انس! پلیز ریلیکس۔ وہ خطرے سے باہر ہے۔ اب پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔"

"ایوری تھنگ ول بی اوکے۔" اس کی آواز سرگوشی سے زیادہ نہیں تھی۔

"اٹھو اب یہاں سے شاباش۔" بہت نرمی سے اسے اٹھا کر وہ باہر لایا۔

"اب تو گھر چلے جاؤ تم۔۔۔ پلیز یار۔" صارم کی آواز اور انداز میں عاجزی سی تھی۔ انس نے آنکھوں اور چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ پھر اثبات میں سر ہلایا۔

☼ ☼ ☼

یہ وہی گھر تھا جہاں کل تک شادی کے ترانے گونج رہے تھے۔ آج ایک ہولناک سناٹا طاری تھا۔ دروازہ عفت نے کھولا۔

"نائلہ گھر چلی گئی ہے۔ امی وغیرہ کو بتائے گی تو پھر گھبرا جائیں گی۔ اکیلی ہوں گی اس لیے۔" عفت کا چہرہ سویا سویا اور آواز بھاری کی تھی۔ انس تھکے تھکے قدموں سے لاؤنج میں آکر ڈھیر ہو گیا۔

"میں ناشتا لاتی ہوں۔" وہ جھکی جھکی نظروں سے انہیں دیکھ کر بولی۔ پھر کمرے سے باہر جاتے جاتے رک سی گئی۔

"وہ۔۔۔ انس بھائی!" اس کا انداز رکا رکا سا تھا۔ "سوہا اوپر کمرے میں ہے۔" اور اس کی توقع کے عین مطابق اس نے چونک کر سر اٹھایا۔

"میرا خیال ہے آپ وہیں چلے جائیں۔" وہ کہتی ہوئی باہر نکل گئی۔ انس کچھ دیر اور وہیں بیٹھنا چاہتا تھا۔ وہ اس وقت کو یاد کرنا چاہتا تھا۔

پرسوں رات کے وقت کو، جب سارے دوست اور حدید مل کر کمرے میں گانا بجانا کر رہے تھے۔ ہنس رہے تھے۔ گا رہے تھے اور اسے چھیڑ رہے تھے۔ وقت کیسے ریت کی طرح مٹھی سے پھسل جاتا ہے۔ انسان کے اختیار سے باہر اور شاید انسان کے اختیار میں تو کچھ بھی نہیں۔ وہ ایک گہری سانس لے کر اوپر آیا۔

کیا کر رہی ہوگی سوہا۔ میرا انتظار کر رہی ہو یا شاید ناراض بھی ہو۔ میں بھی تو اس اہم موقع پر اس کے پاس نہیں تھا۔ کسے پتا تھا کہ وہ حسین رات، جس کے کتنے ہی سپنے اس نے جاگتی آنکھوں سے بنے تھے۔ یوں آکے گزرے گی کہ میں اس کی یادیں تو دور کی بات، اس کے سائے تک نہیں ڈھونڈ پاؤں گا۔ کمرے کا یوں بھڑا ہوا دروازہ وا کرنے تک کتنے خیالات کے تیز رفتار گھوڑے اس کے دھیان کی زمین پر دھول اڑاتے گزر گئے۔

دھڑکن قدرتی طور پر غیر معمولی اور تیز سی ہو گئی۔ کمرے کا منظر اس کی توقعات کے برعکس تھا۔ موتیے کی لڑیاں ایک طرف سمٹ کر بندھی ہوئی تھیں۔ سرسراتے پردے برابر تھے اور بیڈ پر سوہا گہری نیند سو رہی تھی۔ انس کے احساسات عجیب سے ہو گئے۔

سوہا اسے جس حال میں بھی ملتی۔ بجی سنوری، مسکراتی، یا روتی دھوتی، عام سے لباس میں۔ مگر کم از کم اس نے یہ نہیں سوچا تھا۔ اس گھر اور گھر کے مکینوں پر گزرنے والے حادثے اور اپنی زندگی کے اس اہم موڑ پر نئے آغاز اور تمام تر ہنگامہ آرائی سے بے نیاز، وہ اتنے آرام سے سوتی ہوئی ملے گی۔

اس نے قریب جاکر اس کا چہرہ دیکھا۔ چہرے پر آنسوؤں کے نشان نہیں تھے۔ مگر۔۔۔ ایک معمولی سی سوجن

ضرور محسوس ہو رہی تھی۔ رات والا تمام بناؤ سنگھار ندارد تھا۔ کلائیاں سونی اور چہرہ میک اپ سے مبرا۔ بال بھی بکھرے بکھرے سے تھے۔ اس نے اسے جگانے کا ارادہ ترک کردیا۔ دروازہ بند کرکے باہر نکلتے ہوئے لاکھ منانے کے باوجود دل میں ایک معمولی سا شکوہ منہ بسور کے بیٹھ ہی گیا اور وہ بہت کوشش کے بعد بھی خاموش نہ رہ سکا۔

"سوہا سو رہی ہے۔" ناشتے کی ٹرے سامنے رکھتے ہوئے عفت نے بغور اسے دیکھا۔

"پوری رات جاگ کر آپ کا انتظار کرتی رہی۔ پھر صبح کے قریب میں نے ہی زور دے کر سلایا۔" وہ جانتی تھی۔ انس کے لہجے میں کیا کچھ تھا۔ شکوہ، تعجب، ناراضی، حیرانی، جب ہی صفائی پیش کرنی ضروری ہو گئی تھی۔ انس کوئی جواب دیے بغیر خاموشی سے ناشتا کرتا رہا۔

"آپ بھی اب ذرا دیر آرام کرلیں۔" ناشتے کے بعد اس نے برتن سمیٹے۔ "آپ کے آنے سے پہلے صارم بھائی نے مجھے فون کرکے بتایا تھا کہ حدید کی حالت خطرے سے باہر ہے اور یہ بھی کہا تھا کہ اب آپ کل ہی اسپتال جائیے گا۔"

"نہیں میں شام میں ہی چلا جاؤں گا۔" اس کا فیصلہ حتمی اور اٹل تھا۔

"مجھے ایک کپ چائے اور دے دو۔" وہ لاؤنج میں ہی صوفے پر لیٹ گیا۔ عفت نے دیکھا ضرور، مگر کچھ کہہ نہیں سکی۔

☼ ☼ ☼
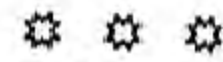
جانے وہ کون سا غیر معمولی جذبہ انسیت تھا جو اس لڑکی کو دیکھ کر اس کے دل میں ابھرا تھا۔

اس نے ایک نظر اسے دیکھا تھا اور پھر دل میں بار بار ہر وقت اسے دیکھنے کی خواہش جنم لینے لگی۔ وہ خود ہی اپنی دلی کیفیت کو محسوس کرکے متعجب سا ہو گیا۔ کیا خاص تھا اس میں، کچھ بھی تو نہیں یا شاید یہ اس کا گریز اور محتاط رویہ تھا جو آج کل کی لڑکیوں میں ناپید ہوتا جارہا ہے۔ اس نے جتنی بار بھی اس پر نظر ڈالی۔ اسے اس احساس سے الجھتا ہوا پایا کہ کوئی غیر انجان شخص اسے دیکھ رہا ہے۔

اس کی بہن کب سے اس کے پیچھے پڑی تھی کہ اب شادی کرلو۔ مگر وہ ہر بار اسے ٹالتا رہا۔ کیا کہتا۔ عورت کے ہر روپ میں وہ اس کا احترام کرتا ہے مگر بیوی۔ شاید اس رشتے پر وہ کبھی اعتبار نہ کرسکے اور کیوں نہ کرسکے۔ اس کی وجہ بھی وہ کسی کو بتا نہیں سکتا تھا۔

دیار غیر میں کسی معمول کی طرح گزرنے والی بے کیف راتیں اور بے مقصد دن، اسے لگتا زندگی بس اسی بے مقصد صبح و شام سے عبارت ہے اور شاید یوں ہی اختتام پذیر ہو جائے گی۔ کسی ہم سفر کے ساتھ کی ضرورت تھی نا اعتبار، ہاں ایک خواہش جو اگر کبھی تھی بھی تو کسی کی بے وفائی کا زخم کھانے کے بعد ابدی نیند سو چکی تھی۔

"اب ان محبت کرنے والی بہنوں کو کوئی کیسے سمجھائے، کھنڈر دلوں کے بنجر جذبے، کسی نوخیز حسن کی ہریالی میں کھل کھلنے کے قابل نہیں ہوتے۔" کمرے کی فضا میں اس کی خود کلامی گونجی اور گہری یاسیت سرنیہوڑے اس کے سامنے آبیٹھی۔

"واٹ! تم یہ بات مجھے اب بتا رہے ہو۔" کسی کی نوکیلی آواز اس کی سماعتیں چھیدنے کے لیے ہزاروں بار کی طرح اس بار بھی بن بلائے چلی آئی۔

"تم اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہو حسیب۔ تم جو چاہے کرتے پھرو گے اور بعد میں آکے مجھ سے معافی مانگ لو گے اور میں تمہیں اتنی آسانی سے معاف کردوں گی۔"

"لیکن وہ سب تم سے ملنے سے پہلے کی بات ہے۔"

"سو واٹ! تمہیں مجھے بتانا تو چاہیے تھا۔ میں تو ہمیشہ تم سے کہتی رہی کہ تم پہلے شخص ہو جسے میں نے چاہا۔ ہاں لیکن کتنے افسوس کی بات ہے کہ ابھی تک میں اپنے آپ کو ہی سمجھتی رہی کہ میں شاید تمہاری پہلی محبت ہوں۔ مگر نہیں...."

"نہیں کیوں نہیں ماریہ! تم ہی تو ہو میری محبت، میری چاہت، میرا مان، سب کچھ۔" اس نے سامنے کھڑی لڑکی کو بازوؤں سے تھام کر اپنی طرف موڑا۔

"مت ہاتھ لگاؤ مجھے۔" اس نے اس کے ہاتھ جھٹک دیے۔

"اپنے تمام جذبے کسی اور پر لٹا کر تم اب مجھ سے یہ دعوا کیسے کرسکتے ہو حسیب۔"

وہ اس کی غلطی بخشنے پر تیار نہیں تھی۔ بلکہ وہ تو شاید اس کی غلطی کو غلطی جاننے کے لیے بھی تیار نہیں تھی۔

"آئندہ مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش مت کرنا۔" اس کے دھواں دھواں چہرے پر ایک نگاہ غلط ڈالے بغیر وہ وہاں سے جاچکی تھی۔

کمرہ خالی ہو چکا تھا اور دل ویران۔ اس کی زندگی کی طرح اور کتنے ہی سالوں سے یہ زندگی یوں ہی ویران تھی اور یہ دل یوں ہی جذبوں سے خالی تھا۔ ہاں مگر اس چہرے کو دیکھنے کے بعد یہ کیفیت کچھ بدلی بدلی سی تھی۔ وہ اس بدلتی کیفیت سے حیران بھی تھا۔ خائف بھی اور شاید کہیں خوش بھی۔

☼ ☼ ☼

کسی عجیب سے احساس کے تحت سوتے میں اس کی آنکھ کھلی تھی۔ وہ جلدی سے اٹھ بیٹھی۔ ابھی دوپہر پوری طرح سے عروج پر نہیں پہنچی تھی۔ سورج کی تپش میں صبح کی نرمی باقی تھی۔ اس نے گھڑی دیکھی، بارہ بجے تھے۔ جلدی جلدی منہ پر پانی کے چھپاکے مارتی نیچے اتری تو لاؤنج میں صوفے پر انس کو محو خواب دیکھ کر سن سی ہو گئی۔ بانی گھر میں جانے کوئی تھا یا نہیں اور انس پتا نہیں کتنی گہری نیند میں تھا۔ اس نے قریب جا کر اس کا تھکا ماندہ چہرہ دیکھا۔ عفت نے لاؤنج میں قدم رکھا تو وہ اسے دیکھ کر بے اختیار پیچھے ہٹتی ہوئی جھینپ سی گئی۔

"کچھ کھاؤ گی۔" وہ محبت سے پوچھ رہی تھی۔ اس نے نماز کی طرح دوپٹا لپیٹ رکھا تھا۔

"نہیں بالکل بھوک نہیں ہے۔" "اچھا اوپر چلو میں انس بھائی کو بھیجتی ہوں۔"

"مگر میں تو ابھی...." اس نے کہنا چاہا، مگر عفت نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر چپ کرادیا۔ پھر اوپر جانے کا اشارہ کیا۔

"تھوڑا میک اپ کرو، زیور پہنو، تم ایک دن کی دلہن ہو۔" عفت کو کہتے ہوئے عجیب سی خجالت کا احساس ہوتا تھا۔ مگر مجبوری تھی۔

اس نے ذرا ڈارک کلر کی لپ اسٹک لگائی اور کانوں میں آویزے پہن کر ایک ہاتھ میں چوڑی ڈال لی۔ سیڑھیوں پر کسی کی آہٹ ہو رہی تھی۔ وہ جلدی سے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

انس نے اندر داخل ہو کر دیکھا۔ سر پر دوپٹا ہونے کی وجہ سے چہرہ چھپ سا گیا تھا۔ اس نے چہرہ جھکا بھی رکھا تھا۔

"السلام علیکم۔" سوہا نے سلام میں پہل کی۔

"وعلیکم السلام۔" دروازہ بند کرتے ہوئے اس نے دھیرے سے جواب دیا تھا۔

اس نے جھکی پلکوں سے دیکھا۔ انس اس کے بالکل پاس ہی کھڑا تھا۔ اس کی دھڑکنیں منتشر ہونے لگیں۔ چہرے سے ایک دم ہی آگ سے نکلنے لگی۔ وہ موتیے کی بندھی ہوئی لڑیاں کھول رہا تھا۔ "کیسی ہو۔" اس نے

سامنے بیٹھ کر سوہا کے حنائی ہاتھ تھامے۔
"آپ کیسے ہیں۔" سوال کا جواب سوال سن کر وہ ہنس دیا۔ ایک پھیکی سی ہنسی۔
"ٹھیک ہوں میں۔"
"اور حدید۔"
"وہ بھی ٹھیک ہے۔ اللہ کا شکر ہے۔ اب تو بہتر ہے۔ تم ٹھیک سے بیٹھو نا۔" اس نے پیر اٹھا کر بیڈ پر رکھ لیے۔ انس بھی سہولت سے اس کے دوسری طرف نیم دراز ہو گیا۔
"میں جانتا ہوں تم کل میرے نہ آنے کی وجہ سے اداس ہو گئی ہو گی' ہے نا۔" اس نے ایک بازو اس کے شانے پر پھیلا کر اسے قریب کر لیا۔ یہ ان دونوں کے درمیان قائم ہونے والے رشتے کا پہلا بے تکلفانہ استحقاق تھا۔ سوہا اس کی بات سننے کے بجائے ایک دم سمٹ سی گئی۔ اس سے جواب میں کچھ بولا نہیں گیا۔ انس دوسرے ہاتھ سے اس کا ہاتھ تھام کر سہلانے لگا۔
"زندگی میں ہر کام' بلکہ کوئی بھی کام ہماری مرضی سے نہیں ہوتا۔ بظاہر جو کچھ ہماری پلاننگ سے ہو بھی رہا ہوتا ہے۔ وہ دراصل خدا کی مرضی ہوتی ہے۔ اس کی رضا اور ہماری بھلائی۔ میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں اور یقیناً" تم بھی رکھتی ہو گی۔" اس نے رک کر اس کا سرخ چہرہ دیکھا۔
"تو ہو سکتا ہے ہماری بھلائی اور بہتری اسی میں ہو۔ جو رات اور جو لمحے ہمارے قسمت میں ہمارے ساتھ کے درج نہیں تھے۔ وہ گزر چکے۔ ان کے افسوس میں آنے والے دنوں اور آنے والی زندگی کو ضائع کیوں کریں۔ ابھی ایسی بہت سی راتیں آگے زندگی میں ہماری منتظر ہیں۔ ہمیں خوش دلی سے گزرا ہوا وقت بھول کر آنے والے لمحات کو خوش آمدید کہنا چاہیے' ہوں۔"
اس نے دو انگلیاں اس کی تھوڑی کے نیچے رکھ کر اس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔ سوہا اس کی قربت کی آنچ سے پگھل رہی تھی۔ گھبرا رہی تھی اور وہ کس حساب کتاب میں کھویا تھا۔ وہاں تو منظر ہی اور تھا۔ وہ دیر تک نگاہوں میں اس کا شرمیلا روپ جذب کرتا رہا۔
"آپ کچھ دیر لیٹ جائیں۔ آرام کر لیں۔" اس نے گھبرا کر ایک بے تکا مشورہ دیا۔ خود پر سے اس کی نظریں ہٹانے کے لیے اسے یہی ایک بات سوجھی تھی۔ وہ مسکرا دیا۔ دل خود بخود کسی انجانی مگر مدھر دھن پر گنگنانے لگا۔ اسے ایک دم ہی شرارت سوجھی۔
"جو حکم جناب۔" اور اس نے فوراً" سوہا کی گود میں سر رکھ دیا۔ سوہا ایک دم بدک سی گئی۔
"میرا مطلب تھا تکیے پر۔" وہ گڑبڑا کر وضاحت دینے لگی۔ پھر شرما کر چپ ہو گئی۔
"یہ جگہ بھی بری نہیں ہے۔" اس کی آنکھوں میں خمار آ گیا تھا۔ سنہری کلائیوں پر مضبوط ہتھیلیوں کی گرم گرفت تھی اور ایک محبوب چہرہ قریب تر۔ سوہا کی نظریں ادھر ادھر بھٹکتی پھرتیں۔ پھر اس کے چہرے پر آن رکتیں۔ پھر جھینپ کر راستہ بدل لیتیں اور وہ خود تو تھا ہی بے خود۔ یہ چہرہ قریب سے' فرصت سے دیکھنے کی خواہش بھی تو بہت تھی اور موقع بھی بڑے موقع سے ملا تھا۔

☼ ☼ ☼

حدید کو ہوش آ چکا تھا۔ انس جب اسپتال پہنچا تو وہ دھیرے دھیرے صارم سے بات کر رہا تھا۔ ڈاکٹرز نے زیادہ بولنے سے منع کیا تھا۔ ماہا' امی اور خالہ جان بھی وہیں تھیں۔ ماہا کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ چکی تھی۔ وہ کتنی دیر چھوٹی بہنوں کی طرح اس کا سر تھپکتا رہا۔ اس کے آنسو صاف کرتا رہا۔

خالہ جان یعنی ماہا کی تائی امی موقع کی نزاکت کا احساس کیے بغیر اس منظر کو بہت بے چینی سے ملاحظہ کرتی رہیں۔ حقیقت یہ تھی کہ انہیں اپنا دوسرا بھانجا بھی ہاتھوں سے نکلتا ہوا لگ رہا تھا۔
"اب تم انس کے ساتھ چلی جانا گھر' عفت کو بھیج دو۔ بے چاری تھک گئی ہو گی کام کر کر کے۔" نہ چاہتے ہوئے بھی ان کے لبوں سے ایک عجیب سی بات نکل ہی گئی۔
ماہا کو تو صبح ہی حدید کے ایکسیڈنٹ کا پتا چلا تھا۔ بلکہ خود ان کو بھی اور رہی عفت تو اسے ایسے گھر میں کیا اور کتنا کام ہو سکتا تھا۔ جہاں خود اس کے اور ایک نئی نویلی دلہن کے سوا کوئی موجود ہی نہ تھا۔
صارم اپنے گھر گیا تھا اور جاتے وقت یہ کہہ کر گیا تھا کہ وہ حدید کے پاس رات میں ٹھہرنے کے لیے کسی کا انتظام کر دے گا۔ مگر انس کو کسی کے آنے کی پروا نہیں تھی۔ وہ آج کی رات بھی اسپتال میں ہی رکنا چاہتا تھا۔
حدید سو چکا تھا۔ کمزوری اور مسکن دواؤں کے زیر اثر اسے نیند آ بھی زیادہ رہی تھی۔ انس ترحم' تاسف اور محبت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ کمزور' زرد۔
خالہ جان' امی اور ماہا واپسی کے لیے اٹھ گئیں۔ صد شکر کہ انہوں نے واپسی کے وقت کوئی بات نہیں کی۔ شاید انہیں اپنی بات کے بے تکے پن کا اندازہ ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

عفت اور وہ لاؤنج میں خاموشی سے بیٹھی تھیں۔ آج اس کی شادی کا دوسرا دن تھا۔ اصولاً" آنے والے دن اس کا ولیمہ ہونا تھا۔ مگر۔۔۔ انس نے عفت سے کہا تھا کہ ولیمہ ملتوی ہونے کی خبر خاندان میں سب کو پہنچا دے۔
"میرا بھائی اسپتال میں پڑا ہے اور میں دعوتیں اڑاؤں۔"
انس کے انداز میں ناگواری سی تھی۔ چپکے چپکے اس کا چہرہ پڑھتی سوہا نے دل میں پہلی بار اس کی بات پر ناگواری محسوس کی۔
کیسی عجیب بات تھی۔ زندگی کا وہ حصہ جب ہر روز' روز عید اور ہر شب شب برات محسوس ہوتی ہے۔ اس کی زندگی کا وہ حصہ ایک عجیب سے خالی پن کی نظر ہو رہا تھا۔
حدید سے انسیت اپنی جگہ' اس کا ایکسیڈنٹ اور اس کی تشویش ناک حالت اپنی جگہ' اسپتال کے چکر' فکر' اس تمام صورت حال کے باوجود' اس سب سے قطع نظر ارزاں تو اس کی اپنی ذات بھی نہ تھی کہ وہ اور اس سے منسلک ہر خوشی یوں نظرانداز کر دی جاتی۔ یہ ٹھیک تھا کہ حدید اسپتال میں ہو تو ولیمہ کی دعوت نامناسب لگتی۔ مگر انس آج رات بھی اسپتال میں رک گیا تھا۔
یہ اس کی شادی کے انتہائی ابتدائی دن تھے۔ جب عام سی ترین صورتیں بھی' چاند چہرہ' ستارہ آنکھوں کا لقب پاتی ہیں۔ روتی بسورتی شکلیں بے وجہ مسکراتی ہیں۔ کرخت لہجوں میں نرمی اتر آتی ہے۔ خوشیوں اور امنگوں کا ایک الگ اور نیا ہی جہان ہوتا ہے۔ جہاں پر دل لمبی سے لمبی اڑان بھرنے کے لیے' پر تولے تیار بیٹھا رہتا ہے۔ ہاتھوں میں کھنکتی چوڑیوں سے لے کر ریشم زلفوں سے ٹپکتی بوندوں تک اور ہم سفر کی ایک سرسری نگاہ سے لے کر مستحقاق بھری گرفت تک' سب کچھ معنی خیز اور ایک حجاب آگیں' مسکان سے جھلکتا ہے۔
اس کے معاملے میں اسے سب الٹا ہوتا لگنے لگا۔ جب رات کو گیارہ بجے تک انس کی واپسی کے امکان نظر نہ آئے۔
"تو ثابت ہوا کہ میں اہم ہوں' مگر اتنی زیادہ نہیں۔" جلد باز' جذباتی کم عمر لڑکیوں کی طرح اس نے بھی فیصلہ کرنے میں ذرا جلدی دکھائی۔ موقع محل کی مناسبت اس وقت انس کو اپنے کمرے میں ہونا چاہیے تھا۔ مگر وہ اپنے

نئی دلہن کی ہی طرح سے سجے سجائے کمرے میں' تنہائی کی باہنوں میں سمٹی' کروٹ کے بل سسک رہی تھی۔ سہرے کی کلیاں مرجھا چکی تھیں۔ اس کے دل میں پھوٹتے تنے نکورا رمانوں کی طرح۔
سرشام نئے سرے سے کیا گیا تمام بناؤ سنگھار' ٹشو پیپر کی ایک معمولی رگڑ سے ڈسٹ بن کی نظر ہو گیا۔ چمکتے دمکتے طلائی آویزے' گلوبند' پازیب' قرینے سے واپس ڈبیوں میں جانے کے بجائے' بے دلی سے سنگھار میز پر پھینکے گئے۔ آگے پھر طویل اور بے زار کن رات اس کی منتظر تھی۔
"اور کون جانے ایسی کتنی راتیں" اس کی قسمت میں باقی ہیں۔" کل وہ کہہ رہا تھا جو گزر گیا اس کا غم نہیں کرنا' جو آنے والا ہے۔ اس کا کھلے دل اور مہربان مسکراہٹ کے ساتھ خیر مقدم کرنا ہے۔
"تو کیا اس تنہائی کے ساتھ اپنی خوشیاں بانٹوں' یا اس اداس سناٹے کو اپنا غم سنا کر دل کا بوجھ ہلکا کروں کہ مجھے بہت چاہ سے بیاہ کر لانے والا میرا جیون ساتھی بہت جلد مجھے بھول بیٹھا ہے۔" آنسو بے آواز پلکوں سے ٹوٹ کر تکیے میں جذب ہوتے رہے۔
آج عفت اس کے ساتھ ہی لیٹ گئی تھی۔ گو دل تو نہیں مانتا تھا۔ مگر یہ سوہا کا ہی اصرار تھا کہ اسے اکیلے کمرے میں ڈر لگتا ہے۔ سوہا کی دبی دبی آواز کی بہت دھیمی سسکیاں اس کے کانوں تک بھی آئی تھیں۔ وہ صرف انس کی عقل پر ماتم ہی کر سکتی تھی۔

☼ ☼ ☼
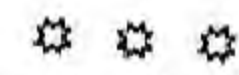
صبح ہی صبح اس نے بے حد غصے کے عالم میں گھر فون کیا۔ "امی اور میں تو اسپتال جا رہے تھے۔" ماما اپنے دھیان میں تھی۔ اس کی آواز اور لہجے پر چونک گئی۔
"کیا ہوا۔"
"ہونا کیا ہے بس۔۔۔ میرا دل گھبرا رہا ہے۔" "تو ٹی وی وغیرہ دیکھ لو۔"
"مجھے نہیں دیکھنا۔ میں کیا یہاں ٹی وی دیکھنے کے لیے آئی ہوں۔" وہ بہت اکتائی تھی۔
"تو پھر مجھے بتاؤ میں کیا کروں۔"
"گھر آجاؤ مجھے لینے۔"
"میں اکیلی کیسے آؤں گی۔" ماما متذبذب ہوئی۔
"اوفوہ سیدھی بس تو آتی ہے اور تم کیا ایسی نئی نویلی ہو کہ کہیں آجا نہیں سکتیں۔"
عفت پاس کھڑی بغور اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے تیور دیکھ کر چپ چاپ باہر نکل گئی۔
"اچھا ذرا اسپتال ہو آئیں۔"
"کوئی ضرورت نہیں ہے تمہیں وہاں جانے کی۔" سوہا بے اختیار آواز دبا کر چیخی۔
"تم پہلی فرصت میں یہاں آؤ بس۔۔۔ ورنہ اچھی بات نہیں ہو گی۔"
اس نے فیصلہ کن انداز میں کہہ کر لائن کاٹی' پھر۔۔۔ سیل بیڈ پر پھینک کر رونے لگی۔

☼ ☼ ☼
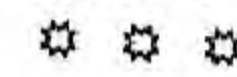
ذرا دیر بعد ماما امی کے ساتھ موجود تھی۔
وہ امی کو سلام کرنے نکلی تو اس کا چہرہ ستا ہوا اور آنکھیں نم تھیں۔
امی کو معلوم تھا وہ' انس کی بے توجہی سے اداس ہو گئی ہے' مگر وہ اس معاملے میں بے بس تھیں۔ سوہا ان کے پاس بھی زیادہ دیر تک نہیں بیٹھی۔ بلکہ اوپر کمرے میں جا کر بند ہو گئی۔ امی نے ماما کو اس کے پاس بھیجا۔ انہیں اس

کا رویہ بہت غیر معمولی سا لگ رہا تھا۔
"امی سے کہو وہ عفت کو لے کر اسپتال چلی جائیں۔ مجھے گھر جانا ہے۔" وہ کمرے میں ماما کی آمد کی منتظر بھری بیٹھی تھی۔
"اچھا کہہ دیتی ہوں۔"
ماما نے اس کے فیصلہ کن انداز پر گہری سانس بھری اور پلٹ گئی۔
سوہا بھری بھری آنکھوں سے ایک جوڑا اور چند چوڑیاں بیگ میں رکھ کر تیار ہو گئی۔ امی عفت کے ساتھ اسپتال چلی گئیں۔
گھر کی چابی عفت کے ہی پاس تھی۔ اس نے اسپتال میں ہی انس کے حوالے کرنے کے خیال سے ساتھ ہی رکھ لی۔ وہ خود بھی اب گھر جانا چاہ رہی تھی۔ خاندان میں سے کوئی ایک بھی تو یہاں سوہا سے ملنے نہیں آیا تھا۔ جس جس کو خبر ملی' حدید کی عیادت کو ہی پہنچا۔
"پرہیزی کھانا تو میں گھر سے بنا کر بھی دے سکتی ہوں۔ انس ہمارے یہاں نہیں تو سوہا کے ساتھ ہی رک جائے گا۔"
اس نے گھر سے نکلتے نکلتے اپنی رائے بھی دے دی تھی۔ کسی کو انکار یا اعتراض نہ تھا۔

☼ ☼ ☼

شام ڈھل رہی تھی۔ جب اس نے تالا کھول کر ویران گھر میں قدم رکھا۔ ہر ہر قدم پر سرنہوڑائے اداسی اس کے ساتھ ساتھ سرکتی اس کے کمرے میں پہنچی اور اس سے پہلے ہی وہاں قابض ہو گئی۔
اس نے دہلیز پر ٹھٹک کر چوکھٹ سے ٹیک لگائے کتنی ہی دیر خالی کمرے کو تکنے میں لگا دی۔ سب چیزیں ساکت پڑی تھیں۔ انہیں ساکت ہی رہنا تھا۔ انہیں برتنے والی وہاں نہیں تھی۔ لیکن اس کا احساس ضرور ہر کونے سے جھانک رہا تھا۔
مرجھائے ہوئے پھولوں کی باسی مہک نے ایک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا تھا۔ اس نے اپنے پیر چپلوں کی قید سے آزاد کیے اور دھیرے سے آگے بڑھ کر الجھی ہوئی لڑیوں کو بے دھیانی سے سلجھانے لگا۔
"عفت' حدید' سوہا۔"
کتنے ہی لوگ دھیان کی ڈور سے الجھے مگر گرہ لگی تو صرف سوہا پر۔
"سوہا۔" اس کے لبوں پر دھیرے سے ایک نام چمک کر بجھ گیا۔
وہ گہری سانس لے کر لڑیاں ہٹانے لگا۔ پھر ایک ڈھیر کی صورت میں جمع کر کے ڈسٹ بن میں ڈالا سائیڈ ٹیبل پر گلاب کے پھولوں کے بڑے بڑے گل دستے سجاوٹ کی نیت سے رکھے گئے تھے۔ موتیے کی لڑیوں کے بعد ان پھولوں کی باری آئی۔ پھر دیواروں اور فرنیچر پر لگے آرائشی گلوں کی۔ تھوڑی ہی دیر میں مرجھائے ہوئے پھولوں سے کمرہ خالی اور ڈسٹ بن بھر چکا تھا۔ کمرے میں چکراتی مہک کافی کم ہو گئی تھی۔
بدلتا موسم اپنی نرم حدت لیے کمرے میں گھس آیا تھا۔ اس نے ہلکا سا پنکھا چلا کر چادر تان لی۔
نیند آنکھوں سے دور سہی۔ کسی کی یاد بہت فرصت سے دل و دماغ پر دستک دیتی سوچ کے کواڑ کھلنے کی منتظر تھی۔

☼ ☼ ☼

اسے وہیں فون کر کے صارم نے اس وقت حدید کے ایکسیڈنٹ کی خبر دی جب' نہ صرف اس کی حالت

خطرے سے باہر آچکی تھی۔ بلکہ صورت حال کافی حد تک بہتر تھی۔ اس کا گھبرانا ایک فطری سا عمل تھا۔ کاروباری مصروفیات اپنی جگہ تھیں۔ وہ ایک دم سب چھوڑ کر پاکستان تو نہیں جاسکتا تھا۔ ہاں البتہ انس سے فون پر خبر گیری ضرور کی۔ اسے اپنے ساتھ اور ہر قسم کے مالی تعاون اور مدد کا بھرپور یقین دلایا۔

وہ اپنے اور انس کے رشتے کو مستقبل میں جس نظر سے دیکھتا تھا۔ اس کا تقاضا تھا کہ وہ جتنا ہو سکے اس مشکل وقت میں اس کا ساتھ دے۔

فی الحال تو انس نے کسی قسم کی مالی مدد لینے سے انکار کردیا تھا۔ مگر حبیب کے خلوص بھرے انداز پر اس کے دل کو اطمینان ضرور ہوا تھا۔

حبیب نے کراچی میں مقیم اپنی بہن کو فون پر نہ صرف اپنی شادی کی رضامندی دے دی تھی۔ بلکہ ماہا اور سوہا کا حدود اربع بھی بتادیا تھا۔

اس کی بہن کا خیال تھا کہ پہلے وہ اپنے بھائی کے دوست کی عیادت کے بہانے ان لوگوں کو دیکھ بھال کر فیصلہ کرے گی۔ پھر رشتہ وغیرہ اس کے دوست کی حالت سنبھلنے کے بعد ہی دیا جائے تو بہتر رہے گا۔

حبیب کو کوئی اعتراض نہ تھا۔ یوں بھی اسے یقین تھا کہ ماہا اس کی بہن کو ضرور پسند آجائے گی۔ اسے ایک نظر دیکھنے کے بعد وہ مسترد کر ہی نہیں سکتی۔

☼ ☼ ☼

مغرب کے بعد کہیں جاکے ماہا کے سیل پر انس کی کال آئی تھی۔

وہ جان بوجھ کر سوتی بن گئی۔ ماہا نے ہی فون پر بات کی تھی' تب سے اب تک ڈیڑھ دو گھنٹے گزر چکے تھے۔ وہ اپنے کمرے میں بے حس و حرکت پڑی تھی۔

کبھی کبھی کوئی بھولا بھٹکا موتی پلکوں کے کنارے پر چمکتا۔ وہ بے دردی سے آنکھیں تو کیا پورا چہرہ ہی رگڑ ڈالتی۔

شریا حضوری یا امی کے ڈر سے زبردستی لادا گیا زیور' ہینڈ بیگ کی زینت بن چکا تھا۔ ماہا پر اس کے مزاج کی برہمی کسی حد تک واضح ہو چکی تھی۔

خاندان کے اور بہت سے دوسرے افراد کی طرح سوہا سے ہمدردی رکھنے کے باوجود' وہ انس کی مخالفت نہیں کرسکتی تھی۔ اور سوہا کو شاید اسی بات پر ماہا سے خفگی تھی۔ بلکہ وہ تو شاید ہر شخص سے ہی ناراض تھی۔

عفت نے بہت معاملہ فہمی کا ثبوت دیا جو ماہا کو زیادہ کرید کرنے سے منع کردیا۔ وہ جب سے آئی تھی' ماہا صرف اس کا چہرہ جانچنے کے کام کررہی تھی۔

نہ اس نے کوئی بات کی نہ سوہا نے ہی اسے مخاطب کیا۔ انس کا فون بند کرنے کے بعد اسے پتا چلا کہ سوہا جاگ رہی تھی۔ مگر جان کر آنکھیں بند کیے پڑی رہی۔ تب سے اب تک ایک ہی کروٹ کے بل لیٹ کر خلا میں نگاہیں گاڑے کیا سوچ رہی تھی۔ اندازہ لگانا سہل بھی تھا اور شاید گنجلک بھی۔

کبھی اسے لگتا وہ رو رہی ہے۔ کبھی اس کا چہرہ سرخ پڑجاتا۔ اور کبھی غصے کے آثار نظر آتے۔ امی عشاء پڑھ کر سونے ہی جارہی تھیں۔ انہیں فجر میں اٹھنا ہوتا تھا۔ جب انس نے دروازے پر دستک دی۔

گو کہ کوئی ایسی رات نہیں گزری تھی۔ گھڑی نو کے ہندسے سے ذرا ہی آگے سرکی تھی۔ مگر سوہا جس تیزی سے اس کی آمد کا سن کر باتھ روم میں بند ہوئی تھی۔ اس سے ماہا کو لگا شاید بہت دیر ہوگئی۔

امی انس سے باتیں کرکے اور حدید کی طرف سے اطمینان لے کر سونے چلی گئیں۔ انہوں نے انس کو خاص تاکید کی تھی کہ آج رات یہیں رک جائے۔

"وہ سوہا نہارہی ہے۔" ماہا نے اسے اٹک اٹک کر بتایا۔

انس سر ہلا کر خاموشی سے چائے پینے لگا۔ ماہا کی سمجھ میں نہیں آیا مزید کیا بات کرے۔ حدید کی خیریت بھی پتا چل چکی تھی۔

باتھ روم صحن کے ایک کونے میں ہی تھا۔ جس کے بند دروازے کے پیچھے چھائی خاموشی ماہا کے جھوٹ کا بھرم کھول رہی تھی۔

"اتنی رات میں نہانا ٹھیک نہیں۔"

انس کافی دیر کے بعد مختصر سا تبصرہ کرکے خاموش ہوگیا۔

"میں امی کے پاس کمرے میں جارہی ہوں آپ اس کمرے میں۔" اس سے بات مکمل نہیں ہو سکی۔ سوہا باتھ روم کا دروازہ کھول کر نکلی اور انس کی طرف دیکھے بغیر کمرے کی طرف بڑھتی چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

"کیا ضرورت تھی تمہیں وہاں رک کر ان کی نوکرانی بننے کی۔" نائلہ دبی دبی آواز میں چیخ رہی تھی۔

"نوکرانی بننے کی کیا بات ہے۔ کسی کو تو رکنا تھا نا وہاں۔ میں نہیں تو امی یا چچی رک جاتیں۔" عفت جاتی تھی۔

نائلہ کو اس کا انس کے گھر رکنا بہت برا لگا تھا۔ اور کم از کم اس کے سامنے وہ ہر ناگواری کا اظہار کرنے میں بالکل آزاد تھی۔

"ہاں تو رکتیں چچی جان۔ ان کی لاڈلی کا گھر ہے نا وہ۔ اور رہیں اماں تو ان کو تو میں کبھی بھی نہ رکنے دیتی۔"

"کیوں بھئی۔ ایسی بھی کیا بات ہوگئی۔ ان کی بہن کا گھر ہے وہ۔"

"ہے نہیں۔ کبھی تھا۔ جب تک ان کی بہن زندہ تھیں ــــــــــــ یا جب تک انس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔"

"اب کیا ہوگیا۔" عفت اکتا سی گئی۔

"اب یہ ہوگیا کہ جب خدمتیں کرنے کا وقت آتا ہے تو خالہ یا ان کی بیٹیاں رہ جاتی ہیں۔" عفت گہری سانس بھر کے رہ گئی۔

"شادی کے وقت انس کو میں نظر نہیں آئی۔ پہلے کس قدر دوستانہ رویہ تھا میرے ساتھ۔ اور یہ حدید۔ اس کو تو ابھی سے مٹھی میں کرکے رکھا ہوا ہے۔ جادو گرنی ہے پوری۔" نائلہ کے لہجے میں سلگتی جلن کی تپش عفت تک بخوبی پہنچ رہی تھی۔

"میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا نائلہ۔ بھول جاؤ اب اس بات کو۔ تم ایک بے کار کی بات کو جواز بنا کر حسد کررہی ہو۔ تم خود سوچ سوچ کر گھل جاؤ گی۔ اور کسی کو احساس تک نہ ہوگا۔ انس بھائی کی شادی سے پہلے تم سے جتنی بھی دوستی رہی ہو۔ مگر اب یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سوہا ان کی بیوی ہے۔" عفت نے سمجھانے کی کوشش کی۔ ہمیشہ کی طرح ایک ناکام کوشش۔

"کچھ بھی ہو۔ میں ایک بار انس سے پوچھوں گی ضرور کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ میرے جذبوں سے لاعلم تو وہ بہرالحال نہیں تھا۔"

رات کے سناٹے میں اس کی آواز سرسرا رہی تھی۔

"تمہارا دماغ خراب ہے اور کچھ نہیں۔"

"کیوں اس میں دماغ خراب ہونے والی کیا بات ہے۔"

"اور نہیں تو کیا۔ وہ دھڑلے سے یہ بات کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ انہوں نے کبھی تمہیں شادی کے سبز باغ نہیں دکھائے۔"

"ارے منہ سے نہیں کہا تو کیا ہوا۔ اس کا رویہ تو مجھے احساس دلاتا تھا ناں۔" عفت چند لمحوں کے لیے چپ کر گئی۔

لڑکیاں' اپنی ذہنیت سے کتنی ہی چالاک ہوں مگر' فطرت سے معصوم ہی ہوتی ہے۔ کسی کی ذرا سی ہنسی۔ ایک نرم مسکراہٹ اور ایک مہربان نظر سے زندگی بھر کے لیے مفہوم تلاش کر خواب بننے والی۔ معصوم اور نادان لڑکیاں۔

اس نے دل ہی دل میں تمام لڑکیوں کے ساتھ ساتھ اپنی عقل کو بھی سلام پیش کیا۔ خود وہ بھی تو حدید کے نرم رویے سے آس لگائے بیٹھی تھی۔

☼ ☼ ☼

"کیا بات ہے سوہا۔ تم ناراض ہو انس بھائی سے۔"

ماہا اس کے رویے سے حد درجہ الجھ گئی تھی۔ ابھی ان کی شادی کو دن ہی کتنے ہوئے تھے۔

"نہیں۔" مختصراً" کہہ کر وہ صاف ستھرا بستر جھاڑنے لگی۔

ماہا چند لمحے اسے دیکھتی رہی۔ اس کی حرکتوں سے ناراضی جھلک رہی تھی۔

"اچھا میں ان کو بھیجتی ہوں۔ وہ آج رات یہیں رکیں گے۔"

"کوئی ضرورت نہیں ہے۔" اس کی آواز بہت بلند تھی۔ ماہا باہر نکلتے نکلتے ٹھٹک گئی۔

"کیوں۔"

"کیونکہ وہ آج یہاں نہیں۔ حدید کے پاس اسپتال میں رکیں گے۔"

"پاگل ہوئی ہو۔" ماہا نے آواز دبا کر احتیاط" باہر نظر ڈالی۔ سامنے سے انس نظر نہیں آرہا تھا مگر آواز یقیناً" اس تک پہنچی ہو گی۔

"اب اس وقت وہ اسپتال کیوں جائیں گے۔"

"کیونکہ ان کا بھائی جس سے وہ بے حد پیار کرتے ہیں اس وقت ہاسپٹلا ئزہے۔ اس کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے اور کیوں۔" اس کی آواز میں کاٹ تھی۔

"میں انہیں بھیج رہی ہوں یہاں۔"

"ماہا اگر تم نے ایسا کیا تو میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔" اس کی آواز پر ماہا نے گھبرا کر باہر دیکھا۔ انس اسی طرف آرہا تھا۔

"ویسے بھی میں یہاں آئی ہوں تمہارے ساتھ وقت گزارنے کے لیے۔" انس دروازے تک آگیا تھا۔ سوہا کی پشت ہونے کی وجہ سے وہ انس کو دیکھ نہیں سکی۔ مگر انس نے اس کی بات سن لی تھی۔

"انس بھائی! اندر آجائیں۔"

سوہا کو اس کی بدتمیزی سے روکنے کا فی الحال یہی ایک طریقہ تھا کہ وہ اسے انس کی موجودگی کا احساس دلا دیتی۔

"نہیں بس' اب کافی رات ہو گئی ہے۔ اب چلوں گا گھر۔" اس نے بہت تحمل سے ماہا کی بات کا جواب دے کر سوہا کو دیکھا۔

"سوہا آپ چلیں گی میرے ساتھ۔" وہ یونہی رخ موڑ کر کھڑی رہی۔

"میں وہاں اکیلے کیا کروں گی۔ اور اگر آپ یہاں سے ڈائریکٹ اسپتال چلے جائیں تو راستہ زیادہ لمبا نہیں پڑے گا آپ کو۔" اس کی آواز دھیمی پڑ گئی تھی۔ مگر اس میں بدتمیزی کا عنصر واضح تھا۔

انس نے کندھے اچکا کر ماہا کو دیکھا اور خدا حافظ کہتا باہر نکل گیا۔ ماہا اس کے پیچھے پیچھے سیڑھیاں اتر کر بیرونی دروازے تک آئی۔

"انس بھائی۔" وہ رک کر اسے دیکھنے لگا۔

"سوہا کی باتوں کا برا مت مانیے گا۔ وہ ایکچوئیلی بہت ڈسٹرب سی ہو گئی ہے۔" اس کی آواز لجلجا گئی تھی۔

زندگی میں کبھی اس طرح کی عجیب' معذرت خواہانہ اور شرمندہ صورت حال سے واسطہ ہی نہیں پڑا تھا۔

دو دن فقط۔۔۔ دو دن پرانا بہنوئی اور یہ وضاحتیں۔ اس کی ہتھیلیاں نم ہو گئیں۔ (امی کو بھی تو تمام بات کا کچھ علم نہیں اف۔)

"میں جانتا ہوں۔" وہ مسکرا دیا۔

"اپنا خیال رکھنا اور اپنی بہن کا بھی۔" ماہا نے بے حد بجھے دل سے دروازہ بند کیا۔ اپنے کمرے کی کھڑکی سے چپک کر کھڑی نائلہ کا وجود اندھیرے میں گم تھا۔ اور اس کے لبوں پر کھیلتی کڑوی مسکراہٹ بھی۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

☼ ☼

فاخرہ گل

جلا سا لالا اور اوپر والا

چوتھی قسط

ابا اپنے بیڈ پر جانے کب سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ ایسا لگتا گویا بیٹھے نہیں ہوئے بلکہ کسی نے انھیں اٹھا کر بس رکھ دیا ہے اور جب سے رکھا ہے تب سے وہ بڑی ایمان داری کے ساتھ وہیں رکھے ہوئے ہیں۔ دیکھنے میں ان پر کسی مہمان خصوصی کا گمان ہوتا تھا جسے سیکڑوں کے مجمع کے عین سامنے محض دس فٹ اونچائی کے اسٹیج پر بٹھا کر تھوک کے حساب سے تقاریر کی جارہی ہوں اور وہ۔۔۔ اظہار بھی مشکل ہے۔۔۔ کچھ کہہ بھی نہیں سکتے مجبور ہیں اف اللہ۔۔۔ چپ رہ بھی نہیں سکتے کی تفسیر بنے بت بن گئے ہوں۔۔۔ اسی دوران چندا بڑے خوش گوار موڈ میں ان کے کمرے میں داخل تو ہوئی مگر ان کی پریشانی نے اسے بھی پریشان کر ڈالا۔

"کیا ہوا ابا؟ آپ کی طبیعت نہیں ہے ٹھیک؟" چندا کی آواز انھیں خیالات سے ہٹا کر حقیقی دنیا میں واپس کھینچ لائی تھی۔ سوچو نکے تو ضرور لیکن چندا کو وجہ نہ تو بتانے والی تھی اور نہ ہی انھوں نے بتائی۔

"او نہیں پتری۔۔۔ بس ذرا ایویں ای۔"

"مگر ابا مجھے تو لگتا ہے آپ ہیں بیمار۔" ٹیلی فون کے الارم کی طرح اب وہ شاید چپ نہ رہنے کا سوچ چکی تھی۔

"نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ میں نے کیا تے ہے کہ میں ٹھیک ہوں۔ پریشان نہ ہو۔۔۔ اور بس چھوڑ دے۔"

"ہائے ابا۔۔۔ نہ چھوڑ کر جانا مجھے۔۔۔ ابھی تو میرے نام نہیں ہوئی زمینیں۔۔۔ ابھی تو مجھے پتا ہی نہیں بینک میں رکھے زیور اور روپیوں کا۔۔۔ ابھی نہ جانا مجھے چھوڑ کر ابا۔۔۔ ابھی تو مجھے بڑی ضرورت ہے آپ کی۔۔۔" لمبا سا سانس لینے کو رکتی ہے اور پھر جملہ پورا کرتی ہے۔

"چیزوں کی۔۔۔"

بیٹھے بٹھائے چندا با آواز بلند رونے لگتی ہے اور اس کا یوں بغیر پیشگی اطلاع کے رونے سے خود ابا بھی گھبرا سے گئے تھے۔ سو فوراً سیدھے ہو کر بیٹھے اور بڑے جلالی انداز میں اسے دیکھا۔

"چپ کر۔۔۔ میں کہتا ہوں واز بند کرا پنی۔" ابا کی گرج چمک میں بھی بڑا دم تھا۔ چندا سہم کر تو فوراً چپ ہو چکی تھی۔

"او شکر کر۔۔۔ گورنمنٹ کو تیرے رونے کا پتا نہیں چل گیا۔"

"ورنہ۔۔۔؟"

"ورنہ وہ تیرے آنسوؤں پر بھی ٹیکس لے لیتی۔"

"لیکن ہوا کیا تھا آپ کو؟ جو یوں ایک دم اچانک چپ چاپ بیٹھے تھے کسی جعلی عامل کی طرح۔" چندا سے یہ گتھی سلجھائے نہ سلجھ رہی تھی اور اسی بات نے اسے گھبراہٹ میں مبتلا کر دیا تھا۔

"او پتری۔۔۔ دراصل کش روپیوں کی ضرورت پڑ گئی تھی۔"

"روپیوں کی ضرورت۔۔۔ اور آپ کو۔۔۔" اگر ابا اس وقت دن کو رات کہتے تو اس کے لیے ایک عام سی معمول کی بات ہوتی لیکن روپیوں کی ضرورت اور وہ بھی ابا جیسے بندے کو۔۔۔ یہ امر خاصا حیران کن تھا اور اس پر تصدیق کی مہر لگائی۔ انھوں نے دھیرے دھیرے گردن ہلائی۔

ناولٹ

"لیکن آپ بھی تو کہتے تھے نا کہ نہیں خرچ کرنے چاہییں روپے۔"

"او یے سب ٹھیک ہے پر میں اپنی رائے بھی تے کپڑوں کی طرح بدلتا ہوں نا۔" ابا نے کھسیا کر جواب دیا۔

"یعنی کبھی نہیں بدلتے؟"

"نہیں نہیں زادہ شیار بننے کی ضرورت نہیں میرے سامنے۔" ابا کی بات پر چندا نے ناراضی کا اظہار کرنے کے لیے منہ پھلا لیا تھا۔ اور ابا جیسے بھی تھے لیکن چندا آخر ان کی اکلوتی بیٹی تھی جس کی ناراضی برداشت کرنا ان کے لیے ایسا ہی تھا جیسا جہاز سے چھلانگ لگانا یعنی ناممکن!

"اب کیوں سکے خربوزے جیسا منہ بنا کر بیٹھ گئی ہے؟"

"میری بھلا کیا غلطی تھی؟ آپ ہو گئے ہیں اتنے پرانے تو میں کبھی شاید آگیا ہے آخری وقت۔۔۔ اور

باتیں بھی روپوں کی۔"

باقی ساری باتیں تو ایک طرف لیکن ابا کا دھیان لفظ "پرانے" سے تو آگے گیا ہی نہیں "پرانا؟ میں پرانا ہو گیا ہوں؟ او کیوں میرے اوپر کیا جالے لگ گئے ہیں؟"

"نہیں ابا دراصل۔" ابا کے چہرے کے نقوش کے ساتھ یہ دردناک تاثرات دیکھ کر اسے یوں لگا جیسے کسی نے گرما گرم بریانی پر ٹھنڈا ٹھنڈا اسکواڈ ڈال دیا ہو۔ جب ہی وضاحت کرنا تو چاہی لیکن ابا سننے کے موڈ میں کم اور سنانے کے موڈ میں زیادہ پائے گئے جب ہی تو کیسی غریب نادہندہ کی بجلی کی طرح فوراً" اس کی بات کاٹ دی۔

"تجھے کیا پتا" لڑکیاں تو اب بھی مجھے دیکھنے اور میری وار سننے کی خاش کرتی ہیں۔"

"جی جی' وہ دیکھنا چاہتی ہوں گی نا کہ ہوتے تھے کیسے پرانے زمانوں کے انسان۔"

"اوئے نہیں۔" پرجوش انداز میں ابا نے ٹانگیں سمیٹ کر آلتی پالتی ماری۔ شدت جذبات سے ان کا چہرہ ایسا لال سرخ دکھائی دیتا تھا کہ لگتا سوتے میں پشتو فلم کا گانا دیکھ لیا ہو۔

"لڑکیاں تیرے ابا سے دوستی کرنا چاہتی ہیں۔" اس ہچکولے کھاتے انکشاف سے ابا کا خیال تھا کہ چندا حیران رہ جائے گی مگر وہ پریشان ہو گئی۔ بڑی رحم بھری نظر ابا پر ڈالی اور گہری سانس لے کر یقیناً" دل ہی دل میں ان لڑکیوں کو داد دے کر بولی۔

"ہاں تو کرلیں نا دوستی' پچھتائیں گی۔"

"اچھا میری بات تے سن۔"

اٹھ کر کمرے سے نکلتی چندا کو ابا نے آواز دے کر روکا تو وہ پھر سے پلٹی۔

"چل ایسا کر' غصہ تھوک دے تے آج قیمہ گوشت پکالے۔"

"آج پھر؟ پہلے پکایا تھا کب؟" چندا نے انہیں حاتم طائی کی قبر پر لات مارنے سے بال بال بچایا۔

"یاد نہیں رہا' چار مہینے پہلے ملتی کے بیٹے نے عقیقہ کا گوشت دیا تھا تے پکایا نہیں تھا؟"

"یاد ہے ابا یاد ہے۔" چندا بے زاریت سے بولی۔

"یاد ہے تے قیمہ جو باقی بچا تھا ناں اج قیمہ پکالے۔ عیش کر میری چڑی' تیرا ابا ابھی زندہ ہے۔" چندا بغیر کچھ کہے ان کی حالت پر دل ہی دل میں کڑھتی کمرے سے نکل گئی تو وہ ایک بار پھر خود سے ہم کلام ہوئے۔

"عیش کر میری چڑی تو۔ اور میں بھی اپنے عیش کا بندوبست کروں۔" فون پر پیسے بھیجنے کی جو شرط رکھی گئی تھی وہ ابا کی سوچوں کے کئی در وا کر گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

فلفی کے جی بے لی تھی دن فلفی بنتی جاتی ہے
ہر محبوبہ بالکل اپنی بے بے بنتی جاتی ہے
تل پر لٹو ہونے والے رہ رہ کر پچھتاتے ہیں
چھیل چھبیلی بلو' باکڑ بلی بنتی جاتی ہے

خالہ اپنے کمرے میں ڈریسنگ ٹیبل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر خود کو مختلف زاویوں اور کئی دوسروں کی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ کبھی انہیں اپنا سراپا پڑی کیا جیسا لگتا تو کبھی جسامت جن قامت لگنے لگتی۔ کمرے میں گونجتا تیز میوزک تھا تو انجوائے منٹ کے لیے لیکن اس وقت انہیں وہ بھی برا لگنے لگا تھا۔

"ایک دو جگہ سے اگر میں چہرے کی سرجری کروانے کا سوچ بھی لوں مگر ان ری ایکشنز کو دیکھ کر ہی ڈر لگ جاتا ہے جو بے چاریاں سرجری کے بعد کھل کر قہقہہ لگانے سے بھی ڈرتی ہیں۔ صرف دل سے مسکرا ہی دیں تو بلوچستان کی زمینوں میں پڑنے والی دراڑوں کی یاد دلا دیتی ہیں۔ ہاں اگر رسمی مسکراہٹ ہو تو ان جیسا اور کوئی نہیں۔" خالہ کی خود کلامیاں جاری تھیں کہ کھلے ہوئے دروازے سے انہیں آئینے کے سامنے کھڑا دیکھ کر ضمیر بھائی اندر چلے آئے اور اپنے تئیں شرارت سے بولے۔

"بھئی سنا ہے کہ جھریوں کا جلسہ ہو رہا ہے۔"

"جھریوں کا جلسہ ہو رہا ہے تو چاقو کو بھی بھیجو۔"

خالہ نے بھی انہی کی طرح مسکراتے ہوئے کہا۔ "خالہ میں نے چھریاں نہیں جھریاں کہا ہے۔"

"ہاں تو میں بھی تو چھریاں ہی کہہ رہی ہوں نا۔ میں نے کب جھریاں کہا؟"

"اچھا جی' چلیں جو آپ کی مرضی۔" ضمیر بھائی کندھے اچکاتے ہوئے باہر جانے کو مڑے۔ ویسے بھی خالہ کے ساتھ زیادہ وقت گزارنا کوئی آسان بات نہیں تھی۔

"تم نے جانا ہے ضمیر تو جاؤ۔ بھلا میں کیوں چلوں؟"

"اس لیے خالہ کہ اب آپ کے تو چل چلاؤ کا وقت آگیا ہے۔" وہ ہنوز مذاق کے موڈ میں تھے۔

"تم کتنے اچھے ہو ضمیر۔ بھلا پلاؤ کا وقت آگیا ہے تو پہلے بتاتے۔ کیا دم پر لگا کر آئے ہو؟"

"جی ہاں۔ اور اگر اب ایک منٹ بھی رکا تو نکل جائے گا۔" ضمیر بھائی نے لفظوں کو چباتے ہوئے چڑ کر کہا۔ مگر وہ خالہ ہی کیا جو بات کا وہی مطلب سمجھیں جو کہنے والے کا ارادہ ہو۔ سو فوراً" منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولیں۔

"ہائے کیا نکل جائے گا؟"

"دم۔" ضمیر بھائی نے چیخ کر کہا اور لحہ بھر مزید رکنے کا رسک لیے بغیر باہر چلے گئے۔ خالہ نے بھی گردن جھٹکی اور پھر سے آئینے کی طرف رخ موڑا۔

"مجال ہے جو ضمیر بھی کبھی چھری تلے دم لے' ویسے علی کچھ پیسے جمع کرلے تو میں بھی اپنی فرنیکس پر کچھ خرچ کروں۔"

☼ ☼ ☼

سرسری ذکر کیا تھا عشق میں مرجائے گا
اب اسے ضد ہے کہ تم مر کے دکھاؤ ہم کو

ابا نے فون پر ہر بات کرتے ہوئے یقیناً" یہ نہیں سوچا تھا کہ انہیں پہلے قدم پر ہی اپنی محبت کی قیمت ادا کرنی پڑ جائے گی تب ہی تو پاؤں پھیلاتے ہوئے چادر کیا چار دیواری تک کا دھیان نہ رہا۔ اور اب روپوں کے ہاتھ سے جانے کا سوچ سوچ کر ذہن و دل میں سوگ طاری تھا۔ سو اب بھی ذہن میں وہی سوچ لیے ادھر سے ادھر ننگے پاؤں چہل قدمی میں مصروف تھے۔ رہا سوال جوتوں کا تو انہیں ابا نے دیوار کے بالکل ساتھ کارپٹ کے اوپر پلاسٹک بچھا کر رکھ چھوڑا تھا۔ اور پھر ان جوتوں کے اوپر ایک رومال بھی ڈال دیا تھا۔ کارپٹ کے اوپر پلاسٹک کا ٹکڑا اس لیے کہ جوتوں کے رکھنے سے کارپٹ گندا نہ ہو اور جوتوں کے اوپر ننھا سا رومال اس لیے کہ ان پر کسی قسم کی گرد نہ پڑے۔

"کش سمجھ نہیں آرہا کروں تے کیا کروں۔ ویسے کڑی لگتی تے چنگی ہے' اور فیر میری تے خیر ہے چلو چندا کو ایک جوان ماں کا پیار مل جائے گا۔" کچھ دیر سوچنے سمجھنے کے بعد آخر کار وہ ایک نتیجے پر پہنچ چکے تھے۔ اور پھر وہ وقت بھی آگیا جب کہ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ گہری سانسیں لے کر اپنا ذہنی توازن بحال رکھتے ہوئے الماری کے عین سامنے جا پہنچے۔

"چل دمی رانی' تیری خاطر تیری ہونے والی ماں کو پورے اک سو اکیاون روپے کا چیک کٹ دیتا ہوں۔" انہوں نے الماری کھولی تو ایک بار پھر آباؤ اجداد کی یاد آگئی۔

"میرے دادے شادے ٹھیک ہی کہتے تھے کہ کش لینے کے لیے کش دینا پڑتا ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے دودھ لینے کے لیے پہلے اسے دیگچی دینی پڑتی ہے بھیک لینے کے لیے پہلے دعا دینی پڑتی ہے پر چلو خیر ہے۔"

ابا کے چہرے پر افسوس کے ایسے تاثرات تھے کہ انہیں رنگین چشمہ پہن کر بھی دیکھا جاتا تو زبردستی بلیک اینڈ وائٹ ہی نظر آتے۔ سو بڑے ہی مدھم طریقے سے انہوں نے الماری کے دونوں پٹ کھولے اور یوں اندر دیکھا جسے محبت سے گلی میں عین اس وقت جھانک رہے ہوں جب کالج کی لڑکیاں صبح تر و تازہ ہو کر گھروں سے نکل رہی ہوں۔ سامنے بنی تجوری کو کھول کر اس کے اندر سے کپڑے میں لپٹی کوئی چیز لا کر بیڈ پر بیٹھے اور چند لمحے اس یوں پیار سے دیکھا جسے سامنے کوئی گھونگھٹ الٹے جانے کا منتظر

ہو۔ اور پھر اتنی جذبات سے اس پر سے کپڑا ہٹایا۔ اندر اخبار زرد صحافت کا رنگ اپنائے زرد پڑ چکی تھی اخبار کی اندر لکڑی کا ایک مربع شکل کا ڈبا تھا جسے موم جامہ میں لپیٹا گیا تھا سو اس کے سمیت جب ابا نے ڈبا کھولا تو وہ ہمارے سرکاری خزانے کی طرح بالکل خالی ابا کا منہ چڑا رہا تھا۔

اور یہ اتنا غیر متوقع تھا کہ ابا کے رہے سہے اوسان بھی خطا تو جو ہوئے سو ہوئے چہرے پر بھی ہوائیاں اُڑنے لگیں۔

"اوے ایہہ کی ہو گیا۔ میں تے لٹ گیا، تباہ ہو گیا، برباد ہو گیا۔"

ابا کا چہرہ ایک دم لگتا تھا جیسے ان کا ہاتھ دروازے میں آ گیا ہو فوراً دہائیاں دیتے کمرے سے نکلنے ہی لگے تھے کہ کچھ یاد آنے پر پھر واپس مڑے اور لکڑی کے ڈبے کو موم جامہ میں اسی لپیٹ میں پھر اخبار میں اور پھر کپڑے میں لپیٹ کر دوبارہ لا کر رکھا اور ایک بار پھر کرلانے کا سلسلہ وہیں سے جوڑا جہاں سے ٹوٹا تھا۔ اور بڑے رہانسے کرب اور درد ملے انداز میں گویا ہوئے۔

او میں تے ایویں ایویں ایویں ایویں لٹ گیا
او میں تے ایویں ایویں ایویں ایویں لٹ گیا

اب ان کی آواز سن کر یہ فیصلہ کرنا نہایت مشکل تھا کہ وہ اس وقت روتے ہوئے گانا گا رہے ہیں یا گانا گاتے ہوئے رو رہے ہیں۔ البتہ جو بھی تھا اس سب سے قطع نظر ان کے ایویں ایویں لٹ جانے کی اطلاع سب کو دینا تھی جو شاید ان کی آواز سے مل گئی ہو۔

☼ ☼ ☼

یہ بھیجا کس نے بھیجا اور کسے بھیجا کدھر بھیجا نہ دل بھیجا نہ سر بھیجا بس اک بھیجا ادھر بھیجا مجھے بھیجا تھا جو بھیجا بہت پڑا لقمہ بھیجا کہ میں نے خود بھی کھایا اور اس کو ہر جگہ بھیجا

خالہ نے آج اپنے لیے خاص طور مگر انفرادی طور پر بھیجا فرائی کیا تھا۔ انفرادی طور پر اس لیے کہ اس پر کوئی مائی کا لعل بری تو کیا للچائی ہوئی نظر بھی ڈالتا تو خالہ کو نظر لگ جانے کا ڈر لگ جاتا۔ یہی وجہ تھی کہ آج وہ چینا کے ساتھ ٹی وی دیکھتے ہوئے رنگ برنگے کمنٹس کرنے کے بجائے چپ چاپ کھانے میں مگن تھیں۔ جب ایک دم ہی علی ان کے پاس آ کر بیٹھا اور آتے ہی خالہ کہہ کر مخاطب بھی کر دیا تو وہ ایک دم چونک گئیں۔

"آئے ہائے کیا ہے علی، کم از کم بتا کر تو بولا کرو۔"

"کیا بتایا کروں؟" یہ عجیب ڈیمانڈ تھی کہ پہلے انہیں اطلاع دی جائے۔

"یہی کہ اب تم بولنے لگے ہو۔"

"یعنی میں پہلے گونگا تھا؟"

"اوہو، جب تک اپنے کمرے میں سو رہے تھے تب تک تو گونگے ہی تھے نا اور کیا ہم سب سوتے ہوئے گونگے بہرے اندھے نہیں ہو جاتے؟" اپنی غلط بات کو درست ثابت کرنے کا فن بہرحال ان کے پاس تھا جس کے سب قائل تھے جب ہی علی نے مزید کوئی بحث کرنے کے چینا کی طرف رخ موڑا تو وہ باقی بعد میں کھانے کا سوچ کر برتن کچن میں رکھنے چلی گئیں۔

"آپی۔ خوش ہو جائیں، پیسوں کی ریل پیل ہونے والی ہے اب۔"

"کیوں تم نے کیا M.N.A کا الیکشن جیت لیا ہے؟" ٹی وی پر بدستور نظریں جمائے چینا نے اس کی اطلاع کو نظر انداز کیا۔

"ارے میری بھولی بھالی اور پیاری سی آپی، کسی بھی قسم کا فراڈ کرنے کے لیے سیاستدان ہونا ضروری نہیں ہوتا۔"

"خبردار، فراڈ کا ایک پیسہ بھی اس گھر میں نہ آئے۔" خالہ نے کچن سے آتے ہی کہا۔

"ڈونٹ وری خالہ، گھر میں بالکل نہیں آئے گا اس کام کے لیے بینک ہیں نا۔" علی مسکرایا۔

"علی پوری بات بتاؤ نا، چینا کو بہت سخت بے چینی ہو رہی ہے۔"

"ارے آپی کیا بتاؤں۔ سچ اس اشتہار نے تو کارنامہ کر دکھایا ہے۔" علی کا جوش دیدنی تھا۔

"ہائیں۔ اشتہار نے کون سا ڈرامہ کر دکھایا اب؟"

خالہ نے دماغ پر زور ڈالا۔ اور زبان منہ کے اندر گھما کر دانتوں میں رہ جانے والا "بھیجا" حلق کے ذریعے معدے میں بھیجا تو علی جو پہلے ہی انہیں اکیلا کھاتا دیکھ کر محض سسک کر رہ گیا تھا اب تو تڑپ ہی گیا۔

"کیوں؟ ڈرامہ بھی کھاتا ہے؟"

"ارے واہ میں کیوں اوپاما کھاؤں گی؟ آدم خور سمجھ رکھا ہے کیا؟" وہ کلبلا گئیں۔

"اوہو میں نے یہ کب کہا۔" علی کو اپنی بات ادھوری رہ جانے پر جو غصہ تھا ان کی ناقص سماعت سے اب سر پٹخ کر بولنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"یعنی میں جھوٹ بول رہی ہوں۔" اس وقت خالہ پر ان خواتین کا عکس نظر آ رہا تھا جن کی زبان ان کے پاؤں سے کہیں زیادہ لمبی ہوتی ہے۔ اور کیسا اذیت ناک وقت ہوتا ہے وہ جب ہمیں ان لوگوں کو قائل کرنا پڑے جن کی ذہنی سطح ہماری سینڈل کی ہیل سے بھی کم ہوتی ہے۔

"اوہو خالہ تم کیا ہو گیا ہے ایک دم" چینا نے تو ایسا کچھ بھی نہیں سنا۔"

"واہ واہ واہ۔ ارے تم پوچھو نا اس سے جو کہہ رہا ہے کہ میں اوپاما کو کھا جاؤں گی۔"

"علی۔" چینا نے علی کو ایسی ہی تنبیہ کی تھی جیسے امریکہ کشمیر کے معاملے پر بھارت کو کیا کرتا ہے۔ یعنی سرسری سی، دکھاوے لائق۔

"یقین کریں آپی، میں نے ایسا کچھ کہا ہی نہیں ہے خالہ کو تو بس ویسے ہی۔"

"دیکھا۔ دیکھا تم نے اب یہ مجھے جھوٹی کہنا چاہ رہا ہے۔" خالہ نے الہام ظاہر کیا۔ تو چینا کے ہونٹوں پر بھی دبی دبی مسکراہٹ ابھر آئی۔

"ہاں کچھ کہہ رہا تو ہے؟"

"لیکن آپی۔"

"تم چپ رہو علی۔ جو منہ میں آتا ہے بس بولے چلے جاتے ہو۔" اشارے سے اسے خاموش رہنے کا کہہ کر وہ خالہ کے اس قدر نزدیک ہوئی کہ اسے ان کے کھائے گئے بھیجے تک کی باس محسوس ہونے لگی۔

"فکر نہ کرو خالہ، چینا کو یقین ہے کہ تم اسے نہیں کھاؤں گی۔" چینا نے ان کا کندھا تھپتھپایا تو وہ فوراً سے اپنے فرضی آنسو صاف کرنے لگیں۔

"تو اور کیا چینا، میں تو زیادہ پاور کی دوائی نہیں کھاتی۔ وہ تو پھر سپر پاور ہے۔"

"ہاں ہاں خالہ سب جانتی ہوں، اور ویسے بھی علی! ڈاکٹر نے خالہ کو صرف وائٹ میٹ کھانے کا کہا ہے، اس لیے اوپاما کی فکر کرنا بنتا بھی نہیں ہے، تم بتاؤ کیا کہہ رہے تھے۔"

"سلام کہہ رہا تھا آپ کو اور آپ کی ان خالہ کو۔" غصے میں پیر پٹختا وہ اسی وقت اٹھ کر وہاں سے چلا گیا تھا۔

"اسٹوپڈ علی۔ کاش چینا تمہیں بدتمیز کہہ سکتی۔"

شدت جذبات سے چینا نے خالہ کے اسی کندھے پر دھموکا جڑ دیا تھا جسے ابھی چند لمحے پہلے سہلا رہی تھیں اور تب ہی خالہ نے اسے یوں پلٹ کر دیکھا جیسے ان کے جوتے پر چلتے چلتے چینا کا پاؤں آ گیا ہو۔

"خالہ یہ تھپڑ میں نے آپ کو نہیں اس بدتمیز علی کو مارا ہے۔"

"اچھا اچھا پھر ٹھیک ہے، اگر مجھے مارا ہوتا نا تو ابھی ایک کے دو مار کر یدلا لے لیتی۔" خالہ نے سکون سے گردن ہلائی اور صوفے پر بیٹھ کر ٹی وی آن کر لیا لیکن کندھے کے اوپر ہوتی چھن چھن نے ان کے دل میں یہ احساس پختہ کر دیا تھا کہ ایک ساتھ رہنے والوں کے دکھ درد سانجھے ہوتے ہیں اور اس کی زندہ اور تازہ مثال یہ تھی کہ چینا نے غصے میں آ کر تھپڑ علی کو مارا تھا اور درد وہ محسوس کر رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے
کل تم کو بتا دیں گے رقم کتنی بنی ہے

"او چتری کہاں ہے؟"

ابا دل ہی دل میں بے ہوش ہوتے چندا کے کمرے میں دروازہ کھول کر یوں داخل ہوئے جیسے پیراشوٹ کے ذریعے بیلی کاپٹر سے چھلانگ لگائی ہو۔

"ابا خیر تو ہے؟ ہوا کیا؟"

"اوہو چندری! ایہہ پوچھ کہ کیا نہیں ہوا؟" بیڈ کے کنارے تک گر کر انہوں نے سانس بحال کی "چلیں بتادیں یہی کہ کیا نہیں ہوا؟"

"جھلیے کدی کوئی بات سیدھی طرح بھی کرلیا کر۔"

"ابا بتادیں جلدی سے ورنہ میں بے ہوش ہوجاؤں گی گھبراہٹ سے۔"

"او نہ نہ نہ۔ اک ہور خرچہ نہ کراویں ڈاکٹر کا۔ پہلے ہی میری چیک بک گم ہوگئی ہے۔"

"کیا۔ کیا کہا ابا؟ ہوگئی ہے گم چیک بک؟" اس مرتبہ وہ بھی حیران ہوئی۔

"اسی لیے تے میں حیران پریشان تیرے پاس آیا ہوں۔ میں نے خود لسباری میں رکھی تھی پر اب نئیں ہے۔"

"لیکن آپ نے چیک بک کو کرنا کیا تھا؟"

"مہوا لگانی تھی اور کش" وہ بے زار تھے اور چندا کو اٹکھیلیاں سوجھ رہی تھیں جب ہی چڑ کر بولے۔

"ہاں ابا۔ لگوانی بھی چاہیے تھی ہوا۔ کیونکہ اب تک تو بے چارے چیک گلے ہوں گے چیک بھی۔"

"او چیک چکے ہوں گے ناپاغل' بنک میں رکھے نوٹ تے نئیں ناچکے ہوں گے۔"

"چکے نہ بھی ہوں تو ان کے اوپر سے مٹ گئے ہوں گے بندے۔"

وہ ابا کو ان کی لامحدود کنجوسی پر طنز کا نشانہ بنانے سے کبھی نہ چوکتی۔ مگر اس وقت ابا خود مقامات آہ و فغاں کے نکڑ پر پہنچ چکے تھے اس لیے صلح آمیز لہجے میں بولے۔

"خدا کا واسطہ ای چندری' باتیں نہ کرتے چیک بک ڈھونڈ دے۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ میں کرتی ہوں کوشش۔" ابا بھی اس کے ساتھ مل کر چندا کے کمرے کی ہر ممکنہ جگہ پر ڈھونڈتے ہیں کہ اسی دوران چندا کے دماغ میں ایک نیا نکتہ آتا ہے۔

"ویسے ابا ہے آپ کو یقین کہ چیک بک گم ہوئی ہے؟"

"اوئے آہو چندری گم ہی ہوئی ہے اب ٹن تو ہونے سے رہی۔"

"میرا مطلب تھا ہو نہ گئی ہو چوری" اس کے تہ ہوئے کپڑوں کو ستیاناس کرتے ابا کے ہاتھ ایک دم رکے تھے۔

"یہ تے میں نے سوچیا وی نئیں تھا۔"

"تو سوچ لیں اب۔ اور چھوڑ دیں میری الماری کی جان" چندا نے ان کو بازو سے پکڑ کر بیڈ پر بٹھایا۔

"مجھے ایسا کیوں لگتا ہے جیسے آپ ہو رہے ہوں بوڑھے؟"

"شاواشے۔ کبھی سٹھ سال کا بندہ وی بڈھا ہوتا ہے؟"

"یہ سوچ تو کسی بوڑھے کی ہو سکتی ہے۔" چندا نے پر سوچ انداز میں کہا۔

"لے تے خیر میری ایہو ای سوچ ہے۔ تے ویسے وی میرا خیال ہے کہ ابھی تے میں سٹھ سال کا ہو گیا ہوں' پر آئندہ کدی سٹھ سال کا نئیں ہونا۔"

"لیکن کیوں؟"

"بس ایویں ہی ہر کوئی بابا جی' انکل جی کہہ دیتا ہے۔" ابا نے پاؤں ہلاتے ہوئے کہا تو چندا کی نظر بھی ان کے بغیر جوتوں کے پاؤں پر پڑی۔

"آپ ایسا کریں' فریم کروالیں جوتوں کو بھی۔"

"عاشقے نے گھر میں قالین اس لیے نئیں ڈلوا کے دیے کہ ان پر جوتے پہن پہن کر چلو اور گندا کرو' ضائع کردو۔"

"جوتے پہن کر چلنے سے نہیں ہوتے قالین ضائع۔"

"پر جوتے تے ضائع ہو جاتے ہیں نا۔ جب اتنا نرم قالین پڑا ہوا ہے تے ضروری ہے کہ جوتیاں پہن کر انہیں بھی گھسا دوں۔"

"ابا یقین کریں' آپ کو تو انسان کہنے کا نہیں چاہتا دل۔" چندا کی حالت اس بچے جیسی تھی جو ایک پسندیدہ ٹافی کو بھی اس لیے چوستا رہتا ہے کہ اس کے

پاس اس کے علاوہ کوئی آپشن نہیں ہوتا۔

"کیوں؟ دماغ تے نئیں کھسک گیا تیرا۔" ابا کو فوراً اپنی عزت خطرے میں محسوس ہوئی تھی۔ اور ان کا یہ رد عمل دیکھ کر چندا اگڑ بڑا ہی تو گئی۔

"اس لیے کہ آپ تو ہیں ہی نہیں انسان۔" ابا کی آنکھیں غصے میں مزید کھل گئیں تو اس نے فوراً وضاحت کی۔

"بلکہ آپ تو ہیں عظیم ترین انسان۔" اور یہی وہ لمحہ تھا جب ابا کو اپنے آپ پر اور چندا پر بے تحاشا فخر محسوس ہوا۔ ویسے بھی چندا۔ اسی لیے ان کے ساتھ زیادہ سچ نہیں بولتی تھی کہ ان کے ساتھ سچ بولنے کا مطلب ان کو برا بھلا کہنا ہوتا۔

"تیری ان کچی کھری تے خوب صورت باتوں نے کش دیر کے لیے ای سہی پر چیک بک کا غم کھڈے لائن لگا دیا ہے۔ صدقے جاؤں جیوندی رہو چندری۔" ان کا مزاج بحال ہونے پر چندا بھی مسکرائی تھی بالکل اسی طرح جیسے ہماری نیوز کاسٹرز بم دھماکوں کی خبر کے فوراً بعد اگلی خبر شروع کرتے ہی مسکرا دیتی ہیں اور ایسا ہلکا سا مسکراتی ہیں کہ بندہ تذبذب کا شکار ہو جائے کہ آخر اس کے پس پردہ کیا اور وجہ جو بھی ہو بھلی معلوم ہوتی ہیں کیونکہ ہماری قوم کو ہر چمکنے والی چیز سونا اور ہر مسکرانے والی لڑکی سوہنی لگتی ہے۔

☼ ☼ ☼

چینا' خالہ اور علی لان میں بیٹھے ضمیر کا انتظار کررہے تھے کہ کب وہ اپنے کلینک نما حجرے سے باہر نکلے۔ مگر لگتا تھا کہ آج خدا نے ان کی سن لی تھی' جب ہی تو وہ اتنے مصروف تھے اور اب تک کلینک میں ہی موجود تھے' ورنہ تو اس وقت تک وہ ان کے بیچوں بیچ ٹھنڈے ٹھار موسم میں نیر بنے بیٹھے ہوتے۔

"آج ہم کتنے دنوں بعد لان میں آکر اتنے سکون سے بیٹھے ہوئے ہیں نا' لگ رہا ہے جیسے حکومت کا کوئی اعلا سطحی اجلاس ہو رہا ہے۔"

موبائل فون پر جھکے علی نے جب چینا اور خالہ کو مستقل گھورتے ہوئے پایا تو چونک گیا اور سوچا کہ کوئی بات کی جائے۔ ورنہ اس کا ارادہ آج ان سب لوگوں کو اپنی فیس بک پروفائل سے ان فرینڈ کرنے کا تھا جو صرف ایڈ ہونے کے بعد جانے کہاں لحاف اوڑھے سو جاتے ہیں' نہ کمنٹ نہ لائک۔ بس اسی لیے آج وہ چھانٹی کرنے کے موڈ میں تو تھا' لیکن ان دونوں کی باریک بین نظروں کے باعث یوں ہی سی بات کر ڈالی اور خالہ تو جیسے چند فارغ تجزیہ نگاروں کی طرح اسی انتظار میں تھیں کہ کہیں کوئی بات سنیں اور اس پر اپنا تجزیہ دیں۔

"تو اور کیا ان سطحی اجلاسوں نے تو 67 سالوں میں ملک کو یہاں تک لا پہنچایا ہے۔"

"ہائیں۔۔۔ کیا ہمارا ملک بھی کہیں پہنچ گیا ہے۔" چینا چونکی۔

"آپ بے فکر رہیں آپی۔ ہمارے ملک کو چلانے والے ہی اتنے پہنچے ہوئے ملتے ہیں کہ ملک کو کہیں پہنچنے ہی نہیں دیتے۔"

"اچھا چھوڑو۔۔۔ آج تو بتادو وہ تمہارا پیسے جمع کرنے والا آئیڈیا کہاں تک پہنچا؟" چینا کو یاد آیا تو علی ذرا اتراتے ہوئے پہلے تو ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر بیٹھا' پھر پہلے خالہ اور اس کے بعد اوپر چندا والے پورشن کی بالکونی کو دیکھ کر بولا۔

"کیا بتاؤں۔۔۔ بس اتنا سمجھ لیں کہ اب ہم لوگوں سے پیسوں کے ساتھ ساتھ انتقام بھی لے سکیں گے۔"

"واہ علی۔۔۔ چینا کو نہیں پتا تھا کہ تم میں سیاست دانوں والی سوچ ہے۔" اتنی سی بات تھی اور شاید ابھی خالہ یا علی میں سے کوئی جواب بھی عرض کرتا' کیونکہ "تکرار ہاؤس" میں کسی بھی بات کا فوراً جواب نہ آنا اس بات کی نشانی تھا کہ گھر والے سو رہے ہیں۔ دوسری کسی بھی صورت میں ایسا ممکن نہ تھا۔ لیکن ابا کی بالکونی میں سے برآمد ہوتی آواز انہیں چونکا گئی۔

"اوئے اٹ سے اٹ بجادوں گا۔۔۔ دیکھتا ذرا۔"

"گانا میں گاؤں گا اور بجائے گا آپ۔۔۔ لیکن بینڈ کا نام کیا رکھیں گے؟" علی نے ان کی دھمکی ہوا میں

اداکاری جس پر وہ مزید چراغ پا سے نظر آنے لگے۔
"فکر نہ کر کاکے۔ تجھے تو لگ پتا جائے گا۔" ابا کا رنگ غصے میں اس اداکارہ جیسا ہو گیا تھا جو زبان سے زیادہ اپنی آنکھوں سے باتیں کرنے میں نام رکھتی ہیں۔ لیکن ان کی قسمت کہ کوئی بھی ان کی دھمکی کو سیریز لینے پر تیار نہ تھا۔ ان سب کا خیال تھا کہ دنیا میں رزق کی طرح ہر بندے کے حصے کے بے وقوف مقدر ہیں اور شاید ابا جی اسے کوٹے کو پورا کرنے کے لیے تکرار ہاؤس میں تشریف لائے ہیں اور وہ تمام لوگ جنہیں اب تک اپنے حصے کے بے وقوفوں سے ملنے کا اتفاق نہ ہوا ہو۔ ہرگز دل چھوٹا نہ کریں کیونکہ اس کا سادہ سا مطلب ہے کہ وہی اپنے اردگرد والوں کا حصہ ہیں۔

"اچھا۔ تفصیل نہ سہی، چینا کو پر دمو ہی دکھا دیں کہ ہوا کیا ہے۔"

"اوئے۔ میری چیک بک چوری کر کے تم لوگ سمجھتے ہو کہ بڑا عیش کر لو گے؟ پر میں نیش کر کے دوں گا۔ نہ عیش تے نہ کیش۔"

"ارے واہ۔ ہم کیسے کیش کر لیں گے، بنک میں سائن کرنا پڑتے ہیں۔" خالہ نے انہیں غلط ثابت کرنا چاہا، لیکن ناکام رہیں۔

"اوئے ہوئے ہوئے۔ اس کا مطلب ہے کہ تم لوگ بنک سے ہو کر آ بھی گئے ہو؟" ابا کو لگے جیسے ان کا بی پی ملک میں بارروزگار افراد کے گراف کی طرح آہستہ آہستہ نیچے آنے لگا ہے۔

"ارے نہیں۔ ہم تو صبح سے گھر سے نکلے ہی نہیں، یہ خالہ تو بس۔" علی نے خالہ کو گھورا، مگر ابا اس وقت کسی کی بھی بات سننے کے موڈ میں نہیں تھے۔ اس لیے فوراً اس کی بات کاٹ دی۔

"دیکھ لوں گا سب کو ایک ایک کر کے۔"

"ایک ایک کر کے۔" خالہ کو اس پر بھی اعتراض تھا۔

"ہم کوئی ریمپ پر ماڈلنگ کر رہے ہیں کیا جو ایک ایک کر کے دیکھو گے۔" چینا کی وہ تمام کوششیں بے کار جا رہی تھیں جو وہ خالہ کی زبان بندی کے لیے اشاروں میں کر رہی تھی۔

"خالہ کتنی دیر سے چینا تمہیں اشارے کر رہی تھی، مگر تم۔" ابا کے منظر سے غائب ہو جانے کے بعد چینا بے حد غصے میں بولی۔

"مجھے کیا پتا تھا کہ تم مجھے اشاروں سے کچھ سمجھا رہی ہو۔ میں تو سمجھی، مجھے غصے میں دیکھ کر ہنسانے کی کوششیں کر رہی ہو اور تم خود بتاؤ میں پھر بھی نہیں ہنسی کہ کہیں وہ کچھ اور ہی نہ سمجھ لیں؟"

"واہ خالہ۔ ایک تو اتنا بڑا الزام وہ ہم پہ لگائے گئے ہیں۔ اگر آپ آپی کا اشارہ سمجھ جاتیں تو کچھ ڈھنگ سے بات ہو سکتی تھی۔"

"اشارے تو سمجھو تم یا یہ تمہاری بہن چینا۔ مجھے ان آنکھوں کے اشاروں کی کیا سمجھ، کبھی کیے ہوں تب نا۔" چینا نے بڑے افسوس سے علی کو دیکھتے ہوئے سر ہلایا۔

"کالج بھی عین پولیس اسٹیشن کے سامنے ہوا کرتا تھا۔ وہاں بھی کسی کو جرات نہیں ہوتی تھی کہ مجھ جیسی سیدھی سادی لڑکی کو گیٹ پر آ کر کچھ اشارے بازی کی پریکٹس کروا جاتا۔ یہ ہماری پولیس ہی ذمہ دار ہے، بلکہ میں تو کہتی ہوں مجھے اشارہ بازی سمجھ نہ آنے کی ساری ذمہ داری حکومت پر عائد ہوتی ہے۔"

"ہونہہ۔ کہیں کی مٹی کہیں کا روڑا، بھان متی نے کنبہ جوڑا۔" چینا نے ناگواری سے کہا اور اٹھ کر ضمیر کے کلینک کی طرف کا رخ کیا، تاکہ اسے اس تازہ ترین خبر سے آگاہ کرے۔ علی البتہ وہیں بیر پسارے ایک مرتبہ پھر لاگ ان ہو چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

ڈاکٹر اور ڈاکوؤں کی گولیوں کے فرق کی
ایک لمبی داستان ہے، کیا بتاؤں کیا ہوا

ڈاکوؤں کی گولیاں کھا کر تو بچ نکلا تھا وہ
ڈاکٹر کی گولیاں کھا کر بے چارہ چل بسا

"اچھا بھئی۔ یہ بتاؤ کس چیز کی دوا لینی ہے؟" ضمیر بھائی نے مریض کی ظاہری اوقات جانچنے کے بعد سوال کیا۔

"پتا نہیں جی۔ مجھے تو خود کچھ اپنی سمجھ نہیں آ رہی کہ کس چیز کی دوا لوں؟" وہ بے بسی سے بولا۔

"ہوں۔ سگریٹ پیتے ہو؟"

"جی ہاں ایسا کریں گولڈ لیف منگوا لیں؟" مریض شاید کچھ زیادہ ہی بے تکلف ہونا چاہتا تھا۔ مگر اس کا یہ انداز ضمیر بھائی کو بالکل نہیں بھایا تھا کہ وہ ان کے کلینک کو ہوٹل سمجھنے پر تلا ہوا تھا۔

"کیا محسوس کرتے ہو؟ میرا مطلب ہے ایسا کیا احساس تھا جو تم نے دوا لینے کا سوچا۔"

"جناب کیا بتاؤں، بیوی کے سامنے کچھ بولا ہی نہیں جاتا، لگتا ہے جیسے گلے میں لقمہ پھنس گیا ہو اور یہ ہی نہیں، بلکہ وہ غصے میں ہو تو یہ کم بخت گردن جھٹ سے نیچے گر کر اس کے سامنے جھکی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ بڑا عاجز آ گیا ہوں میں تو اس مسئلے سے کوئی حل ہو تو خدارا بتائیں۔"

"کب سے ہو رہا ہے ایسا؟" ضمیر نے پر سوچ انداز میں پوچھا۔

"شادی کے فوراً بعد سے۔"

"اور دن میں کن اوقات میں یہ علامات زیادہ ظاہر ہوتی ہیں؟"

"بستر سے اٹھتے ہی اور بستر پر دوبارہ جانے تک۔"
ضمیر بھائی کچھ دیر بیٹھ کر اس بندے کا نفسیاتی معائنہ کیا اور سامنے والے کے چہرے پر تیرتی مسکینی کو جانا پہچانا محسوس کرتے ہوئے نتیجے پر پہنچ گئے۔

"دراصل تم کسی بھی بیماری کا شکار نہیں ہوئے، بلکہ اس بیوی نما بیماری نے تمہارا شکار کر لیا ہے۔"

"بیوی نما بیماری؟" اس کا حیران ہونا بنتا تھا۔

"تو اور کیا۔ یار تم جیسے شوہروں نے ہی تو ساری شوہر برادری کو ڈبو دیا ہے۔ بلکہ تم جیسے مرد تو قسم سے شوہر کے نام پر دھبہ ہیں دھبہ۔" ضمیر نے اسٹیتھو اسکوپ اپنے کانوں سے لگا کر پھر ارادہ ملتوی کر دیا اور بولے۔

"منہ کھولو۔"
لیکن مریض یقینی طور پر اس کی باتوں کو دل پر لے چکا تھا۔ اس لیے ناراض بچوں کی طرح بیٹھا رہا۔

"او یار منہ کھولو، میں تمہاری بیوی نہیں ہوں کہ ڈر رہے ہو۔" اتنا کہنا تھا کہ مریض نے ایک جھٹکے سے اپنا منہ آخری حد تک کھول دیا۔

"بس بس، میں نے منہ کے اندر تھوڑی جانا ہے۔ باہر ہی بیٹھ کر چیک کروں گا۔" اور اس سے پہلے کہ وہ اس کی زبان کے ہونے نہ ہونے کی یقین دہانی کرتے، چینا باہر سے ہی اسے آوازیں دیتی اندر آ گئی۔

"ضمیر۔ کتنی دیر سے چینا بلا رہی ہے، لیکن لگتا ہے یا تو گلا خراب ہو گیا ہے یا لقمہ پھنس گیا ہے۔" حرف بہ حرف مریض جیسی علامات چینا نے خود اس کے لیے بھی گنوائیں تو وہ شرمندگی سے لال ہو گئے۔ یوں بھی چینا آپی جب بھی کلینک آتیں، نارمل گفتگو بھی ایسے کرتیں گویا ڈانٹ رہی ہوں۔

"اب منہ میں پان دبائے بیٹھے ہو کیا، چینا کی کسی بات کا جواب تو دو۔" اور اس سے پہلے کہ ضمیر بھائی چینا کی کسی بھی بات کا جواب اپنی ذمہ داری پر دیتے لگتے۔ چینا کی نظر سامنے بیٹھے مریض پر پڑی جو بڑے ذوق و شوق سے چینا کو آنکھیں پھاڑے دیکھ رہا تھا۔

"مر گئے ہو کیا جو آنکھیں بند نہیں ہو رہیں۔"

"میڈم! دیکھنے کے اوقات جو آپ نے باہر لکھ رکھے ہیں۔ اس میں تو جی بھر کر دیکھ لینے دیں نا، صبح نو سے بارہ اور شام پانچ سے دس؟" اس بندے نے یقیناً "کلینک کو ڈیوٹی فری سمجھ لیا تھا اور یہ ہی سمجھ رہا تھا کہ چینا فری ڈیوٹی دے رہی ہے۔

"ضمیر۔ لوگ تمہاری عزت پر حملہ کر رہے ہیں اور تم چپ چاپ وزیر دفاع بنے بیٹھے ہو۔" جواب میں ضمیر بھائی تو کچھ نہیں بولے، البتہ مریض کرسی چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔

"ایسے لوگوں کو وزیر دفاع نہیں وزیر دفعہ کہتے ہیں۔ شوہروں کے نام پر دھبہ۔ ہونہہ۔" اور تب

ضمیر بھائی کو محسوس ہوا کہ جاتے۔" جھجکی گردن اور نیس بک پر ضائع کیے گئے وقت کا خیال ہمیشہ بعد میں ہی آتا ہے۔ سو مریض کو جاتا دیکھ کر اس سے فیس بھی طلب نہ کر سکے کہ چینا سامنے ہی موجود تھی اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ مریض کے سامنے ان کی چینا سے مزید عزت افزائی ہو۔

"ضمیر۔ الو بھی اپنی بیوی کے سامنے ہمیشہ سر اٹھا کر بات کرتا ہے۔ اور تم۔" چینا کو ضمیر کے میمنے روپ نے بڑا ہرٹ کیا تھا۔ "سمجھا کرو نا چینا! اس لیے تو سب اسے الو کہتے ہیں۔" ضمیر بھائی نے سلو موشن میں گردن اوپر کی۔

"تمہاری ان ہی حرکتوں کی وجہ سے آج چینا کو یہ دن دیکھنا پڑا۔ کاش چینا تمہیں تھرڈ کلاس کہہ سکتی؟" چینا نے بڑے روہانسے انداز میں کہا اور یوں پاؤں پٹختی ہوئی گئی جیسے تیئس مارچ کی پریڈ ہو رہی ہو۔

☼ ☼ ☼

ایک ٹینشن ختم تو اور ہزار۔

پہلے تو ٹینشن تھی کہ اس ٹیلی فون والی حسینہ کو رقم بھیجنا تھی اور وہ بھی پورے ایک سو اکیاون روپے اور اب غم یہ تھا کہ وہ نمبر ہی پیوستہ نہ رہا تھا جس سے بہار کی امید کی جا سکتی کہ نہ رہی تھی چیک بک اور نہ بچے تھے پیسے۔ سوا بانے سوچا کہ ایسا نہ ہو ہاتھ آیا رشتہ نکل جائے اس لیے اسے جتا دینا چاہیے کہ کچھ مسئلے مسائل ختم ہوتے ہی وہ اسے رقم بھیج دیں گے۔

سوا بانے اسی سوچ کو عملی جامہ پہناتے ہوئے انہوں نے اپنے تکیے کے غلاف سے سنبھال کر رکھی گئی اخبار اور شاپر میں لپٹ کر محفوظ کیا گیا موبائل نکالا اور نمبر ڈائل کرنے کے ساتھ ساتھ بڑی پریشانی سے کمرے میں یہاں وہاں ٹہلنے لگے۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے اسپتال میں ڈلیوری روم کے باہر ٹہل رہے ہوں۔

لیکن ایک' دو' تین' ٹیلی فون کی لمبی لمبی بیلز انہیں آشنا ہٹ کا شکار کر رہی تھیں۔

"ذکری یہ دی کوئی فضول خرچ ہی لگتی ہے او بھلا بندہ ٹیلی فون کی بیل ہی چھوٹی کروا لیتا ہے۔ تو وا تو وا اتنی لمبی بیل ہے کہ سی این جی کی لین کی طرح ختم ہی نہیں ہو رہی۔"

ایک تو انہیں چندا کے بھی آجانے کا خطرہ تھا۔ اوپر سے فون ریسیو نہیں ہو رہا تھا۔ سو ان کا دل چاہا کہ بس غصے میں اور کچھ نہیں تو دیوار میں سر دے ماریں۔ اپنا نہیں اس لڑکی کا جسے وہ اب تک جانے کیا سمجھ بیٹھے تھے اور وہ تو فیصلہ کر چکے تھے کہ وہ اسے گھر کا سربراہ تک بنا دیں گے اور اس کی حیثیت اور اختیارات میں صدر پاکستان کے برابر ہونے کا بھی خاص خیال رکھیں گے۔ کیونکہ یہ حقیقت بھی ان سے چھپی ہوئی نہیں تھی کہ ہر وہ شوہر گھر کا طاقت ور ترین سربراہ کہلاتا ہے جو گھر کے تمام اہم فیصلے اپنی بیوی کو کرنے دے۔ بچوں کے ہونے نہ ہونے سے لے کر اپنے بچوں کی شادیوں تک۔

☼ ☼ ☼
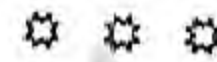
پھول ہی پھول کھلاتا ہے سر شاخ وجود
اور خوشبو کو تسلسل نہیں ہونے دیتا

عالم ذات میں درویش بنا دیتا ہے
عشق انسان کو پاگل نہیں ہونے دیتا

جب سے اتنا خوب صورت شعر علی کی نظروں سے گزرا تھا۔ اس نے سب گھر والوں کو با آواز بلند کہہ دیا تھا کہ ہر انسان کو زندگی میں ایک مرتبہ عشق ضرور کرنا چاہیے' کیونکہ یہ عشق ہی ہے جو آدمی کو انسان بناتا ہے اور پھر اسی انسان کو پاگل پن سے بھی بچائے رکھتا ہے اور یہ تو ایک حقیقت ہے کہ دنیا میں پچاس فیصد لوگ کسی نہ کسی کے عشق میں ضرور مبتلا ہوتے ہیں۔ باقی پچاس فیصد اس کے سائیڈ ایفیکٹ بھگت رہے ہوتے ہیں اور اس وقت بھی "دیکر ار ہاؤس" کے مکین سائیڈ ایفیکٹ ہی بھگت رہے تھے' لیکن عشق کے نہیں' بلکہ کرایہ داروں کے نوجوان کے سر پر موٹر سائیکل پر بیٹھے چوتھے شخص کی طرح سوار ہو گئے تھے

اور جب سے انہوں نے چوری کا الزام لگایا تھا انہیں تو لینے کے دینے پڑ گئے تھے۔ اسی پریشانی کے عالم میں وہ سب بیٹھے کچھ سوچ بچار کر رہے تھے کہ چینا کے سامنے رکھے علی کے موبائل پر بیل ہونے لگی۔ ضمیر بھائی نے ایک نظر فون کو دیکھا اور پھر چینا سے مخاطب ہوئے۔

"علی ابھی آتا ہوگا' تم اسے اٹھالو۔"

"چینا' علی کو اٹھالے؟ ضمیر کاش چینا تمہیں عقل سے فارغ کہہ سکتی۔ یعنی حد ہو گئی۔" چینا نے بڑے اہتمام اور دھوم دھام سے برا منایا۔

"علی کو اٹھانے کا کس پاگل نے کہا ہے' میں تو اس کا فون اٹھانے کا کہہ رہا ہوں۔" وضاحتی بیان آیا۔

"علی کو اٹھانے کا چینا نے کہا ہے' دیکھ لو چینا ضمیر تمہیں پاگل کہہ رہا ہے۔ ہاں بھئی میاں' بیوی کو ایک دوسرے سے بہتر بھلا کون جان سکتا ہے۔" خالہ نے چینا کو اطلاع دی تھی کہ شاید اسے پتا نہ چلا ہو اور واقعی اسے پتا ہی نہیں چلا کب اس کی بے عزتی ہوئی۔ ویسے بھی شادی شدہ خواتین و حضرات کو چھوٹی موٹی باتوں پر اتنی بے عزتی محسوس نہیں ہوتی' جتنی غیر شادی شدہ لوگوں کو ہوتی ہے۔ اس کی بڑی وجہ شاید یہ بھی ہے کہ کثرت سے مہیا ہونے والی ہر چیز اپنی اہمیت کھو دیتی ہے۔

"ضمیر فون علی کا ہے تو آخر چینا کیوں اٹھائے؟"

"فون علی کا ہے' مگر وہ بھائی کس کا ہے؟"

"چینا کا۔"

"تو پھر فون کس کا ہوا؟"

"علی کا!"

"او میرے خدا' یار اگر علی تمہارا بھائی ہے تو پھر فون بھی تمہارا ہی ہوا نا۔" ضمیر بھائی کی مثال اس کہانی کو جیسی تھی جس نے پوری رات کہانی سننے کے بعد پوچھا تھا کہ ہیر آدمی تھا یا عورت۔

"اچھا چلو۔ اگر تم اس میں خوش ہو تو چینا مان لیتی ہے کہ فون بھی چینا کا ہے اب۔"

"تو پھر کیا تمہیں آواز نہیں آ رہی اس کی بیل کی؟"

عین اسی وقت فون کرنے والے نے ہمت ہار کر فون بند کر دیا۔

"نہیں۔ لگتا ہے تمہارے کان بج رہے ہیں ضمیر۔" اور یہ ہی نہیں ہمیشہ ضمیر بھائی کی قسمت ایسے ہی موقعوں پر ان کا ساتھ چھوڑ دیتی تھی۔ جب انہیں اس کے ساتھ کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی اور تب انہوں نے بڑی شدت سے دعا کی تھی کہ کم از کم ایک بار رونگ نمبر ہی سہی' لیکن کسی کی کال آئے' نہ آنا تھا' نہ آیا۔ البتہ فون کی جگہ علی ضرور آگیا تھا اور اب حیرت سے سامنے رکھے فون کو اٹھا کر بولا۔

یہ فون یہاں کیا کر رہا ہے؟

"تمہارا ہے نا؟" ضمیر بھائی نے تصدیق چاہی۔

"نہیں۔ یہ تو عاشق انکل کا ہے۔" علی کے انداز میں لاپروائی سرکاری عہدیداران کو مات دے رہی تھی۔ "ہر وقت کہتے رہتے تھے کہ تم لوگ میرا فون نہیں اٹھاتے' میں گیا اور ان کا فون اٹھا لایا۔"

"دیکھا ضمیر۔ چینا کا بھائی کتنا عقل مند ہے۔" فخریہ انداز میں چینا نے کریڈٹ لینا چاہا۔

"ہاں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ سو فیصد تم پر ہی گیا ہے۔" ضمیر بھائی نے لفظ چباتے ہوئے طنز کیا۔

"یہ سب چھوڑو۔ لیکن دیکھو انہیں طعنے کا جواب ہم نے دینا تھا اور وہ پھر سے طعنہ بھی مار گئے۔ ساتھ الزام بھی لگا گئے۔" اس سے پہلے کہ علی انہیں حوصلہ تسلی دیتا' ایک بار پھر فون کی بیل بجنے لگی تھی' مگر اس دفعہ فون علی کا تھا' سو وہ ایک نظر ان تینوں کو دیکھتے ہوئے اوپر کی پورشن کی طرف متوجہ ہوا اور فون لے کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ضمیر بھائی' چینا اور خالہ سب ہی سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھتے وہیں کھڑے تھے۔

☼ ☼ ☼

ہم دوا دارو نہیں دیتے' دغا دیتے ہیں بس
اچھوں اچھوں کو یقین آتا ہے پھنس جانے کے بعد

’’او جی سناؤ۔۔۔ کی حال ہے سوہنیو۔‘‘ ابا شیرہ ٹپکاتے لہجے میں علی کے کانوں میں سیسہ انڈیل رہے تھے کہ جو بات علی کے مطلب کی تھی اور جس مقصد کے لیے انہیں پھنسایا گیا تھا وہ تو اب تک حل نہیں ہو رہا تھا اور جس طرح بے صبرے دولہا سے قاضی صاحب کا طویل خطبہ نکاح برداشت نہیں ہوتا بالکل اسی طرح علی سے بھی اب ان کی مفت بات چیت برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

’’کیا بتاؤں۔۔۔ بھائی کی طبیعت خراب ہی ہے۔‘‘

’’ویسے آپ کا بھائی ریل گڈی میں تے پیدا نہیں ہوا تھا۔‘‘ فون کرتے ہی بھائی کے ذکر نے ابا کو ایسا بدمزا کیا تھا جیسے حلیم میں ہڈی نکل آئی ہو۔

’’کیا مطلب ہے آپ کا؟؟‘‘

’’او جی مطبل یہ ہے کہ ریلوے سے بڑا ملتا جلتا ہے۔ چوبیں گھنٹے بارہ مہینے خراب کی ہی خبر آتی ہے۔‘‘

’’ایسی بات کرنے سے پہلے آپ کو سوچنا چاہیے تھا کہ کس سے کر رہے ہیں۔‘‘ علی کے انداز میں دبا دبا غصہ تھا۔

’’نئیں جی۔۔۔ سچی بات کرنے سے پہلے سوچن لگ جاؤں تا تے فیر بات کرنے کی ہمت نئیں رہتی۔‘‘

’’نہیں بھی۔۔۔ اب ایسی باتیں کر کے بور نہ کریں۔‘‘ علی نے نخرہ دکھایا تو ان کے بھی گویا سارے سوچ آن ہو گئے۔

’’تا تے فیر تسی دس دیو سوہنیو کہ کون سی باتوں میں خوشی مسوس کرو گے؟؟‘‘

’’نوٹوں کی‘ روپوں کی۔۔۔ ابھی تک ایک بھی چیک نہیں بھیجا‘ کسیے بڑے وہ ہیں آپ۔‘‘

اور تب ابا کو یوں ہی لگا جیسے فون کے دوسری طرف موجود حسینہ کے گھر کی زمین بھی چھت سے شروع ہوتی ہو گی‘ لیکن پھر خود ہی لاحول پڑھ ڈالی۔

’’او آہو جی۔۔۔ وہ دراصل۔۔۔‘‘

’’لوگ تو دل و جان ہتھیلی پر لیے کھڑے ہیں۔ لیکن میں چاہ رہی تھی کہ آپ سے ہی بات آگے بڑھے۔ دراصل جو فیلنگز آپ سے بات کرنے میں ہوتی ہیں

نا۔۔۔ وہ کسی اور کے ساتھ محسوس ہی نہیں ہوتیں۔‘‘

اور تب ابا کو اپنے دل پر جو چھریاں چلتی محسوس ہوئی تھیں اس کا اندازہ وہی لگا سکتے تھے۔ جی چاہ رہا تھا کہ چیک بک چرانے والے کو من بھر کی گالیاں سنائیں‘ تاکہ اس کی آنے والی نسلوں میں بھی کوئی بندہ کسی ایسے وقت میں چیک بک چوری نہ کرے‘ جبکہ اگلا عشق و عاشقی کی سب سے اوپری سیڑھی پر موجود ہو۔ اب گالیاں دینے کی خواہش کرنے والے ابا کو یہ کون سمجھاتا کہ گالی دینے والے مرد اور جگالی کرنے والے جانور میں سے اگر چار ٹانگوں کا فرق نکال دیا جائے تو انہیں بآسانی ایک ہی صف میں کھڑا کیا جا سکتا ہے۔

’’ہائے میں مرجاواں ہوا کھا کے۔۔۔ آپ کو کیا پتا میرے نال کیا تے کش ہو گیا ہے۔‘‘ ابا نے سسکی لینے کی کوشش میں غلطی سے ڈکار مارا اور بغیر شرمندہ ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔

’’پر دیکھو کسی کا دل کر وہ نہ لے لینا۔
میں راستے میں ہوں‘ بس آرہا ہوں۔‘‘

کسی اور کی دلہن نہ بن جانا‘‘ منذر ریلا
میرا انتظار کرنا‘‘ منذر ریلا

مختلف فلمیں‘ ڈرامے اور جلسے دیکھ کر ابا کو بھی اب اتنا تو اندازہ ہو ہی گیا تھا کہ کسی کے بھی دل میں گھر کرنے اور اپنی حمایت حاصل کرنے کے لیے اب گانا بجانا‘ میوزک کس قدر اہم ہے۔ جب ہی شرماتے لجاتے ہوئے بات کرتے کرتے بغیر بتائے ہی گنگنانے لگے تو علی نے چشم تصور میں انہیں آدمیوں کی تو منتخب ریشماں قرار دیتے ہوئے سوچا کہ ابا کی آواز سے بہتا درد چیک بک کی چوری سے کہیں زیادہ اس ادھورے رومانس کا تھا جو فی الحال تصورات کی دنیا ابا کے زیر سایہ پالا پوسا جا رہا ہے۔

’’انتظار تو کروں‘ مگر کب تک۔۔۔ آخر میرا بھائی۔۔۔‘‘ علی نے خوب صورت نسوانی آواز پر جذبات کا غلاف چڑھایا تو انہوں نے فوراً ’’بات کاٹ دی۔

’’او گولی مارو۔۔۔ میرا مطبل ہے گولی دو تا بھائی کو تے اسے آرام آجائے گا۔۔۔ پر دراصل میری چیک بک

ہمارے ہمسایوں نے چوری کر لی ہے۔‘‘

’’ہمسایوں نے؟‘‘ علی نے حیرت سے کہا۔

’’مگر وہ سب تو بہت اچھے ہیں۔‘‘ بے ساختہ ہی علی کے منہ سے چھینک کی طرح برآمد ہوتے الفاظ نے لمحہ بھر کے لیے ابا کو چونکایا۔

’’اچھے ہیں؟ کیوں وہ سب آپ کا باتھ روم صاف کرتے ہیں؟‘‘

’’نہیں‘ نہیں۔۔۔ میرا یہ مطلب تھا کہ ہمسائے تو اچھے ہوتے ہیں‘ لیکن انہوں نے تو آپ پر بڑا ظلم کیا ہے۔ یہ بھلا کیسے ہمسائے ہوئے۔‘‘

’’بس جی میرے ہمسائے بھی ایسے ہی ہیں جیسے پاکستان کے ہیں۔۔۔ دینے کے لیے ان کے پاس صرف اور صرف ٹینشن ہوتی ہے ہور کش نئیں۔۔۔ حالانکہ میں نے تے آتے ساتھ ہی بڑے پیار کا چھوٹا سا پیغام بڑی عید سے پہلے اور چھوٹی عید کے بعد براہ راست خود دیا تھا۔۔۔ پر وہ تے اس قابل ہی نئیں تھے۔‘‘

’’اچھا تو اب میں سمجھی کہ آپ بھی ان لوگوں میں سے ہیں جو موبائل پر آئی لو یو کا میسج لکھ کر اسے Send to all کر دیتے ہیں۔‘‘ علی نے بھی جوابی وار کیا‘ جو حسب توقع وہ برداشت نہ کر سکے۔ یوں بھی بڑی عمر کے مردوں سے محبت کرنے کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ وہ تلخ سے تلخ بات کو بھی برداشت کر کے ہنستے مسکراتے ہوئے اس پھل کا انتظار کیا کرتے جس کا وعدہ صبر کرنے کے بعد دینے کا ہوتا ہے۔ اس عمر میں بندہ محبت کی بس ایک نظر سے ہی سیر ہو جاتا ہے‘ جبکہ دوسری صورت میں سیر بھر محبت سے بھی بندے کی نظر بس نہیں ہوتی۔

’’آ۔۔۔ ہائے توبا کریں‘ میں نے تے آج تک کسی کو میسج پر آئی لو یو نہیں کیا۔ سب کو ان کے منہ پر ہی کہا اور پھر منہ کی کھا کر اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔‘‘

’’وہ تو سب ٹھیک ہے۔۔۔ لیکن۔۔۔‘‘

’’او جی تسی فکر نہ کرو۔۔۔ میں پلیس میں ان سب کے خلاف رپٹ لکھوانے لگا ہوں۔۔۔ ورنہ پیار سے تے یہ لوگ چیک بک کیا رستہ دی نئیں دیتے۔‘‘

’’نہیں نہیں ایسا نہ کرنا۔۔۔‘‘ علی نے چاہا کہ انہیں روک لے‘ مگر ناکامی ہوئی۔

’’دیکھیے گا جی۔۔۔ کیسے مال برآمد کراتا ہوں ان سے۔۔۔ اور فیر ہم دونوں کا ملنا زیادہ دور نہیں۔‘‘

’’ہاں نزدیک تو ہم ویسے بھی بہت ہیں۔‘‘ ممکنہ خطرے کے پیش نظر علی کی آواز مدھم پڑ گئی تھی جب ہی رب رکھا کہنے کے بعد جب دونوں اطراف سے فون بند ہوئے تو علی کی نسوانی آواز ابا کے کانوں میں ایسے دوڑ رہی تھی جیسے فٹ بال گراؤنڈ میں بال۔۔۔ ہر طرف ’’ہائے اوئے صدقے جاواں نزدیک سمجھتی ہے مجھے۔ مرجاواں غصہ کھا کے جلدی سے جلدی میں اس حسینہ کو دیکھ لوں تے میری وی زندگی آسان ہو جائے۔‘‘

ٹیلی فون پر لڑکی کا گمان کیسے ابا کے دل میں اس کے لیے اتنی محبت بھر گئی تھی کہ اپنی صحت کے پیش نظر انہوں نے بس وہیں تک ہی بریک لگا دی کہ کہیں حد سے نہ بڑھ جائے۔ یوں بھی ان کا ماننا تو یہ تھا کہ محبوبہ کی زبان کا حدود اربع جتنا مختصر ہو محبت کا رقبہ اتنا ہی وسیع و عریض ہوتا ہے۔ اس کے برعکس محبوبہ کی زبان کا حدود اربع وسیع ہونے لگے تو پھر محبت کا رقبہ نہیں کتبہ ملا پا جاتا ہے کہ مرد خود چاہے جتنا ہی باتونی اور اکھڑ ہو‘ لڑکی اسے ہاں میں سرہلاتے رہنے والی ہی اچھی لگتی ہے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ بعض اوقات ہی لڑکی اگر بیوی بن جائے تو ہاں میں سرہلاتے رہنے کا کام شوہر کو سونپ دیتی ہے اور بات بات پر جوتا اتار لینے والا بندہ دوسروں کے سامنے زیادہ سے زیادہ جرابیں اتارنے کو ہی بڑی پہلوانی خیال کرتا ہے۔ یوں بھی ابا کا تعلق ایک ایسے خاندان سے تھا کہ جہاں پریشر ککر کو صرف اس لیے کچن میں نہیں رکھا گیا تھا کہ وہاں خواتین کام کرتی ہیں اور یہ سیٹیاں بجاتا ہے۔ خواتین کا اس حد تک خیال رکھنے والے خاندان کے ہونہار سپوت ابا اگر ان روایات سے روگردانی کرتے تو یقیناً ’’اسلاف کی روح کو تکلیف پہنچتی۔ اس لیے انہوں نے بھی اپنے تمام حقوق و فرائض اس نئی آنے والی کے لیے نام لکھ دیے

تھے۔

☼ ☼ ☼

آج کل موسم ٹھنڈا ہونے کی وجہ سے سکون ہی تھا اور اسی سکون کو انجوائے کرتی چندا ابھی گاؤں میں اپنی سہیلی سے باتیں کر کے فون بند کر کے اٹھی ہی تھی کہ دوبارہ بیل ہوئی اور اس کے ہیلو کہنے اور ابا کی آمد کے ساتھ ہی کال منقطع بھی ہو گئی۔

"کیوں پتری کس کا فون تھا؟"

"پتا نہیں ابا کون ہے۔ صرف فون پر ہی کرتا رہتا ہے تنگ۔" اس نے کندھے اچکائے۔

"نئیں تے تیرا کیا مطلب ہے کہ تیرے سامنے آ کے تنگ کرے۔" "او ہو ابا۔ آپ تو۔" چندا نے یوں بے دلی سے کہا۔ جیسے کھانے میں سے باسی کی بساند آئی ہو۔

"نئیں تے تیرا کیا خیال ہے میں پاگل ہوں۔" ابا کا سر ابلتے پانی کی کیتلی کے ڈھکن کی طرح آہستہ آہستہ ہلنے لگا تھا اور یہ اس بات کی پہلی علامت تھی کہ انہیں غصہ آ رہا ہے۔

"ارے نہیں ابا مجھے تو ہے یقین۔"

"یعنی میں پاگل ہوں؟"

"نئیں۔ میں بھلا ایسا سوچ سکتی ہوں کیسے۔" چندا نے فوراً "مصالحتی جھنڈا" لہرا کر انہیں ٹھنڈا کیا' تو وہ اٹھ کر کسی کو فون ملانے لگے' مگر ایسے کہ نمبر ملاتے ہی کاٹ دیتے اور یہ ہی عمل۔ انہوں نے تین' چار مرتبہ دہرایا تو چندا پوچھ ہی بیٹھی۔

"ابا۔ آپ اس وقت ٹیلی فون کے ساتھ کھیل رہے ہیں کون سا کھیل؟"

"اوئے۔ کھیل نئیں رہا' میں تے پلیس اسٹیشن پر مس کالیں مار رہا ہوں۔"

"مس کالیں وہ بھی پولیس اسٹیشن پر؟"

"تے ہور کی۔" ابا کھلے دل سے ہنسے اور یوں ہنسے کہ چندا کو لگا گیس کے چھوٹے چھوٹے سلنڈر ایک ساتھ پھٹ گئے ہوں۔

"پلیس کو چیک بک کی رپٹ لکھوانے کے لیے بلاتا ہے نا۔ تاکہ آ کر موقع واردات بھی دیکھ لیں۔" چندا ان کی باتوں کے جواب میں یوں چپ چاپ کھڑی تھی کہ لگتا ہو ورک نہ کر آنے کے بعد استاد کے سامنے کھڑی ہو۔ چپ چاپ اور خاموش' ابا البتہ مکمل جوش سے باتوں میں مصروف تھے۔ جب چینا نے اپنا خدشہ ظاہر کیا۔

"ویسے ابا کیا وہ آ جائیں گے ایک مس کال پر؟"

"آہو۔ کیوں نئیں آئیں گے' اور خاص کر اس وقت جب ایک دوسرے سے کہیں گے کہ "مس" کال آئی تھی تے فیر دیکھیں سب نمبر دیکھتے ہی دوڑیں گے۔" ابا کچھ زیادہ ہی خوش فہم ہو رہے تھے۔

"ہاں بس اللہ کرے۔ مل جائے چیک بک۔" چندا نے اتنے جذب سے دعا کی تھی کہ ابا کو شک سا ہوا۔

"آہو پتری بس دعا کریں۔ پر تو نے کیا کرنی ہے چیک بک؟"

"ابا دراصل وہ۔ لڑکی تھی نا۔ نام اس کا نہیں یاد۔" چندا نے ذہن پر زور ڈالا' مگر ابا اس سے پہلے ہی بول پڑے۔

"علیشا۔ علیشا نام ہے اس اخبار والی لڑکی کا۔" ابا جس بے تابی سے بولے تھے اس پر وہ خود ہی یوں شرمندہ ہوئے کہ چہرہ سرخ پڑ گیا اور پھر انداز سرسری سا بناتے ہوئے بولے۔ "مجھے شک ہے کوئی لیشا' لوشا جیسا ہی نام تھا شید۔" ابا کا انداز چندا کو چونکا گیا تھا۔ "ہاں ویسے شک تو ہے مجھے بھی یہی۔"

"تینے اس پر شک کرنی ہے؟" ابا کی حالت ایسی تھی کہ جیسے کسی کے گھر بجلی کا کنڈا لگاتے ہوئے پکڑے گئے ہوں۔

"نہیں' شک تو مجھے اس پر ہے۔ جس کا نام لیشا۔ لوشا بتایا ہے آپ نے۔"

"اوئے کس کا نام۔ یہ ہے کون؟"

"وہی ابا۔ جس کی میں کرنا چاہتی ہوں مدد۔ اور جس سے مل کر میں دنیا چاہتی ہوں اسے کچھ روپے۔"

"اچھا۔ چل ٹھیک ہے' ٹھیک ہے چیک بک مل گئی تے دیں دئیں تو دی کش پانچ دس روپے' خوش؟"

"جی ابا بہت خوش۔" چندا مسکرائی تو ابا نے بھی خطرہ ٹل جانے پر یوں گہرا سانس لیا' جیسے علیشا کا نہیں بلکہ ان کے سر سے نیلوفر کا خطرہ ٹل گیا ہو۔

ادھر جھپٹے' ادھر پلٹے اسے جکڑا اسے پکڑا لہو کو گرم رکھنے کے بہانے ہیں اڑانوں میں ہر اک لڑکی نظر آتی ہے ان کو فاختہ جیسی عقابی روح جب بے دار ہوتی ہے جوانوں میں

گھر میں پولیس کے آ جانے کے ممکنہ خطرے کے پیش نظر کتنی سخت ٹینشن چل رہی ہے۔ اس تمام معاملے اور مسئلے سے بے خبر علی بڑے آرام سے صوفے پر بیٹھا موبائل فون ہاتھ میں لیتے ہوئے فیس بک پر لاگ ان ہو رہا تھا۔ جس طرح ہر دور میں مختلف ڈرگس نوجوان نسل میں مقبول ہو کر انہیں غیر محسوس طریقے سے تباہ کرتی رہی ہیں' بالکل اسی طرح آج کل کے دور کی سب سے مشہور ڈرگ کا نام ہی فیس بک ہے۔ جو ایک اچھے بھلے انسان کو تنہائی پسند بنا دیتی ہے۔ دوسرے صورت میں وہ ہجوم میں بھی خود کو تنہا کر لیتا ہے اور یہ ہی وجہ ہے کہ آج ملک کے ستر فیصد نوجوان کمر درد میں مبتلا ہیں۔ باقی تمیں فیصد کے پاس ابھی انٹر نیٹ کی سہولت نہیں ہے۔ ورنہ وہ بھی اب تک کمر درد کے کئی اسباب میں چپ چاپ مبتلا ہو چکے ہوتے۔

ایسا ہوتا ہے ناکہ آپ کے فرینڈز میں ایڈ کوئی بندہ ایک دم ہی انگڑائی لے کر جاگ جاتا ہے اور پھر آپ کی وال پر موجود ہر پوسٹ کے ساتھ چیک پوسٹ جیسا سلوک کرنے لگتا ہے اور جس کا نتیجہ تھوک کے حساب سے موجود نوٹیفکیشنز کے ساتھ آپ ہی کو بھگتنا پڑتا ہے۔ یہ ہی کچھ آج علی کے ساتھ بھی ہوا تھا' سو اس نے بڑے غصے سے آؤ' دیکھا نہ تاؤ' اسے فرینڈز لسٹ میں سے ہی نکال باہر پھینکے کہ یہ وہی کم بخت تھے جو اس کے کئی مرتبہ کہنے پر بھی اس کا بنایا گیا پیج لائک کرنے پر ٹال مٹول سے کام لے رہے تھے اور تب علی یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا کہ وہ لڑکے جنہیں گھر میں

دوسری مرتبہ مانگنے پر سالن نہیں ملتا اور وہ لڑکیاں جن کے ذمہ گھر میں ہاتھ روم دھونے کا کام ہوتا ہے۔ پیج لائک کرنے کا کہو تو ایسا سمجھتے ہیں کہ انہیں ایک کلک کرنے نہیں' بلکہ نکاح نامہ سائن کرنے کو کہا جا رہا ہے۔

اور لڑکیوں کے تو کیا ہی کہنے' پہلے مختلف کارٹون سینڈ کر کے اوٹ پٹانگے جواب دیتی رہیں گی اور پھر ایک دم ہی انہیں یاد آتا ہے کہ میں تو لڑکوں سے چیٹنگ ہی نہیں کرتی اور یہ کہ مجھے ایسے لڑکے نہیں پسند جو لڑکیوں سے زیادہ فری ہونے کی کوشش کریں۔ اس پر اگر کوئی جانباز آگے سے یہ لکھ دے کہ باجی آپ غلط سمجھ رہی ہیں' میں تو آپ کو بہن کی طرح بات کر رہا تھا۔ بس یہ میسج آخری ثابت ہوتا ہے اور لڑکی اسے اپنی بے حرمتی خیال کر کے نہ صرف ڈیلیٹ بلکہ بلاک بھی کر دیتی ہے اور تین دن تک آئینے سے ہی پوچھتے پائی جاتی ہے کہ مائی گاڈ۔ کیا میں بغیر دیکھے بھی بہن جی ٹائپ لگتی ہوں۔

دوسری طرف علی کی ٹائپ کے لڑکے تو جیسے ہوتے ہی اس انتظار میں ہیں کہ ادھر کوئی لڑکی ان کا کمنٹ کسی بھی پیج یا گروپ پر لائک کرے اور وہ فٹ سے اسے فرینڈز ریکوئسٹ بھیجیں۔ ہر ہفتے ہو جانے والا سچا پیار انہیں کا علامتی نشان ہے۔ اب چاہے کسی بے چاری سے انجانے میں لائک پر کلک ہو گیا ہو' لیکن انجانے میں بھی سرزد ہونے والے اس عمل کو وہ دل پر لے لیتے ہیں اور صبح شام ہاتھ روم جائیں نہ جائیں لڑکیوں کو السلام علیکم' گڈ مارننگ' شب بخیر' سلام صبح اور اس کے بعد سلام محبت تک کہنا اپنا آئینی و قانونی حق سمجھتے ہیں۔ ایسے لڑکے گھر والوں کے سامنے اس طرح کا منہ بنائے رکھتے ہیں کہ گھر کے بڑے انہیں نصیحت کرتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں کہ پہلے ہی بے چارہ اتنا سیدھا ہے' کہیں اپنے بھولپن میں مارا ہی نہ جائے۔ اگر کسی طریقے سے خدا رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا واسطہ دے دے کر فون نمبر تک بھی رسائی ہو جائے تو بات کرنے سے دو دن پہلے ہی پیاز کھانا چھوڑ

دیتے ہیں۔۔۔ محبت کا اظہار ایسے کرتے ہیں جیسے کراچی شہر میں لوگ چوریاں کرتے ہیں۔۔۔ یعنی دھڑلے سے اور روزانہ کی بنیاد پر۔

مگر اس سب کے باوجود آخر کار ان کی اس خواب سے آنکھ کھل جاتی ہے اور غصے اور مایوسی میں خود کو کمرے میں بند کرلیتے ہیں۔ کیونکہ خود نہ کریں تو ان کی حالت دیکھ کر دوسروں کو کرنا پڑے اور پھر ان کا فیس بک پر ایسا آنا جانا ہوتا ہے کہ اسٹیٹس لگا کر کمنٹس اور لائکس کے انتظار میں بیٹھے رہتے ہیں' جیسے آج کل مالٹوں کی ریڑھی والا گاہک کے انتظار میں بیٹھتا ہے۔

سو علی نے بھی اسٹیٹس اپ لوڈ کیا ہی تھا کہ چینا اور خالہ ایک دوسرے کے آگے پیچھے ٹرین کے ڈبوں کی طرح لاؤنج میں داخل ہوئیں اور خالہ نے علی کو دیکھتے ہی سوال داغ دیا۔

"ضمیر کہاں ہے؟"

"بک گیا۔" علی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا تو چینا کو اس کا یوں مسکرانا اچھا نہیں لگا۔ "کاش چینا تمہیں فنی کہہ سکتی۔"

"واقعی چینا مجھے خود لگتا ہے اس میں تمہاری امی کی طرف سے کوئی فنی خرابی رہ گئی ہے۔"

"اوہو۔۔۔ مجھے تو سمجھ نہیں آرہا ہے کہ آپ لوگ گھبرا کیوں رہے ہیں۔" علی بولا۔

"اگر پولیس گھر پر آبھی گئی تو خیر ہے۔۔۔ کیا ہو جائے گا؟"

"علی یہ بات تو کسی جاہل سے بھی پوچھو تا تو وہ بھی تمہیں بتا دے گا۔" "آپی اسی لیے تو آپ سے پوچھ رہا ہوں۔"

"علی۔۔۔ چینا تمہیں جاہل لگتی ہے کیا؟" چینا کو یوں آزادانہ انسلٹ کی علی سے توقع نہیں تھی۔

"ہاں چینا ویسے پچھلے کچھ دنوں سے تو مجھے بھی تم کاہل کاہل سی محسوس ہو رہی ہو۔ لیکن چھوڑو یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے۔"

"ہاں خالہ۔۔۔ صحیح یاد دلایا' یہ وقت تو میرا آن لائن ہونے کا ہے۔" اور اس سے پہلے کہ علی اپنے کمرے کی طرف مڑتا ضمیر بھائی کے تاثرات نے اسے رکنے پر مجبور کر دیا کہ آتے ہی جو بیان انہوں نے دیا وہ بھی خاصا عجیب تھا۔

"بس۔۔۔ یہ ہی۔۔۔ یہ ہی ایک وجہ ہے کہ مجھے بچے اچھے لگتے ہیں اور وہ یہ کہ ان کے بیوی' بچے نہیں ہوتے' گھر میں سالا نہیں ہوتا۔ ٹینشن فری لائف گزارتے ہیں۔" کلینک کی چابی انہوں نے چینا کو یوں دی جیسے گرفتاری دے رہے ہوں' بڑی ہی بد دلی سے۔

"یعنی گھر والے تمہیں ٹینشن دے رہے ہیں ضمیر؟" چینا نے اتنے پیار سے بات کی کہ ضمیر کو لگا ابھی ان کی شادی نہیں ہوئی۔ مگر خالہ کی آواز نے یہ خیال دیر تک قائم نہ رہنے دیا۔ "پینشن بھی دے لینا' پہلے چیک بک کا تو سوچو۔"

"خالہ! چینا نے ٹینشن کہا تھا۔"

"ہاں تو پینشن لینا بھی تو ٹینشن سے کم نہیں ہے نا۔۔۔ قطار میں کھڑے کھڑے اگلے مہینے کی بھی پینشن آجاتی ہے۔" حسب معمول خالہ کو سکون تب ملا جب وہ خود کو درست ثابت کر چکیں اور ان کی ان ہی خوبیوں کو سامنے رکھتے ہوئے اکثر چینا سوچتی کہ اس کا وہ کون سا گناہ ہے' جس کی پاداش میں خالہ اب تک کسی کی بھی بیوی بننے سے بال بال بچی ہوئی ہیں۔

"باتیں چھوڑیں اور اب ذرا چیک بک بھی ڈھونڈ لیں۔" علی نے اصل مسئلہ یاد دلایا۔

"لیکن چینا نے تو کہیں نہیں چھپائی۔۔۔ اس لیے جیسے گئی ہے ویسے ہی آئے گی۔"

"چینا۔۔۔" ضمیر بھائی نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کی۔ "شادی کے بعد ہی کم از کم بندہ عقل مند ہو جاتا ہے' لیکن تم تو۔۔۔"

لیکن ضمیر' بعد میں ہونے کا بھلا کیا فائدہ۔۔۔ شادی Undo تھوڑی ہو سکتی ہے۔

"چیک بک نہ ملی تو ہمیں پیسے دینے پڑیں گے۔ یاد رکھیں یہ بات۔" علی نے پھر الارم بجایا۔

"تمہارا دماغ' نیت اور نظر تو ویسے ہی خراب ہے' لیکن بندہ کم از کم کوشش کر کے سوچ ہی اچھا لیتا ہے۔" ضمیر بھائی نے اسے مولانا بن کر کسی گناہ گار کی طرح ٹریٹ کیا تھا اور تب وہ خود کو چیلنج کر کے کچھ سوچنے لگا اور جلد ہی چٹکی بجا کر تینوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ "کیوں نا' میں اوپر جا کر چندا سے ہی مدد مانگوں؟"

"چندا سے مدد؟ کیوں وہ ایدھی کی ایمبولینس چلاتی ہے۔" وہ اب تک چڑے ہوئے تھے۔

"وہ اپنے ابا سے کیس نہ کرنے کا تو کہہ سکتی ہے نا۔" علی نے وضاحت کی تو چینا نے بڑے فخر سے اسے دیکھا۔

"دیکھا ضمیر۔۔۔ چینا کا بھائی کتنا جینئس ہے۔"

"ہاں چھپالو۔۔۔ نظر نہ لگ جائے۔" انہوں نے نصیحت کی طرح بے زاری سے سنا اور جواب دیا۔ علی ان کے کسی بھی مزید اقدام کا انتظار کیے بغیر اوپر کو جاتی سیڑھیوں کی طرف چڑھا تو خالہ بھی اس کے پیچھے لپکیں۔

"رکو علی۔۔۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔"

"نہیں خالہ تم کیا کرو گی جا کر۔۔۔ یہیں رہو۔" علی نے جان چھڑائی۔

"میں بس تمہارے پیچھے کھڑی رہوں گی۔" اپنا مطلب ہو تا تو خالہ کا لہجہ سزائے موت کے قیدی جیسا ہو جایا کرتا تھا۔ چہرے پر بھی وقت نزع محسوس ہوتا کہ شاید اسی طرح بات بن جائے۔ اور یہ ہی وہ موقع تھا جب ضمیر بھائی کو محسوس ہوا کہ یہ علی کو تپانے کا آئیڈیل وقت ہے سو جھٹ سے بولے۔

"علی۔۔۔ خالہ ٹھیک کہہ رہی ہیں' کیونکہ ہو سکتا ہے چندا گھر میں اکیلی ہو۔ اس لیے تمہیں تو ہم کبھی بھی اکیلا نہیں جانے دیں گے۔" ضمیر بھائی کی بات پر حسب توقع وہ چڑ گیا تھا۔

"ہر بندے کو اپنی طرح کا مت سمجھا کریں۔ ہر بندہ آپ کی طرح کا نہیں ہوتا کہ جہاں کوئی لڑکی دیکھی جھٹ سے اپنے ڈاکٹر ہونے کی اطلاع دے دی کہ کوئی تو چھوٹی موٹی بیماری ہو گی ہی۔"

"ہر بندہ میری طرح نہیں ہوتا نا اسی لیے تو تمہیں اکیلا نہیں بھیجیں گے' کیوں چینا؟ خالہ تم خود و بتاؤ' کیونکہ چینا کو تو کچھ سمجھ نہیں آرہا کہ تمہارا پیچھے کھڑے رہنے کا آخر مقصد کیا ہے۔" ضمیر بھائی نے گیند چینا کے کورٹ میں پھینک دی تھی۔ ادھر علی کا ایک پاؤں اوپری سیڑھی پر اور دوسرا نچلی پر تھا۔ لگتا جوتے پہن کر پالش کروا رہا ہے۔

"چینا۔۔۔ کیا تم نہیں جانتی کہ ہر کامیاب کے پیچھے ایک عورت ہے؟ بس اسی لیے میں بھی علی کو کامیاب مرد کے طور پر دیکھنا چاہتی ہوں۔" چینا کو ان کی بات دل پر لگی تھی۔ جب ہی یوں متواتر تائید میں سر ہلایا' جیسے بس میں بیٹھی ہوں اور بس کسی ناہموار سڑک پر ہچکولے لے رہی ہو۔ "ہونہہ۔۔۔ یاد رکھیے گا ہر ناکام مرد کے پیچھے دو عورتیں ہوتی ہیں۔" علی نے بڑے غصے میں کہا۔ ضمیر بھائی نے اپنی جیت کی خوشی میں مسکراتے ہوئے چینا کو دیکھا تو انہیں محسوس ہوا کہ جس انداز میں وہ آگے بڑھ کر کھڑے ہیں۔ چینا اور خالہ دونوں ان کے پیچھے ہیں' سو علی کی بات کے تناظر میں جہاں تھے' جیسے تھے' وہیں بیٹھ گئے۔

"ضمیر کیا ہوا؟ چکر آگیا' بی پی لو ہو رہا ہے یا۔۔۔" چینا کے تشویش بھرے سوالات کا ان کے پاس اس وقت کوئی بھی جواب نہیں تھا۔ صرف اس لیے کہ ابھی تازہ تازہ انسلٹ کا خمار برقرار تھا۔ ورنہ تو عام حالات میں وہ ان مرد حضرات میں سے ہرگز نہیں تھے جو اپنی بیوی کے دو چار سوالوں پر ہی ناک بھوں چڑھانے لگتے ہیں اور یہ ہی سوال اگر کوئی اور خاتون پوچھ لیں تو علم و فضل کے وہ دریا بہاتے ہیں کہ پوچھنے والی کی طبیعت ہو جائے' مگر یہ جتا کر نہ تھکیں۔ جب ہی چینا نے بھی انہیں کچھ دیر کے لیے تنہا چھوڑنا بہتر سمجھا۔

☼ ☼ ☼

جب حسب تسلی نہ ملا قافیہ کوئی
پھر کام چلایا ہے فقط خانہ پری سے

کرتا ہے خوشامد بھی بڑے رعب سے الور
مکھن بھی لگائے تو لگتا ہے چھری سے

دل ہی دل میں چندا سے کیے جانے والے ممکنہ مکالموں اور خوب صورت جملوں کو دہراتے ہوئے جب علی خالہ کی زیر نگرانی چندا کے پورشن تک پہنچا تو اتفاق سے وہ لاؤنج میں ہی موجود تھی اور انہیں یوں بریکنگ نیوز کی طرح اچانک دیکھ کر حیران رہ گئی۔

"ارے آپ لوگ کیسے آئے گھر ہمارے۔"

"سیڑھیوں سے۔ ویسے عاشق انکل سے کہا تو ہے کہ لفٹ لگوا دیں، کیونکہ اب تو دونوں گھروں میں آنا جانا لگا ہی رہے گا نا۔" علی نے مسکراتے ہوئے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

"اوہو۔ لیکن کیوں؟ کہتی ہوں میں کہ خیر تو ہے، ایسا کیا ہو گیا؟" وہ اب تک سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

"بس چندا خیر ہی تو نہیں ہے۔" علی کا انداز بالکل ایسا تھا جیسے ان دونوں میں بڑی گہری دوستی بڑے عرصے سے چلی آ رہی ہو اور یہ ہی بات چندا کو زیادہ حیران کر رہی تھی۔

"تمہارا پیر نہ ہو علی، میرا تو ہے، بلکہ دونوں ہیں۔" خالہ کی باتوں کو وہ صرف اس لیے نظر انداز کرنے کا ارادہ کر کے آیا تھا کہ چندا کے سامنے معاملات مزید خراب نہ ہو جائیں۔ جب ہی ان کی بات کو سنی ان سنی کرتے ہوئے چندا کے ذرا سا نزدیک آ کر پوچھا۔

"چندا ویسے تمہارے ابا ہیں؟"

"نہیں تو میں اکیلی ہوں۔" چندا نے جواب دیا تو علی خود کو روک نہ پایا اور با آواز بلند بولا۔ "انا للہ و انا الیہ راجعون" اور یقیناً" یہ پہلا موقع ہو گا جب کسی نے اتنی خوشی سے یہ الفاظ ادا کیے ہوں۔ چندا اس کی بات سمجھ کر غصے میں آ گئی تھی۔

"شرم نہیں آتی کرتے ہوئے ایسی باتیں؟"

"نہیں۔ مجھے تو ویسی باتیں کرتے شرم آتی ہے۔" علی نے شرمانے کی بھونڈی اداکاری کی۔

"کمال ہے، یعنی ساری دنیا جانتی ہے کہ میرے ابا ہیں حیات اور تم۔"

"اور کیا علی۔ اس کے ابا کے واہیات ہونے کے بارے میں تو ساری دنیا جانتی ہے" تم مجھ سے یہ ہی پوچھ لیتے بھلا۔ ساری بات تفصیل سے بتا دیتی۔" خالہ کے نقص سماعت نے اپنا آپ ظاہر کیا۔

"کمال ہے۔ یعنی آپ لوگ آئے ہیں یہاں ہماری بے عزتی کرنے؟"

"نہیں۔ وہ تو ہم گھر پر بھی کر رہے تھے۔ یہاں تو ہم ایک بات کرنے آئے تھے کہ۔" علی کی بات کو جانے کیوں خالہ نے موضوع سے ہٹتا محسوس کیا یا شاید اس کی آنکھوں سے کوئی تحریر پڑھی کہ فوراً" سے اسے کہنی مار کر سیدھی طرح بات کرنے کا اشارہ آنکھوں سے کیا۔"

"اچھا۔ سچ سچ بتاؤ کہ تمہارے ابا اس دنیا میں کہاں پر ہیں؟" علی نے اپنا سوال واضح کیا۔

"وہ بس چیک بک ڈھونڈنے گئے ہیں، کیوں ہے کوئی مسئلہ؟"

"تو گھر میں ہی سرچ آپریشن کرتے نا بھلا باہر کیوں گئے؟" خالہ نے پوچھا۔ "اس لیے کہ گھر میں بجلی جلانے کا بل آتا ہے۔ اس لیے ڈھونڈ رہے ہیں سورج کی روشنی میں۔" بات کرنے کے دوران چندا نے لمحہ بھر رک کر دونوں کو دیکھا اور پھر ان کی یادداشت واپس لانے کی کوشش کی۔

"میں یاد دلا دوں کہ آپ دونوں آئے تھے کسی کام سے۔"

"تمہارا کوئی بھی کام ہو چندا، میرے سر آنکھوں پر۔" علی نے پھر سے پٹری سے اترنا چاہا۔

"لیکن سر تو سب کا آنکھوں پر ہی ہوتا ہے۔" چندا نے نیا نقطہ نکال لیا تھا۔

"سب کہاں۔ آج کل کے لڑکے تو سر ہاتھوں میں لیے پھرتے ہیں۔" چندا نے حیرت سے خالہ کی وہ بات سمجھنے کی کوشش کی جو خود خالہ نے بھی شاید نا سمجھی میں کر دی تھی۔ "خالہ سر نہیں دل ہاتھوں میں لیے پھرتے ہیں۔" علی نے دونوں کی مشکل آسان کی۔

"آپ دونوں نے آپس میں ہی باتیں کرنی ہیں تو

کر لیں اپنے گھر جا کر۔" "نہیں، نہیں چندا، وہ دراصل تمہارے ابا سمجھتے ہیں کہ ان کی چیک بک ہم نے چوری کی ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔" علی بات کرتے کرتے منمنانے لگا تھا۔

"ہو سکتا ہے سمجھ رہے ہوں ٹھیک۔" چندا نے اپنے ابا کی سائیڈ لی۔

"یعنی تم ہماری مدد نہیں کرو گی؟"

"پولیس کا ہے فرض مدد آپ کی۔ اور میں ہرگز نہیں ہوں پولیس میں۔" چندا نے صاف جواب دے کر انہیں اب چلے جان کا اشارہ کیا تو بڑے ہی بے آبرو ہو کر اس کے کوچے سے وہ نکلے۔

☼ ☼ ☼

"علی۔ علی۔ اب آ بھی جاؤ نا کہاں ہو؟" چینا نے کچن کی کھڑکی سے سر نکال کر علی کو پکارا تو وہ فوراً" بیرونی گیٹ سے لان اور پھر لاؤنج سے ہوتا ہوا کچن میں آ گیا۔

"آپی میں باہر گیا تھا۔ فقیر کہہ رہا تھا اللہ کے نام پر کچھ دے دو، باہر ابا کی سائیکل کھڑی تھی۔ میں نے بٹھا کر جھولا دے دیا۔"

"خدا کا واسطہ ہے ابا کی کسی چیز کو بھی مت چھیڑا کرو، پہلے ہی ہم سب چینا سمیت پھنس گئے ہیں۔" چینا نے ٹیبل پر کھانا لگاتے ہوئے کہا۔ جس پر علی نے بھی تائید میں گردن ہلائی اور گلاس میں پانی ڈال کر پینے سے پہلے ہی اسے غور سے دیکھ کر بولا۔

"آپی دیکھیں تو ذرا۔ آج کل میرا خیال ہے پانی صاف نہیں آ رہا۔ اس لیے برف کو دھو اور ابال کر استعمال کیا کریں۔" علی کی بات پر ڈونگے میں سالن ڈالتی چینا چونکی۔

"وہ اچھا کیا بتا دیا علی۔ چینا دودھ والے کو بھی میسج کر دیتی ہے کہ پانی ملانے سے پہلے ابال لے۔" کھانے کا وقت تھا اور اب سب کو کچن میں ہی جمع ہونا تھا۔ اس لیے خالہ اور ضمیر تقریباً" ایک ساتھ ہی داخل ہوئے اور اپنی اپنی کرسیاں دراز کھولنے کے انداز میں گھسیٹ کر بیٹھ گئے۔

"چینا بھئی کیا ہے آج لنچ میں؟" خالہ نے منہ میں آئے پانی کو نگلتے ہوئے پوچھا تو ہلکا سا جواب آیا۔

"دوپہر کا کھانا۔"

"چلو شکر ہے آج لنچ میں دوپہر کا کھانا ہے، ورنہ کل بھی تم نے غلطی سے دوپہر کو ڈنر کروا دیا تھا۔ بچی رات بھر بھوک لگتی رہی۔"

"میں تو کہتا ہوں کہ ہو سکتا ہے اس بڑھے کھوسٹ ابا نے بدلا لینے کے لیے وہ چیک بک ہمارے ہی گھر میں کہیں چھپا دی ہو۔" ضمیر بھائی جو اتنی دیر سے خاموش تھے آخر بولے۔

"نہیں ضمیر بھائی، گھر میں نہیں ہے۔ کیونکہ میں نے تو آپ کے والٹ تک میں ڈھونڈ لی، مگر کہیں نہیں ملی۔" علی نے پانی پی کر گلاس ٹیبل پر رکھا۔

"اچھا تو میرے والٹ سے پیسے تم نے نکالے ہیں؟" علی یقیناً" ضمیر بھائی کے ہاتھوں پکڑا گیا تھا۔ مگر چینا اسے بچانے کو میدان میں کود پڑی اور گڑبڑاتے ہوئے بولی۔ "نہیں ضمیر، ہو سکتا ہے چینا نے نکالے ہوں۔"

"بالکل نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس میں ابھی کچھ پیسے بچے ہوئے بھی تھے۔" ان کے پاس موجود پکے ثبوت نے علی کو شرمندہ سا کر دیا تھا۔

"علی تم تو کہہ رہے تھے کہ ان کے طعنے کا جواب دو گے۔ پڑ گئے نا لینے کے دینے۔" خالہ نے مسکراتے ہوئے اس پر پھبتی کسی تھی اور وہ جو پہلے ہی کھسیاہٹ کا شکار تھا، دھیرے سے بولا۔ "ہاں تو مجھے کیا پتا تھا کہ وہ اوور ٹیک کر جائیں گے۔"

"ہاں تو اوور ٹیک کوئی بتا کر بھی کرتا ہے کیا؟" خالہ نے ہونہہ کے انداز میں گردن کو جھٹکا دیا۔ "ویسے میں سوچ رہا ہوں کہ اگر ہم خود پہلے پولیس اسٹیشن پہنچ جائیں تو۔"

"واؤ۔ واؤ۔ واؤ۔ ضمیر تم پولیس اسٹیشن جا رہے ہو؟" خالہ کا جذبہ قابل فکر تھا۔ جب ہی علی بولا۔ "جوش تو دیکھیں جیسے پولیس اسٹیشن نہیں، خلائی

اسٹیشن جارہے ہیں۔"
"ہاں ویسے خالہ علی ٹھیک کہہ رہا ہے اس میں اتنا خوش ہونے والی کوئی بات تو چینا کو بھی سمجھ نہیں آئی۔"
"مجھے پولیس اسٹیشن دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ بلکہ بچپن سے ہی شوق ہے۔" خالہ نے بتایا۔
"خالہ میں پولیس اسٹیشن کی بات کررہا تھا۔ تدو کی نہیں۔" ضمیر بھائی پہلے ہی اکتائے ہوئے تھے۔
"اوہو۔۔۔ لیکن تھوڑا سا ہی فرق ہوتا ہے ناکہ تدو میں نقصان پہنچانے والے پنجرے کی سلاخوں پر ہوتے ہیں اور پولیس اسٹیشن میں عہدے پر۔"
"خالہ کم از کم بندہ جمعے کے جمعے ہی دماغ استعمال کرلیتا ہے۔ کچھ لوگوں کی وجہ سے سب کو رگڑا کیوں دے رہی ہو۔" علی نے حیرت انگیز طور پر کام کی بات کی تھی جو خالہ کو سمجھ نہیں آئی۔ "اوہو۔۔۔ سیدھے لفظوں میں مجھے بتاؤ کہ کیا کرتا ہے؟"
"وہ جو پہلے تم نے کبھی نہیں کیا۔" چینا بھی کرسی پہ بیٹھی اور سالن ڈالتے ہوئے بولی۔
"آرام۔۔۔"
"نہیں کام۔۔۔"
"تم نے مجھے کام والی سمجھ رکھا ہے چینا؟"
"کاش چینا تمہیں کام والی ماسی کہہ سکتی۔" خالہ نے کھا جانے والی نظروں سے چینا کو دیکھا تو اسے فوراً ہی ایک وضاحتی بیان جاری کرنا پڑا۔ "کاش کہہ سکتی۔۔۔ مگر کہا تو نہیں نا۔" اور تب خالہ کی خوشی کا عالم وہی تھا جو جھڑکیاں کھا کر خیرات لینے والے فقیر کا ہوتا ہے۔

☼ ☼ ☼
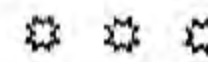
فقط اس آس پر بیٹھی رہی رفعت کی ماں برسوں
کہ بیٹی کے لیے اونچا سا اک پیغام آجائے

نہ شاہیں زیرِ دام آیا تو اس حد تک اتر آئیں
کوئی موچی، کوئی دھوبی، کوئی حجام آجائے

خالہ بھی پہلے پہل تو بہتر سے بہترین کی تلاش میں ہر آنے والے رشتے کو انکار کہتی رہیں اور اب حالت یہ تھی کہ ابا جیسے سیکنڈ ہینڈ انسان کے پیچھے بھی آہیں بھرتی پائی جاتیں اور اب جب صبح ناشتے میں سب چائے پی رہے تھے، تب بھی خالہ اوپری پورشن کی طرف بھیگی نظروں سے دیکھتی ہوئی صبر کے گھونٹ پی رہی تھیں۔ جب چینا کی آواز سے سب کی خاموشی ٹوٹی۔
"کیا خیال ہے، کیا لگتا ہے کہ ابا کی چیک بک مل جائے گی؟ اور اگر ملے گی تو کیا ہمارے گھر سے یا چینا کی مانگی گئی دعا کے عین مطابق ان کے اپنے گھر کے کسی کونے سے؟"
"چینا ہم کوئی نجومی تھوڑی ہیں کہ تم مستقبل کا حال جاننے کے لیے آپہنچی ہو۔" ضمیر بھائی نے چائے کا کپ ٹیبل پر رکھا۔
"اوہو۔۔۔ وہ تو سب ٹھیک ہے، لیکن چینا تو صرف General Opinion لے رہی تھی۔"
"تو بھئی۔۔۔ اب چینا کے لیے تو Onion بھی کسی جرنل کے ہونے چاہییں؟" خالہ نے بھی کپ اٹھایا تو علی ان کی بات سے مکمل طور پر متفق نظر آیا۔
"خالہ جرنل بھی تو Onion کی طرح کئی پرتوں میں چھپے ہوئے ہیں اور جب سامنے آتے ہیں تو بس رلا ہی دیتے ہیں۔" اس سے پہلے کہ "تکرار ہاؤس" میں اب اس بات پر گھنٹہ بھر تکرار چلتی باہر ہوتی موسلا دھار ڈور بیل نے ان سب ہی کی توجہ ادھر مبذول کروادی۔
"ارے یہ کون آگیا اس وقت؟" صبح صبح گوالے کے بجائے اور کون ہوسکتا تھا' یہ بات سب ہی کے لیے حیرت کا باعث تھی۔
"میں دیکھتا ہوں۔" علی اٹھنا چاہتا تھا' مگر چینا نے بازو پکڑ کر دوبارہ بٹھا دیا۔
"تم بیٹھو' چینا خود دیکھتی ہے۔" چینا کو ان کے یوں سلسلہ وار بیل دینے پر بہت غصہ آرہا تھا' جب ہی گیٹ کھولتے ہی ساتھ ساتھ بولتی بھی گئی۔
"ارے چینا کہتی ہے بیل سے ہاتھ ہٹا بھی لو' کیا

ناشتے میں کرنٹ کھانے کا ارادہ ہے؟" اور گیٹ کھولنے کے بعد بھی چینا کے بولنے کی اسپیڈ میں کوئی خاص فرق نہیں آیا تھا۔ اسی جوش سے جملہ پورا بھی کیا۔
"ہاں بھئی بتاؤ۔۔۔ کیا طیارے میں فیول ختم ہوگیا تھا جو اتنی جلدی میں تھے؟"
اور بس پھر اس کے بعد جیسے ہی چینا نے نظر اٹھا کر سامنے دیکھا تو وہاں موجود حولدار اور لیڈی کانسٹیبل کو دیکھ کر منہ کھلا کا کھلا رہ گیا اور وہ دونوں ان کے گھر کو خالہ جی کا گھر سمجھتے ہوئے بڑی ہی بے تکلفی سے نہ صرف یہ کہ اندر آگئے' بلکہ تنقیدی نظروں سے لان سے لے کر گھر کے سامنے لگی لائٹوں تک کو بے تکلفی کے ساتھ جانچنے لگے۔ چینا کا کسی بھی پولیس مین کے ساتھ یہ پہلی مرتبہ واسطہ پڑا تھا۔ اس لیے گھبرا ایسے گئی تھی جیسے کسی اور دنیا کی مخلوق دیکھ لی ہو۔ تب ہی حوالدار نے اسے مخاطب کیا تو چینا پر یہ عقدہ بھی کھلا کہ سامنے پولیس وردی میں نہ سمجھ آنے والا معمہ نہ صرف حوالدار ہے' بلکہ پٹھان بھی ہے۔
"او خو چی یہ سارا گھر تمہارا اے؟"
"نہیں' نہیں سارا کہاں۔۔۔ چینا کا تو صرف یہ چھوٹا سا نیچے کا پورشن ہے۔ باقی اتنا بڑا اوپر کا پورشن اور وہ دیکھیں۔۔۔ وہ اوپر والی بالکونی سب چندا اور اس کے ابا کا ہے۔"
"آچا آچا۔۔۔ تو پر پہلے چینا کو بلاؤ۔۔۔ ام اس کو دیکھے گی۔" حوالدار صاحب نے فرمائش کی۔ "کبھی عورتوں کو دیکھنے سے بھی پرہیز بھی کیا کریں۔ چینا کی قسم صحت اور عہدے میں بڑا فرق پڑے گا۔"
اس دوران ہی لیڈی کانسٹیبل کی نظر خالہ' علی اور ضمیر بھائی پر پڑتی ہے جو چھپ چھپ کر انہیں دیکھے جارہے تھے۔ جب ہی وہ تشویش ناک انداز میں تفتیش کرتے ہوئے بولی۔
"یہ سب اندر کھلے ہوئے ہیں یا بیلٹ باندھ کر گھومتے ہیں؟"
"یہ چینا کا گھر ہے' چڑیا گھر نہیں۔" چینا نے اس کے یوں کہنے پر بے حد مائنڈ کیا تھا۔
"او ئے خو چی تم چپ کرو' ام خود جا کر دیکھتی اے کہ اندر آخر ہوتی کیا اے۔" چینا نے چاہا تو بہت کہ انہیں کسی طریقے یہیں باہر ہی روک لے۔ مگر یہ ہو نہ سکا اور اب یہ عالم تھا کہ آگے آگے حوالدار صاحب' پیچھے لیڈی کانسٹیبل اور ان دونوں کے پیچھے چینا حواس باختہ سی اندر کی طرف جارہی تھی۔

☼ ☼

(باقی آئندہ)

فوحی نعیم
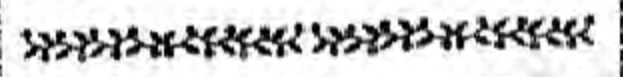
اطلاعی گھنٹی کی آواز پر ثمرین جو اپنے اور یاسر کے کپڑے استری کر رہی تھی یکدم تھکی اور بے زاری سے گھڑی کی طرف دیکھا۔

"یہ اس وقت کون آگیا؟ ارے پانچ بج گئے' پتا بھی نہ چلا۔" وہ اپنے آپ سے بول رہی تھی۔ اس دوران دوبارہ گھنٹی بج چکی تھی۔

"اُفوہ۔" اس نے جلدی سے سوئچ بند کر کے پلگ نکالا اور تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی۔

"ارے آپ اس وقت' آج جلدی آگئے۔" دروازے پر یاسر کو دیکھ کر وہ تھوڑا سا چونکی اور پھر اندر کی طرف بڑھ گئی۔ یاسر بھی مین گیٹ بند کرتا ہوا اس کے پیچھے تھا۔

"ہاں آج دفتر سے جلدی اٹھ گیا تھا پھر مارکیٹ چلا گیا۔" وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ شاپنگ بیگ اس نے وہیں صوفے پر ڈال دیے تھے۔

"تم کیا کر رہی تھیں اور ہانیہ کہاں ہے؟"

"سو رہی ہے۔ میں نے سوچا اس کے اٹھنے سے پہلے پہلے سارے کپڑے استری کرلوں پھر وہ اٹھ جائے گی تو تنگ کرے گی۔" وہ دوبارہ سے استری کرنے لگی تھی اور اس کے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے۔ یاسر چند منٹ وہاں بیٹھا اور پھر اندر کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

ثمرین نے ہفتہ بھر کے کپڑے استری کر کے اب وہ تمام کپڑوں کو بڑی احتیاط کے ساتھ ہینگر میں ڈال کر الماری میں لٹکا رہی تھی پھر اسی طرح اس نے یاسر کے کپڑے اس کی الماری میں ہینگ کیے۔ ہفتہ کا دن اس کا بڑا مصروف گزرتا۔ وہ خود ایک دفتر میں اچھی پوسٹ پر تھی لہٰذا ایسے سارے کام وہ آج ہی کے دن پر رکھتی۔ پہلے وہ صفائی ستھرائی کرتی کہ روزانہ تو ماسی ہی الٹا سیدھا کر کے چلی جاتی تھی۔ پھر کچن دیکھتی اور دو تین ایسی چیزیں ایکسٹرا بنا کر فریز کر دیتی تاکہ آفس سے آکر اسے زیادہ محنت نہ کرنی پڑے اور پھر دوسرے کام نمٹاتی۔

اس دوران ہانیہ کے کام بھی چلتے رہتے کیونکہ سارے ہفتے کے بعد اسے بھی ماں ان دو دنوں میں ہی نظر آتی تو وہ بھی پھر خوب اس کی گود میں چڑھتی اور ضدیں کرتی اور اسے اپنے ساتھ لگائے رکھتی جس سے ثمرین کبھی کبھی تو جھنجلا جاتی۔ کیونکہ روزانہ تو وہ اسکول سے واپسی پر نانی کے گھر اترتی جہاں نانی اسے کھلا پلا کر سلا دیتیں پھر شام میں ثمرین اسے آفس سے واپسی میں لے لیتی۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ اسی گلی میں اس کے آفس کی ایک خاتون کا گھر تھا وہ جب گھر اترتیں تو ہارن کی آواز پر اس کی امی فوراً ہی ہانیہ کو لے کر گیٹ پر آجاتیں اور وہ ہانیہ کو جلدی سے وین میں بٹھالیتی اور دونوں ساتھ ہی گھر آجاتیں۔ لیکن اس زائد "زحمت" کے پھر وہ ڈرائیور کو چند نوٹ اوپر سے دیتی لہٰذا وہ بھی معترض نہ ہوتا۔ کیونکہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ہانیہ سو رہی ہوتی اور امی کو اسے اٹھا کر لانے میں چند منٹ کی تاخیر ہو جاتی۔ جس پر ڈرائیور کا منہ بن جاتا یا کبھی وہ خاتون ہی غیر حاضر ہوتیں تو ڈرائیور کو خاص طور پر اس ایریا میں صرف ہانیہ کی وجہ سے آنا پڑتا جس پر ڈرائیور کے ساتھ وین میں بیٹھی خواتین کو بھی اعتراض ہو جاتا چنانچہ اس نے ہانیہ کو پک کرنے کے لیے الگ رقم مخصوص کر دی تھی۔ جس کے بعد وہ بھی مطمئن ہو گئی تھی اور ڈرائیور بھی کچھ کہنے سے باز رہتا۔

☆ ☆ ☆

ثمرین پچھلے دو سال سے' جبکہ ہانیہ اس وقت تین سال کی ہوئی تھی۔ ایک آفس میں جاب کر رہی تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ یاسر کے معاشی حالات اس قابل نہ تھے کہ وہ گھر کا خرچ نہ اٹھا سکتا بلکہ ثمرین ہی کو اپنے کمانے کھانے کی عادت پڑ چکی تھی۔ وہ شادی سے پہلے بھی ایک اسکول میں آفس جاب کرتی تھی۔ جہاں اس کی تنخواہ ٹھیک ٹھاک تھی اور یوں اسے اپنی کمائی کا نشہ چڑھ چکا تھا۔ اس کے والد اور بھائی کو اس کی جاب پر کوئی اعتراض بھی نہ تھا اور نہ ہی ضرورت' پھر وہ اسکول گھر سے قریب بھی تھا لہٰذا آنے جانے کا کوئی مسئلہ نہ تھا۔

ہاتھ میں تنخواہ آتے ہی وہ اگلے ہی دن بازار کا رخ

آئے تھے۔ ثمرین نے انہیں دیکھا وہ اس سے کوئی فائل مانگ رہے تھے۔

"رشید سے کہہ دیتے۔" وہ فائل دراز میں سے نکالتی ہوئی بولی۔ اور دفتر کے لڑکے کا نام لیا۔

"کیوں میرے آنے پر آپ کو اعتراض ہے۔" وہ غور سے اس کو دیکھتے ہوئے بولے۔ وہ جواب میں کچھ نہ بولی اور فائل ان کو پکڑانے لگی۔ فائل پکڑتے ہوئے انہوں نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے مس کیا جس پر وہ جل بھن کر رہ گئی وہ اکثر ایسی حرکت کرتے تھے۔

"ناصر صاحب ذرا آنکھیں کھول کر فائل پکڑا کریں۔" وہ غصہ سے بولی تھی۔ لیکن آواز دبی ہی رہنے دی تھی تاکہ آس پاس کے لوگ نہ سنیں۔

"آپ کے پاس آکر تو سوئی آنکھیں بھی خود بخود کھل جاتی ہیں۔" وہ بے شرمی سے ہنسے تھے اور آگے بڑھ گئے دوسری طرف ثمرین بل کھا کر رہ گئی۔

"اب کے ضرور باس سے ان کی شکایت کروں گی۔" اس نے ہمیشہ کی طرح دل میں عہد کیا اور اپنا کام کرنے لگی۔

☆ ☆ ☆

"ارے یار کیا کریں آفس میں تو یہ سب ہوتا ہی ہے۔ برداشت کرو مجبوری ہے۔" لنچ بریک میں جب اس نے اپنی کولیگ ناعمہ کو ناصر صاحب کی حرکت کے بارے میں بتایا تو جواب میں اس نے کہتے ہوئے کندھے اچکائے۔

"لیکن میری کوئی مجبوری نہیں ہے میں چاہوں تو ابھی اس نوکری کو لات مار دوں۔" وہ سینڈوچ کھاتے ہوئے بولی۔

"ہاں یار تم یہ کر سکتی ہو کیونکہ یا سر بھائی کی جاب بہت اچھی ہے اور تمہیں کمانے کی کوئی مجبوری نہیں، ہم سے پوچھو، بلکہ میں تو کہوں تم تو آرام سے گھر بیٹھو، خوامخواہ ہی شوق کے پیچھے اتنے کام کی دردسری اٹھا رہی ہو۔" ناعمہ اپنا لنچ کرتے ہوئے بولی۔

"بس کیا کروں، جب مہینے کے آخر میں تنخواہ ہاتھ میں آتی ہے تو ساری دردسری ہوا ہو جاتی ہے۔" وہ ہنسی۔

"تو بس پھر برداشت کرو کیونکہ ناصر صاحب اور ان جیسے مرد سدھرنے والے نہیں۔" ناعمہ اپنا لنچ بکس بند کرتے ہوئے بولی۔

"چلیں لنچ بریک بھی ختم ہونے والا ہے۔"

"ہاں چلو۔" ثمرین بھی اٹھتے ہوئے بولی اور اپنی سیٹ کی راہ لی۔

☆ ☆ ☆

لفٹ خراب تھی یا نہ جانے کیا مسئلہ تھا۔ تھوڑی دیر تو ثمرین نے گراؤنڈ فلور پر کھڑے ہو کر لفٹ کا انتظار کیا۔ پھر دیر ہونے کی وجہ سے سیڑھیوں کی طرف قدم بڑھا دیے اور تیزی سے سیڑھیاں چڑھنے لگی ابھی تیسری منزل کی سیڑھیاں ہی چڑھ رہی تھی کہ اس کا سانس پھولنے لگا تھا۔ یہ ایک کثیر المنزلہ بلڈنگ تھی جس کے ہر فلور پر مختلف دفاتر، بینک اور کمپنیوں کے آفس وغیرہ تھے۔ سیڑھیوں پر اور لفٹ میں سارا دن لوگوں کی آمد و رفت کی وجہ سے رش رہتا۔ ثمرین نے گھڑی دیکھی۔

"اف آفس ٹائم شروع ہونے میں صرف پانچ منٹ رہ گئے۔" اس نے کہتے ہوئے سیڑھی کا موڑ کاٹا اور اسی وقت وہ اوپر سے آتے ہوئے کسی سے ٹکرائی تھی۔

"او سوری" ایک نرم سی آواز نے معذرت کی تھی۔

"میں اصل میں دوسری طرف دیکھ رہی تھی اسی لیے آپ کو نہ دیکھ سکی، ایک دفعہ پھر معذرت۔" وہ شرمندگی سے کہہ رہی تھی۔

"کوئی بات نہیں۔" ثمرین نے اپنے سے ٹکرانے والی لڑکی کو دیکھ کر کہا اور چہرے پر زبردستی کی مسکراہٹ لائی۔

"شاید غلطی میری تھی۔ میں ہی کچھ تیزی میں تھی۔"

"ارے نہیں آپ کی اس میں کوئی غلطی نہیں۔" لڑکی شاید فارغ تھی جب ہی اطمینان سے بات کر رہی تھی لیکن ثمرین کو تو دیر ہو رہی تھی لہٰذا وہ آگے بڑھ گئی۔

اور پھر اس پہلی ملاقات کے بعد وہ تو اس لڑکی کو تقریباً" بھول ہی جاتی جو وہ پانچویں دن پھر اسے نہ ملتی۔ آفس ٹائم ختم ہو چکا تھا اور ثمرین سیڑھیاں اتر رہی تھی کہ اچانک ہی کسی نے پیچھے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا وہ بری طرح چونکی تھی۔ پلٹ کر جو دیکھا تو وہی لڑکی تھی۔ چند لمحے تو وہ اسے پہچاننے کی کوشش کرتی رہی۔

"ارے اتنے جلدی بھول گئیں ابھی چند دن پہلے ہی تو ہماری آپ کی ملاقات انہی سیڑھیوں پر ہوئی تھی۔" وہ ہنسی تھی۔

"اوہ ہاں۔" وہ مروتاً" مسکرائی۔

"کیسی ہیں آپ؟ چوٹ تو نہیں لگی تھی نا آپ کو؟"

"نہیں نہیں، آپ کیسی ہیں؟"

"میں ایک دم فسٹ کلاس، آپ کا نام تو مجھے معلوم ہی نہیں۔" وہ شوخی سے بول رہی تھی۔

"ثمرین۔"

"واؤ، زبردست، کسی سے ملنے آئی ہیں یا کسی آفس میں جاب کرتی ہیں۔" وہ پوچھ رہی تھی۔

"ہاں اسی بلڈنگ میں ففتھ فلور پر میرا آفس ہے۔"

"ونڈر فل، پھر تو آپ سے ملاقات ہوتی رہے گی۔" وہ آج بھی اطمینان سے کھڑی باتیں کر رہی تھی لیکن ثمرین کو وین کی فکر تھی کہ کہیں اس کی وجہ سے دیر نہ ہو جائے۔

"اچھا میں چلتی ہوں میری وین نیچے میرا ویٹ کر رہی ہو گی۔"

"اوکے سی یو۔" اس نے کہا اور ثمرین نے بھی سر ہلا دیا۔ وہ نیچے آئی تو سب ہی وین میں بیٹھ چکے تھے اور اسی کا انتظار تھا۔

"کہاں رہ گئی تھیں۔" شبانہ پوچھ رہی تھی۔

"ہاں بس وہ۔" وہ ٹال گئی کیا کہتی اور پھر یہ ملاقاتیں اور اتفاقات اکثر ہونے لگے۔ ایک، دو دفعہ تو اس نے دور سے ہی اسے دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ ایک دفعہ باقاعدہ نام لے کر اسے پکارا کیونکہ وہ کافی فاصلے پر تھی۔ اپنا نام سن کر وہ سٹپٹا گئی تھی۔ اسے اچھا نہیں لگا تھا بھلا اتنے لوگوں کے درمیان اسے نام سے پکارنے کی کیا ضرورت تھی۔

"ہیلو۔" ثمرین چھٹی منزل پر آفس کے کام سے کسی سے ملنے گئی تھی کہ کسی نے اسے پکارا تھا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا وہی تھی۔

"ثمرین کیسی ہو؟" وہ بے تکلفی سے پوچھ رہی تھی۔ جواب میں ثمرین نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا تھا۔

"یہاں کیسے؟" اس نے اگلا سوال کیا۔

"کسی سے ملنے آئی تھی۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"آپ یہاں ہوتی ہیں۔" ثمرین نے پہلی دفعہ اس سے سوال کیا تھا۔

"آں، ہاں، ہاں میں یہاں اسی فلور پر ہوتی ہوں؟"

"ثمرین، تم میرڈ ہو یا ان میرڈ؟" اس نے ایک اور ذاتی سوال کیا۔

"میرڈ ہوں، کیوں؟"

"لگتی جو نہیں، اتنی پیاری ہو، خوب صورت اور حسین۔" اس نے ثمرین کے بالوں کو چھوتے ہوئے کہا اور بالوں کی لٹ جو چہرے پر جھول رہی تھی اسے کان کے پیچھے اڑسا۔ ثمرین متحیر سی اس کی بات سن رہی تھی اور اس کی اس حرکت پر تو بے ساختہ ہی پیچھے ہٹ کر اپنے چہرے سے اس کا ہاتھ ہٹایا۔ تب ہی کسی نے اسے آواز دی۔ وہ جلدی سے اس آواز کی سمت بڑھی تھی۔

"ارے ثمرین میری بات سنو۔" لیکن ثمرین نے ان سنی کر کے چلی گئی تھی۔

آفس کے کام کے سلسلے میں جس سے ملنا تھا اس سے بات کر کے وہ جب کرسی سے اٹھنے لگی تو اچانک ہی میڈم رابعہ نے اس سے سوال کیا تھا۔

"وہ کون تھی ثمرین جس سے تم بات کر رہی تھیں؟"

"کون؟" وہ لحہ بھر کے لیے حیران ہوئی۔

"وہی جس سے تم ابھی باتیں کر رہی تھیں۔" وہ سرسری لہجے میں پوچھ رہی تھیں۔

"وہ ' ہاں وہ میری ملنے والی تھی۔" اس نے جواب دیا اور جلدی سے اٹھ گئی اور پھر اپنے دفتر میں آتے آتے اور سیٹ پر بیٹھتے تک وہ اس انجان لڑکی کے بارے میں سوچ رہی تھی جس کا نام بھی اس نے اب تک نہ پوچھا تھا۔

" حالانکہ وہ مجھ سے کتنی باتیں معلوم کر چکی ہے۔" آج اسے پہلی دفعہ یہ خیال آیا تھا اور اس کی آج کی حرکت ثمرین نے بے ساختہ ہی اپنا ہاتھ چہرے پر پھیرا۔

"یہ تو میرے پیچھے ہی پڑ گئی ہے۔ ناعمہ کو بتاؤں؟" اس نے سوچا پھر خود ہی اپنے خیال کو جھٹکا۔

"اگر وہ اس لڑکی کے بارے میں کچھ پوچھے گی تو میں کیا جواب دوں گی جیسے میڈم رابعہ نے پوچھا اور میں گڑبڑا گئی' یعنی حد ہو گئی میں نے اب تک اس کا نام ہی نہیں معلوم کیا۔" خیالات کی یلغار تھی جو اس کے دل و دماغ میں آ رہی تھی۔ کتنی ہی دیر وہ یہی سب سوچتی رہی کہ باس نے بلا کر اس کے ذمہ نیا کام حوالے نہ کر دیا۔

☼ ☼ ☼

آج ناعمہ نہیں آئی تھی وہ اکیلی ہی بیٹھی لنچ کر رہی تھی کہ کسی نے کھنکار کر اسے متوجہ کیا اس نے سر گھمایا تو وہی لڑکی اسے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

"ارے آپ یہاں' آپ کو کیسے پتا کہ میں یہاں' اس آفس میں کام کرتی ہوں۔"

"اس میں کیا مشکل' اچھا چلو میں تم کو لینے آئی ہوں۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ آج ہم لنچ اکٹھے کریں گے۔"

"مگر کہاں؟ اور آپ نے اب تک مجھے اپنا نام تو بتایا ہی نہیں۔"

"تم نے پوچھا ہی نہیں ہو گا۔" وہ اپنے مخصوص انداز میں ہنسی۔

"ایمی نام ہے میرا' چلو جلدی سے اٹھو۔" وہ اسے ہاتھ سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے بولی اور اسے اوپر لے آئی۔

یہ اتفاق ہی تھا کہ ثمرین اتنے سالوں میں کبھی چھٹی منزل سے اوپر نہ آئی تھی۔ ایمی اسے آٹھویں منزل پر واقع ایک بے حد شاندار آفس میں لے کر آئی تھی۔ یہاں وہ اسے ایک آرام دہ صوفے پر بٹھا کر خود انٹرکام پر شاید لنچ کا آرڈر کرنے لگی تھی۔ ثمرین نے چاروں طرف نظریں گھمائیں۔ فل ایئر کنڈیشنڈ اور قیمتی فرنیچر سے آراستہ وہ دفتر اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کسی اور ہی جگہ آ گئی ہو۔ کسی غیر ملکی آفس میں۔

"کیا آپ یہاں کام کرتی ہیں؟" ثمرین نے پوچھا۔

"ہاں میں یہاں ہوتی ہوں۔"

"یہ کس چیز کا دفتر ہے۔" ثمرین سادگی سے پوچھ رہی تھی۔

"بتاؤں گی پہلے لنچ کرتے ہیں۔" ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ دروازے پر ناک ہوئی اور ایک ملازم میز پر ٹرے سے سامان اٹھا کر لگانے لگا۔

"یہ اتنا کچھ۔" ثمرین حیرت سے سب دیکھ رہی تھی۔

"ارے کچھ نہیں ہے اور پھر تم پہلی دفعہ آئی ہو' اتنا تو حق بنتا ہے۔" وہ مسکرائی۔

ثمرین نے لنچ کے دوران ہی آج پہلی دفعہ اسے غور سے دیکھا تھا وہ لڑکی ایمی جو پچیس اور تیس کے درمیانی عمر میں ہو گی اتنی خوب صورت تھی نہیں جتنا اس نے اپنے آپ کو بنا سنوار کر رکھا تھا۔ اس کے انداز میں ایک عجیب سا اسرار تھا۔ اس کی گفتگو بھی شائستہ نہ

تھی وہ مسلسل ثمرین کی' اس کی ڈریسنگ' اس کے حسن اور اس کے فگر کی تعریف کر رہی تھی۔

"ثمرین تم کہاں اپنے آپ کو ضائع کر رہی ہو۔ میں تمہیں اس سے بھی پرکشش جاب دلوا سکتی ہوں؟"

"کہاں؟" ثمرین نے اچنبھے سے پوچھا۔

"تم میرے پاس آجاؤ۔" وہ مزے سے بولی۔

"لیکن یہاں کیا کام ہو گا؟"

"بہت آسان' دراصل یہ ایک ٹی وی چینل کا دفتر ہے اس کے علاوہ ہم دو تین انگلش میگزین بھی نکالتے ہیں' تم ہمارے میگزین کے لیے ماڈلنگ کرو' سچ کہتی ہوں' راتوں رات شہرت حاصل کر لو گی پھر ہم تمہیں الیکٹرونک میڈیا پر لائیں گے اور تم شہرت کی بلندیوں کو چھو لو گی کیونکہ میں نے تمہارے اندر چھپے ٹیلنٹ کو پرکھ لیا ہے پھر تم ہو گی اور دولت کے انبار ہوں گے۔"

ثمرین نے جواب دینے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ اس سے پہلے ہی ایمی نے اسے بولنے سے روک دیا۔

"ابھی کوئی جواب نہ دو گھر جا کر اچھی طرح سوچنا پھر جواب دینا' یہ میرا اور دفتر کا کارڈ ہے۔" اس نے ثمرین کے آگے کارڈ بڑھائے تو اس نے کچھ سوچتی نظروں سے اس کے ہاتھ سے کارڈ پکڑ لیے اور اٹھنے لگی۔

"ارے بیٹھو اپنی کولڈ ڈرنک تو پوری کر لو۔" اس نے گلاس ثمرین کے ہاتھ میں پکڑایا اور اسی وقت ایمی کے موبائل پر ایک انگریزی دھن بجنے لگی اس نے نمبر دیکھا اور ایکسکیوز کر کے اٹھی۔

"تم یہ ڈرنک پوری کرو میں ابھی آئی یہ کہہ کر وہ برابر والے کمرے میں گھس گئی۔

ثمرین نے چند گھونٹ لیے اور گلاس ٹیبل پر رکھ کر اس کارڈ کو دیکھنے لگی جو ایمی نے اس کے ہاتھ میں تھمائے تھے اور اسی وقت اس کی نظر گلاس ٹیبل کے نچلے حصے پر پڑی چند انگریزی فیشن میگزین وہاں رکھے تھے اس نے اٹھائے اور پھر جیسے جیسے وہ صفحے پلٹ رہی تھی ویسے ویسے ہاتھ پیروں پر پسینہ آ رہا تھا۔ اس نے ان ماڈلز کو غور سے دیکھا آیا کہ وہ غیر ملکی ماڈلز ہیں یا

اپنے ہی ملک کی! اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ لڑکیاں ایک مسلمان ملک کی باشندہ ہیں۔ جو فیشن کے نام عریانی وفحاشی پھیلا رہی تھیں۔ اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔

"یہ لباس کی نمائش کر رہی ہیں یا اپنی۔۔۔ اف۔"
اس سے مزید وہ میگزین نہ دیکھا گیا اس نے ایک نظر اس دروازے پر ڈالی جہاں سے ایمی گئی تھی اور تیزی سے میگزین کو واپس جگہ پر رکھ کر اس آفس سے نکلتی چلی گئی۔ اپنے دفتر آکر اس نے سیٹ پر بیٹھ کر سکون کا سانس لیا۔ پھر اس کا ذہن منتشر ہی رہا۔ کام میں بھی دل نہ لگ رہا تھا تو وہ طبیعت خرابی کا کہہ کر آفس سے اٹھ گئی۔ گھر آکر بھی وہ بے چین ہی رہی۔

"ایمی نے کیا سوچ کر مجھے یہ آفر کی' کیا میں اسے ایسی لگتی ہوں کہ اتنی بیہودہ ماڈلنگ کروں گی' اگر میں دفتر میں کام کرتی ہوں تو اس کا یہ مطلب تھوڑی کہ ایسے کام بھی کروں' اس کی ہمت کیسے ہوئی' غصے کے مارے اس کا برا حال تھا۔

تبھی اسے یاسر کی کئی ماہ پہلے کہی ہوئی بات یاد آئی تھی کہ لوگوں کی نظروں میں کیسی ہوس ہوتی ہے اور اس نے لوگوں سے مراد صرف مرد کی نظریں لی تھیں اسے نہیں معلوم تھا کہ مرد کے ساتھ چند عورتیں بھی ایسی ہیں جو اپنی جیسی دوسری عورتوں کو اتنی ہی ہوس ناک نظروں سے ٹٹولتی ہیں اور ان کو بھی ایک بازار میں بکنے والی جنس ہی سمجھتی ہیں۔

اگلے دن اس کی ایمی سے ملاقات ہوئی اور جب ایمی نے اس کا جواب مانگا تو اس نے اپنے ہینڈ بیگ سے دونوں کارڈ نکالے اور اس کے سامنے ہی ان کے چار ٹکڑے کرکے اس کو پکڑا دیے اور اطمینان سے واپس مڑ گئی۔ ایمی حیران نظروں سے اسے دیکھتی رہ گئی اسے ثمرین کی طرف سے شاید اتنے سخت جواب کی توقع نہ تھی۔

☼ ☼ ☼

ہفتے کو ثمرین کا آف تھا اور وہ حسب معمول مصروف تھی۔ ہانیہ پڑوس میں گئی ہوئی تھی۔ جہاں اس کی ہم عمر بچی سے بڑی دوستی ہو گئی تھی۔ لہٰذا ثمرین جلدی جلدی اپنے کام نمٹا رہی تھی۔ ساتھ ہی اس کے ذہن میں پچھلے ہفتے ہونے والے واقعات بھی گھوم رہے تھے۔ ایمی کو اس کے کارڈ پھاڑ کر دینے پر ایمی کی طرف سے بڑا سخت رد عمل سامنے آیا تھا۔ اس نے ثمرین کو کئی فون کیے تھے' لیکن ثمرین نے ہر دفعہ ہی اس سے بات نہ کی' پھر وہ دو دفعہ آفس بھی آئی' آخر کار ثمرین نے ناعمہ کو ساری صورت حال بتائی۔ جس نے آفس کے ایک کولیگ جمال صاحب جو خاصے ادھیڑ عمر تھے' کو درمیان میں ڈال کر معاملہ بڑی خوش اسلوبی سے نمٹا دیا تھا۔

اس کے بعد ثمرین نے دو دن کی آفس سے چھٹی لی اور اپنے آپ کو ریلیکس کرتی رہی کیونکہ وہ اس ساری صورت حال سے پریشان ہو گئی تھی۔ یاسر کو اس نے اس معاملے سے دور ہی رکھا تھا کہ مبادا وہ کہیں غصے میں آکر بات کو خراب ہی نہ کر دے اور یہ خدا کا شکر ہی تھا کہ معاملہ بخیر و خوبی نمٹ گیا تھا اور حالات پھر سے معمول پر آگئے تھے۔ لیکن شاید واقعہ اس کی زندگی میں ایک ٹرننگ پوائنٹ کی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ جو چادر اور چار دیواری کو کوئی اہمیت نہ دیتی تھی۔ اس کے خیالات بھی کسی حد تک بدل گئے تھے۔ پردے اور حجاب کی اہمیت اس پر آہستہ آہستہ آشکار ہو رہی تھی۔ یاسر کے عبایا لانے پر اس نے کیسی باتیں نہ بنائی تھیں اور آج! عورت اور پردہ کتنا لازم و ملزوم ہے یہ ایمی اور ناصر صاحب جیسے مردوں کی معاشرے میں موجودگی نے اس کا احساس دلوا دیا تھا۔ وہ آج خود اپنے خیالات کے آگے پہلی دفعہ پسپا ہو گئی تھی۔

کام سے فارغ ہو کر وہ اپنی الماری کی طرف بڑھی اور یاسر کا کئی ماہ پہلے کا لایا ہوا وہ نیلا شاپنگ بیگ ڈھونڈنے لگی جس میں ایک مسلم عورت کی پہچان رکھی ہوئی تھی۔

☼ ☼

سمیرا غزل صدیقی

سحر ضوفشاں

"واہ بھئی کیا کہنے ہیں اس گورنمنٹ کے پیٹرول سستا کیا تو آٹا مہنگا کر دیا جب آٹا سستا کریں گے تو بجلی مہنگی کر دیں گے نیا سال ابھی آیا نہیں اور ان کی ڈرامہ بازیاں پہلے سے شروع ہو گئیں۔" حسب حال ٹی وی پہ خبریں دیکھتے ہوئے شازیہ نے اپنا تبصرہ جاری کیا تھا اپنے ہاتھوں پہ نیل پالش لگاتی علیزہ نے سر اٹھا کے اسے بڑی کوفت سے دیکھا تھا۔

"اف یار تم کبھی کچھ اور بھی دیکھ لیا کرو جب دیکھو نیوز چینل لگا کے بیٹھ جاتی ہو بہت ہی بورنگ ہو گئی ہو تم ابھی سے جب سے تم نے صحافت جوائن کی ہے۔" علیزہ اس کی بہن تھی اور اس کی صحافت کی وجہ سے سخت بور ہوتی تھی ایک تو وہ گھر پر ہوتی نہیں تھی اور جب ہوتی تھی تو اسے ہی بور کرتی تھی جبکہ علیزہ اس سے قدرے مختلف تھی فیشن پرستی کی دلدادہ اسے ڈراموں وغیرہ میں کافی دلچسپی تھی سیاست سے تو اس کا دور دور تک کوئی تعلق نہ تھا اس کی نظر میں آج کل کے دور میں سیاست سے دلچسپی رکھنا سراسر حماقت تھی۔

"حد ہوتی ہے علیزہ کبھی حالات پہ بھی نظر رکھ لیا کرو۔ کہ تمہارے اردگرد کیا ہو رہا ہے اتنی بھی بے زاری اچھی نہیں ہوتی۔" ہمیشہ کی طرح شازیہ کو اس کا ٹوکنا سخت ناگوار گزرا تھا نتیجتاً" وہ اس سے بحث کرنے لگ گئی تھی ہمیشہ دونوں ایسے ہی بات کرتے کرتے لڑنے لگ جایا کرتی تھیں۔

معروف نیوز چینل پہ شہر کراچی میں ہونے والے دھماکے کے متعلق خبر نشر کی جا رہی تھی دل دہلا دینے والے مناظر علیزہ جیسی نازک دل والی لڑکی سے کہاں برداشت ہوتے تھے سو اس نے جھٹ کھڑے ہو کے ٹی وی کا پلگ ہی نکال دیا تھا شازیہ کو اس کی حرکت سخت ناگوار گزری تھی۔

"آخر تمہیں کب سمجھ آئے گی علیزہ تم مت بیٹھا کرو میرے ساتھ اگر تم سے نہیں برداشت ہوتا تو۔"

"تو کہاں بیٹھوں جا کر ہمارا گھر کوئی بنگلہ نہیں ہے کہ جس کا جہاں دل چاہے وہاں بیٹھ جائے۔ دو کمروں کا گھر ہے جس میں سے ایک ماما پاپا کا ہے ایک ہمارا یہ میری مجبوری ہے کہ تمہارے ساتھ بیٹھنا پڑ رہا ہے ورنہ کبھی بھی ہر وقت نیوز برداشت نہ کروں تم پیچھا چھوڑ کیوں نہیں دیتیں ان سب کا صحافت سے تم کو کیا مل جائے گا تم کوئی اچھی جاب کرلو پلیز۔" علیزہ نے صوفے پہ بیٹھتے ہوئے کشن سنبھالا تھا۔

"تم چھوٹی ہو چھوٹی رہو مجھے مشورے مت دو جاؤ۔ جا کے کچن میں دیکھو امی بلا رہی ہیں تمہیں۔" اسماء بیگم نے کچن سے آواز لگائی تو شازیہ نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا ورنہ وہ نیوز نہ دیکھ پاتی دونوں بہنوں میں ایسے ہی نوک جھونک ہوا کرتی تھی۔ اسماء بارہا دونوں کو سمجھاتی تھیں مگر وہ ایک کان سے سنتیں اور دوسرے سے نکال دیتی تھیں مگر یہ بھی سچ تھا کہ ان دونوں کی اسی نوک جھونک اور پیار بھری تکرار میں ہی اس گھر کی رونقیں پوشیدہ تھیں۔

☼ ☼ ☼

"مس شازیہ آپ نے بلاشبہ ایک بہترین آرٹیکل لکھا ہے مگر آئی ایم سوری میں اسے شائع نہیں کر سکتا۔" رات بھر جاگ کے اس نے یہ آرٹیکل مکمل کیا تھا مگر مقامی اخبار کے ایڈیٹر کے انکار نے اسے حقیقتاً" چونکا کے رکھ دیا تھا نئے سال کے حوالے سے لکھے گئے آرٹیکل میں اس نے سال بھر میں پیش ہونے والے ناگوار حادثات و واقعات اور ان کی وجوہات پہ گہری روشنی ڈالی تھی۔

"مگر کیوں ظہیر صاحب کوئی کمی رہ گئی ہے تو بتا دیں میں صحیح کر دوں گی۔" اس کا موڈ یکدم آف ہوا تھا۔

"کمی کوئی نہیں ہے مگر میں نہیں چاہتا کہ نئے سال کے حوالے سے ہم دکھ و افسوس سے بھرے آرٹیکل شائع کریں یہ خوشی کا موقع ہے دنیا سلیبریٹ کرتی ہے جہاں آپ نے گورنمنٹ و حساس اداروں کی غلطیاں دکھائی ہیں ان پہ تنقید کی ہے وہیں آپ اس کے بجائے سال بھر کی جانے والی عوام کے لیے کوششوں کا ذکر کریں لوگوں کے ذہنوں پہ حکومت کے لیے مثبت اثر ڈالنے کی کوشش کریں نہ کے منفی۔" ظہیر صاحب نے عینک صحیح کرتے ہوئے بغور اس کا جائزہ لیا تھا۔

"معاف کیجیے گا سر مگر آپ شاید بھول رہے ہیں کہ ہم ایک اسلامی مملکت کی رعایا ہیں۔ یہاں پہ سال تو اول تو محرم الحرام سے شروع ہوتا ہے پھر بھی ہم انگریزی سال تو مناتے ہیں نمود و نمائش پہ لاکھوں روپے خرچ کرتے ہیں آتش بازی وغیرہ میں کئی جانوں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں اور سب سے بڑھ کر محرم یعنی نئے اسلامی سال کی شروعات ہی ہنگاموں اور دھماکوں سے ہوتی ہے۔ کبھی ماتمی جلوسوں میں دھماکے تو کبھی بارگاہوں میں دھماکے فسادات کرانے کی بھرپور کوششیں کی جاتی ہیں روز نجانے کتنے ہی معصوم لوگ اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں میڈیا کو تو بس دھرنوں اور جلسوں کی فکر ہے اوپر سے آپ مجھے کہہ رہے ہیں کہ میں مثبت لکھوں۔" ظہیر صاحب کی بات سن کے اسے بے حد افسوس ہوا تھا۔

"آپ کی بات درست ہے محترمہ مگر میں کیا کروں ضروری نہیں ہے کہ جو چیز دل میں ہو ہر وہ چیز ہر طرح کی تنقید میں شائع کر دوں آپ کو آرٹیکل چھپوانا ہے تو ویسا ہی لکھیں جیسا میں کہہ رہا ہوں۔" اب کے انہوں نے صاف لفظوں میں کہہ ڈالا تھا شازیہ نے انہیں سخت نظروں سے گھورا تھا۔

"اور ضروری نہیں ہے کہ آپ کے مفاد کی وجہ سے حق بات کو چھپا جائے صحافت آزاد ہوتی ہے قلم پہ پابندیاں لگانے سے سچ چھپ نہیں جاتا نہ ہی اس سے نظریں چرائی جا سکتی ہیں۔" اس نے نہایت غصے سے اپنی بات مکمل کی اور اپنا آرٹیکل ٹیبل سے اٹھا کے باہر آ گئی آنکھوں میں نمی در آئی تھی۔

☼ ☼ ☼

ظہیر صاحب کے انکار کے بعد اس نے دو تین جگہ اور کوشش کی تھی مگر وہاں بھی اسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس کا دل حقیقتاً" دکھ سے بھر گیا تھا دن رات محنت کر کے اس نے ایم اے کیا تھا صحافت میں نہایت کوششوں سے صحافت کی دنیا میں قدم رکھا تھا۔ وہ بھی محب الوطن تھی کچھ نہ سہی تو قلم کے ذریعے ہی وہ پاکستان کے لیے کچھ کرنا چاہتی تھی مگر اب اسے لگ رہا تھا کہ وہ ناکام ہو جائے گی وہ نہیں جانتی تھی کہ قلم پہ بھی پابندیاں لگ جاتی ہیں لکھنے سے پہلے اجازت لینی پڑتی ہے موضوع بھی دوسروں کی ہی مرضی کا ہوتا ہے حکومت تو کہتی ہے کہ صحافت آزاد ہے میڈیا آزاد ہے اسے شدید غصہ آ رہا تھا لوگوں کے دوغلے پن پہ۔

"بیٹا پریشان مت ہو پلیز اس طرح تو آپ اپنی صحت خراب کرلو گی۔" انور صاحب سے بیٹی کی پریشانی دیکھی نہیں جا رہی تھی وہ کب سے اسے ادھر ادھر ٹہلتا ہوا دیکھ رہے تھے انہیں بھی شازیہ کی زبانی صورتحال کا سن کے دکھ ہوا تھا۔

"آپ خود بتائیں تایا پاپا یہ کہاں کا انصاف ہے میرا دل چاہ رہا ہے کہ ان ایڈیٹرز کا گلا دبا دوں حد ہوتی ہے کسی چیز کی۔" شازیہ نے صوفے پہ بیٹھتے ہوئے ریموٹ سنبھالا تھا۔

"بیٹا جب اوپر سے نیچے تک ہر جگہ سے سسٹم خراب ہو تو آپ اور مجھ جیسے لوگ کچھ نہیں کر سکتے غصہ کرنے سے کیا ہو گا آپ کا کام تو صرف لکھنا ہے نا" چھاپنا نہ چھاپنا تو ان لوگوں کا کام ہے آپ مایوس مت ہو بیٹا۔" انور صاحب نے اسے سمجھانا عین فرض سمجھا تھا۔

"مگر پاپا۔۔۔"

"بس اب مت سوچو اتنا" جاؤ جا کے آرام کرلو۔" شازیہ نے مزید بولنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ انور صاحب نے ریموٹ اس سے لے کے اسے چپ کرا دیا تھا ناچار وہ اٹھ کے آرام کے لیے چلی گئی تھی۔

ابھی آرٹیکل نہ چھپنے کی پریشانی کم نہ ہوئی تھی کہ اس کے سر پہ ایک اور مصیبت آن نازل ہوئی تھی ظہیر صاحب نے فون کر کے اسے ارجنٹ اپنے آفس بلوایا تھا۔

"آئی ایم سوری مس شازیہ! آپ نے بچوں کی نفسیات و پرورش پہ اچھا آرٹیکل لکھا ہے مگر میں اسے ابھی شائع نہیں کر سکتا۔" کچھ دن بعد اس نے نیا آرٹیکل لکھ کے بھیجا تھا اسے امید نہیں تھی کہ پھر اس کے ساتھ ایسا ہوگا اس کے آرٹیکل کا تو سیاست اور تنقید سے کوئی تعلق بھی نہ تھا۔
"مگر کیوں ظہیر صاحب۔" اس کے منہ سے فقط کیوں ہی نکلا تھا۔
"کیوں کہ آپ نے ایک آرٹیکل لکھا تھا مرکزی جلوس میں دھماکے کے حوالے سے اور مجھ سے غلطی یہ ہوئی کہ وہ میں نے شائع کر دیا آپ کا وہ آرٹیکل دیگر اداروں و سربراہان نے بھی بخوبی پڑھا ہے اور جب سے میرے پاس مستقل فون آ رہے تھے جنہیں میں کچھ نہ کچھ کہہ کر ٹالتا رہا اور اب میرے پاس اوپر سے آرڈر آئے ہیں آئی ایم سوری اب میں آپ کا کوئی کالم شائع نہیں کر سکتا۔ کبھی کبھی قلم جب حد سے زیادہ سچ ہو جائے تو ایسا ہی ہوا کرتا ہے ہم ایسی کوئی بات شائع نہیں کر سکتے کہ جس سے کسی کی دل آزاری ہو یا کسی پہ انگلی اٹھے اب آپ جا سکتی ہیں۔" ظہیر صاحب نے دو ٹوک بات کی تھی۔
کہنے کو تو بہت کچھ تھا مگر شازیہ نے ان سے اب کوئی بات کرنا یا کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا اور وہاں سے چلی آئی۔

☼ ☼ ☼

"میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آزادی کی دعویدار ہماری میڈیا اور لوگ اس قدر تلخ ہیں میں نے تو ہمیشہ کوشش کی کہ سچ لکھوں پتا نہیں کیوں ہماری عوام ہماری حکومت ہمارے لوگ اس قدر بے حس ہو گئے ہیں۔" دل ہی دل میں خود کو مخاطب کرتی وہ حالات سے سخت دلبرداشتہ تھی اس کی سوچوں کا تسلسل اسماء بیگم کی آمد سے ٹوٹا تھا۔
"بیٹا اتنا مت سوچا کرو ابھی تو تمہارے ہنسنے کھیلنے کے دن ہیں۔" اس کے سر پہ انہوں نے پیار سے چپت رسید کی تھی۔
"امی آپ بھی روایتی ماں نہ بنیں اگر ہم لوگ ابھی بھی ہنستے کھیلتے رہے نہ تو یقین کریں ہمارا ملک ہماری آنکھوں کے سامنے برباد ہو جائے گا اور ہم لوگ کچھ نہ کر سکیں گے۔" وہ فوراً جذباتی ہوئی تھی۔
"اللہ نہ کرے بیٹا کہ ہمارے ملک کو کچھ ہو۔ تم چھوڑو یہ باتیں مجھے تم سے ضروری بات کہنی تھی۔" دائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں موجود انگوٹھی گھماتے ہوئے انہوں نے تمہید باندھی تھی۔
"جی بولیں کیا بات ہے۔" ضروری بات کا سن کے شازیہ فوراً متوجہ ہوئی تھی۔
"بیٹا دراصل تمہارے ابو کے جاننے والوں کی طرف سے تمہارے لیے ایک پروپوزل آیا ہے تمہارے ابو بتا رہے تھے کہ لڑکا اچھا ہے پڑھا لکھا ہے انہوں نے تو لڑکے کو کئی بار دیکھا ہے میں چاہتی ہوں کہ تم اس بارے میں سوچو وہ لوگ اسی سال شادی کرنا چاہ رہے ہیں۔ اس سنڈے کو وہ لوگ باقاعدہ تمہارا رشتہ لے کر آئیں گے۔" کافی تفصیل سے انہوں نے اپنی بات کی تھی۔ شازیہ نے الجھ کے انہیں دیکھا۔
"مگر امی آپ جانتی ہیں نا کہ میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی میں ابھی لکھنا چاہتی ہوں اپنا کیریئر بنانا چاہتی ہوں۔"
"میں سب جانتی ہوں بیٹا اور یہ بھی کہ تمہیں ہماری پسند پہ ہی بھروسہ ہے مگر بیٹا تمہارے ابو یہی چاہتے ہیں کہ جلد از جلد تمہارے فرض سے سبک دوش ہو جائیں اب تو تمہاری پڑھائی بھی تقریباً مکمل ہو گئی ہے۔" انہوں نے جیسے ہر صورت اسے راضی کرنے کی ٹھان رکھی تھی۔
"جب آپ نے اور ابو نے فیصلہ کر ہی لیا ہے تو پھر مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔" مسکراتے ہوئے اس نے بھی ہاں کر دی تھی اسماء بیگم نے مسکراتے ہوئے اسے گلے لگا لیا تھا ان کا دل مطمئن ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

آج اکتیس دسمبر تھا۔ سال کا آخری دن وہ کب سے

غائب دماغی سے اس سال ہونے والے سانحات پر غور و فکر کر رہی تھی۔ اس کے لکھنے پہ پابندی لگ گئی اس کی منگنی بھی ہو گئی۔ اس نے کیا کچھ سوچا تھا اور کیا کچھ ہو چلا تھا وہ ڈیفنس کے قریب فلیٹ کے ایک اپارٹمنٹ میں رہائش پذیر تھی جہاں کی بالکونی سے ساحل نظارہ ڈوبتے سورج کا حسین منظر اپنی آنکھوں میں مقید کیا جا سکتا تھا۔ سال کی ہر آخری شام وہ ساحل سمندر پہ ہی گزارتی تھی ابھی بھی ساحل سمندر پہ ایک سنگی بینچ پہ بیٹھی گہری سوچ میں گم تھی جیسے جیسے رش بڑھ رہا تھا ڈوبتے سورج کا منظر دیکھنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا جس میں زیادہ تعداد منچلوں کی تھی جنہوں نے اس ملک کے لیے صرف اتنا ہی کیا تھا کہ بائیک کے سلنسر نکال کے بڑے بوڑھوں اور بیماروں کو پریشان کیا تھا جا بجا پٹاخوں اور ہوائی فائرنگ کے ذریعے نجانے کتنے ہی گھرانوں کے چراغ بجھا دیے تھے ہر سال یہی تماشا اس شہر میں برپا ہوا کرتا تھا۔
آج بھی اک جم غفیر اس تماشا میں حصہ لینے جا رہا تھا۔ شازیہ نے تاسف سے نوجوانوں کو دیکھا تھا۔ وہ لڑکی تھی خود کو اس نے بدل لیا تھا ملک کے لیے کچھ نہ سہی تو وہ اپنے قلم کے ذریعے ہی لوگوں کے اذہانوں کو بدلنا چاہتی تھی۔ اس کے اندر جیسے کوئی انقلابی روح گھس آئی تھی جو جلد از جلد انقلاب لانا چاہتی تھی مگر اونچا اڑان بھرنے سے پہلے ہی اس کے پر کاٹ دیے گئے تھے اس سے پہلے کہ اس کی آنکھوں کی نمی مزید بڑھتی اس کی توجہ موبائل کے ٹون نے کھینچ لی تھی جہاں ایک مقامی اخبار کے ایڈیٹر کی کال اسی کی منتظر تھی اس نے دھڑکتے دل سے کال ریسیو کی تھی دوسری جانب سے دی جانے والی خبر نے اس کے اندر زندگی کی نئی روح پھونک دی تھی انہوں نے نہ صرف اس کے تنقیدی و توصیفی آرٹیکل چھاپنے کی اس سے درخواست کی تھی بلکہ اس سے اپنے اخبار کے لیے لکھنے کی بھی گزارش کی تھی۔
اس نے سنا تھا کہ یہ ملک اچھے لوگوں کی وجہ سے چل رہا ہے بلاشبہ یہاں کے سسٹم میں کئی طرح کی خرابیاں ہیں مگر کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو ایمانداری سے اس ملک کے لیے کام کر رہے ہیں جن کی وجہ سے آج تک یہ ملک چل رہا ہے دشمنوں کے ناپاک ہاتھوں سے محفوظ ہے اس بات پہ اس کا یقین مزید پختہ ہو گیا تھا۔ عباسی صاحب کی کال نے اسے پھر سے پرجوش کر دیا تھا۔
وہ جو ڈوبتے سورج کے ساتھ مزید ڈوبتی جا رہی تھی اس کال نے اسے نئی سحر کا پیغام بخشا تھا اس نے جلدی سے اپنا بیگ سنبھالا تھا کہ گھر جا کے اس اپنا آرٹیکل عباسی صاحب کو دینا تھا تاکہ وہ سال کے پہلے شمارے میں شائع ہو سکے یہی نہیں اسے ابھی بہت کچھ کرنا تھا ہمیشہ اپنے وطن عزیز کے لیے۔

☼ ☼

بقیہ ابن انشا

جلے" ان کی مجمع آرائیوں کا مرقع تھا۔ یہ کتاب صیغہ واحد متکلم میں لکھی گئی تھی۔ اور اسی صیغے کی گردان پر مشتمل تھی۔ جملہ معترضہ ختم ہوا) ہاں تو ذکر ہو رہا تھا ابن انشا کی "اردو کی آخری کتاب" کا' اس کے بارے میں بعض لوگوں کا خیال تھا کہ یہ اردو کی نہیں ہے۔ بلکہ غلط اردو کی کتاب تھی۔ ہمیں اس سے اتفاق نہیں ہے۔ کیونکہ ابن انشا غلط اردو بھی ارادتاً" نہیں لکھتے تھے۔ ہاں کبھی کبھی عادتاً" لکھ لیتے ہوں تو دوسری بات ہے۔ معترضین کو اگر اس پر اصرار ہے کہ ابن انشا غلط اردو لکھتے تھے تو ہم ان کا یعنی معترضین کا دل رکھنے کی خاطر یہ بات مانے لیتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی عرض کریں گے کہ جیسی غلط اردو ابن انشا لکھ گئے۔ ویسی لوگوں کو صحیح اردو لکھنی بھی نصیب نہیں ہوتی۔ "اردو کی آخری کتاب" اگر غلط اردو کی کتاب ہے تو کاش اردو میں ایسی چار کتابیں اور بھی ہوتیں' یہ کتاب دراصل ایک چھوٹا سا انسائیکلو پیڈیا ہے جس میں ریاضی' ابتدائی سائنس' حیوانیات' تاریخ اور اخلاقیات کے بارے میں بیش بہا معلومات جمع کر دی گئی ہیں۔ یہ معلومات بالکل نئی ہیں۔ ابن انشا سے پہلے کسی مصنف یا مفکر نے ان علوم کو اتنی خوب صورتی سے سمجھنے سمجھانے کی کوشش نہیں کی۔ (سمجھنے کی کم' سمجھانے کی زیادہ) اس کتاب کے مطالعے سے ابن انشا کے وسیع و عریض مطالعے کا اندازہ ہوتا ہے۔ انہوں نے مشکل سے مشکل مسئلے کو پانی کر دیا ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ہمارے سامنے اس کتاب کا جو نسخہ ہے وہ دریدہ ہونے کے ساتھ ساتھ آب رسیدہ بھی ہے۔ یعنی مسئلے مسائل کا پانی کتاب کے اوراق تک بھی پہنچ گیا ہے۔ اس کتاب سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابن انشا محض کالم نگار یا شاعر ہی نہیں تھے بلکہ صحیح معنوں میں عالم بھی تھے۔ افسوس کہ تذکرہ علمائے پاک و ہند میں ابن انشا کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔

معاصرین ابن انشا کے بے شمار معاصرین تھے جن میں سے اکثر کو تو یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ ابن انشا انہیں کے زمانے کا کوئی فرد ہے لیکن بعض سے موصوف کے تعلقات محض معاصرانہ ہی نہیں بلکہ دوستانہ اور عاشقانہ تھے۔ اس قسم کے معاصرین میں محمد خالد اختر' مشتاق احمد یوسفی اور جمیل الدین عالی خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اختر اور یوسفی کے بارے میں صرف اس قدر معلوم ہو سکا ہے کہ یہ دونوں بھی مقبول و معروف مصنف تھے اور ادبی دنیا میں ان کا نام بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ افسوس کہ اب ان دونوں کی تحریریں بھی بڑی حد تک نقش و نگار طاق نسیاں ہو چکی ہیں۔ البتہ اختر نے ابن انشا کی ایک کتاب کے فلیپ پر جو رائے لکھی تھی اور یوسفی نے "اردو کی آخری کتاب" پر جو دیباچہ تحریر کیا تھا۔ وہ ان دونوں ادیبوں کے نمونہ کلام کے طور پر باقی رہ گئے ہیں۔ محمد خالد اختر نے فلیپ پر ابن انشا کی جو تعریف کی ہے اس کا پہلا جملہ یہ ہے۔

"ابن انشا بخیل اور گھٹے ہوئے لکھنے والوں میں سے نہیں جو دو سال میں ایک شاہکار کو جنتے ہیں۔ وہ فیاضی سے فراوانی سے اور آسانی سے لکھتے ہیں۔"

ہماری رائے میں یہ ابن انشا کی تعریف نہیں' تنقیص ہے محمد خالد اختر نے بخل اور گھٹن کا جننے سے اور فیاضی' فراوانی اور آسانی کا لکھنے سے متعلق دکھایا ہے۔ اگر معاملہ برعکس ہوتا تو اس جملے کو یا ابن انشا کو چار چاند لگ جاتے معلوم نہیں محمد خالد اختر نے یہ بات سنجیدگی سے لکھی تھی یا بطور مزاح۔ ویسے سننے میں آیا ہے کہ اختر کا مزاح بہت سنجیدہ ہوتا تھا اور خاص خاص لوگ ہی اس سے محظوظ ہوتے تھے۔ عام لوگ جب محظوظ ہونا چاہتے تھے تو وہ دوران مطالعہ اپنے دائیں بائیں دو آدمیوں کو گدگدی کے لیے بٹھا لیتے تھے اس طرح وہ پڑھتے بھی جاتے تھے اور ہنستے بھی جاتے تھے۔

مشتاق احمد یوسفی نے ابن انشا کی کتاب پر جو دیباچہ لکھا ہے وہ نثر میں قصیدہ گوئی کی ایک عمدہ مثال ہے۔ اس دیباچے میں یوسفی نے ابن انشا کا دل رکھنے کو انہیں مزاح نگاروں کے قبیلے کا تارا کہا ہے تاکہ چاند کسی اور کو کہا جا سکے اور اپنے دل کی بات اس طرح بیان کی ہے کہ "بچھو کا کاٹا روتا ہے سانپ کا کاٹا سوتا ہے انشا جی کا کاٹا سوتے میں مسکراتا ہے۔" گویا یوسفی یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ابن انشا کاٹا بھی کرتے ہیں۔ اس انداز میں کوئی ہماری کتاب کا دیباچہ لکھتا تو ہم اس کتاب کو اپنی تصانیف سے اور دیباچہ نگار کو اپنے حلقہ احباب سے خارج کر دیتے۔ ابن انشا کی وسیع القلبی ہے کہ انہوں نے یوسفی کی اس بات کو نہ صرف برداشت کیا بلکہ بطور دیباچے کے اپنی کتاب میں

شامل کیا کہ کتاب کے ساتھ یہ دیباچہ بھی ایک دوست کی واحد یادگار کے طور پر محفوظ رہ جائے۔

ابن انشا کے تیسرے ہم عصر جمیل الدین عالی اپنے عہد کے مشہور شاعر' کالم نویس اور قومی نغمہ نگار تھے۔ ان کے بارے میں ابن انشا کی یہ رائے تھی کہ ان کی شاعری کو کالم نویسی' اور کالم نویسی کو ان کی قومی نغمہ نگاری لے ڈوبی لیکن الحمدللہ کہ قوم محفوظ رہی ابن انشا کی یہ رائے تعصب اور حسد پر مبنی ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ عالی میں بہت سی ایسی خوبیاں تھیں۔ جو ابن انشا کو چھو کر بھی گزر جاتیں تو ابن انشا کچھ سے کچھ ہو جاتے اسی لیے ابن انشا عالی کے مقابلے پر اپنے آپ کو ہمیشہ ایک احساس محرومی کا شکار پاتے تھے۔ مثلاً" عالی اپنے دور کے مشہور شاعر تھے۔ جب وہ مشاعروں میں پڑھتے تھے تو علم موسیقی کے اسرار و رموز سے ماہرانہ آشنائی کا ثبوت دیتے ہوئے پڑھتے تھے۔ اس کے برعکس ابن انشا کو اول تو مشاعروں میں بلایا نہیں جاتا تھا اور اگر بلایا جاتا تھا تو پڑھوایا نہیں جاتا تھا۔ عالی کے نغمے بچے بچے کی زبان پر تھے اور آخری زمانے میں تو صرف بچوں ہی کی زبان پر رہ گئے تھے۔ لیکن ابن انشا کی شاعری بچوں میں بھی مقبول نہ تھی۔ حالانکہ اس کا ایک حصہ بطور خاص بچوں ہی کے لیے لکھا گیا تھا۔ سننے میں آیا ہے کہ جب ابن انشا شاعری کے معاملوں میں بڑوں سے مایوس ہو گئے تو انہوں نے بچوں کو شیشے میں اتارنے کے لیے بہت سی نظمیں لکھیں۔ ان نظموں کے مجموعے کا نام "بلو کا بستہ" ہے اسے بچوں سے زیادہ بڑی عمر کے تبصرہ نگاروں نے پڑھا اور تعریفی تبصرے لکھے۔

عالی سے حسد کی وجہ یہ بھی تھی کہ عالی ابن انشا سے بڑے سیاح تھے۔ انہوں نے بعض ایسے ممالک کی بھی سیاحت کی تھی جن کا ابن انشا کے سفرنامے میں نام تک نہیں آیا۔ عالی نے سفرنامہ لکھنے کی روایت قائم کی اور ابن انشا نے ان کی تقلید کی۔ یہ دوسری بات ہے کہ عالی سفر میں آگے نکل گئے اور ابن انشا سفرنامے میں۔ لیکن ہم سچی بات کہیں گے کہ عالی کا سفرنامہ ایک علمی چیز ہے اور ابن انشا کا سفرنامہ علم سے تہی ہے۔ عالی کے سفرنامے میں جو معلومات ملتی ہیں وہ ابن انشا کے سفرنامے میں کیا... انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا میں بھی نہیں ملتیں۔ عالی کے سفرنامے سے لوگ عبرت حاصل کرتے ہیں اور ابن انشا کے سفرنامے سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا تھا۔

ابن انشا اور عالی ایک ہی اخبار میں کالم لکھتے تھے اور دونوں اپنے اپنے قارئین میں مقبول تھے۔ البتہ ایک معاملے میں عالی کو ابن انشا پر فوقیت حاصل تھی اور وہ یوں کہ ابن انشا کا کالم معرّیٰ یعنی بغیر تصویر کے ہوتا تھا اور عالی کے ہر کالم کے ساتھ ان کی تصویر ہوتی تھی۔ اس وجہ سے عالی کا کالم ابن انشا کے کالم سے زیادہ دیکھا جاتا تھا۔ یہ امر بھی ابن انشا کے لیے تکلیف دہ تھا۔ اپنی تکلیف کو دور کرنے کے لیے انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ مہینے میں دو ایک مرتبہ عالی کو موضوع بنا کر شگفتہ اردو لکھنے کی مشق کرتے۔ مشتاق احمد یوسفی نے وہ جو کاٹنے والی بات لکھی ہے اس کا اشارہ شاید اسی بات کی طرف تھا۔

عالی اور ابن انشا ایک دوسرے کے بارے میں جو کچھ لکھتے تھے۔ اسے بعض لوگوں نے "ملی بھگت" کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کی مشہوری کے لیے طے شدہ پروگرام کے مطابق کالم لکھتے تھے۔ اور چھپنے سے قبل ایک دوسرے کو دکھا لیتے تھے۔ بلکہ یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ اس قسم کے کالم ان دونوں میں سے ایک ہی شخص لکھتا تھا اور یہ کالم باری باری دونوں کے نام سے چھپتے تھے۔ لیکن ہمیں اس خیال سے اتفاق نہیں ہے کیونکہ دونوں کالم جداگانہ اسلوب کے حامل ہوتے تھے۔ ابن انشا کا کالم "واہ" ہوتا تھا تو عالی کا "آہ" گویا میر و سودا والا معاملہ تھا۔ بہرحال اس "ملی بھگت" کا یا معاصرانہ چشمک کا یہ نتیجہ نکلا کہ عالی نے نثر لکھنی تو کیا نثر میں گفتگو تک کرنی چھوڑ دی۔

خاتمہ ابن انشا کے بارے میں ہمیں جو کچھ معلوم تھا اور جو کچھ معلوم نہیں ہو سکا' وہ سب کچھ ہم نے اس رسالے میں بلا کم و کاست بیان کر دیا ہے۔ ہم اس کوشش میں کہاں تک کامیاب رہے ہیں' اس کا اندازہ کچھ ابن انشا ہی کر سکتے تھے۔ کاش وہ آج ہم میں موجود ہوتے تو دیکھتے کہ ہم نے انہیں حیات نو عطا کرنے کے لیے کس قدر زحمت اٹھائی ہے۔ اتنی زحمت تو ابن انشا نے اپنے سفروں کے دوران بھی نہیں اٹھائی ہو گی۔

آخر میں قارئین کرام سے گزارش ہے کہ اگر انہیں اس رسالے میں کوئی غلطی نظر آئے تو اسے موضوع کی خوبی سمجھ کر نظر انداز فرمائیں اور اگر کوئی خوبی نظر آئے تو ہمیں اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔

☼ ☼

پارس شاہ

ادارہ

☆ "آپ کا پورا نام گھر والے پیار سے کیا پکارتے ہیں؟"
"پارس' نک نیم پری ہے۔"

☆ "کبھی آپ نے آئینے سے آئینے نے آپ سے کچھ کہا؟"
"جی بالکل! آئینے نے مجھ سے کہا کہ میں بہت سوئٹ اور کیوٹ ہوں۔ ہاہاہا۔ شکر ہے اللہ تعالیٰ کا کہ جس نے مجھے مکمل اور خوب صورت بنایا۔ آہم!"

☆ "آپ کی سب سے قیمتی ملکیت؟"
"میرا قلم' میرے رشتے' میری ڈائری اور میرے دوست۔"

☆ "آپ کے لیے محبت کیا ہے؟"
"محبت دل پہ دستک ہے' محبت دنیا کا سب سے خوب صورت اور طاقت ور جذبہ ہے جو ایک وحی کی طرح آپ کے دل میں نازل ہوتا ہے۔ جس کے سامنے ہر چیز' ہر جذبہ بے معنی ہو جاتا ہے۔"

☆ "مستقبل قریب کا کوئی منصوبہ جس پر عمل کرنا آپ کی ترجیح میں شامل ہو؟"
"انسان جو چاہے پلان کرلے۔ ہوتا وہی ہے جو ازل سے آپ کے نصیب میں مقرر ہے۔ پھر بھی اک خواہش ہے کہ میں ایک مسیحا اور ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے آرمی کو جوائن کروں۔"

☆ "پچھلے سال کی کوئی کامیابی جس نے آپ کو مسرور و مطمئن کیا؟"
"میٹرک کے امتحان میں بہترین نمبر حاصل کرنا۔"

☆ "آپ اپنے گزرے کل' آج اور آنے والے کل کو ایک لفظ میں کیسے واضح کریں گی؟"
"کامیابی' خوشی اور امید۔"

☆ "اپنے آپ کو بیان کریں؟"
"چلبلی' شرارتی' نرم دل اور حساس۔"

☆ "کوئی ایسا ڈر جس نے آج بھی اپنے پنجے آپ میں گاڑے ہوئے ہیں؟"
"اپنے رشتوں اور دوستوں کو کھونے کا ڈر' کیونکہ میں پہلے ہی بہت سے دوست اور رشتے کھو چکی ہوں۔"

☆ "آپ کی کمزوری اور طاقت کیا ہے؟"
"کتابیں اور رشتے میری کمزوری ہیں' مطالعہ کے بغیر میں ادھوری ہوں۔ اللہ پر بھروسا میری سب سے بڑی طاقت ہے۔"

☆ "آپ خوش گوار لمحات کیسے گزارتی ہیں؟"
"جب میں خوش ہوتی ہوں تو بہت زیادہ ہنستی ہوں اور کینڈلز جلاتی ہوں یا پھر کزن اور سسٹرز سے شیئر کرتی ہوں۔"

☆ "آپ کے نزدیک دولت کی اہمیت؟"
"ہاتھ کا میل ہے دولت' کبھی اس کے پاس' تو کبھی اس کے پاس' ہاں اتنی ہونی چاہیے کہ آپ عزت کے ساتھ زندگی بسر کرسکیں۔"

☆ "گھر آپ کی نظر میں؟"
"عورت کے لیے سب سے زیادہ محفوظ پناہ گاہ' ایک ایسی سلطنت جس کی وہ ملکہ ہوتی ہے۔"
"کیا آپ بھول جاتی ہیں اور معاف کردیتی ہوں؟"
"بھولنا تو مشکل ہے' لیکن ہر ممکن کوشش کرتی ہوں کہ معاف کردوں اور اس کوشش میں کافی کامیاب بھی رہتی ہوں۔"

☆ "اپنی کامیابیوں میں کسے حصے دار ٹھہراتی ہیں؟"
"سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے میری اوقات سے بڑھ کر عطا کیا' اس کے بعد مجھے جو کچھ ملا میری ماں کی دعاؤں اور میری اپنی محنت کی وجہ سے ملا۔"

☆ "سائنسی ترقی نے ہمیں مشینوں کا محتاج کرکے کاہل کردیا یا واقعی یہ ترقی ہے؟"
"سائنسی ترقی نے ہمیں بہت سی سہولیات فراہم

کی ہیں' مگر دوسری طرف مشینوں کا محتاج کرکے کاہل بھی کردیا ہے' جہاں فوائد ہیں' وہاں دوسری طرف نقصانات بھی ہیں۔"

☆ "کوئی عجیب خواہش؟"
"کہ کاش میں کسی ناول یا اسٹوری کا کوئی کردار ہوتی جو ایسے ناول یا اسٹوری کو پڑھنے پر سانس لیتا ہے۔"

☆ "برکھارت کو کیسے انجوائے کرتی ہیں؟"
"برکھارت کو بارش میں بھیگ کر انجوائے کرتی ہوں یا پھر دریچے سے لگ کر برستی بارش کو خاموشی سے دیکھتی ہوں اور گیلی مٹی کی سوندھی سی خوشبو کو اپنے اندر اتارتی ہوں۔"

☆ "آپ جو ہیں' وہ نہ ہوتی تو کیا ہوتیں؟"
"میں جو ہوں' اگر وہ نہ ہوتی تو شاید پارس نہ ہوتی' ایک اچھی اسٹوڈنٹ نہ ہوتی اور کتابوں کی دیوانی نہ ہوتی شاید۔"

☆ "آپ بہت اچھا محسوس کرتی ہیں جب؟"
"بھائی کی آواز سنتی ہوں' شام کو سیڑھیوں پر اکیلی بیٹھ کر ڈوبتے سورج اور گھونسلوں کو لوٹتے پرندوں کو دیکھتی ہوں اور جب ہم سب اکٹھے ہوتے ہیں سب کزنز اور رشتے دار وغیرہ۔"

☆ "آپ کو کیا چیز متاثر کرتی ہے؟"
"دوسروں کی سیرت' بات کرنے کا انداز' خوب صورت آنکھیں اور خلوص۔"

☆ "کیا آپ نے اپنی زندگی میں وہ سب پالیا جو آپ پانا چاہتی تھیں؟"
"بہت کچھ پالیا ہے' مگر ابھی بہت کچھ رہتا ہے جو مجھے حاصل کرنا ہے اپنے لیے' اپنے ملک کے لیے اور اپنی فیملی کے لیے۔"

☆ "اپنی ایک خوبی اور ایک خامی جو آپ کو مطمئن یا مایوس کرتی ہے؟"
"نرم دلی' ہمت اور صبر کرنا میرے خیال میں میری خوبی ہے' جو مجھے کامیابی سے ہمکنار کرتی ہے۔ بہت زیادہ غصہ کرنا میری خامی ہے' جس سے بہت مایوس ہوں۔"

☆ "کوئی ایسا واقعہ جو آج بھی آپ کو شرمندہ کردیتا ہے؟"
"ایسا کبھی کوئی واقعہ پیش ہی نہیں آیا جو بیان کرسکوں۔"

☆ "کیا آپ مقابلے کو انجوائے کرتی ہیں یا خوف زدہ ہو جاتی ہیں؟"
"مقابلہ ہمیشہ انجوائے کرتی ہوں' ہار جیت تو زندگی کا حصہ ہے' کبھی کبھی انسان کو ہار بھی لینا چاہیے' کیونکہ ہار کا بھی اپنا مزا ہوتا ہے۔ ہر بار جیت جانے سے جیت کا مزا ختم ہو جاتا ہے۔"

☆ "متاثر کن کتاب' مصنف' مووی؟"
"زاویہ' نون' ناول جنت کے پتے' اشفاق احمد' عشیر الٰہی' نمرہ احمد' مووی دیکھتی نہیں ہوں۔"

☆ "آپ کا غرور؟"
"میرا قلم' میرا صبر' میری ہمت' میری ثابت قدمی اور سب سے بڑھ کر میرا ملک پاکستان۔"

☆ "کوئی ایسی شکست جو آج بھی آپ کو اداس کردیتی ہو؟"
"ایسی کوئی شکست نہیں۔"

☆ "کوئی شخصیت یا کسی کی حاصل کی ہوئی کامیابی جس نے آپ کو حسد میں مبتلا کیا ہو؟"
"جی نہیں' میں کسی سے حسد نہیں کرتی' میں اس بات پر یقین رکھتی ہوں کہ انسان کو دوسروں سے حسد کرنے کی بجائے خود کو اتنا اچھا اور کامیاب انسان بنانا چاہیے کہ دوسرے آپ کو آئیڈیلائز کریں اور آپ جیسا اچھا انسان بننے کی کوشش کریں۔"

☆ "مطالعہ کی اہمیت آپ کی زندگی میں؟"
"میرے لیے مطالعہ کی اتنی اہمیت ہے' جتنی زندہ رہنے کے لیے آکسیجن کی اہمیت ہوتی ہے' کتاب آپ کی بہترین دوست ہوتی ہے۔"

☆ "آپ کی پسندیدہ شخصیت؟"
"حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم' علامہ اقبال' جہان اور خرم بھائی۔"

☆ ☆

میری بھی سنیے

سمیع خان

شاہین رشید

1 "میرا اصلی نام؟"
"منصور اسلم خان نیازی۔"

2 "شوبز کا نام؟"
"سمیع خان اور یہ نام میں نے اپنی مرضی سے نہیں رکھا بلکہ اپنے ایک دوست کے کہنے پر رکھا۔ اور کیوں رکھا۔ یہ تو مجھے خود بھی نہیں معلوم ہے۔"

3 "میرا تعلق؟"
"میاں والی عیسیٰ خیل سے ہے۔"

4 "جنم شہر/ جنم تاریخ؟"
"لاہور/ 6 جولائی۔"

5 "میرے والدین؟"
"میرے والد کا نام محمد اسلم خان نیازی ہے۔ وہ ایک نجی کمپنی میں جاب کرتے ہیں اس سے قبل وہ گوجرانوالہ میں ایم ڈی واس کے عہدے پر فائز تھے اب ریٹائر ہو گئے ہیں۔ والدہ ہاؤس وائف ہیں۔"

6 "بہن بھائی؟"
"ہم تین بھائی اور ایک بہن ہیں۔"

7 "تعلیمی قابلیت؟"
"انجینئر ہوں۔"

8 "شادی؟"
"جی شادی ہو چکی ہے۔ بیگم کا نام شانزے خان ہے۔"

9 "بچپن؟"
"بہت سہانا گزرا... کھیلتے کودتے مستیاں کرتے۔ بہت خوب صورت دور تھا اور پڑھائی میں بھی بہت تیز تھا۔"

10 "فیلڈ میں آمد؟"
"اتفاقاً" اصل میں تو مجھے ہوسٹنگ کا شوق تھا اور اس خواہش کی تکمیل کے لیے پرائم ٹی وی پہ آڈیشن دیا اور کامیاب بھی ہو گیا... مگر میرا انتخاب شو کے لیے نہیں ہوا بلکہ فلم کے لیے ہوا۔"

11 "پہلی فلم/ پہلا ڈرامہ؟"
"پہلی فلم راشد خواجہ کی "سلاخیں" پہلا سیریل "دل سے دل تک" اور یہ بات ہے 2004ء کی اور مزے کی بات کہ پہلی ہی فلم میں "ہیرو" آیا۔"

12 "والدین کیا چاہتے تھے؟"
"جس فیلڈ میں ڈگری لی ہے اسی میں نام کماؤں... مگر نصیب میں تو شوبز لکھا تھا... اس لیے آ گیا۔ شروع میں مخالفت بھی ہوئی اور مشکلات بھی... مگر مزا آ گیا تھا اس فیلڈ میں اس لیے چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔"

13 "فیلڈ میں بیوٹی کام آئی یا ٹیلنٹ؟"
"دونوں... مگر ٹیلنٹ زیادہ کام آیا... کیونکہ بیوٹی تو ایک بار چلتی ہے جبکہ ٹیلنٹ ہمیشہ کام آتا ہے۔"

14 "فخر کا لمحہ؟"
"جب والدین نے کہا کہ تمہارا نام ہماری پہچان بن جائے گا اور یہ کہ مجھے فخر ہے اپنے بیٹے پر۔"

15 "شادی کے فائدے یا نقصانات ہیں؟"
"دونوں ہیں۔ شادی سے پہلے دوستوں کی محفل اور بے فکری کی زندگی اور شادی کے بعد ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں اور بیوی کا ہر طرح سے خیال رکھنا پڑتا ہے۔"

16 "مجھے جو بات لوگوں میں نمایاں کرتی ہے؟"
"لوگوں پر جلدی اعتبار کر لیتا ہوں۔ سب کے کام آتا ہوں اور میری شخصیت میں کوئی بناوٹ نہیں ہے۔"

17 "بہترین وقت جو میں گزارتا ہوں؟"
"صرف اور صرف اپنی فیملی کے ساتھ گزرے وقت کو بہترین وقت کہہ سکتا ہوں۔"

18 "ایک کام جو مکمل کرنا چاہتا ہوں؟"
"ادھورا ماسٹرز جو مکمل کرنا چاہتا ہوں۔"

19 "موبائل سروس آف ہو تو؟"
"واہ جی واہ... بہت سکون میں ٹائم گزرتا ہے۔"

20 "میں حیران ہوتا ہوں؟"
"کہ لوگ نفرت کیسے کر لیتے ہیں۔"

21 "انٹرنیٹ اور فیس بک کو زندگی سے نکال دیا جائے تو؟"
"تو کوئی مسئلہ نہیں... ای میلز چیک کر لیتا ہوں باقی کاموں کے لیے وقت ہی نہیں ملتا۔"

22 "وہ فلم جو پہلی بار سینما میں دیکھی؟"
"Cliff Hanger"۔

23 "میں Irritate ہو جاتا ہوں؟"
"جب کوئی چیز اپنی جگہ سے نہ ملے... بس پھر مت پوچھیں Irritate (اریٹیٹ) بھی ہوتا ہوں اور غصہ بھی بہت آجاتا ہے۔"

24 "والٹ میں کیا کیا رکھتا ہوں؟"
"بیگم کی تصویر۔ اے ٹی ایم کارڈ اور کچھ رقم۔ کہ اے ٹی ایم مشین نہ ملے تو مسئلہ نہ ہو۔"

25 "دل کی سنتا ہوں یا دماغ کی؟"
"زیادہ تر دل کی سنتا ہوں۔"

26 "اپنے فیصلے خود کرتا ہوں یا؟"
"مشورہ لے لیتا ہوں مگر زیادہ تر فیصلے خود ہی کرتا ہوں اور اللہ کا شکر ہے کوئی فیصلہ غلط نہیں ہوا۔"

27 "اپنی شہرت پر کیا سوچتے ہیں؟"
"رب کا شکر ادا کرتا ہوں اور ڈرتا ہوں اس وقت سے کہ جب لوگ پسند کرنا بند کر دیں گے... اللہ نہ کرے ایسا ہو... اس لیے ہمیشہ انکساری سے کام لیتا ہوں۔"

28 "نئی نسل کے لیے کہنا چاہتا ہوں؟"
"کہ والدین کی عزت و خدمت کریں، چھوٹوں سے پیار، پھر دیکھیں اللہ آپ کو کتنا نوازتا ہے۔"

29 "شاپنگ "ضرورتاً" کرتا ہوں یا انجوائے کرتا ہوں؟"
"شاپنگ "ضرورتاً" ہی کی جاتی ہے۔ لیکن اگر خوش دلی کے ساتھ کی جائے تو اچھا لگتا ہے۔ میں بیگم کے ساتھ زیادہ تر شاپنگ کرتا ہوں۔"

30 "ٹیگ دیکھ کر پرائس دیتا ہوں یا؟"
"ٹیگ پہ لکھے پرائس ہی دیتا ہوں۔ بارگیننگ کی عادت نہیں ہے نہ مجھے نہ بیگم کو۔"

31 "کن چیزوں کو لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتا؟"
"سیل فون۔ گاڑی کی چابی اور والٹ تو بہت ہی ضروری ہوتا ہے۔"

32 "فیوچر پلاننگ؟"
"تعلیم سے فارغ ہوا تھا تو فیوچر کے بارے میں بہت سوچتا تھا' مگر جب فیلڈ میں آیا تو اللہ تعالیٰ راہیں کھولتا چلا گیا۔ تو جو پلان کیا تھا اس سے زیادہ مل گیا ہے۔"

33 "میرا خوب صورت دور؟"
"بچپن اور موجودہ دور... بچپن بے فکری کا دور تھا۔ اب کے دور کو انجوائے کر رہا ہوں۔"

34 "کوکنگ سے لگاؤ/ کھانے سے لگاؤ؟"
ہاہاہا... "کھانے سے لگاؤ ہے کوکنگ سے لگاؤ نہیں ہے۔ بہت مجبوری ہو تو ٹوٹا پھوٹا قسم کا آملیٹ بنا لیتا ہوں۔"

35 "تعریف یا تنقید کیا پسند ہے؟"
"تعریف تو سب کو ہی پسند ہوتی ہے... مجھے بھی ہے مگر مجھے مثبت تنقید بھی اچھی لگتی ہے کہ اس سے آپ کو سیکھنے کا موقعہ ملتا ہے۔"

36 "مرد سخت دل ہوتا ہے یا؟"
"ارے نہیں جی مرد بھی انسان کا بچہ ہوتا ہے اس کے سینے میں بھی دل دھڑکتا ہے جو کہ بہت نازک اور نرم ہوتا ہے... بس اللہ نے مرد کو طاقت دی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو مضبوط بنائے رکھتا ہے اور دوسروں کو سخت دل نظر آتا ہے۔"

37 "پسندیدہ میوزک سنجیدہ یا پاپ؟"
"موڈ پر منحصر ہے... ویسے ہلکی پھلکی میوزک پسند ہے اور کبھی کبھی سنجیدہ بھی۔"

38 "دنیا سے کیا ختم کرنا چاہتے ہیں؟"
"نفرت اور لالچ کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔"

39 "فیلڈ میں جگہ بنانے کے گر؟"
"کوئی خاص نہیں... دوسروں کے بارے میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن میرا اپنا خیال ہے کہ کسی کا برا نہ چاہیں اور محنت اور لگن سے کام کرتے رہیں تو سب کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے۔"

40 "صبح جلدی اٹھنے کی عادت ہے یا؟"
"مجھے صبح جلدی اٹھنے کی عادت ہے۔ کتنی ہی دیر سے کیوں نہ سوؤں تقریباً" آٹھ ساڑھے آٹھ تک اٹھ جاتا ہوں۔"

41 "فضول خرچ ہوں یا؟"
"فضول خرچ نہیں کہہ سکتے' ضرورت کی چیزیں خریدتا ہوں۔ مگر خرچ کرتے وقت سوچتا نہیں ہوں۔ کیونکہ انسان کماتا کس لیے ہے۔"

42 "فیشن کو فالو کرتا ہوں یا اپنے دل کو؟"
"فیشن کو فالو کرنا پڑتا ہے کیونکہ زمانے کے ساتھ چلنا اچھا لگتا ہے لیکن دل کی بھی مانتا ہوں۔"

43 "محنت سے پیسا ملتا ہے یا قسمت سے؟"
"لکھا قسمت سے ہوتا ہے۔ محنت انسان کرتا ہے کیونکہ اسے نہیں معلوم ہوتا کہ اس کی قسمت میں کیا لکھا ہے۔"

44 "چھٹی کا دن کہاں گزارتے ہیں؟"
"اپنی فیملی کے ساتھ کہیں بھی نکل جاتا ہوں۔"

45 "اچھی اور خوشگوار زندگی گزارنے کے لیے کیا ضروری ہے؟"
"محبت اور محبت... مگر پیسہ بھی ضروری ہے۔"

46 "بے ساختہ مسکرا دیتا ہوں؟"
"جب اپنے بچپن کی باتیں سوچتا ہوں کہ شرارتیں کوئی کرتا تھا اور ڈانٹ مجھے پڑتی تھی۔"

47 "میری ایک عادت جو گھر والوں کو پسند نہیں؟"
"کہ میں اکثر اوقات غصہ میں آجاتا ہوں اور بہت زیادہ غصے میں آجاتا ہوں۔"

48 "سالگرہ کب مناتا ہوں؟"
"6 جولائی کو... اور اپنی فیملی کے ساتھ... خوب انجوائے کرتا ہوں۔"

49 "خونی رشتوں میں کون سا رشتہ اچھا لگتا ہے؟"

"سب رشتے سب اپنے اپنے حصے کا پیار لیتے ہیں۔ سب کی اپنی اپنی اہمیت ہے۔"

50 "جلدی گھل مل جاتا ہوں یا لیے دیے رہتا ہوں؟"

"جلدی گھل مل جاتا ہوں اور بچوں کے ساتھ بچہ اور بڑوں کے ساتھ بڑا بن جاتا ہوں۔"

51 "اپنے آپ کو میچور سمجھتا ہوں یا ابھی کم عمر ہوں؟"

"ایسا نہیں ہے... میچور ہوں تب ہی شادی ہوئی ہے... اور ہمیشہ میں نے اپنے آپ کو اپنی اصلی عمر سے بڑا ہی سمجھا ہے۔"

52 "میرے اچھے دوستوں میں؟"

"میرے بہت سے اچھے دوست ہیں۔ لیکن سلمان علی عامر اور بابر کی دوستی ناقابل بیان ہے۔"

53 "مطالعہ کا شوق؟"

"بہت ہے۔ ابن صفی 'منٹو' اشفاق احمد' بانو قدسیہ ان کو بہت شوق سے پڑھتا ہوں جبکہ شاعری کی طرف رجحان نہیں ہے۔"

54 "پاکستان کے لیے کیا سوچتا ہوں؟"

"سوچتا تو اچھا ہی ہوں کہ یہ قائم و دائم رہے اور بہت ترقی کرے۔ مگر اس کے آنے والے وقت سے ڈر لگتا ہے آج کل کے حالات دیکھ کر۔"

55 "عشق و محبت میں کیا فرق ہے؟"

"عشق خدا سے کیا جاتا ہے اور محبت اس کی تخلوق سے۔"

56 "کس ملک کی شہریت پسند ہے؟"

"کبھی سوچا نہیں 'فیملی کے قریب ہوں۔ جہاں وہ رہیں گے وہیں میں بھی رہنا پسند کروں گا۔"

57 "میڈیا میں کیا برائی دیکھتا ہوں؟"

"میڈیا میں کافی برائیاں رونما ہو رہی ہیں۔ ہم اپنی ثقافت سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ جس کی وجہ سے کچھ غلط اثرات بھی مرتب ہو رہے ہیں۔ میڈیا میں اچھا ہو رہا ہے مگر بہت زیادہ نہیں۔"

58 "کس دن کا انتظار کرتا ہوں؟"

"اچھے اور بہت اچھے دنوں کا۔ گزرنے والے دنوں کا نہیں کیونکہ دن ہوں۔ عمریں ہوں کبھی لوٹ کر نہیں آتے۔"

59 "پسندیدہ کھیل؟"

"کرکٹ بہت پسند ہے۔"

60 "کس طرح کے لوگوں میں رہنا پسند ہے؟"

"ذہین اور سلجھے ہوئے اور ہنس مکھ لوگوں کے ساتھ وقت گزارنا اچھا لگتا ہے۔"

☼ ☼

شعاع عمیر

کرن کرن خوشبو

فرمان باری تعالیٰ

اگر تیرے رب کی طرف سے پہلے ایک بات طے نہ کر دی گئی ہوتی اور مہلت کی ایک مدت مقرر نہ کی جا چکی ہوتی تو ضرور ان کا بھی فیصلہ چکا دیا جاتا۔ پس اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں' ان پر صبر کرو اور اپنے رب کی حمد و ثنا کے ساتھ اس کی تسبیح کرو سورج نکلنے سے پہلے' اور رات کے اوقات میں بھی تسبیح کرو اور دن کے کناروں پر بھی' شاید کہ تم راضی ہو جاؤ۔

(سورۃ طٰہٰ 129 - 130)

فرمان رسول صلی اللہ علیہ وسلم

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ کوئی شخص اللہ کی راہ میں زخمی نہ ہو گا۔ (اور اللہ اس شخص کو خوب جانتا ہے جو اس کی راہ میں زخمی ہوتا ہے۔) مگر یہ کہ وہ قیامت کے دن اس حالت میں آئے گا کہ (اس کے) خون کا رنگ تو مثل خون کے رنگ کے ہو گا اور خوشبو مثل مشک کی خوشبو کی ہو گی۔

(بخاری... کتاب الجہاد)

امینہ ملک... کراچی

نیا سال

نہ جانے کیا ہوا ہے سال بھر میں
دیا روشن کہ مدھم ہو گیا ہے
ہمیں معلوم ہے اتنا کہ سال ایک
ہماری عمر سے کم ہو گیا ہے

فوزیہ ثمریٹ' ثانیہ عمران... گجرات

سجدہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اپنے رب سے سب سے زیادہ قریب بندہ سجدہ کی حالت میں ہوتا ہے۔ پس سجدہ میں خوب دعائیں کرو۔" (مسلم)

زینب صدیقی... کوٹ چھٹہ

دعا

خلیل جبران کہتا ہے۔

"دعا" روح اور آرزو کی ہم آہنگی کا نام ہے۔ دینے اور لینے والے کے مابین ایک ایسے لمحے کی تخلیق کا پیش لفظ ہے جس میں خواہشوں کی تکمیل موجزن رہتی ہے۔ دعا نہ مانگنے والے ہاتھ ریگستانوں کی طرح خالی رہتے ہیں جن پر پانی کی ایک بوند برسائے بغیر بادل تیزی سے گزر جاتے ہیں۔

حسینہ مبارک... لاہور

اقوال زریں

☆ تلوار کا زخم جسم پر ہوتا ہے اور گفتار بد کا روح پر (عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

☆ جو دوسروں کے غم سے بے غم ہے' آدمی کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔ (شیخ سعدی)

☆ برے دوستوں سے بچو' کیونکہ وہ تمہارا تعارف بن جاتے ہیں۔ (حدیث نبوی)

☆ جو شخص برے کاموں سے بچے وہ سب سے بہادر ہے

(جانسن)

☆ ہر مشکل انسان کی ہمت کا امتحان لینے آتی ہے۔
(افلاطون)

☆ خوش مزاج انسان ٹوٹے ہوئے دل کی دوا ہے۔
(حضرت سلیمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

☆ دل اگر سیاہ ہو تو چمکتی ہوئی آنکھ بھی کچھ نہیں کر سکتی۔
(بوعلی سینا)

☆ زندگی کو غنیمت جانو' یہ اچانک تم سے لے لی جائے گی۔
(مولانا روم)

☆ اخلاق کا اچھا ہونا محبت الٰہی کی دلیل ہے۔
(حدیث نبوی)

☆ انسان خود عظیم نہیں ہوتا' اس کا کردار اسے عظیم بناتا ہے۔
(حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

حنا فرحان۔۔۔ راجن پور

کام کی باتیں

☆ جب دوست مانگے تو کل کا سوال ہی نہیں ہوتا۔
☆ سچی بات کہنے سے پہلے اگر اسے بار بار تولا جائے تو اس کا وزن گھٹ جاتا ہے۔
☆ خاموشی اعلاترین تقریر ہے۔
☆ شیر کی وحشت دور سے نظر آتی ہے' مگر انسان کی وحشت دکھائی نہیں دیتی۔
☆ دنیا وہاں تک جاتی ہے جہاں تک آپ کا شعور جاتا ہے۔
☆ سمندر کی تعریف کرو' مگر کنارے پر ہی رہو۔
☆ کامیابی کی سیڑھی جیبوں میں ہاتھ رکھ کر طے نہیں کی جاتی۔
☆ ایک لمبی زبان زندگی کو چھوٹا کر دیتی ہے۔
☆ شکر میٹھی ہوتی ہے' خواہ اندھیرے میں ہی ہو۔
☆ انسان کے ارمانوں کی حد قبروں میں جاکر ختم ہوتی ہے۔
☆ جو لوگ کچھ کر سکتے ہیں وہ کرتے ہیں۔ جو کچھ نہیں کر سکتے' وہ ہدایات دینے لگتے ہیں۔
☆ پسو مارنے کے لیے قالین نہ جلاؤ۔
☆ جس کا پیٹ بھرا ہو وہ کچھ نہیں سیکھتا۔

امن عامر۔۔۔ کراچی

حسن اخلاق

حسن اخلاق اور حسن سلوک اسلام نے دونوں پر خصوصی زور دیا ہے۔ حسن اخلاق کا مطلب ہے کہ ہر ایک سے خندہ پیشانی سے پیش آؤ۔ دوسروں کو نقصان مت پہنچاؤ' رویہ اور لہجہ حتی الامکان نرم رکھو۔ عزیز رشتہ داروں سے حسن سلوک اور رواداری سے پیش آؤ' یہاں تک کہ غیر مسلم کے ساتھ بھی حسن سلوک کی تلقین کی گئی ہے کہ وہ متاثر ہو کر قبول اسلام کرے۔ سو ہم سب کو خصوصی طور پر حسن اخلاق اور حسن سلوک کا اہتمام کرنا چاہیے کہ دین اور دنیا دونوں سنور جائیں۔ اللہ ہمیں نیک راہ پر چلنے کی توفیق عطا کرے۔ (آمین)

حنا رانا۔۔۔ کراچی

آنسو

آنسو' اپنے اندر غم اور خوشی دونوں کو سمیٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ دونوں ہی میں انسان کا ساتھ دیتے ہیں۔ کسی کے بچھڑنے پر' تو کسی کے ملنے پر' کچھ کھونے پر تو کچھ مل جانے پر' آنسو انسان کی فریاد ہیں۔ پرانی یادوں کے ترجمان ہیں۔ دل کی اتھاہ گہرائیوں سے نکلنے والا آب حیات کا چشمہ' خواہشات کے صحرا میں نخلستان کا مزہ۔ یہ آنسو جہاں زیست انسانی اور اس سے پیوستہ جذبات کے ترجمان ہوتے ہیں' وہیں یہ کسی شخص کی بصیرت اور بے ثباتی کے آئینہ دار بھی ہوتے ہیں۔ کسی کی آنکھ سے نکلے ہوئے آنسو' موتی کے مترادف اور کسی کے آنسو برکھارت کے قطرے کی مانند بے وقعت و بے معنی۔ بہرحال' آنسو چاہے موتی نما ہوں یا کسی برکھارت کی برسات کے ہم چشم' یہ ہر حال میں موسم دل کی نمائندگی کرتے ہیں۔

مہوش۔۔۔ نواب شاہ

نیا سال سب کی خوشی کا سال ہو

نیا سال سب کی خوشی کا سال ہو
خدا کرے نیا سال سب کو راس آجائے
تو جسے چاہے وہ تیرے پاس آجائے
اس نئے سال میں یہ دعا ہے میری
خوشیوں کی ہو ہر طرف رنگین جھڑی
مست مست رنگوں میں موسم بہار کے
ہو جائیں شامل قسمت میں تیری ہر خوشی
ہر صبح تیری خوشیاں ہر رات ہو تیری چاندنی
ہوں سب مرادیں ہی پوری تیری
جو لمحہ بھی گزر جائے حسین لمحہ ہو جائے
رہے ساری زندگی میں بہار تیری
اس نئے سال میں ہو ساری دعائیں قبول میری

الشان۔۔۔ کراچی

عقل کی بات

☆ رزق کے پیچھے اپنا ایمان خراب مت کر' کیونکہ روزی انسان کو ایسے تلاش کرتی ہے جیسے مرنے والے کو موت۔۔۔!
☆ خوب صورت ہونا اہم نہیں' بلکہ اہم ہونا خوب صورتی ہے۔ خوب صورت انسان سے محبت نہیں ہوتی' بلکہ جس انسان سے محبت ہوتی ہے خوب صورت لگنے لگتا ہے۔
☆ دولت مٹی کی طرح ہوتی ہے اور مٹی کو پاؤں کے نیچے ہونا چاہیے' اگر سر پر چڑھاؤ گے تو قبر بن جائے گی اور قبریں زندہ انسانوں کے لیے نہیں ہوتیں۔
☆ جھوٹ' غیبت اور ناشکری ایسے کیڑے ہیں جو رزق کی کشادگی اور گھر کی خوش حالی کو آہستہ آہستہ کھا جاتے ہیں۔

آسیہ۔۔۔ 113 این بی

ذرا سنو تو۔۔۔۔

☆ جس محاذ پر فتح کا امکان ہو اور نہ شکست کی توقع' وہاں انسان اندر سے تھک جاتا ہے' اپنے آپ سے ہار جاتا ہے۔
☆ روئے زمین پر بہادری کا سب سے بڑا امتحان شکستہ دل ہوئے بغیر شکست کو برداشت کرنا ہے۔
☆ ضرورت سے زیادہ احتیاط انسان کے درمیان بدگمانیاں پیدا کرتی ہے۔
☆ دولت کھاد کی مثال ہے' جب تک اسے پھیلایا نہ جائے فائدہ نہیں دیتی۔
☆ ہم میں سے اکثر خاموشی کے مفہوم کو سمجھتے ہیں لیکن اس سے بہت کم آگاہ ہیں کہ خاموشی کب اختیار کرنی چاہیے۔
☆ محبت سالوں تک ہمارے اندر پنپتی رہتی ہے اور ہم اس سے لاعلم رہتے ہیں لیکن پھر ادراک کا ایک لمحہ آتا ہے اور یہ ہم پہ کھلتی چلی جاتی ہے۔
☆ ہر عمل کھوکھلا ہے جب تک محبت نہ ہو اور جب محبت کے ساتھ عمل کرتے ہو تب تم خود کو اپنے سے' ایک دوسرے سے اور خدا سے باندھ لیتے ہو۔

ثمینہ کوثر عطاری۔۔۔ ڈوگر گجرات

یادیں

بس یہ ہی مشکل ہے کہ بھول جانا انسان کے بس میں نہیں جو حادثہ ایک دفعہ گزر جائے وہ یاد بن کے بار بار گزرتا ہے۔ بھولنے کی کوشش ہی اسے زندہ رکھتی ہے۔ انسان ظالم کو معاف کر سکتا ہے لیکن اس کے ظلم کو بھول نہیں سکتا۔ بھول جانا انسان کے اختیار میں نہیں۔ موسم گزر جاتے ہیں لیکن یاد نہیں گزرتی۔ مرحوم زمانوں کی یاد مرحوم نہیں ہوتی۔ پرانے چہرے نئے چہروں میں نظر آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ پرانے غم نئے غم میں شامل نظر آتے ہیں۔ پرانی یادیں نئی زندگی کے ساتھ چلتی ہے۔ درد یہ یاد انسان کے اندر ہمیشہ محفوظ رہتی ہے۔ یاد سے نجات کی کوشش دلدل سے نجات کی کوشش کی طرح رائیگاں ہوتی ہے۔
(واصف علی واصف کی کتاب ''دل دریا سمندر'' سے اقتباس)

فوزیہ ثمرٹ' ثانیہ عمران۔۔۔ گجرات

انمول موتی

☆ جو نہیں ہے اس کا غم نہ کریں۔ بلکہ جو ہے اس پر قناعت کریں۔
☆ کبھی کسی سے توقعات نہ رکھیں بلکہ جو آپ سے بن پڑے وہی کریں۔
☆ دنیا تمہیں اس وقت تک نہیں ہرا سکتی جب تک تم خود نہ ہار جاؤ۔
☆ اگر کسی نے تمہاری راہ میں کانٹے بچھائے ہیں تو تم ان کانٹوں کو ہٹا دو کیونکہ اگر تم بھی جواب کانٹے بچھاؤ گے تو دنیا کانٹوں سے بھر جائے گی۔

غصہ پی جانا

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔
"کسی بندے نے غصے کے گھونٹ سے زیادہ بہتر گھونٹ دودھ یا شہد کا کبھی نہیں پیا۔"

فوزیہ ثمریٹ۔۔۔ گجرات

انمول باتیں

☆ آدمی کی قابلیت زبان کے نیچے پوشیدہ ہے۔
☆ ذہین آدمی ناکام ہو سکتا ہے لیکن محنتی آدمی ناکام نہیں ہو سکتا۔
☆ دعائیں دستک کی طرح ہیں اور مسلسل دستک دینے سے دروازہ کھل ہی جاتا ہے۔
☆ اللہ سے ہمیشہ وہ طلب کرو جو تمہارے حق میں بہتر ہو نہ کہ وہ جو تم چاہتے ہو ہو سکتا ہے تمہاری چاہت بہت کم ہو اور تمہارا حق بہت زیادہ ہو۔

مدیحہ نورین مہک۔۔۔ برنالی

غلطی کا اعتراف

ڈاکٹر علامہ اقبال سے سوال کیا گیا۔
"عقل کی انتہا کیا ہے۔"
علامہ اقبال نے جواب دیا "حیرت۔"
پھر سوال کیا گیا "عشق کی انتہا کیا ہے؟"
فرمایا "عشق کی کوئی انتہا نہیں، عشق لاانتہا ہے۔"
سوال کرنے والے نے پوچھا۔ مگر آپ نے لکھا ہے۔ "تیرے عشق کی انتہا چاہتا ہوں"
اس پر علامہ اقبال مسکرا کر فرمانے لگے "اس کا دوسرا مصرعہ بھی تو پڑھیے، جس میں اپنی غلطی کا اعتراف کیا گیا ہے، وہ یہ ہے۔
میری سادگی دیکھ کہ میں کیا چاہتا ہوں۔

کہکشاں اسامہ۔۔۔ فیصل آباد

خالی زندگیاں

بہت سے لوگوں کو دین اور نفسیات کا بڑا علم ہوتا ہے لیکن ان کی زندگیاں بڑی خالی ہوتی ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ صرف باہر کا علم انسان کے اندر کو نہیں بدل سکتا، ہر شخص جانتا ہے کہ ظلم سے ظلم پیدا ہوتا ہے پھر بھی ہر شخص دوسرے پر ظلم کرتا ہے۔
(اشفاق احمد کی کتاب سے اقتباس)

نوشابہ منظور۔۔۔ بھریا روڈ

اصل مسئلہ

ایک آدمی ایک حمام کے پاس گیا۔
حمام نے کہا۔ "مجھے خدا پر یقین نہیں ہے۔"
آدمی نے پوچھا۔ "کیوں؟"
حمام نے جواب دیا۔ "اپنے ارد گرد دیکھو دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ لوگ بھوکے ہیں۔ غریب ہیں، بے یار و مددگار راہوں میں پڑے ہیں۔"
آدمی نے جواب "نہیں۔"
اچانک اسے ایک شخص نظر آیا جس کے بال بہت لمبے اور بہت خراب تھے۔
اس نے حمام سے پوچھا۔ "کیا اس دنیا میں کوئی حمام نہیں ہے؟"
حمام نے کہا۔ "میں ہوں، پھر تم کیسے کہہ سکتے ہو؟"
آدمی نے کہا۔ "باہر دیکھو لوگوں کے بال لمبے اور بہت خراب ہیں۔"
حمام نے کہا۔ "اس لیے کہ وہ میرے پاس نہیں آتے۔"
آدمی نے بڑا پیارا جواب دیا۔ "یہ ہی مسئلہ لوگوں کے ساتھ ہے وہ اللہ کی طرف نہیں جاتے۔"

فریحہ شبیر۔۔۔ شاہ نکڈر

بُشریٰ محمود

روبینہ شریف، کی ڈائری میں تحریر
ابن انشا کی نظم

جنوری کی سرد راتیں ہیں طویل،

دل بہلنے کی نہیں کوئی سبیل
جنوری کی سرد راتیں ہیں طویل
ڈالتا ہوں اپنے ماضی پر نگاہ
گاہے گاہے کھینچتا ہوں سرد آہ
کس طرح اب دل کو رہ پر لاؤں میں
کس بہانے سے اسے بہلاؤں میں
سب کو محو خواب راحت چھوڑ کے
نیند آتی ہے شبستاں میں مرے
مجھ کو سوتے دیکھ کر آتا ہے کوئی
میرے سینے سے چمٹ جاتا ہے کوئی
دیکھتا ہوں آ کے اکثر ہوش میں
کوئی ظالم ہے مری آغوش میں
خود کو تنہا ہی مگر پاتا ہوں میں
پھر گھڑی بھر بعد سو جاتا ہوں میں
پھر کسی کو دیکھتا ہوں خواب میں
اس دفعہ پہچان لیتا ہوں تمہیں
بھاگ جاتے ہو قریب صبح دم
چھوڑ دیتے ہو رہین رنج و غم
مجھ کو تم سے عشق تھا مدت ہوئی
ان دنوں تم کو بھی الفت مجھ سے تھی
کم نگاہی اقتضائے سال و سن
کیا ہوئی تھی بات جانے ایک دن
بند اپنا آنا جانا ہو گیا
اور اس پر اک زمانہ ہو گیا
تم غلط سمجھے، ہوا میں بدگماں
بات چھوٹی تھی مگر پہنچی کہاں
جلد ہی میں پشیماں ہو گیا
تم کو بھی احساس کچھ ایسا ہوا
لشکر پندار میں لیکن تھے مست
تھی گراں دونوں پہ تسلیم شکست
ہجر کے صحرا کو طے کرنا پڑا!
مل گیا تھا رہنما امید سا
ہے مری جرأت کی اصل اب بھی یہی
دل یہ کہتا ہے کہ دیکھیں تو سہی
جس میں اترا تھا ہمارا کارواں
اب بھی ممکن ہے وہ خالی ہو مکاں
آج تک دیتے رہے دل کو فریب
اب نہیں ممکن ذرا تاب شکیب
آؤ میرے دیدہ تر میں رہو
آؤ اس اجڑے ہوئے گھر میں رہو
حوصلے سے میں پہل کرتا ہوں
دل میں اتنا سوچ کر ڈرتا بھی ہوں
تم نہ ٹھکرا دو مری دعوت کہیں
میں یہ سمجھوں گا اگر کہہ دو "نہیں"
گردش ایام کو لوٹا لیا
میں نے جو کچھ کھو دیا تھا پا لیا

یاسمین رؤف، کی ڈائری میں تحریر
وصی شاہ کی غزل

سرد مہری،

گل زباں پہ وہی سردیوں کا موسم ہے
تمہاری یاں پہ وہی سردیوں کا موسم ہے

درخت پہ جو کبھی جوڑیوں سے ڈالا تھا
اس اک نشاں پہ وہی سردیوں کا موسم ہے

سُلگ رہی ہیں ذہن میں قبائیں لفظوں کی
مگر زباں پہ وہی سردیوں کا موسم ہے

تمہارے آنے پہ سورج کے ہاتھ چمکیں گے
مرے مکاں پہ وہی سردیوں کا موسم ہے

تیری جدائی کے پل سے ہوا ہے عشق خبط
کہ اس جہاں پہ وہی سردیوں کا موسم ہے

وہ مجھ کو سونپ گیا فرصتیں دسمبر کی
درختِ جاں پہ وہی سردیوں کا موسم ہے

ہمارے لب تو دُعائیں جلائے رکھتے ہیں
پھر آسماں پہ وہی سردیوں کا موسم ہے

مسز نگہت غفار، کی ڈائری میں تحریر

فوزی گیلانی کی غزل

تیری خوشبو نہیں ملتی تیرا لہجہ نہیں ملتا
ہمیں تو شہر میں کوئی تیرے جیسا نہیں ملتا

یہ کس دُھن میں ہم تم سفر آغاز کر بیٹھے
تمہیں آنکھیں نہیں ملتیں ہمیں چہرہ نہیں ملتا

ہر اک تدبیر اپنی رائیگاں ٹھہری محبت میں
کسی بھی خواب کو تعبیر کا رستہ نہیں ملتا

بھلا اس کے دُکھوں کی رات کا کوئی مداوا ہے
وہ ماں جس کو کبھی اس کا کھویا ہوا بچہ نہیں ملتا

زمانے کو قرینے سے وہ اپنے ساتھ رکھتا تھا
مگر میرے لیے اس کا کوئی لمحہ نہیں ملتا

مسافت میں دُعائے ابر ان کا ساتھ دیتی ہے
جنہیں صحرا کے دامن میں کوئی دریا نہیں ملتا

جہاں ظلمت رگوں میں اپنے پنجے گاڑ دیتی ہے
اس تاریک رستے پہ دیا جلتا نہیں ملتا

گڑیا شاہ، کی ڈائری میں تحریر

فیاض وید کی غزل

پھول مرجھا گئے چپ ہوئے بام و در شامِ تنہائی میں
مانند پڑنے لگے تتلیوں کے بھی پر شامِ تنہائی میں

حال و خد میں تیرے ایسے کھوئے ہیں ہم اشارہ دے ہیں ہم
اپنے احوال سے ہو گئے بے خبر شامِ تنہائی میں

گاہے گاہے تیری دھیمی سرگوشیاں مجھ کو آنے لگیں
رفتہ رفتہ ہوا خاموشی کا اثر شامِ تنہائی میں

شامِ تنہائی میں اس کو شدت سے میں سوچتا ہوں اِدھر
مجھ کو شدت سے وہ سوچتا ہے اُدھر شامِ تنہائی میں

وحشت جسم و جاں سوچیے تو ذرا کیسی ہو گی یہاں
جب زندگی کے دن ہو رہے ہوں بسر شامِ تنہائی میں

دن کی رونق لیے محفل دوستاں پہنچی انجام کو
وید صاحب اضطراب چلو اپنے گھر شامِ تنہائی میں

شگفتہ سلیماں

نمرہ ________ کراچی
کچھ خوشیاں کچھ آنسو دے کر ٹال گیا
جیون کا اک اور سنہرا سال گیا

عائشہ سندھو ________ اسلام آباد
یہ سال بھی گزرا ہے تیرے پیار کی مانند
آتے ہوئے کچھ اور تھا جاتے ہوئے کچھ اور

صدف عمران ________ کراچی
لمحہ لمحہ نظر آتا ہے کبھی اک سال
کبھی لمحے کی طرح سال گزر جاتا ہے

عائشہ ________ گوجرہ
برسوں بعد بھی اس کی عادت نہ بدلی محسن
کاش میں دوست نہیں اس کی عادت ہوتا

کرن عبدالرحمٰن ________ فیصل آباد
اس کو کھونے کا بہت دکھ ہے مگر
ہم اسے پانے کے اسباب کہاں سے لاتے

ندا یوسف ________ حیدر آباد
تمہارا ساتھ ہو تو سارے موسم اچھے لگتے ہیں
وگرنہ بے مزا ہیں پھول، خوشبو اور برساتیں

مدیحہ فہیم ________ کراچی
مزاج اپنے بہت مختلف سہی پھر بھی
ہمارے بیچ محبت کا پاس رہتا ہے

فضہ، ندا ________ فیصل آباد
اس قدر زیست کی راہوں نے تھکا ڈالا ہے مجھے
کون بچھڑا ہے کہاں، کون ملا، یاد نہیں

صبا سلیم ________ کراچی
یہ کہہ رہا تھا میرا ہاتھ پڑھ کے دست شناس
فقط لکھا ہے لکیروں کے درمیان تلاش

تبسم، نمیرہ ________ کراچی
توبہ کر کے دل سے دعا مانگو اے مجاز
بے خوف و خطر گزرے الٰہی یہ نیا سال

حفصہ ________ کراچی
پھر نیا سال نئی صبح نئی امیدیں
اے خدا خیر کی خبروں کے اجالے رکھنا

زبیدہ ریاض ________ کراچی
بتا تو ذرا کون سی بہار لے کر آیا ہے جنوری
تم تو کہتے تھے کہ بہت ویران ہے دسمبر

صائمہ بلیمی ________ کے ڈی اے
سہے ہیں میں نے عجب کرب سود مندی کے
گلہ ہے مجھ کو زیاں کا، زیاں تو کچھ بھی نہیں

کسے خبر سر منزل جو دل نے حال سہے
اذیت سفر رائیگاں تو کچھ بھی نہیں

تحریم ________ لاہور
یہ عنک رت یہ نئے سال کا پہلا لمحہ
دل یہ کہتا ہے کہ موسم اب کوئی یاد آئیں

ہم نے ماضی کی سماعت پہ جو دل پھر سوچا
دکھ بھی کیا کیا ہمیں یادوں کے سبب یاد آئے

بشریٰ انیس ________ یزمان
جنوری کی سردیوں میں ایک آتش دان کے پاس
گھنٹوں تنہا بیٹھنا بجھتے شرارے دیکھنا
جب کبھی فرصت ملے تو گوشۂ تنہائی میں
یادِ ماضی کے پرانے گوشوارے دیکھنا

سیدہ نسبت زہرا ________ کبیر والا
کبھی جو مجھ سا تیرے جیسا مل گیا کوئی
میں زندگی کی طرف پھر سے لوٹ آؤں گا

سدرہ وزیر ________ خوشاب (دبئی)
پچھلے برس تھا خوف تجھے کھو نہ دوں کہیں
اب کے برس دعا ہے تیرا سامنا نہ ہو

فوزیہ ثمر بٹ ـــــــ گجرات

اس جہانِ بے صدا میں اک صدا ہے روشنی
منزلیں بکھری پڑی ہیں راستہ ہے روشنی
رات کی تاریکیوں کا ڈر نہیں ہے اب مجھے
جانتی ہوں میں کہ شب کی انتہا ہے روشنی

عذرا ناصر ـــــــ کراچی

شان و شوکت شبِ ہجراں کی نہ کم ہو جائے
ہم نے اشکوں سے کیے رکھا چراغاں بزم

نمرہ، اقرا ـــــــ کراچی

ساقی کی اک صدا کے افسانے بن گئے
کچھ پھول ٹوٹ کر مرے پیمانے بن گئے
کافی جہاں تصورِ جاناں میں ایک شب
کہتے ہیں لوگ اس جگہ بت خانے بن گئے

آسیہ جاوید ـــــــ تلی پور چھٹہ

اس شب کے مقدر میں سحر ہی نہیں محسن
دیکھا ہے کئی بار چراغوں کو بجھا کر

مدیحہ فہمید ـــــــ کراچی

یونہی بے سبب نہ پھرا کرو کوئی شام گھر بھی رہا کرو
یہ غزل کی سچی کتاب ہے، اسے چپکے چپکے پڑھا کرو
کوئی ہاتھ بھی نہ ملائے گا جو گلے ملو گے تپاک سے
یہ نئے مزاج کا شہر ہے ذرا فاصلے سے ملا کرو

صبا سلیم ـــــــ کراچی

کچھ ایسی مہرباں تو نہ تھی ہم پہ زندگی
کیوں ہر کوئی جہاں میں ہمارا رقیب تھا

تبسم ناز ـــــــ کورنگی کراچی

تمام عمر کی آوارگی پہ بھاری ہے
وہ ایک شب جو تری یاد میں گزاری ہے
مجھے یہ ناز کہ میں حسن کا مصور ہوں
انہیں یہ فخر کہ تصویر تو ہماری ہے

عائشہ ـــــــ گوجرہ

یہ ایک شب کی ملاقات بھی غنیمت ہے
کسے ہے کل کی خبر تھوڑی دور ساتھ چلو

ندا، فضہ ـــــــ فیصل آباد

رفتہ رفتہ بجھ گیا آخر چراغِ آرزو
پہلے دل خاموش تھا اب زندگی خاموش ہے

ثمینہ ـــــــ کراچی

ہیں بڑے عجیب سے واسطے کہ گریز پا سبھی راستے
وہ تیری نگاہ کے فاصلے، یہ میری نظر کی مسافتیں

آمنہ ناز محمد ـــــــ میر پور خاص

محبتوں میں ہر ایک لمحہ وصال ہوگا، یہ طے ہوا تھا
بچھڑ کے بھی ایک دوسرے کا خیال ہوگا یہ طے ہوا تھا
وہی ہوا نا بدلتی رُت میں، تم نے ہم کو بھلا ہی ڈالا
کوئی بھی رُت ہو، نہ چاہتوں کا زوال ہوگا یہ طے ہوا تھا

سادیہ چوہدری ـــــــ ڈوگہ گجرات

زندگی تیرے مزاج کار سے تیری گفتار سے ہم ہار گئے
اے موسمِ ہجراں شبِ فراق سے ہم ہار گئے
سمجھا تھا جسے ہمدرد و غمگسار اپنا وہی سوزِ جگر نکلا
اے گردشِ دوراں تیری چال اے زندگی تیری رفتار سے ہم ہار گئے

بینش مدثر ـــــــ فیصل آباد

بہت نزدیک ہو کر بھی وہ اتنا دور ہے مجھ سے
اشارہ ہو نہیں سکتا، پکارا جا نہیں سکتا

نورین مسکان سرور ـــــــ سیالکوٹ ڈسکہ

ہمیشہ آئینوں کے ہی مقدر میں کیوں چھٹنا
کبھی یہ معجزہ بھی ہو کہ پتھر چوٹ کھا جائیں

مہرین خان ـــــــ کراچی

یہ دکھ نہیں کہ وہ سمجھا نہیں میرے فن کو
مخالفت کا سلیقہ نہیں تھا دشمن کو
میں کس مقام سے بولوں میں کس سے بات کروں
کہ خواہشات کا کاسہ ملا ہے اس تن کو

افشاں علی ـــــــ کراچی

اگرچہ تجھ سے بہت اختلاف بھی نہ ہوا
مگر یہ دل تری جانب سے صاف بھی نہ ہوا
تعلقات کے برزخ میں ہی رکھا مجھ کو
وہ میرے حق میں نہ تھا اور خلاف بھی نہ ہوا

مریم ساجد ـــــــ سیالکوٹ

نہ جانے کون سا فقرہ کہاں رقم ہو جائے
دلوں کا حال بھی اب کون کس سے کہتا ہے
میرے بدن کو نمی کھا گئی ہے اشکوں کی
بھری بہار میں کیسا مکان ڈھلتا ہے

کرن کا دسترخوان

خالدہ جیلانی

تلی ہوئی مچھلی

اشیا :

مچھلی ـــ دس عدد
کالی مرچیں ـــ آدھا چائے کا چمچہ
پیپریکا ـــ آدھا چائے کا چمچہ
تیل ـــ ایک کپ
لیموں کا جوس ـــ ایک کھانے کا چمچہ
پیاز ـــ ایک درمیانی
(باریک باریک کاٹ لیں)
لہسن (پسا ہوا) ـــ ایک پیالی تین
چوتھائی چائے کا چمچہ
ادرک (کدوکش کی ہوئی) ـــ آدھا چائے کا چمچہ
مکھن ـــ دو کھانے کے چمچے
ہرا سوکھا دھنیا (پسا ہوا) ـــ ایک کھانے کا چمچہ
کیری کی چٹنی ـــ چار کھانے کے چمچے

ترکیب :

مچھلی پر کالی مرچ اور پیپریکا ملکا لگا کر چالیس منٹ تک رکھیں پھر مچھلی تیل میں تل کر نکال لیں۔

ایک پین میں مکھن لے کر اس میں پیاز، لہسن اور ادرک کو براؤن کر لیں۔ اب اس میں سوکھا دھنیا شامل کر کے مکس کریں۔

آخر میں ایک اوون پروف ڈش لے کر اس میں مچھلی رکھیں۔ اس کے بعد اس میں ادرک لہسن والا مسالا ڈال دیں اوپر دوبارہ مچھلی رکھیں۔

اب اس پر چٹنی ڈال کر اوون میں 180 سینٹی ڈگری پر بارہ منٹ کے لیے رکھ دیں۔ اوون سے نکالنے کے بعد گرم گرم پیش کریں۔

سوئٹ اینڈ ساور فش

اشیا :

مچھلی کے اجزا
مچھلی کے قتلے ـــ ایک کلو
نمک ـــ حسبِ ذائقہ
لہسن پسا ہوا ـــ ایک کھانے کا چمچہ
سفید مرچ پسی ہوئی ـــ ایک کھانے کا چمچہ
سویا ساس ـــ دو کھانے کے چمچے

آمیزہ بنانے کے اجزا
میدہ ـــ ایک پیالی
کارن فلار ـــ آدھی پیالی
انڈوں کی سفیدی ـــ دو عدد

حسن و صحت

ادارہ

سرد موسم..... آنکھوں اور ہونٹوں کا میک اپ!

اگر موسم سرما میں رنگوں کے بارے میں سوچنے کی ضرورت پیش آئے تو گہرے رنگوں کے بارے میں سوچیں مثلاً" جیول ٹونز(Jewel Tones) اور براؤن..... اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ ان کو گرم موسم میں استعمال نہیں کرسکتی ہیں اور دوسرے یہ کہ آپ کو اپنی جلد کو سرد موسم میں زیادہ سے زیادہ موئسچرائزڈ رکھنا ہے۔ درجہ حرارت میں تبدیلی (گھر کے اندر گرمی اور گھر سے باہر ٹھنڈی ہوا اور پھر جب آپ کار میں بیٹھتی ہیں تو ایک بار پھر ہیٹر کی گرم گرم ہوا) اس تبدیلی کی وجہ سے آپ کی جلد تیزی سے خشک ہو جاتی ہے۔ ان کو موئسچرائزر کے ذریعے نرم بنائے رکھیں اور ان کو سورج کی روشنی سے بھی محفوظ رکھنے کی کوشش کریں جس میں نقصان دہ شعاعیں ہوتی ہیں جو تب بھی آپ کی جلد کو متاثر کرتی ہیں جب دھوپ میں زیادہ شدت نہیں ہوتی ہے۔ ایک بہترین موئسچرائزر جس میں کم سے کم SPF-15 شامل ہو، آپ کی جلد کے لیے بہترین ہے، یہ جلد کو نرم رکھنے کے ساتھ ساتھ شگفتہ بھی رکھتا ہے۔ ذیل میں کچھ ٹپس ملاحظہ فرمائیں:

آئی برو

اس سیزن آپ اپنی بھنوؤں کو لش بنائیں۔ ان کو زیادہ توڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس موسم میں جس قدر گھنی ہوں گی اس قدر اچھی لگیں گی۔ پہلا کام یہ کریں کہ اگر آپ نے ان کی کاٹ چھانٹ کرکے ان کو پتلا کرلیا ہے تو ان کو مکمل طور پر افزائش ہونے دیں اور کاٹ چھانٹ بند کردیں، جب ان کی بھرپور افزائش ہو جائے تو ان کو شیپ دیں، جی ہاں اگرچہ آپ نے ان کو قدرتی انداز میں گرو ہونے دیا ہے اس کے باوجود ان کو قدرتی محرابی انداز میں شیپ دینے کی ضرورت ہے۔ اگر آپ کو یہ کرنے میں دشواری پیش آئے تو آپ کسی سیلون سے رجوع کرسکتی ہیں جو تھوڑے سے معاوضے پر یہ کام کردیتے ہیں۔

کیا آپ کی بھنویں قدرتی طور پر باریک (پتلی) ہیں یا یہ کاٹ چھانٹ کرنے کے بعد یہ واپس تیزی سے نہیں بڑھتی ہیں؟ کوئی مسئلہ نہیں۔ آپ آئی برو پاؤڈر یا پنسل خرید لیں۔ ان کا درست استعمال آپ کی بھنوؤں کو قدرتی انداز میں بھرپور بنا کر پیش کرے گا۔ اس کے لیے اگر معقول اور مناسب آئی برو برش کا استعمال کیا جائے تو نتیجہ اور بھی اچھا رہے گا۔

برش کو اندر سے باہر کی طرف استعمال کرنے کے بعد برش کو اچھی طرح صاف کرلیا کریں کہ پاؤڈر جم کر برش کے بالوں کو خراب کردیتا ہے۔

آئی شیڈو

موسم سرما اپنے ساتھ اسموکی(Smokey) آئی میک اپ لے کر آتا ہے۔ جادو اس میں ہے کہ آپ اس مقصد کے لیے برائٹ، بولڈ اور ایسے شیڈز استعمال کریں جو فوراً" لوگوں کی توجہ حاصل کرلیں۔ گرے، سلور اور بلیو یہ سب آپ کے انتخاب کے منتظر ہیں۔ یہ بہت ہی بولڈ لک ہیں اور شاید ان کو اپنانے میں آپ تھوڑی بہت ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کریں مگر سچ یہ ہے کہ ان کو اپنایا جاسکتا ہے۔ جھجک والی کوئی بات نہیں۔ کیوں نہ اس موسم میں کچھ اور شوخ رنگوں کو اپنایا جائے؟ مثلاً" برونز(Bronze)، برگنڈی (Burgundy)، کورل، ڈیپ گرین اور ڈیپ پرپل..... یہ سب اپنے اندر بہت کشش رکھتے ہیں۔ مٹیالے شیڈز بھی اس موسم میں استعمال کیے جاسکتے ہیں، مگر محدود انداز میں لہٰذا آپ ہر طرح کے رنگوں کو اس سرد موسم میں ٹرائی کریں۔ آپ چاہیں تو کچھ ایسے کلر بھی اپنا سکتی ہیں جو خواتین گاہے گاہے ہی استعمال کرتی ہیں مثلاً" برونز اور برگنڈی۔

آئی لائنر

اس ٹپس میں آپ کے لیے آئی لائنر کے حوالے سے بھی کچھ ٹپس ہیں۔ گرافک ڈیزائننگ کے لیے آپ کو چاہیے کہ آپ لیکوئڈ آئی لائنر استعمال کریں، اگر آپ پرفیکٹ شیپ چاہتی ہیں تب بھی آپ کو لیکوئڈ آئی لائنر ہی استعمال کرنا چاہیے۔ اس سیزن میں کچھ نئے شیپ بھی مقبول ہیں جب آپ چاہیں تو ٹرائی کرسکتی ہیں۔ مثلاً" بلنٹ ایج (Blunt-Edge) اور اسکوائر(Square) شیپ۔ روایتی کیٹ آئی(Cat Eye) کا شیپ بھی ٹھیک رہے گا اور آپ چاہیں تو ایسا شیپ بھی استعمال کرسکتی ہیں جو آنکھ کی بناوٹ کو تھوڑا ٹیڑھا کرکے لوگوں کے سامنے پیش کرے۔ اگر آپ لیکوئڈ آئی لائنر کو پسند نہیں کرتی ہیں تو پھر پاؤڈر یا پنسل لائنر کا استعمال کریں، دونوں صورتوں میں اچھی آئی لائنر کا انتخاب کریں۔

ہونٹ

اس سال جو رجحان ہے اس کا فائدہ اٹھائیں اور اپنے ہونٹوں کا میک اپ کئی طرح سے کریں اور لپ گلوس کے ساتھ ساتھ ہونٹوں کو رنگین بنانے پر بھی زور دیں۔

شوخ اور گہرے شیڈز ایسے ہیں جو آپ کے ہونٹوں کو پرکشش بناتے ہیں اور لوگوں کی توجہ فوراً" اپنی طرف مبذول کروالیتے ہیں۔ سرخ، برگنڈی، چیری اور گارنٹ(Garnet) شیڈز اس بار آپ کے لیے زبردست رہے گی۔ اپنی پسند کی لپ اسٹک خریدیں اور اسے ہونٹوں کے درمیان میں لگائیں۔ اس کے بعد لپ برش لے کر اسے ہونٹوں کی لائن کے ساتھ ساتھ پھیلاتے ہوئے دونوں کناروں تک پھیلادیں۔

اس کے برعکس آپ چاہیں تو ہونٹوں کو میک اپ سے پاک یعنی سادہ رکھ سکتی ہیں۔ اگر آپ ہونٹوں کا بولڈ میک اپ کررہی ہیں تو پھر آپ کو چاہیے کہ اپنی آنکھوں کو میک اپ سے پاک یعنی سادہ رکھیں۔ اس طرح اگر آنکھوں کا بولڈ میک اپ کررہی ہیں تو ہونٹوں کو سادہ رکھیں۔ دونوں کو بیک وقت بولڈ میک اپ سے لیس نہیں کرنا ہے۔ آخر میں پلکوں پر مسکارا لگالیں۔ اس کی پروا نہ کریں کہ آپ نے شیپ کون سا اپنایا ہے۔

☆ ☆

مسکراتی کرنیں

مجبوری

"کیا تم نے اس سے شادی کا پکا ارادہ کر لیا ہے؟"
"ہاں بھئی مجبوری ہے۔"
"کیسے؟"
"وہ اتنی موٹی ہو گئی ہے کہ کوشش کے باوجود اس کی انگلی سے وہ قیمتی انگوٹھی نہیں نکلی جو میں نے اسے منگنی کے موقعے پر پہنائی تھی۔"

مریم قیصر۔۔۔ اسلام آباد

راز داں اپنا

ایک صاحب نے شام کی چائے پیتے ہوئے تنہائی میں اپنے لڑکے کو بلا کر کہا۔
"آج تمہاری ٹیچر کی طرف سے مجھے ایک خط ملا ہے۔"
یہ سن کر لڑکا تیزی سے بولا۔
"ٹھیک ہے پاپا اسے رکھ لیں۔ میں امی کو نہیں بتاؤں گا۔"

رفعت جبیں۔۔۔ ملتان

بدلہ

ایک شادی شدہ جوڑا ایک پارک میں بینچ پر بیٹھا شام کی ٹھنڈی ہوا سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ ان سے دور ایک بینچ پر ایک نوجوان لڑکا اور لڑکی راز و نیاز میں مصروف تھے۔ ان کو دیکھ کر بیوی نے اپنے شوہر سے کہا۔
"ان کو خبر ہی نہیں کوئی انہیں دیکھ رہا ہے۔ وہ لڑکا اب شادی کی تجویز پیش کرنے والا ہے تمہارا کیا خیال ہے تم سیٹی بجا کر اس کو ہوشیار نہیں کرو گے۔"
"میں کیوں سیٹی بجاؤں۔" شوہر نے جواب دیا۔
"جب میں نے تمہارے سامنے شادی کی تجویز پیش کی تھی تو کسی نے سیٹی بجائی تھی۔"

حنا۔۔۔ کوٹ رادھا کشن

فرق

شادی کے ایک ہفتے بعد دولہا دلہن ہنی مون کے لیے روانہ ہوئے راستے میں دلہن کو ٹھوکر لگی تو دولہا نے فوراً اس کو بانہوں میں تھام لیا اور بولا۔
"ڈارلنگ آرام سے۔"
شادی کے دس سال بعد پھر ایک جگہ جاتے ہوئے دلہن کو ٹھوکر لگی تو دولہا نہایت غصے کے عالم میں بولا۔
"اندھی ہو گئی ہو دیکھ کر نہیں چل سکتیں۔"

فوزیہ ثمرت۔۔۔ گجرات

مفت مشورہ

ایک موٹی عورت نے تیزی سے کمرے میں داخل ہو کر بے تابی سے پوچھا۔
"ڈاکٹر صاحب آپ ٹھیک ٹھیک بتائیں میرے ساتھ مسئلہ کیا ہے۔"
کمرے میں موجود صاحب نے اس کا سر سے پیر تک جائزہ لیا اور تحمل سے بولے۔
"سب سے پہلے تو آپ کو پچاس ساٹھ پونڈ وزن کم کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ اگر آپ میک اپ نہ کریں تو زیادہ خوب صورت لگیں اور دوسری بات کہ میں ڈاکٹر نہیں آرٹسٹ ہوں ڈاکٹر کا کمرہ اوپر ہے۔"

اُم ہانیہ عمران۔۔۔ گجرات

دیکھ مگر۔۔۔!

ایک غریب باپ کا نکما بیٹا میٹرک کے امتحان میں فیل ہو گیا تو اسے بیٹے پر رہ رہ کر غصہ آنے لگا کیونکہ اسی محلے کی ایک لڑکی اسی امتحان میں فرسٹ ڈویژن میں کامیاب ہوئی تھی۔
"اس لڑکی کو دیکھو۔۔۔ اس نے اپنے گھر اور خاندان کا نام روشن کر دیا۔۔۔ اور ایک تم ہو۔ نکمے، آوارہ اور جاہل۔" باپ غصے میں آ کر بیٹے کو بار بار یہی طعنہ دے رہا تھا۔
اسی لعنت ملامت میں دو روز گزر گئے، تیسرے دن بیٹے نے باپ کی زبان سے جب یہی سب سنا تو اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور اس نے جل کر کہا۔ "ابا! میں اس لڑکی کو اور کتنا دیکھوں۔۔۔؟ سال بھر اسی کو دیکھتے رہنے کے چکر میں تو میں امتحان میں فیل ہوا ہوں۔"

انجم۔۔۔ ننکن پور مقصور

حکمت عملی

ایک صاحب کو اپنے پڑوسی سے اکثر کچھ نہ کچھ مانگنے کی عادت تھی۔ ایک روز پڑوسی کے پاس پہنچے اور بولے۔ "کیا آج آپ اپنی گاڑی میں کہیں جائیں گے؟"
پڑوسی نے ان کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا۔
"جی ہاں۔۔۔ گاڑی آج میرے استعمال میں رہے گی، آج مجھے کئی جگہوں پر جانا ہے۔"
"یہ تو بہت اچھا ہوا۔ دراصل مجھے آپ کی موٹر سائیکل کی ضرورت تھی۔" ان صاحب نے اطمینان سے کہا۔

افشاں۔۔۔ کراچی

ماں، بیوی اور مسکین شوہر

☆ ماں کے قدموں تلے جنت ہوتی ہے۔
۔۔۔ بیوی کے قدموں تلے شوہر ہوتا ہے۔
☆ ماں اگر بیٹے سے اپنے لیے کچھ منگواتی ہے۔
۔۔۔ تو بیوی سے پہلے اجازت لی جاتی ہے۔
☆ ماں، بیٹے کے لیے پائی پائی جمع کرتی ہے۔
۔۔۔ بیوی، شوہر کو پائی پائی کا محتاج کرتی ہے۔
☆ بیٹے اکثر ماں کا کام بھول جاتے ہیں۔
۔۔۔ شوہر بیوی کے کام ختم کر کے ہی دفتر جاتے ہیں۔
☆ ماں کو بیٹے کی ہر خوشی عزیز ہوتی ہے۔
۔۔۔ بیوی کو شاپنگ اور سیر و تفریح عزیز ہوتی ہے۔
☆ ماں کی محبت (ممتا) بیٹے کو جوان رکھتی ہے۔
۔۔۔ بیوی کی حکومت شوہر کو پریشان رکھتی ہے۔

ثمینہ۔۔۔ توبہ ٹیک سنگھ

انکشاف

"مجھ پر چوہے کی آواز کا راز ظاہر ہو گیا ہے۔" پسینے میں شرابور خاتون نے کار مکینک سے کہا، جو خاتون کی شکایت پر ڈھائی گھنٹے سے کار کے انجن میں چوہا تلاش کر رہا تھا۔
"دراصل چوں چوں کی آواز میرے جوتوں سے نکل رہی تھی۔" خاتون نے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا۔

ثوبیہ۔۔۔ کراچی

وجہ تاخیر

ایک معروف اداکارہ نے تھانے میں رپورٹ درج کرائی کہ فلاں سیٹھ صاحب نے اس کے ساتھ "بد تمیزی" کی ہے۔
"سیٹھ صاحب نے آپ سے کب بد تمیزی کی؟" تفتیشی افسر نے پوچھا۔
"پچھلے ہفتے۔" اداکارہ نے جواب دیا۔
"تو آپ نے رپورٹ پچھلے ہفتے کیوں درج نہیں کرائی۔۔۔؟" تفتیشی افسر نے حیرت سے پوچھا۔
"اس وقت تک ان کا دیا ہوا چیک ڈس آنر ہو کر بینک سے واپس نہیں آیا تھا۔" اداکارہ نے روہانسی شکل بنا کر کہا۔

سلمیٰ خاتون۔۔۔ میرپور خاص

باعث افسوس

ایک صاحب کو اداس بیٹھے دیکھ کر ایک جاننے والے نے اس کا سبب پوچھا تو صاحب نے آہ بھر کر جواب دیا۔ "میرا ایک پرانا دوست میری بیوی کو لے کر بھاگ گیا ہے۔"

"اوہ! یہ تو بہت برا ہوا۔" جاننے والے نے افسوس کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں! مجھے تو کل سے ہی اپنے دوست کی حالت پر رونا آرہا ہے۔" اس نے پھر آہ بھر کر کہا۔

ثمرین۔۔۔ کراچی

ثابت قدم

ایک لڑکی نے اپنی سہیلی سے رازداری سے پوچھا۔ "کیا یہ درست ہے کہ تم نے فاروق سے شادی صرف اس لیے کی ہے کہ اس کے دادا اس کے لیے ڈھیر ساری دولت چھوڑ کر مرے ہیں؟"

سہیلی نے فوراً" نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"بالکل غلط۔۔۔ اگر دادا کی بجائے کوئی اور بھی فاروق کے لیے اتنی دولت چھوڑ کر مرتا' تب بھی میں فاروق سے ہی شادی کرتی۔"

فرزانہ۔۔۔ کراچی

الٹی ہوگئیں سب تدبیریں

ناصر صاحب یہ سوچ کر تیز بارش میں ریڈی میڈ شرٹ خریدنے کے ارادے سے گھر سے نکلے بارش کی وجہ سے دکانوں پر گاہک نہیں ہوں گے اور دکان دار رعایت کے ساتھ شرٹ دے دے گا مگر وہ اس وقت حیران رہ گئے' جب دکان دار نے شرٹ کی قیمت مقررہ قیمت سے دو چار سو روپے زائد بتائی۔

"بھائی کمال ہے۔۔۔!" ناصر صاحب نے غصے سے کہا۔ "میں تو یہ سوچ کر آیا تھا کہ ایسے خراب موسم میں شرٹ رعایتی قیمت میں مل جائے گی۔"

"اسے رعایت ہی سمجھیں جناب!" دکان دار نے ناصحانہ انداز میں کہا۔ "ہمیں اندازہ ہے کہ جو شخص اتنی تیز بارش میں شرٹ خریدنے کے لیے نکلا ہے' اسے شرٹ کی کتنی ضرورت ہوگی۔"

کہکشاں انجم۔۔۔ فیصل آباد

نوید مسرت

کالج کے نوٹس بورڈ پر کسی طالبہ کی طرف سے اعلان درج تھا۔ "میری فزکس کی نصابی کتاب گم ہو گئی ہے' جس کی مجھے اشد ضرورت ہے' جس کو ملی ہو تو براہ کرم مجھے درج ذیل سیل نمبر پر مطلع کرے' میں انہیں اپنے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھلاؤں گی۔"

یہ نوٹس پڑھ کر ایک طالب علم نے کتابوں کے انبار میں سے اپنی کتاب نکالی اور خوشی خوشی ان محترمہ کو فون کیا کہ آپ کی گمشدہ کتاب مل گئی ہے۔ طالبہ نے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ "جناب! آپ نے دیر سے رابطہ قائم کیا۔ گزشتہ تین گھنٹوں میں دس افراد کتاب ملنے کی نوید سنا چکے ہیں۔"

عائشہ بشیر۔۔۔ پھول نگر

جدید محاورے

☆ بیویاں کیا جانیں' شوہروں کی قدر۔
☆ امریکا باتٹے پیسے' اپنا مطلب پورا کرنے کو۔
☆ سیاستدان کو سیاستدان ہی پہچانتا ہے۔
☆ بیوی کے بغیر گھر میں شوہر بھی شیر ہوتا ہے۔
☆ عام آدمی کیا جانے' سیاست کے مزے۔
☆ شوہر بے چارہ' گھر کا نہ سسرال کا۔
☆ پاکستان کو آئی ایم ایف کا سہارا۔

فرح بشیر۔۔۔ بھائی پھیرو

ڈائٹنگ

"ڈاکٹر صاحب! آپ نے مجھے ڈائٹنگ کا جو پروگرام دیا ہے وہ کافی سخت ہے۔ خوراک کی کمی کی وجہ سے میں غصیلی اور چڑچڑی ہوتی جارہی ہوں۔ کل میرا اپنے شوہر سے جھگڑا ہو گیا اور میں نے طیش میں آکر ان کا کان کاٹ کھایا۔" ایک خاتون نے اپنے فیملی ڈاکٹر سے کہا۔

"گھبرانے کی کوئی بات نہیں محترمہ۔" ڈاکٹر نے اطمینان سے کہا۔ "ایک کان میں سو حرارے ہوتے ہیں۔"

زینب۔۔۔ بہاول پور

دشمن

ایک دوست دوسرے دوست سے پوچھتا ہے۔
"بیوی' بیگم اور وائف میں کیا فرق ہے؟"
دوسرا دوست جواب دیتا ہے۔ "یہ بھی انڈیا' بھارت' ہندوستان کی طرح ایک ہی دشمن کے تین نام ہیں"

پلاٹ

وائف: "آپ مجھے کتنا پیار کرتے ہیں؟"
ہزبینڈ: "شاہ جہاں جتنا!"
وائف: "میرے مرنے کے بعد تاج محل بنواؤ گے؟"
ہزبینڈ: "میں نے تو پلاٹ بھی لے رکھا ہے' سستی تو تم کر رہی ہو۔"

مدیحہ نورین مہک۔۔۔ برنالی

زیور

ٹیچر نے لڑکے سے پوچھا۔ "تمہاری تعلیم کیا ہے؟"
لڑکا: "تعلیم اک زیور ہے اور زیور مردوں پر حرام ہے!"

مدیحہ۔۔۔ برنالی

باس اور ملازم میں فرق

جب ملازم کوئی کام نہ کرپائے تو وہ سست اور کام چور کہلاتا ہے۔
☆ لیکن جب باس ایسا نہ کرسکے تو کہا جائے گا کہ وہ انتہائی مصروف ہے۔
جب ملازم سے کوئی غلطی ہوجائے تو اسے احمق کا خطاب ملتا ہے۔
☆ لیکن غلطی باس سے ہوجائے تو کہا جائے گا کہ غلطی انسان ہی سے ہوتی ہے۔
جب ملازم کوئی کام بغیر منظوری کے کرے تو کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی حدود یعنی اوقات سے تجاوز کرگیا ہے۔
☆ جبکہ باس ایسا کرے تو اسے پیش قدمی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔
جب ملازم آفس سے باہر رہے تو وہ بلا جواز وقت ضائع کرنے والا کہلاتا ہے۔
☆ لیکن باس کا آفس سے باہر رہنا ضروری اور کاروباری مصروفیت کہلاتی ہے۔

طوبیٰ اقبال مغل۔۔۔ پسرور

ہری مرچیں

☆ "کل میرے شوہر نے بندر کے ساتھ تصویر کھنچوائی' تصویر میں وہ غضب کا پیارا لگ رہا تھا۔"
"کون۔۔۔ تمہارا شوہر؟"
"نہیں بھئی' بندر۔"

☆ خاتون نے ایک کوٹ پسند کیا اور سیلز گرل سے بولیں۔
"اگر میرے شوہر کو یہ کوٹ پسند نہیں آیا تو کیا تم وعدہ کرتی ہو کہ اسے واپس لینے سے انکار کردوگی۔"

☆ بیوی نے شوہر سے کہا۔ "تمہارا کہنا ٹھیک ہے کہ میں بہت زیادہ روپیہ خرچ کرتی ہوں۔ اس کے علاوہ کوئی فضول خرچی بتاؤ۔"

☆ "میری بیوی دنیا کی بہترین عورت ہے۔"
ایک شخص نے اپنے دوست سے کہا۔ "اور یہ میری واحد رائے ہے' جس سے میری بیوی بھی متفق ہے۔"

☆ ایک امریکی لڑکی نے اپنی سہیلی سے کہا۔
"مجھے تمہارا نیا بوائے فرینڈ بالکل پسند نہیں آیا۔"
سہیلی نے بے ساختہ کہا۔ "خدا کا شکر ہے۔"

☆ باپ: "میں نہیں چاہتا کہ میری بیٹی ایک گدھے کے ساتھ زندگی گزارے۔"
شادی کا خواہشمند لڑکا: "اسی لیے تو میں اسے یہاں سے لے جانے آیا ہوں۔"

نجمہ حفیظ۔۔۔ کراچی

☆ ☆

اور جھلک دکھانے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ ایسے میں کرن کے ساتھ نے ٹھنڈ کا تاثر ختم کرکے گرم تاثر عطا کیا۔ آج بھی اتنی سردی ہے کہ تبصرہ لکھتے ہوئے ہاتھوں میں واضح لرزش ہے۔

سرورق ماڈل بیسٹ تھی (مگر موسم کے مناسبت سے نہیں) سب سے پہلے حمد و نعت سے دل و روح کو منور کیا۔ فہرست پہ نظر ڈالی۔ آہ۔ فرحانہ ناز کا ناول غائب دیکھ کر دل سے ہوک اٹھی۔ فرحین اظفر کا "ردائے وفا" سامنے روشن تھا۔ پہلے لبنیٰ جدون "عشق سفر کی دھول" پڑھا لاسٹ میں تحریر میں بے جا طوالت تھی۔ مجموعی طور پر ذہن پہ گہرا اثر چھوڑتا دلکش ناولٹ تھا۔ وانیہ تو وفا کی دیوی تھی مگر ارسلان حالات کی چکی میں پستا ہوا کبھی دہکتا الاؤ بن جاتا اور کبھی نرم دل محبتوں سے گندھا انسان۔ ہائی اسٹینڈرڈ کی چکا چوند اور آزادی نے وانیہ کے قدم ڈگمگا دیے تھے۔ مگر رب نے اسے سنبھلنے کا موقع عطا کیا۔ رب جب چاہے اپنے بندوں کو نواز دے (بے شک)

"اک ساگر ہے زندگی" نفیسہ سعید کی تحریر خوب داد و تحسین سمیٹتی منزل کی سمت گامزن ہے۔ زینب کو اس کی نفس پرستی کی سزا ملے گی۔ فرہاد کو بھی تھوڑا سا اسے سمجھنا چاہیے۔ شاہ زین بیسٹ کردار ہے۔

مہشو انصاری اس کے لیے یہ فٹ ہے کہ... آیا، دیکھا اور فتح کر لیا۔ سچ میں اس کا شاہکار ناول "آبرو" اپنے نام کا عکس تھا۔ لفظ لفظ ایک ایک کردار اس ناول کے ٹائٹل ورڈ کے مطابق تھا۔ لڑکیاں پھول کی نازک پتیوں کی طرح ہوتی ہیں۔ غلط ہاتھوں میں چلی جائیں تو فوراً "چٹکی میں مسل کر پھینک دی جاتی ہیں۔ یہ نازک آبگینے ہوتی ہیں۔ ذرا سی غفلت سے بکھر جاتی ہیں کہ پھر زندگی بھر نہیں جڑ سکتیں۔ ان کی عزت ایک شیشہ کی طرح ہوتی ہے جس پر اگر ایک بار دراڑ آجائے تو زندگی بھر نہیں جڑ سکتا۔ اور والدین کی عزت کا جنازہ نکالنے والیوں کا انجام ماہین جیسا یا لائبہ جیسا ہی ہوتا ہے۔ ماہین کے رب پر یقین کامل نے صارم جیسے بندے سے اس کا ملاپ کرادیا اور اس کی عزت کی حفاظت کی۔ اس تحریر کا لفظ لفظ موتیوں کی مانند تھا۔

بشریٰ گوندل کا "پھول، خوشبو اور برساتیں" ناول قلبی رشتوں کی نفسیات کو اجاگر کرتا بیسٹ ناول تھا۔ تنہائی کے عفریت کا دلخراش نقشہ کھینچا گیا تھا۔ اگر دادی کو کچھ ہو جاتا تو رابعہ کا کیا بنتا؟ عائشہ کے رویے نے دکھ دیا۔ یہ تو آستین کا سانپ نکلی۔ کچھ لوگوں کی ایسی نفسیات بھی ہوتی ہیں۔ شاعری میں حفصہ اکبر، فرحت اور مدیحہ نورین کے انتخابات بیسٹ لگے۔

"کرن کرن خوشبو" میں فوزیہ ثمر کا "ایک دسمبر" بشریٰ مزمل کا "سوچ لو" بیسٹ انتخاب تھے۔

"نامے میرے نام" عائشہ خان کو دیکھ کر خوشی ہوئی۔ ثنا شہزاد طویل تبصرے کے ساتھ چھائی رہیں۔

وثیقہ زہرہ۔۔۔ سمندری

حسب معمول 10 تاریخ کو "کرن" مل گیا خوب صورت ٹائٹل اور "کرن کتاب" کے ساتھ دل خوش ہو گیا "اک ساگر ہے زندگی" اس بار بھی قسط شاندار رہی "ردائے وفا" فرحین اظفر دوسرے ناول کی طرح یہ ناول بھی پسند کیا جائے گا "آبرو" محرم جیسے لوگوں کا یہی انجام ہونا چاہیے جو دوسروں کی عزت کے ساتھ کھیلتے ہیں۔ "پھول خوشبو برساتیں" اس ماہ بیسٹ رہا۔ "عشق سفر کی دھول" آخری حصہ کچھ متاثر نہ کر سکا اور باقی ابھی پڑھ نہیں سکی بھلا کیوں ارے ہمارے گھر پیاری سی بھتیجی آئی ہے پہلی بار پھوپھی بنی ہوں اس لیے مصروفیت بہت رہی۔

نشا نورین۔۔۔ یوتالہ جھنڈا سنگھ

پہلے تو سب کرن پڑھنے والوں کو دل خلوص چاہت، پیار اور دل کی گہرائیوں سے "نیا سال مبارک" ہو اور خدا سے دعا ہے جنوری سے لے کر دسمبر تک کوئی غم نہ آئے خوشیاں یہ سال لائے آمین۔

2014ء میں تو سخت حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ اب 2015ء میں کسی غم کو دیکھنے کی ہمت نہیں اور نہ خدا دکھائے

نومبر اور دسمبر کا کرن اکٹھا ملا فرحانہ کی وفات پڑھ کر بے حد افسوس ہوا اللہ ان کی مغفرت فرمائیں آمین۔

"ایک ساگر ہے زندگی" اپنی رفتار کے ساتھ اے ون جا رہا ہے' ویلڈن نفیسہ دی۔

"ردائے وفا" ابھی یہ ناول پڑھا نہیں مگر لگتا ہے فرحین اظفر کا پہلا ناول ہے باقی میں ابھی کچھ نہ پڑھ پائی اور فوزیہ ثمرہٹ شکریہ اچھی دعا دینے کے لیے۔

نومبر میں "مقابل ہے آئینہ" میں خود کو دیکھ کر خوشی ہوئی بہت شکریہ ہر جگہ میری حوصلہ افزائی کی اور میری غلطیوں کو سنوار کر نکھارا۔ آپ کی حوصلہ افزائی کا بے حد شکریہ۔

فوزیہ ثمرہٹ۔۔۔ گجرات

دسمبر کا شمارہ بارہ تاریخ کو ہی مل گیا۔ سرورق بس ٹھیک ہی لگا۔

حمد باری تعالیٰ اور نعت رسول مقبول سے قلب و ذہن کو منور کیا۔ اداریہ کا ہمیشہ کی طرح مختصر گلہ حقیقت کے قریب باتیں اچھی ہوتی ہیں۔

دسمبر ہائے جاتے جاتے کیا دکھ سونپ گیا۔ ہمیشہ سے مجھے دسمبر کے آخری پل سے ڈر لگتا ہے۔ سانحہ پشاور ظلم کی انتہا بس کس کس کو آنکھ روئے۔

انٹرویوز بس ایویں ہی لگے مجھے ہاں "میری بھی سنیے" "میں جو شخصیت تھی ان کے بارے میں جاننے کی خواہش تھی جو آپ نے کہے بغیر پوری کردی۔

"مقابل ہے آئینہ" اب مجھے بورنگ لگنے لگا ہے۔ یکسانیت کا شکار ہو رہا ہے۔ افسانے بھی کچھ خاص نہیں لگے۔ "مستجاب" اچھا لگا۔ عائشہ کی دعائیں قبول ہوتی تھیں۔ بس یہ دعا مانگتی کہ اللہ اسے میرے جیسا بنا کر میرا بنادے۔ تب شاید وہ اسے مل بھی جاتا۔ خود کو مٹی میں رول کر کیا ملا عائشہ کو۔ ایسی تحریریں بوجھل کرتی ہیں۔

رابعہ افتخار کا افسانہ "نہ جانے کب ہوا" اچھا لگا۔ اس میں دیا شعر بہت پسند آیا۔ ہائے مگر یہاں محبت ہوتی کہاں ہے آج کل کے دور میں۔

مکمل ناول "آبرو" بہت اچھا لکھا رائٹر نے بے شک کہانی کے کردار ہمارے معاشرے سے لیے ہیں ماہین خوش نصیب نکلی جو صارم اور اس کی فیملی جیسے نیک لوگ مل گئے ماہین کا اپنے رب پے یقین اچھا لگا۔ اور محرم کو معاف کرنا بھی معاف کرنا اعلیٰ صفت لوگوں کا کام ہے اور میرے خیال میں ماہین اللہ کے زیادہ قریب تھی جو اس کی غلطی کی سزا کی معافی ملی اور وہ اس گندگی سے نکل آئی جیسے ہدایت کے لیے اللہ چن لیتا ہے۔ پھر اس کے رستے یوں ہی صاف ہوتے جاتے ہیں سچ میں بہت سکون ملا اس تحریر کو پڑھ کر۔

"پھول خوشبو' برساتیں" دادی کا کردار اچھا تھا۔ رابعہ اور اس کی ہم جولی کے مزاح بھرے جملے تحریر میں شگفتہ پھول لگے۔ مگر اینڈ میں پھول نما دوست نے کانٹے چبھو دیے کاش بن کر۔ رابعہ کی خوشی اس سے دیکھی نہیں گئی ایسے موقعوں پر ہی ایسے دوست نما سانپوں کی اصلیت کھلتی ہے ناں۔ شہریار مرد مومن تھا۔ ذرا جو ڈگمگایا ہو۔ بہرحال اچھی اینڈ ہمیں بھی اچھی اچھی کر گیا۔

ناولٹ سب سے پہلے تو "عشق سفر کی دھول" لبنیٰ جدون صاحبہ ہمارے دل میں آپ کا اور آپ کی تحریروں کا بڑا مقام ہے اور احترام ہے۔ مگر افسوس یہ تحریر لگتا ہی نہیں آپ کی ہے۔

اس ماہ کی جان مزاحیہ تحریر "ساس در ساس" ہائے ام طیفور جی آپ نے تو کمال ہی لکھ ڈالا۔ اک گل ہو رہی۔ تحریر بے شک مزے دار تھی۔ مگر پڑھتے ہوئے جو لالچ مینوں آئی سمجھا کرے ناں۔ آخر ہم بھی خالاؤں کی صفت میں شامل ہیں۔ مذاق ایک طرف ام طیفور نے بہت حساس موضوع کو مزاحیہ انداز میں بیان کیا ہے۔ ایسے دکھ اور احساسات کو بیان کرنا آسان کام نہیں۔ زندگی میں ہر خوشی تو مقدر نہیں بنتی نا۔

"سالا خالا اور اوپر والا" ہمیشہ کی طرح لاجواب۔

مستقل سلسلے سب بہت اچھے لگے اس بار شازیہ گلزار کا "یقین" پڑھ کر خوب روئی۔ مجھے اپنے متعلق رشتوں کی یاد سے ڈر لگتا ہے اور ستم ہمیشہ یہ رہا کہ زندگی سے ہمیشہ دکھ ہی وصول کیے' خیر۔ "مجھے یہ

شعر پسند ہے" میں آمنہ ناز کا شعر حقیقت کے قریب تر تھا۔ "مسکراتی کرنیں" حرا ناز کا "دہشت" اچھا لگا۔

روبینہ یاسمین..... شورکوٹ

دسمبر کا کرن ملا۔ ٹائٹل "صرف" اچھا تھا۔

حمد اور نعت کے بعد انٹرویو کا رخ کیا۔ راشد فاروقی اور شعیب احمد سے تو پہلے بھی ملاقات ہو چکی ہے ہاں البتہ مریم انصاری سے پہلی دفعہ ملاقات ہوئی اور اچھی رہی یہ ملاقات۔

"مقابل ہے آئینہ" میں نشا نورین سے ملاقات اچھی رہی۔ "کرن" کا یہ سلسلہ اچھا لگتا ہے اب دیکھتے ہیں کہ ہماری کون کون سی بہنیں آئینے کے سامنے آتی ہیں۔

"اک ساگر ہے زندگی" نفیسہ سعید کا ناول اچھا ہے دیکھتے ہیں زینب کا کیا بنتا ہے اور ایشال اپنے باپ کے کیے ہوئے رشتے کی لاج رکھتا ہے یا اپنی دل کی سنتا ہے۔ "ردائے وفا" پہلی قسط تو بہت اچھی رہی اب آگے دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔

دونوں مکمل ناول بہت عمدہ تھے۔ "آبرو" مبشرہ انصاری مبارک ہو۔ آپ نے اس ناول کے ذریعے لڑکیوں کو بہت اچھا سبق دینے کی کوشش کی اور بہترین کوشش کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ غلطیاں انسانوں سے ہوتی ہیں اور توبہ کا در کھلا ہے اگر گڑگڑا کر اپنی غلطی کا اعتراف کیا جائے معافی مانگی جائے تو وہ غفور الرحیم ضرور سنتا ہے۔

"پھول 'خوشبو' برساتیں" بشریٰ گوندل۔ آپ نے بھی بہترین لکھا ہے۔ ہوتی ہیں عائشہ جیسی دوست جو یہ نہیں سوچتیں کہ ہمارے ساتھ جو ہوا۔ اس کا بدلہ اپنوں سے لے کر کیا ملے گا۔ واقعی حسد بہت بری چیز ہے۔

"سالا' خالہ اور اوپر والا" بے ساختہ مسکراہٹ اور کسی جگہ ہنسی آجاتی ہے فاخرہ گل جی بہت شکریہ شکریہ اس ٹینشن کے دور میں ہنسانے کا۔

"عشق سفر کی دھول" لبنیٰ جدون کا ٹھیک تھا۔

"ساس در ساس" واہ خوب ایک ساس کی جگہ چار ساس اور کس عمدگی سے چاروں ساسوں کو خوش رکھا۔ مزا آگیا۔

افسانے چھ عدد سب اپنی اپنی جگہ خوب تھے۔ اور مستقل سلسلے کچھ اچھے اور کچھ بہت اچھے رہے۔

"حسن و صحت" میں پھلوں کے ماسک کا شکریہ یہ تو بہت اچھا کیا گھر بیٹھے جلد کی حفاظت خود کرسکتے ہیں ہم۔ واہ موسم سرما اور حلوہ سب ٹرائی کروں گی اور کرن کو دعائیں دوں گی۔ اور آخر میں "کرن کتاب" کی تعریف کرنا بنتا ہے۔ بہت مفید کتاب پیش کرنے کا شکریہ۔

میری طرف سے "کرن" کی پوری ٹیم کو نیا سال مبارک ہو دعا ہے کہ نیا سال سب کے لیے خیر کا سال ہو آمین۔

سحر انصار..... حیدر آباد

ماہ دسمبر کا شمارہ 15 کو ملا۔ ٹائٹل سو سو تھا۔

ناول "اک ساگر ہے زندگی" نفیسہ سعید اچھا جا رہا ہے۔ مگر نفیسہ جی سین لمبے کررہی ہیں کہانی آگے بڑھنے میں سست ہے۔

فرحانہ ناز کی جگہ فرحین اظفر کا ناول "ردائے وفا" پہلی قسط تو اچھی لگی آگے دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔

مکمل ناول میں دونوں ناول "آبرو" اور پھول خوشبو اور برساتیں" بہت خوب رہے۔ پڑھنے میں بہت مزا آیا۔

تین ناولٹ "سالا 'خالہ اور اوپر والا" فاخرہ گل کی تحریر بہت خوب۔ "عشق سفر کی دھول" لبنیٰ جدون آپ کافی عرصے بعد نظر آئی ہیں۔ اب غیر حاضر نہ ہونا۔ ام طیفور صاحبہ "ساس در س" یہ ہی کہوں گی کہ میدان مار لیا۔

افسانے تمام ہی اچھے تھے "ایک دن بیوٹی پارلر کے ساتھ" نئی رائٹر۔ نیا انداز۔ بہت خوب ندا جی اب دیکھتے ہیں آپ کی اور تحریر کیا رنگ دکھاتی ہیں اس تحریر نے تو رنگ جما لیا۔

"مولا منھسِ وسا" ام ثمامہ تھر کے حوالے سے تحریر بہت اچھی لگی۔

☼ ☼